
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
اپریل 2016

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

جلد 46 • شمارہ 04 اپریل 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

نسخہ کیمیا

جون ایلیا

وہ سرزمین ہار گئی جس میں سب سے پہلی بار گیہوں بویا گیا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس میں پہیا ایجاد ہوا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے دنیا کو دانش سکھائی تھی اور پیغمبروں کو پرورش کیا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے انسانوں کو اپنی دانش پر فخر کرنا سکھایا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے دنیا کو پہلی بار قانون کے ضابطے تعلیم کیے تھے۔ ہاں، حمورابی ہار گیا۔ تو صورتِ حال یہ ہے کہ عراق ہار گیا۔ انسانوں کی بہترین ذہانتوں، کہانتوں اور خطابتوں کی پیش گاہ ہار گئی۔ جون ایلیا تم ہار گئے، تمہارا نسب نامہ ہار گیا۔ تمہارا ماضی اور ماضی کا ماضی ہار گیا۔ بابل ہار گیا، بغداد ہار گیا۔

ایتھنز کے بعد تاریخ نے بغداد سے زیادہ دانش افروز شہر پیدا نہیں کیا۔ اگر تاریخ پڑھتے ہوئے بغداد کو چھوڑ کر آگے بڑھا جائے تو مہذب انسانیت کا ذہن بیسویں صدی سے گزرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تھا تو دنیا کے عظیم ترین شاعر سعدی نے اس تباہی کا مرثیہ کہا تھا۔

آسماں را حق بود گر خوں بہ بارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک
سر بروں آرد قیامت درمیان خلق بیں

اے میرے ہم نشین شام قیامت برپا ہو گئی ہے۔ بغداد اپنی بدترین سرنوشت سے دوچار ہوا ہے۔ تمہاری تہذیب کی سب سے بڑی علامت لہولہان ہو گئی ہے۔ شہروں کا وہ شہر تباہ و برباد ہو گیا ہے جس کے چوراہوں پر تاریخ کی سب سے اعلیٰ دانش، سب سے اعلیٰ بینش کام کیا کرتی تھیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ بغداد تباہ و برباد ہو گیا اور کسی سعدی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ اس لیے کہ اس زمانے کا بغداد سعدی کے زمانے کا بغداد نہیں تھا۔ اس وقت بغداد کے پیچھے ایک درخشاں تاریخ تھی مگر اس بار بغداد کے پیچھے کوئی تاریخ نہیں تھی۔

سن لیا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ تاریخ کے خلاف کبھی جنگ نہیں کی جا سکتی اور اگر جنگ کی جائے گی تو شرمناک ترین شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تم نے تاریخ کے خلاف جنگ کی اور اپنے اندر اور اپنے باہر شکست کھا گئے۔ جو مستقبل کی طرف قدم نہیں اٹھائے گا، وہ ماضی کی طرف بری طرح دھکیل دیا جائے گا۔ تمہارے حریف اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ علم تھا، دانش تھی۔ حکمت اور عمل کا ایک طویل سلسلہ تھا اس لیے ان کی دھاندلی جیت گئی۔ تمہارے ساتھ ایسا کوئی سلسلہ نہیں تھا اس لیے تمہاری غلط کاری اور غلط کوشی کو تو سزا یاب ہونا ہی تھا۔ تم بتاؤ، جواب دو کہ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ آخر تم نے تاریخ سے ایسا کون سا معاہدہ کیا ہے کہ تم وقت سے ہٹ کر چلو اور وقت تمہیں راستہ دے دے۔ عراق کی شکست جمہوریت کے مقابلے میں آمریت کی شکست ہے۔ علم کے مقابلے میں جہالت کی شکست ہے۔

کیا یہاں کبھی یہ سوچا گیا کہ اسلحہ درآمد کرنے والے، اسلحہ برآمد کرنے والوں سے کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں اور اگر مقابلہ کر بھی گزریں تو کیسے رخ پا سکتے ہیں؟

کیا ہنر کی نقالی ہنر سے جیت سکتی ہے، کیا خریدی ہوئی مہارت حقیقی مہارت کا سامنا کر سکتی ہے؟ حیرت ہے کہ ہم یہ بات کیوں نہیں سوچتے اور یہ نقطہ کیوں نہیں سمجھتے۔ ہمیں اس حقیقت کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دسترخوان پر حرام خوری کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے۔

میں اپنے آپ سے اور اپنے گردوپیش سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آخر ہم نے سوچا کیا ہے؟ ہم تاریخ سے آخر کس طرح کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں؟

حقیقت حال یہ ہے کہ ہم تاریخ سے کوئی معاملہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم نے تاریخ سے کبھی کوئی سلیقے کا معاملہ نہیں کیا۔ تاریخ قوموں کی کوئی زرخرید لونڈی نہیں ہے کہ اس سے جو کچھ چاہا جائے، وہ منوا لیا جائے۔

تاریخ کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ علم، دانش اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔ علم کے سامنے ذلیل ہونا جہالت کا مقدر ہے۔ جمہوریت کے مقابلے میں شکست کھانا آمریت کا مقسوم ہے اور کوئی قوم اپنے تاریخی مقدر اور مقسوم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ جو قوم علم، دانش اور جمہوریت کے ساتھ زندہ رہنے کا شعور نہیں رکھتی، اسے رہنے کا کوئی حق نہیں۔ علم، دانش اور جمہوریت، یہی تو موں کے لیے ایک نسخہ کیمیا ہے اور بس۔

....☆....☆....☆

آپ کے خط

محترم قارئین
السلام علیکم!

اپریل 2016ء کا بہاررنگ شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ سال آتے جاتے اور موسم بدلتے رہتے ہیں لیکن انسانی شعور کا خانہ بہت حساس ہوتا ہے جہاں قیمتی لمحات اپنی یادیں ثبت کر جاتے ہیں...... اس بار سال اور موسم کچھ اس طرح بدلا کہ سسپنس کی پھلواری کے دو خوب صورت پھول مرجھا گئے...... گزشتہ شمارے میں جناب محی الدین نواب کے بچھڑ جانے کی افسوس ناک خبر تھی اور اس بار ہر دلعزیز قلم کار جناب کاشف زبیر کے ملکِ عدم سدھارنے کی دلدوز خبر دی جارہی ہے جو 22 فروری 2016ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے (اناللہ وانا الیہ راجعون) سسپنس کے صفحات پر اپنی انفرادی شناخت بنانے والے کاشف زبیر کا نام اپنی تحریروں کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وقت کچھ اور آگے بڑھا اور پچھلے ماہ خواتین کا عالمی دن بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا...... اگر ماضی پر نگاہ ڈالی جائے تو برصغیر میں تقریباً 1886ء سے خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد جاری ہے۔ حتیٰ کہ 1918ء میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس نے خواتین کے حقِ رائے دہی کی حمایت بھی کی۔ آج بھی اس دن کی مناسبت سے ریلیاں نکالی جاتی ہیں۔ تقاریب منعقد کی جاتی ہیں اور قومی دولت کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے...... مگر نتائج صفر...... رٹے رٹائے نعروں اور طے شدہ تقاریر میں الگ الگ مطمحِ نظر کا پرچار کیا جاتا ہے اس کے باوجود آج بھی مسائل اپنی جگہ قائم اور ”عالمی دن“ کی اہمیت اپنی جگہ اٹل ہے...... نہ حقوق کی ادائیگی سہل ہو پاتی ہے نہ حقائق سے پردے اٹھائے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے عالمی منڈی میں پیٹرول کی قیمتوں میں نمایاں کمی کے باوجود نہ تو فوری اطلاق کیا جاتا ہے اور نہ ہی اشیائے صرف کی قیمتوں میں کوئی کمی کی جاتی ہے البتہ اضافے کی صورت میں فوراً سے پیشتر نمک سے لے کر آٹے دال تک ہر چیز کی قیمتوں میں بڑے ذوق و شوق اور جوش و ولولے سے اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ کیسا نظام اور یہ کیسے اصول ہیں کہ اندھیر نگری چوپٹ راج کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی بے یقین و بے یقینی کی کیفیت سے نکلنے اور افسردگی کا احساس مٹانے کے لیے اب چلتے ہیں اپنی نٹ کھٹ محفل کی جانب کہ جہاں کم از کم ایک دوسرے کا خیال تو کیا جاتا ہے۔

✠ عذرا ہاشمی، الائیڈ اسکول گڑھ موڑ سے محفل میں شریک ہیں

”ایسا ہے صنفِ نازک کا بانکپن جیسے جانِ بہاراں جیسے رشکِ چمن
پتلی بھویں، بھاری پلکیں، بند آنکھیں اور وا دہن
اڑتا آنچل اور محوِ طواف تتلیاں ہم رنگ و رنگ برنگ
موسمِ بہار کا عکاس سرورق بہت خوبصورت و من موہن

آگے بڑھے تو منفرد فہرست دیدہ زیب و دل پسند۔ انشائیہ میں جون ایلیا مرحوم انسانیت اور انسانیت دشمنی کی گنجلک گتھیاں سلجھاتے نظر آئے۔ انکل اداریے میں آپ کے تفکرات مبنی برحقیقت ہیں۔ جس ملک میں بدعنوانی عام ہو اور ڈھکے چھپے انداز میں نہیں بلکہ کھلم کھلا بہت خوفناک ماحول اور خوفناک حالات پیدا کیے جارہے ہوں اور کسی حد تک کر چکے ہیں۔ ہم تو فقط یہی دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ عزوجل ہمیں ایسا لیڈر عطا فرمائے جو بکھرے پاکستانیوں کو متفق اور یک جان قوم میں بدل دے۔ (آمین) محی الدین نواب صاحب کی رحلت کی اطلاع نے اتنا دکھی کیا کہ دو دن تک کچھ پڑھا ہی نہیں گیا اور مذکورہ دو دنوں میں نواب صاحب کی یادگار تحریر دیوتا اور اس کے کردار ذہن میں گھومتے رہے اور دماغی پردۂ اسکرین پر ان کی مختلف تحاریر مناظر کی شکل میں فارورڈ کی جانے والی فلم کی طرح بھاگتی رہیں۔ اردو کی بیٹی طویل داستان یتیم ہوگئی۔ اللہ پاک نواب صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) قدرت اللہ نیازی صاحب مسندِ صدارت کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ کا سانحہ اے پی ایس اور سانحہ چارسدہ پر برمحل شعر بہت اچھا لگا۔ اشتیاق شاہین صاحب آپ کا الفاظ کا چناؤ اور بروقت استعمال شاندار ہے۔ سسپنس میں پہلی کوشش ہے (خوش آمدید...... بہت دیر کی مہرباں آتے آتے) ایک راز طشت از بام کیے دیتے ہیں کہ ہمیں جاسوسی سے متعارف کروانے والا اور رسالوں میں سے ہماری پہلی محبت سسپنس ہے جو آج بھی باقاعدگی سے جاری و ساری ہے۔ آج خط لکھتے ہوئے ہم خود بھی حیران ہیں کہ ہم نے سسپنس سے طویل رفاقت کے باوجود خاموش قاری کی حیثیت کیوں برقرار رکھی اور پتا نہیں یہی حیثیت کب تک برقرار رہتی کہ بھلا ہو سید عبادت کاظمی اور رانا حبیب الرحمٰن کا جنہوں نے اپنی صنف کی عددی برتری کے زعم کا برملا اظہار کر کے ہماری غیرتِ نسوانی کو جھنجوڑ ڈالا اور ہم نے اس قضا فریضے کی بجا آوری پر کمر کس لی۔ (شاباش...... اچھا کیا) مرحا گل اور محمد خواجہ کے تبصرے جاندار اور بہت اعلیٰ تھے اور محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ بھی جامع اور عمدہ تھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے مغل بادشاہ اکبر کے بچپن سے لے کر جہانگیر کے عہد تک کی تمام بغاوتوں کو ”سلسلے بغاوت کے“ میں یوں سمیٹا کہ ہم اش اش کر اٹھے۔ ناہید سلطانہ اختر نے

اسلام آباد کے پس منظر میں ننھی ننھی حقیقتوں کو لڑی میں پرو کر یوں پیش کیا جیسے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔ یہ تحریر آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھی اور قصہ شہر شاہاں نے دل پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ اپنی پسندیدہ ترین کہانی شیش محل پڑھی۔ جولیٹ کے والد جوزف کی موت کا صدمہ جولیٹ کے صدمات کی فہرست میں اضافہ کر گیا۔ قسط کی آخری سطرات میں فاروق سے اچانک ملنے والی لڑکی یقیناً بھابیہ سیٹھ کی فیملی ممبر ہو گی۔ ہماری پیشن گوئی ہے کہ جولیٹ جوزف اور جوزفین کی سگی بیٹی نہیں ہو گی بلکہ کسی مسلمان گھرانے کی بچھڑی ہوئی بچی ہو گی۔ اسما قادری صاحبہ ہماری فرمائش ہے کہ جولیٹ اور فاروق کے دکھوں کی طویل قطار میں خوشیوں کے لمحات فوراً شامل کریں۔ کارنامہ میں جان اور ڈیمٹری بلیک میلر کم جاسوس ثابت ہوئے عام ڈگر سے ہٹ کر اچھی کہانی تھی۔ بدطینت میں حسبِ سابق اور حسبِ روایت مرزا امجد بیگ مظلوم یاسمین کو اس کے سوتیلے دیور اجمل شاہ کے چنگل سے بچانے میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے شوہر شوکت علی کے کیس کو بھی اسی نشست میں حل کیا جاتا۔ چلتر، لٹیری عورت کی مہارت اور چالاکی پر مبنی مختصر تحریر کوئی خاص اثر چھوڑنے میں ناکام رہی، نارمل اسٹوری تھی۔ رونیاں اس ماہ کی دوسری کہانی جس نے دل و ذہن کو جھنجوڑ ڈالا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کیا اس ننھی سی جان نے جان، جانِ آفرین کے سپرد کرتے وقت یہ نہ پوچھا ہو گا کہ کیا میرا جرم اتنا بڑا تھا کہ قابل گردن زنی قرار پاتا، وہ بھی اپنوں کے ہاتھوں۔ اگر محفل شعر و سخن میں انتخاب کا حق ہمارے پاس ہوتا تو زرین آفریدی کا شعر اول نمبر پر، محمد شہباز اکرم نوئی کا دوسرے نمبر پر اور قدرت اللہ نیازی صاحب کا تیسرے نمبر پر ہوتا۔ (پسند اپنی اپنی...... نصیب اپنا اپنا) تحفہ میں شیر افگن کے حسن و ادا کے توہمی عمل کو پڑھا۔ مصری عورتوں کی یاد تازہ ہو گئی اور اس کے شوہر دسنت کو بھی سالگرہ پر عجیب تحفہ لینے کی لت تھی، حیرت انگیز اور اچھی کہانی۔ محی الدین نواب مرحوم کی ماروی کی یہ قسط روایت کے برخلاف بہت اچھی لگی۔ مراد اور ہم زاد دونوں نے اپنے اپنے جیون ساتھی ڈھونڈ لیے، دیکھتے ہیں چار گھنٹے بعد کیا ہوتا ہے۔ ہماری فرمائش ہے کہ ماروی کے بعد نیا سلسلہ طاہر جاوید مغل کے قلم سے شروع کیا جائے (آپ کی فرمائش پہنچا دی گئی ہے) بے رنگ میں بھرپور سسپنس پیدا کیا گیا۔ اسٹورٹ کار تو قدرتی جاسوس نکلا۔ مگر انسان کو ڈکسن جتنا دبو اور ڈرپوک نہیں ہونا چاہیے۔ ضیا تسنیم کی اچھی اور عمدہ کوشش ابوالمعلی قطب دوراں میں دوبارہ اکبر اور جہانگیر کے ادوار سے واسطہ پڑا۔ فتح پور سیکری ایک تاریخی شہر ہے۔ اس کی ابتدا اور وجہ تسمیہ کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ زبردست اور اعلیٰ۔ محبوب مصنف کاشف زبیر صاحب لہو اثر لائے۔ روبینہ کی جدوجہد پڑھ کر دل سے برملا نکلا۔ شاندار اور آؤٹ اسٹینڈنگ کاشف زبیر صاحب...... تسی چھا گئے او۔ عبدالرب بھٹی صاحب نے سسپنس کے قیمتی آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ مجاہد شیر علی غازی رہا۔ کشمیر کے متعلق ایسی ایسی معلومات ملیں جو کسی تاریخی کتاب سے آج تک نہیں ملیں۔ کیا کہنے بھٹی صاحب۔ اس ماہ اکثر کترنیں بھی خوب تھیں مگر شفقت محمود کھیوڑہ کے لاجواب لطیفے نے ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا شمارہ طویل سلسلوں کے علاوہ چار ہیرے جیسی کہانیوں سے مزین تھا جو صدیوں نہیں بھلائی جا سکیں گی۔ تمام ادارے کے انتھک ساتھی یونہی ہی بخیریت جگمگاتے رہو۔" (اتنی گہری نظر سے کیا جانے والا تبصرہ واقعی بہت جاندار تھا)

✠ رسول فیملی کی پرستار...... رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے محفل کی زینت بنی ہیں "نگرانِ اعلیٰ محترم معراج رسول صاحب! رب کائنات سے دعا ہے کہ وہ آپ کو لمبی عمر کے ساتھ صحت و تندرستی والی زندگی دے (آمین) آپ کی بیماری کا سن کر میں اور میرے گھر والے جو آپ کے رسالے بے حد شوق سے پڑھتے ہیں، سب بہت پریشان ہوئے۔ مجھے آپ کی بیماری کا بہت دیر سے پتا چلا اور دل بہت اداس ہو گیا۔ یقیناً آپ نے بہت بیماری کاٹی ہے (بس اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں اس آزمائش پر پورا اتارے، آپ کی پراثر دعائیں ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں) آج آپ اپنے رب کے بہت نزدیک ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ آپ اسے ہر وقت یاد کرتے رہیں۔ (بے شک بیماری میں انسان اللہ کے نزدیک ہو جاتا ہے) آج آپ کی وجہ سے آپ کے والدین کے لیے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ آپ جو بھی ان کے لیے دعا کریں گے، وہ ان کی بخشش کا ذریعہ بنیں گی۔ اچھی اور نیک اولاد بھی والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہوتی ہے آپ تو جس جس کے لیے دعا کریں گے وہ بڑا خوش نصیب ہو گا۔ آپ کے رسالوں کے ذریعے ہمیں دنیا بھر کی معلومات گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔ آپ نے ہمیں ہر اچھے برے کام کے بارے میں بتایا ہے۔ اچھے برے لوگوں کے بارے میں معلومات دی ہیں۔ (ان معلومات سے مستفید ہونے کے لیے آپ نے بھی وقت نکالا۔ بہت شکریہ) آپ کی یہ نیکیاں قیامت تک ساری دنیا میں پھیلتی رہیں گی اور لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ رب کائنات نے اس نیکی کے لیے آپ ہی کو چنا ہے۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ آپ کے رسالے بھی آپ کے لیے صدقہ جاریہ کا کام کر رہے ہیں۔ اچھی کتاب اور اچھی پڑھائی انسان کی تنہائی اور دکھ درد کا بہترین ساتھی ہوتی ہیں۔ آپ یوں بھی بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اتنی اچھی، نیک اور خدمت گزار شریک حیات ملی ہیں جو اپنا ہر کام گھر سے لے کر پبلی کیشنز تک بخوبی نبھا رہی ہیں۔ میری ان سے جب پہلی بار گفتگو ہوئی تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میری ان سے بات ہو رہی ہے۔ آپ پبلی کیشنز کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ میرے اس خط کا جواب ضرور دیں۔ میں نے آپ کو اپنی لائبریری کی تصویریں ای میل کی ہیں اور اپنی اس چھوٹی سی لائبریری کو آپ کا نام دیا ہے اور عذرا رسول صاحبہ! آپ سے بات کرنا ہی ہمارے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ (بہت شکریہ اس عزت افزائی کا) میں نے تصویروں کے ساتھ جو کالم ای میل کیا ہے اسے دیکھ کر پہلی نظر میں آپ نے کیا محسوس کیا، ضرور لکھیں۔ اب کچھ آپ کے رسالوں کے بارے میں۔ رب کائنات آپ سب کو اس کام کو بڑھانے میں آپ سب کی مدد کرے اور آپ کو ہمت دے۔" (اتنی چاہت کا بے حد شکریہ۔ جی آپ کا ای میل کردہ کالم اور لائبریری کا عکس ہمیں مل گیا ہے۔ آپ نے اپنی لائبریری جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے روحِ رواں معراج رسول کے نام کی ہے۔ بہت مہربانی۔ آپ نے بے زبان جانوروں کے بارے میں کالم لکھا۔ اچھا ہے اور واقعی ہمیں ان بے زبانوں کا بے حد خیال رکھنا چاہیے۔ آپ کے خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں لیکن سسپنس میں اشاعت کے حوالے سے ہم معذرت چاہتے ہیں مگر ان تمام باتوں میں ڈائجسٹ کی کہانیوں کے بارے میں آپ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ مزید آپ اس کے لیے کیا چاہتی ہیں۔ مصنف اور کہانی پر کوئی رائے نہیں دی۔ خیر آپ نے جو بھی کہا آپ کی محبت سر آنکھوں پر۔ فون پر

فرداً فرداً سب سے بات کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا خطوط کی یہ محفل آپ کی اور ہماری آسانی کے لیے رابطے کا خوب صورت ذریعہ ہے۔ جو بھی کہنا ہے خط لکھیں۔ آپ کے خطوط ہماری محفل کی زینت بنتے رہیں گے۔ ہمارے لیے تمام قارئین محترم ہیں اور سب ہماری محبت اور توجہ کے حق دار ہیں جن کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں)

⌘ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ماہِ مارچ کا سسپنس خوب صورت رنگوں کا امتزاج آزاد فضا میں اڑتی ہوئی تتلیاں بہت عمدہ لگا۔ انشائیے میں عقل وخرد کے موتی چنے جس میں انسانیت کا ذکر سرفہرست رہا۔ اداریے کا بھی اپنا الگ انداز تھا۔ ناموں کی دنیا میں محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا نام تھا۔ مبارکباد۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سلسلے بغاوت کے مغل حکمراں اکبراعظم کے حالات و واقعات بہترین وموثر انداز میں پیش کیے محبت ورقابت، اپنوں کی ریشہ دوانیاں، غیروں کی بے اعتنائیاں خوب عکاسی کی گئی تھی۔ قصہ شہر شاہاں ناہید سلطانہ اختر واقعی انسان کا المیہ ہے کہ وہ ساری عمر جدوجہد کرتا ہے ایک گھر بنانے میں مگر بیشتر لوگ زندگی بھر کاوشیں کرنے کے باوجود سر چھپانے کے لیے گھر نہیں بنا پاتے اور دنیا سے گزر جاتے ہیں حسرت و یاس لیے ہوئے۔ شیش محل اسما قادری کی کہانی خوب صورتی ودلچسپی کا عنصر لیے جاری وساری ہے۔ ہر ماہ بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے پھر تشنگی کا احساس لیے کہانی ختم ہوجاتی ہے۔ کارنامہ تنویر ریاض کی اچھی کہانی تھی۔ بدطینت بھی اچھے انداز میں لکھی گئی کہانی تھی۔ چلتر میں ایک عورت نے پولیس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور دولت لے اڑی۔ روٹیاں منظر امام کی تھی جس نے عبرت کا درس دیا۔ حقیقت سے قریب تر کہانی تھی۔ انسانیت سوز یہ واقعہ کہ گول روٹی نہ بنانے پر باپ وبھائی نے ایک بچی کو مار مار کر ختم کردیا، انسانیت بھی کانپ گئی ہوگی۔ محفل شعروسخن میں بھی اشعار نے مزہ دیا۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے...... لطائف واقوال زریں نے آگہی کا در وا کیا۔ تحفہ اور بے رنگ بھی اچھی تحریریں تھیں۔ ابوالعلیٰ قطب دوراں نے قلبی کیفیت کو نورانی جذبوں سے ہمکنار کیا۔ اللہ کے ولی جب دنیا کو چھوڑ کر اللہ سے لو لگا لیتے ہیں تو ان کی زبان اللہ کی زبان بن جاتی ہے۔ جیسا وہ چاہتے ہیں اللہ ان کی خواہشوں کو پورا کردیتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی صرف اور صرف اللہ کے لیے ہی وقف کی ہوتی ہے۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیاں لہو اثر کاشف زبیر کی بہترین کہانی تھی۔ دوسری کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی کفن بہ دوش تھی جو کشمیر کے پس منظر پر لکھی ہوئی پُراثر تحریر تھی، بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔''

⌘ **محمد صفدر معاویہ**، خانیوال سے چلے آرہے ہیں ''15 فروری کی شام کو مارچ کا شمارہ مسرور ہیں میں ملا۔ سرورق کو ایک خوب صورت ماڈل کے ساتھ رنگ بکھیرتی تتلیوں سے سجایا گیا۔ جون ایلیا محترم نیکی لے کر آئے بہت خوب کہا کہ بس دو ہی عقیدے ہیں، انسانیت اور انسانیت دشمن۔ چاہے مغرب ہو یا مشرق ایسے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو نادان لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا 23 مارچ تو پاکستان کے سنگ بنیاد میں ایک اہم قدم تھا جس سے ہم نے پاکستان حاصل کیا۔ افسوس کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان کے بعد کوئی ایسا لیڈر اور سچا ہمدرد نظر نہ آیا جو پاکستان کے لیے اچھا ثابت ہوتا۔ اپنی محفل میں آئے تو اپنے ہم شہر بھائی قدرت اللہ کو کرسیِ صدارت پر عمدہ تبصرہ کرتے ہوئے براجمان پایا۔ بہت ہی عمدہ تبصرہ مبارک ہو۔ شاکر لطیف کی شکایت محمد خواجہ کی ونڈرفل تبصرہ نگاری کمال کا تبصرہ لکھا۔ رانا حبیب کی سینٹرل جیل لاہور سے شرکت آپ کی ہمت ہے کہ جیل میں بیٹھ کر پڑھنا اور لکھنا اللہ آپ کی مشکل آسان کرے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل سے شروع کیا۔ جولی کو باپ کی موت کا پہاڑ جیسا غم بھی اٹھانا پڑا۔ اب وہ ولدار آغا سے انتقام کو وقتی طور پر بھول کے اپنے والدین کی ہسٹری پڑھ رہی ہے۔ فاروق شملہ جا پہنچا تحریر میں ہندو مسلم فسادات کے بارے میں بتایا گیا۔ ہندوستان کا بٹوارا ہو کے رہے گا کیونکہ مسلم قوم کے لیے ایک الگ ملک ضروری تھا جہاں وہ اپنی زندگی سکون سے گزار سکیں۔ اس کے بعد ماروی تک پہنچے جس کے لکھاری محترم محی الدین نواب منوں مٹی تلے جا سوئے جو لوگ لوگوں کے دلوں میں اور کتابوں میں اتر جائیں وہ کبھی مرا نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ لفظوں اور دعاؤں میں زندہ رہتے ہیں۔ ماروی کی یہ قسط بھی ایکشن سے بھرپور رہی۔ اس کے بعد پہنچے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی وادی کشمیر پر لکھی کفن بہ دوش کے دوسرے اور آخری حصے پر جہاں بھارتی ظلم حد سے گزر گئے تو کفن بہ دوش مجاہدین نے ان کو ناکوں چنے چبوا دیے بتا نہیں ادھر کتنے ہی کیپٹن بھگوت جیسے جہنم واصل ہوگئے مگر کبھی کشمیر پر غلبہ نہ پاسکے۔ تاریخی کہانی سلسلے بغاوت کے بادشاہ اکبر نے جو حکومت کی سو وہ تو کی لیکن اس نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھ کر رب تعالیٰ کا مجرم ٹھہرا۔ ناہید سلطانہ قصہ شہر شاہاں لے کر آئیں۔ صرف میٹرو، فلائی اوور اور دیگر منصوبوں سے ترقی ممکن نہیں بلکہ لوگوں کو خصوصاً غریبوں کو مفت علاج کی سہولت تعلیم وتربیت کی سہولت اور نظم وضبط پر چل کر ملک وقوم ترقی پاتے ہیں۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہونے سے جرم اور ظلم ترقی کرتے ہیں۔ تنویر ریاض کی کارنامہ میں جان نے اچھا کارنامہ انجام دیا۔ مرزا امجد بیگ کی بدطینت بیگ صاحب نے کیا جکڑا قانون کی رسی میں شاہ جی کو مزہ آگیا۔ عمدہ تحریر۔ سلیم انور کی چلتر گزارہ کرگئی۔ محفل اشعار بھی عمدہ رہی۔ ثمر عباس کی تحفہ بہت ہی اچھی تحریر۔ مقبول حسین کی بے رنگ میں اسٹورٹ کار نے ڈکسن کو بچایا ورنہ وہ تو مرنے کے راستے پر تھا پر اسٹورٹ نے بروقت ذہانت سے کام لے کر اصل مجرم کو پکڑوا دیا۔ ضیا تسنیم کی قطب دوراں ابوالعلیٰ پڑھ کر دل کو سکون میسر ہوا۔ کاش ہم بھی نیک لوگوں کے نقش قدم پر چل کے اپنی زندگی آسان بناتے۔ کاشف زبیر کی لہو اثر میں روبینہ کا کردار بہت عمدہ رہا۔ اس نے جس ہمت سے زندگی کی تلخیوں کا سامنا کیا وہ قابلِ داد ہے۔ منظر امام روٹیاں لے کر آئے۔ میں نے کئی دفعہ اس تحریر کو پڑھا تو میری آنکھوں سے ہر دفعہ آنسو ٹپکے۔ روٹی گول نہ بنا سکنے پر دس گیارہ سالہ پھول جیسی بچی کو مار ڈالا۔ یہ پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ غضبِ الٰہی اب کے تب آنے کو ہے۔ ہم سیدھے راستے پر نہ چلے ظلم کی حد کو پہنچے یقیناً سزا تو بھگتنی ہے۔ دنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔ اللہ ہم کو اعمال نامہ درست کرنے کی توفیق دے۔'' (آمین...... بے شک ہمیں اپنے اعمال پر غوروفکر کی ضرورت ہے)

⌘ **محمد یوسف ساتول لنگڑیال**، نور پور تھل ضلع خوشاب سے تشریف لائے ہیں ''شمارہ اپنی روایات کے مطابق 19 کو ہی مل گیا۔

حق کے پیامبر کا پیغام، نیکی پڑھا جسے پڑھ کر یہ سمجھ آئی کہ مجرموں کو بُرا کہنا اور سمجھنا ہی بہت بڑی نیکی ہے۔ اداریہ پڑھا جہاں حسبِ روایات ناانصافیوں کا رونا رویا گیا اور ایک عظیم سانحے کی اطلاع ملی، دل بہت اداس ہوا۔ دیوتا جیسے دیومالائی سلسلے کے خالق جناب محی الدین نواب صاحب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ نواب صاحب جیسے لوگ مرتے نہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ایک زندہ یاد بن کر۔ خداوند کریم نواب صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ مرحا گل بہن جی آپ تبصرہ کرتی رہا کریں۔ آپ کا تبصرہ میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ رضوان تنولی صاحب بھی کافی عرصے سے غائب ہیں۔ پلیز آپ آتے رہا کریں۔ سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ اسما قادری کی تحریریں قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ ربن دادا اور فاروق کا کردار بہت پسند ہے اور جولیٹ کی ماں کی ڈائری دیکھو کیا اسرار کھولتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی بہت بڑا موڑ کہانی میں آنے والا ہے۔ اس کے بعد ماروی پڑھی اور یہ جان کر دل بوجھل ہوا کہ اختتام تشنہ تکمیل رہے گا۔ کفن بہ دوش میں کشمیری نوجوان شیر علی کا کردار بہت پسند آیا اور بہت سے حقائق جو تقسیم برصغیر کے تھے ان سے آشنائی ہوئی۔ سکھ، ہندو گورکھا کے مظالم پر دل خون کے آنسو رویا اور عبدالرحمان جیسے کمانڈر کا کردار بہت پسند آیا۔ سلسلے بغاوت کے دورِ اکبری کا مکمل احاطہ اور نصف صدی تک حکومت کرنے والے بے دین مسلمان بادشاہ کا احوال اور بغاوت کے اسرار و رموز سمجھ آئے۔ بدطینت بیگ صاحب کے ایک اور کامیاب کیس کی کہانی ادارے سے پُرزور ریکوئسٹ ہے۔ ایک ایسی تحریر شائع کریں کہ جس میں بیگ صاحب مقدمہ ہار گئے ہوں کیونکہ بندہ یکسانیت سے اکتا جاتا ہے اور کوئی بھی فرد اپنے فن میں مکمل نہیں ہوتا کہیں نہ کہیں خامی رہ جاتی ہے۔ قصہ شہر شاہاں اسلام آباد کی مکمل عکس کشی کی گئی۔ ناہید سلطانہ اختر بھی ایک معاشرتی جراح ہیں۔ ان کے قلم کی کاٹ بھی بہت تیز ہے۔ میں عرصہ دس سال سے ان جڑواں شہروں میں رہائش پذیر ہوں یعنی کہ جاب کرتا ہوں اور ان دس سالوں کا منظر مصنف کی تحریر میں حقیقی طور پر نظر آیا۔ سلیم انور کی چلتر ایک عورت کی چلتر کاری کا منظر کارنامہ جہاں ایک کارکن اپنے فرض سے کوتاہی کرتا نظر آیا۔ مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے جو اپنے فرض میں کوتاہی برتیں اور دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بنیں۔ منظر امام صاحب کی روٹیاں نے خون کے آنسو رلایا۔ بہت پُردرد اور پُراثر کہانی تھی۔ تحفہ ایک میاں بیوی کی محبت کا نہ سمجھ آنے والا قصہ، لہو اثر معاشرتی کہانی ہمارے اردگرد بکھرے کرداروں سے کاشف زبیر صاحب نے جو دیکھا، وہ لکھا اور بہت عمدہ لکھا۔ بے رنگ ایک عمدہ مغربی کہانی۔ ابوالعلیٰ قطب دوراں اسلامی سلسلے کی ایک اور ہیرے بکھیرتی مالا جس کا ہر دانہ لاجواب اور مصنف کی کاوش کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ محفل شعر و سخن میں عمران عارف، محمد قدرت اللہ نیازی کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ باقی کترنیں بھی اچھی تھیں اور ہاں ٹائٹل کی تعریف تو بھول ہی گیا عمدہ، لاجواب ٹائٹل جہاں حسینہ ماہ جبینہ تتلیوں کے سنگ کھیلتی نظر آئی اچھا لگا۔" (دلچسپ تبصرہ...... شاندار انداز)

✠ بشریٰ افضل، بہاولپور سے محفل میں شریک ہیں" ٹائٹل انتہائی خوب صورت اور دلکش تھا۔ مرحوم جون ایلیا کی (نیکی) پڑھی۔ خود تو چلے گئے ہمارے لیے علم کا خزانہ ایک منظمی انداز میں چھوڑ گئے۔ ہماری معلومات میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ اپنی محفل میں پہنچے انکل کی باتیں سنیں۔ جناب محی الدین نواب کی موت کا بڑا دکھ ہوا۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) کرسیِ صدارت پر محمد قدرت اللہ نیازی کو براجمان پایا جنھوں نے شعر سے ابتدا کی۔ تبصرہ قابلِ ستائش تھا۔ ہمارا خط تیسرے نمبر پر تھا شکریہ ہمیں یاد رکھنے کا۔ شاکر لطیف چلیں رونا بند کر دیں اور کہانی لکھ ڈالیے، ناراض نہیں ہوتے اچھے بچے۔ محفل شعر و سخن میں باکمال اشعار تھے۔ شعروں کی کلیکشن بہترین تھی، مزہ آ گیا پڑھ کر۔ جنید احمد ملک پہلا نمبر مبارک ہو۔ لوگ کتنے روپ بدل کر چوریاں کرتے ہیں جس طرح چلتر میں اس لڑکی نے بوڑھی عورت کا روپ دھار کر چوری کی اور صاف بچ نکلی۔ منظر امام نے روٹیاں کے عنوان سے حقیقت بیان کی ہے ہمارے معاشرے میں یہی تو ہو رہا ہے۔ ہمارے معاشرے کی منظر کشی خوب صورت الفاظ میں کی ہے یہی تو ان کا خاصہ ہے۔ ثمر عباس کی کہانی تحفہ، بہت خوب صورت کہانی۔ شیرافگن تو اپنے شوہر سے زیادہ چالاک نکلی۔ بڑی خوب صورتی سے خود کو بچا لیتی تھی۔ مرزا امجد بیگ کی بدطینت، انداز بیاں خوب صورت تھا۔ سسپنس اتنا کہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ کترنیں بھی بہت خوب صورت تھیں۔" (تبصرہ اچھا لگا...... آپ کی شمولیت محفل کی رونق ہے)

✠ صادق معاویہ سعیدی، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے تبصرہ کر رہے ہیں" مارچ 2016ء کا سسپنس زیبِ نظر ہوا۔ سرورق کی دوشیزہ جانے کونسا پرفیوم لگائے بحوِ استراحت تھی کہ چمن کی ساری حسین تتلیاں دیوانہ وار اس کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ زبردست ڈاکر انکل...... جون ایلیا نے ٹھیک کہا کہ برے کو برا کہنا اور برا سمجھنا بھی نیکی ہے۔ آپ اداریہ میں بے قاعدگی پر تلملاتے نظر آئے۔ خدا کرے کبھی تو غریب عوام کے امیر حکمران، غریبوں کے لیے سنجیدگی سے سوچیں اور دکھ دینے والی خبر کہ ہمارے محبوب قلم کار محی الدین نواب جہانِ فانی سے دارِ بقا کو سدھار گئے۔ حق تعالیٰ مغفرت کرے۔ میری قارئین سے گزارش ہے کہ ایک مرتبہ سورۃ فاتحہ 3 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر انکل نواب کو ایصال ثواب کریں۔ برادرم قدرت اللہ نیازی مارچ 2016ء کے لیے صدر بزم یاراں ٹھہرے (مبارکاں سائیں مبارکاں) طرزِ تحریر اور مضمون شاندار۔ آپ کے ساتھ ہم بھی شریکِ دعا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دہشت گردی کے عفریت سے نجات دے۔ اشفاق شاہین اور بشریٰ افضل مختصر مگر جاندار تحریر کے ساتھ وزارت اور مشاورت کی کرسی پر جلوہ فگن اور پھر آپ نے مجھے خوش آمدید کہا تو جناب میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب ہماری اپنائیت دیکھیے کہ تین دن میں سارا رسالہ پڑھ ڈالا۔ اب سوچتا ہوں باقی 27 دن کیا کروں گا۔ (سیدھی سی بات ہے انتظار) محمد صفدر

سانحۂ ارتحال

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ کی ایڈیٹر یمنیٰ احمد کی ہمشیرہ حنا عروج طویل علالت کے بعد 21 فروری 2016ء کو رضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں۔ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں جگہ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین (قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے)

معاویہ آپ نے ٹھیک کہا کہ پاکستانی ذہانت کا جواب نہیں مگر حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی اور 3 مرتبہ پڑھی۔ پہلی مرتبہ شوق سے۔ دوسری مرتبہ تسکین کے لیے اور تیسری مرتبہ تبصرہ کرنے کے لیے (کمال ہے) کیا تبصرہ کروں سچ تو یہ ہے کہ شیش محل پر تبصرہ کرنے کے لیے میرے حاشیۂ خیال میں الفاظ نہیں ہیں۔ ربن دادا کا ہر جگہ معاملات سمجھانا اور ہر ایک کی خیر خواہی دیکھ کر دل میں خواہش اٹھی کہ کاش ہمارا کرتا دھرتا بھی کوئی ربن دادا ہی بن جائے پھر ماروی پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ آنکھیں بھیگ گئیں کہ تواب انکل اب ہم میں نہیں رہے لیکن دلوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ باقی کہانیوں پر تبصرے کی صورت میں یارانِ محفل کی حق تلفی کا خطرہ ہے لہٰذا بس کرتا ہوں۔ حیات باقی۔ ملاقات باقی۔‘‘ (کافی سمجھدار ہیں)

✠ سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے چلے آرہے ہیں ’’موسم گل کی دستک دیتا سسپنس ہمارے دل میں بھی بہاریں کھلا گیا۔ رنگ برنگی تتلیوں سے سجا سرورق، خوب صورت سے خوب صورت ترین تھا۔ ٹائٹل گرل پر نو کمنٹس۔ جون ایلیا کی کڑوی باتیں سن کر میٹھی سی محفل میں داخل ہوئے۔ محمد قدرت اللہ نیازی محبتوں کی صدارت کرتے نظر آئے۔ خاص کر ان کا انتخاب کردہ شعر دل کو چھو گیا۔ اشفاق شاہین بھائی دعاؤں کے لیے بہت شکریہ۔ بشریٰ افضل کیا کریں، دوستوں کے دیے زخم بھولتے نہیں ہیں نا۔ اب کچھ پرانے دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ بھی محفل میں آئیں ورنہ ہم بھی جارہے ہیں۔ اسما قادری یہ کیا کر رہی ہیں۔ شیش محل میں چاند بانو موجودہ قسط میں غائب تھی۔ ماجد علی جیسے لوگ معاشرے میں رشتوں کے اعتبار کو گنوار ہے ہیں۔ میں تو سسپنس بس شیش محل کی وجہ سے لیتا ہوں...... ماروی کے رائٹر اس جہاں کو الوداع کہہ گئے، بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت نصیب فرمائے۔ اپنے محبوب رائٹر کی کہانی کفن بہ دوش پڑھی، بہت اچھی لگی۔ شیر علی کے ہمت اور حوصلے کی داد دینی چاہیے۔ زینو جیسی سوچ ہر لڑکی کو آجائے۔ جان جائے پر عزت نہیں۔ کشمیری بھائیوں کے لیے دل میں درد اٹھتا ہے۔ خدا غارت کرے ان بھارتیوں کو۔ کچھ تشنگی رہ گئی پتا نہیں کیوں۔ کاشف زبیر کی کہانی لہو اثر پُراثر تحریر تھی۔ منظر امام تو ہر دفعہ اداس کر کے چھوڑتے ہیں۔ روٹیاں ایک زبردست اور سبق آموز تحریر تھی۔ غریبوں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ نبیلہ کو کچھ نہیں کہا گیا کیونکہ وہ امیر گھرانے کی بہو تھی اور اس بچی کو بس اللہ معاف کرے۔ سلسلے بغاوت کے مکمل نہیں پڑھ پایا۔ شعر و سخن میں سعید عباسی کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ میرے والد صاحب علیل ہیں ان کے لیے دعا کی درخواست ہے۔‘‘ (تبصرے کا شکریہ...... اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جلد از جلد صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ آمین)

✠ ایم عمران جونانی، رنچھوڑ لائن، کراچی سے محفل میں حاضر ہیں ’’پچھلے ماہ بلیک لسٹ ہونے کے باوجود ایک سعی اور سہی۔ (ہوں...... یہ ہوئی نا بات...... اچھا لگا) دو چھٹیاں ایک ساتھ ہوں تو سارے کام نمٹا کر مطالعے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جامع و مختصر اداریے میں آپ نے 23 مارچ اور نواب صاحب کو خوب صورتی سے یاد کیا۔ میر محفل نیازی صاحب! تبصرہ خوب صورت ہے۔ صادق معاویہ! خوش آمدید، تفصیلی تبصرے کی امید ہے اب۔ زرین نے دورانِ سفر کلاسک خط لکھا۔ کورنگی کی نمائندگی بڑھتی جارہی ہے۔ خواجہ صاحب نے پورا شمارہ خوب صورتی سے کور کیا۔ مرحا گل کا طویل تبصرہ بہترین سے بھی بلند ہے۔ ایک رات میں رسالہ ختم کرکے عمدگی سے خط لکھا۔ ڈاکٹر ساجد کی تحریریں تو معلومات کا خزانہ ہیں۔ اچھا تو جناب ہندو پنڈتوں نے حسین عورتوں کی سب سے خوب صورت قسم ’’پدمنی‘‘ کو قرار دیا۔ پدمنی کولہاپوری یاد آگئی۔ کل بھی سورج نکلے گا، کل بھی پنچھی گائیں گے اور جی یہ کہ میرے اجداد کے وطن گجرات کا پرانا نام ’’مالوہ‘‘ تھا۔ کیا منظر نگاری ہے اور یہ جملہ دیکھیں ’’فتوحات اکبر کا پیچھا انسان کے رزق کی طرح کررہی تھیں۔‘‘ بیربل کی دانائی کے بڑے قصے سنے تھے۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے اس کا کیا انجام کیا، یہ آج پتا لگا۔ چاند بی بی کی ہمت و شجاعت نے لہو گرما دیا۔ وہیں اس کی بے بس موت نے دل اداس کیا، اکبر کے پچاس سالہ دور کی اس جامع داستان نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب کھول کر بیان کیے۔ آگے چل کر ناہید سلطانہ اختر کی خالص معاشرتی کہانی قصہ شہرِ شاہاں سے ملاقات ہوئی۔ منفرد پلاٹ نے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ اونچے خواب آنکھوں میں سجائے بڑے شہروں کی طرف کوچ کرنے والوں کے دل کی آواز ہے یہ۔ میرا ایک قریبی دوست حال ہی میں دو سال دارالحکومت کی خاک چھان کر کراچی یہ کہتا ہوا واپس آگیا کہ بھئی اپنا شہر اپنا ہی ہوتا ہے۔ ناچیز کی رائے یہ ہے کہ نئے لکھاریوں کو ضرور موقع دیا جائے۔ انگریزی، فرنچ، بنگالی، روسی اور ہندی زبان کی کہانیوں میں ایسے ایسے نگ موجود ہیں کہ قاری اش اش کر اٹھے۔‘‘

✠ مرحا گل، ورابن، ڈیرہ اسماعیل خان سے شریکِ محفل ہیں ’’مارچ کا ٹائٹل بہاروں کا ساتھا۔ رنگ برنگی تتلیوں کی طرح خوش شکل حسینہ بھی گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اداریہ سے مستفید ہوئے۔ وہاں اس خبر نے دل دکھ سے بھر دیا کہ محی الدین نواب ایک بہترین مصنف رضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ ان کی کہانی دیوتا نے ایک عرصے سے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔ مصنفین اپنی کتابوں کی شکل میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی لائبریری میں محفوظ رہتے ہیں۔ خدائے رب ذوالجلال انہیں مغفرت عطا فرمائے۔ آمین۔ ٹاپ آف دی لسٹ قدرت اللہ نیازی تھے، منفرد تبصرہ تھا۔ حساسیت لیے ہوئے تھا۔ مبارکباد قبول کیجیے۔ بشریٰ افضل ایک چھوٹے سے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ صادق معاویہ کی سچی باتیں اچھی لگیں۔ کڑوی محفل آف صنفِ مونچھ میں ہم بطور سویٹ ڈش بن کر آتے ہیں۔ محمد خواجہ کورنگی کا تبصرہ پسند آیا جیسے ٹھنڈی میٹھی پھوار۔ رانا حبیب الرحمٰن کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ خصوصاً نازک صنف کو عزت کے ساتھ پکارے جانے کا انداز ویلڈن۔ گاؤں میں 19 کو ڈائجسٹ پہنچتا ہے اور ہم ایک رات میں پڑھ کر 20 کو لیٹر شائع کردیتے ہیں اتنی محنت سے لکھتے ہیں مگر...... حالانکہ ایک رات میں پڑھنے کا مزہ بھی نہیں آتا مگر محفل کی محبت میں کھنچے چلے آتے ہیں اور آپ ہیں کہ (ارے ارے اس میں دل چھوٹا کرنے کی کیا بات ہے۔ ذرا دل بڑا رکھیں) سب سے پہلے کفن بہ دوش پڑھی۔ روح تک سیراب ہوگئی۔ ایسی زبردست تحریر پڑھ کر۔ ویلڈن ڈاکٹر صاحب۔ شیش محل بور سے بور تر ہوتی جارہی ہے۔ سب سے بیسٹ کہانی منظر امام کی تھی۔ کہانی پڑھ کر دل بوجھل ہوگیا۔ باقی کہانیوں پر تو تبصرہ۔ ہمارے قیمتی الفاظ تو یوں بھی کاٹ دیتے ہیں۔ پہلے محفل کی باتیں پوری شائع ہوجائیں پھر اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ اپریل کے شمارے کو دیکھ کر ہمیں ہچکی ہوجائے گی کیونکہ اپریل میں ہمارے ایگزام ہیں۔

اس دفعہ اچھی باتیں اور کترنوں میں محمد جاوید چھائے رہے۔“ (شکریہ جناب تبصرے کا...... آپ کے اگلے خط کا انتظار رہے گا)

✠ **معراج محبوب عباسی**، ہری پور، ہزارہ سے حاضر ہیں ” مارچ کا سسپنس ڈائجسٹ تھوڑا جلدی 19 کو حاصل ہو گیا۔ ٹائٹل ”حسین زنگوں“ کا عکاس تھا۔ سب سے پہلے ماروی پڑھی (اللہ تعالیٰ اس شاہکار کے خالق جناب نواب صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام دے اور مرحوم کو اعلیٰ درجات اور ورثا کو صبر جمیل دے کیونکہ جانا تو سب نے ہے) مراد علی منگی دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا رہا ہے، وہ بھی بیٹل باڈی کے ساتھ دلکش و دیدہ زیب ڈیزائن والے اور ساتھ میں گھر بھی بسا لیا ہے۔ لہو اثر، کاشف زبیر ایک حساس تحریر کے ساتھ آئے...... خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ رضا مراد کے کرتوت جس طرح کے تھے تو خون کا اثر تو ہونا تھا۔ مقبول حسین صاحب کی بے رنگ خاصی دلچسپ تحریر تھی۔ سیکنڈ لاسٹ صفحے تک قاتل ڈکسن تھا۔ پھر اچانک شہ کو مات ہوئی۔ سکے کا دوسرا رخ سامنے آیا مگر یہ سب اتنی آسانی سے نہیں ہوا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ ارے نہیں، بہت اچھا بے وقوف بنایا مسٹر قاتل کو۔ منظر امام کی روٹیاں ہمارے بے حس معاشرے کا بھیانک رخ اجاگر کرتی حساس تحریر تھی۔ احساس نامی جذبے کو ہم نے بے حسی کے تاج محل کے اندر دفن کر دیا ہے۔“

✠ **بلقیس خان**، واہ کینٹ سے چلی آ رہی ہیں ” محی الدین نواب کی یوں اچانک رحلت کی خبر آزردہ کر گئی۔ یہ وہ قلم کار تھے جن کی تحریروں سے اختلاف رکھتی تھی۔ میں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ رائٹر جب کچھ لکھتا ہے تو بقول منٹو، اپنے گھر کا روزنامچہ نہیں لکھتا۔ ہو سکتا ہے ہنسی آپ کی ہو اور آنسو آپ کی کسی دکھی بہن کے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی پر نواب صاحب جیسے بڑے لکھاری اگر قلم کی مار مارتے ہیں تو ہمیں کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ میرا دل بہت دکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر فضل و کرم کے دروازے کھولے اور تمام منزلیں آسان کرے۔ میری گزارش ہے کہ نواب صاحب کے سابقہ قلمی ناموں سے قارئین کو آگاہ کیا جائے۔ شکریہ۔ نکی، جون ایلیا کی بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ اگر صرف اس ایک جملے پر لوگ عمل کر لیں۔ انسانیت ایک خاندان ہے نہ اس میں کوئی امتیاز ہے نہ کوئی تفریق...... تو میں سمجھتی ہوں دنیا سے ساری کدورتیں، عداوتیں، تفرقے اور انتشار ختم ہو جائے۔ اداریے میں باوردی شخص کے کالے کرتوت پر وردی والوں کے لیے دل میں جو نفرت تھی اس میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ کرسیِ صدارت پر خانیوال کے ایم کیو نیازی (جو اکثر اس کرسی پر قابض رہتے ہیں) براجمان تھے۔ خوب صورت شعر نے خوب سے تبصرے کو کئی چاند جڑ دیے۔ اشفاق شاہین کے ہاتھ وزارت اور بشریٰ افضل کو سفارت کا محکمہ ملا۔ صادق معاویہ سعیدی کی پہلی شرارت لگتا ہی نہیں کہ پہلی ہے۔ اس دفعہ اے ون تبصرہ تھا۔ زرین آفریدی کی دوسری پوزیشن، محمد خواجہ اور تیسری پوزیشن محمد صفدر معاویہ کی رہی۔ مرحا گل اور سید عبادت بھی لمبے ہاتھ مار رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ خوب لکھ رہے ہیں۔ شیش محل سے آغاز کیا۔ فیورٹ کردار رین دادا ہیں اگر اس طرح کے دو چار دادا پاکستان میں پیدا ہو جائیں تو سارا کچرا ہی صاف ہو جائے۔ انتہائی مضبوط کردار خوش رو فاروق بھی کم نہیں ہے۔ جولیٹ، جوزف کی بیٹی نہیں ہے۔ یہ شک تو جوزفین اور جوزف کی سوگوار آنکھوں نے پہلی قسط ہی سے دل میں بٹھا دیا تھا۔ اب فاروق سے کیا رشتہ نکلتا ہے جوزفین کا...... انتظار ہے۔ اسما قادری کی یہ تحریر گرداب سے زیادہ سحر انگیز ہے جو پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ قصہ شہر شاہاں 70 فیصد افراد کی نمائندہ ایسی درد انگیز تحریر جس نے بہت سوں کو میری طرح رلا رلا دیا ہوگا۔ لہو اثر کا اینڈ جلدی میں لکھا گیا۔ رضا مراد کو اتنا ”وحشی“ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بدطینت، حسام بٹ کی یاد رہ جانے والی کہانی ہے جس میں مظلوم کو اس کا حق ملا اور ظالم انجام رسید ہوا۔ بے رنگ، دوستی کے تقاضوں کو پورا کرتی ایک ولولہ انگیز کہانی تھی۔ ابو تحقیق قطب دوراں سے روح سیراب ہوئی۔ کارنامہ، چلتر اور روٹیاں گزارے لائق تھیں۔ آج کل بہت ساری پریشانیوں نے گھیراؤ کیا ہوا ہے ہمارا۔ اس لیے بغاوت کے سلسلے، ماروی اور کفن بہ دوش نہ پڑھ سکی۔ محمد جاوید، نجمی رحمان، رضوان تنولی، مرحا گل، ریاض بٹ اور اختر عارف شاہ کے مراسلے اچھے تھے۔ اشعار جنید احمد ملک، ظفر اقبال ظفر، محمد کمال انور، جبران احمد ملک اور اشفاق شاہین کے خوب رہے۔“

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ” مارچ کا شمارہ فوراً ہی ہاتھ میں آ موجود ہوا۔ سرورق پر ایک خاتون شاید اپنے آنچل کی مہک پر مدہوش نظر آ رہی ہے اور مہک بھی شاید ایسی کہ تتلیاں بھی اس پر منڈلا رہی ہیں۔ جون ایلیا کی پُر مغز اور معنی خیز تحریر گو مختصر ہی سہی لیکن دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے۔ اس دفعہ انہوں نے انسانیت اور انسانیت دشمنی اور اقدار کی کشمکش پر اتنی سیر حاصل تکرار کی ہے کہ ذہن روشن کر دیا۔ خطوط کی محفل دوستوں نے خوب سجائی۔ میرے خط پر آپ کی پسندیدگی کا شکر گزار ہوں۔ محمد قدرت اللہ نیازی اس دفعہ میر کارواں ہونے پر مبارکباد قبول کریں۔ آپ کے شعر کا جواب نہیں۔ رانا حبیب اللہ آپ کو اس مشکل سے آزادی دلائے۔ سلسلے بغاوت کے گو کہ زمین پر عذاب ہی زن، زر، زمین کے وجود سے ہے۔ چاہے وہ عام آدمی ہو یا بادشاہ۔ مغلیہ دور کی یہ کہانی گو کہ کئی داستان گو لکھتے ہی رہے ہیں لیکن ڈاکٹر ساجد امجد نے بڑی شیرینی سے تحریر کی ہے۔ بہت سی نئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ قصہ شہر شاہاں، خاتون نے ہمارے ملک کے دارالخلافہ کے ماضی اور حال کی جو تصویر پیش کی ہے، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرے ذہن میں اس خوب صورت شہر کی جو تصویر تھی، اس میں دھندلاہٹ آ گئی ہے۔ کاش وہ شہر ہمارے سیاستدانوں کی گرفت سے آزاد ہو اور پہلے جیسا خوب صورت ہو جائے۔ شیش محل، بڑی روانی اور چابکدستی سے رواں دواں ہے۔ کہانی قدم قدم نئے موڑ لیتی ہے لیکن مصنفہ دلچسپی اور یکانگت کو قائم رکھتے ہوئے اس کو دلچسپ بنا دیتی ہیں۔ کارنامہ، ایک قتل کی داستان اور سراغرساں کی انتھک کوشش۔ کامیابی کے نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا داؤ آزمایا جیسے کوئی استاد اپنا کوئی گر چھپا کر رکھتا ہے۔ بدطینت، وکیل صاحب کے کارنامے اس رسالے کی جان ہیں۔ بیگ صاحب اپنے کام کے مرد میدان ہیں۔ ایک ستم رسیدہ عورت جو ایک معصوم چڑیا کی طرح ایک حیا و صفت اور مکار شخص کے جال میں پھنس کر الجھ گئی تھی لیکن بیگ صاحب اور ایک نیک شخص نے رحمت کا فرشتہ بن کر اس کو آزاد کیا۔ چلتر، بہت مختصر لیکن اچھی تحریر۔ ایک عورت کی کمال چالاکی جس نے اپنا جرم نہ صرف چھپا لیا بلکہ مال بھی کما کر لے اڑی۔ روٹیاں، نظیر اکبر آبادی کا شعر جو روٹی پر کہا گیا ہے اس کا انتہائی بہترین ترجمہ اور تشریح اس مضمون میں مختلف انداز اور کہانیوں کے ذریعے کیا گیا ہے کہ روٹی اور جاندار کے تعلق کو بہت خوب صورتی سے اجاگر

کردیا گیا۔ تحفہ، میاں بیوی کا سجایا ہوا گورکھ دھندا جس میں لوگ اپنی ہی انگلیاں گنوا بیٹھتے ہیں۔ کہانی گو کہ بڑی معمولی ہے لیکن ثمر عباس کے قلم نے اس میں روح پھونک دی۔ محی الدین نواب جیسے عظیم کہانی نویس کا دارِفانی سے کوچ کر جانا بڑا اندوہناک ہے۔ ایسے لوگ کہاں بار بار پیدا ہوتے ہیں اور ادب کے معراج تک پہنچتے ہیں۔ ایک شخص جو سارے شہر کو ویران کر گیا۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ (بے شک ڈائجسٹ کی دنیا میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے) بے رنگ، دو دوست۔ ایک کی محبوبہ کا قتل جو کیا کسی اور نے اور پھنس گیا ایک دوست جو مقتولہ کا محبوب تھا لیکن دوسرے دوست نے اپنی ذہانت اور ایک معمولی سراغ ڈھونڈ کر دوست کو بچایا اور دوستی کی لاج رکھ لی۔ امیر ابوالعلی قطب دوراں، مغلیہ دور میں ایک باکمال خدا کی بزرگ ہستی کی داستانِ حیات جو ایمان کو تازگی اور زندگی کی راہنمائی کرتی ہے۔ لہو اثر، ایک عورت کی کہانی جو قدم قدم جیتی اور مرتی رہی لیکن پاک دامنی، نیک نیتی اور ذمے داریوں کا بوجھ احسن طریقے سے اٹھاتی رہی۔ کئی جھول بھی نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی کہانی نے بے مزہ نہ کیا۔ کفن بہ دوش، کشمیر پر غاصبانہ قبضہ اور حریت پسندوں کی جنگ کی ایک زندہ حقیقت کا پس منظر۔ ہندوستان کی ظلم و بربریت سے بھرپور داستان اور کشمیریوں کی مظلومیت اور جدوجہدِ آزادی۔ بہترین پس منظر واقعات کی ترتیب اور جنگی چالوں کی بے مثال عکاسی لیکن یہ کہانی تو اختتام پذیر ہوئی۔ مگر جدوجہد آزادی تقسیم برصغیر سے جاری ہے۔ کترنیں اور اشعار، ہمیشہ کی طرح چٹخارے دار، حکایتیں، لطائف اور رنگا رنگ تحریریں۔ اگلے شمارے کے خوب سے خوب تر ہونے کی امید اور آس۔" (آپ کے منفرد تبصرے نے ایک بار پھر دل موہ لیا)

⌘ **ابرار وارث**، سندیلیانوالی سے تشریف لائے ہیں "اس دفعہ کا شمارہ تو بہت ہی لیٹ ملا۔ ہلکے سبز رنگ پر بھورے رنگ میں ملبوس صنف نازک ہمیشہ کی طرح اپنی حشر سامانیوں سے منصبِ کرخت پر قیامت ڈھا رہی تھی۔ جلدی سے سرورق سے جان چھڑائی اور سیدھا آپ کی باتوں میں آئے تو آپ نے مختصر احوال احوال بتا کے ایک بری خبر سنائی کہ محی الدین نواب جو کروڑوں دلوں کی دھڑکن دیوتا کے تخلیق کار تھے، وہ ہم میں نہیں رہے۔ سنی تو یہ خبر پہلے بھی تھی لیکن افواہ کے طور پر لی تھی لیکن یہ کیا؟ میں تو اتنی دیر تک سکتے میں رہ گیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا کہ ایسا ہو گیا ہے کہ اب تو وہ اللہ کے پاس چلے گئے ہیں۔ بے شک ہم سب نے ہی اللہ کی طرف جانا ہے۔ کاش کہ ایسا نہ ہوا ہوتا لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ بہت دیر بعد رسالے کی ورق گردانی کی حالانکہ پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ساتھیوں کے تبصرے بوجھل دل کے ساتھ پڑھے۔ ان میں قدرت اللہ بھائی اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ محی الدین نواب کو اللہ جلد شفایاب کرے تو بے اختیار آنسو آگئے۔ ماروی کا کیا بنے گا وہ تو اب ہم سب میں مقبول ہو چکی تھی۔ ہم سب جشنوں میں کب سے درخواست کر رہے تھے کہ نواب انکل ماروی کو اینڈ کردیں لیکن یہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اختتام ہوگا۔ فہرست میں نظر دوڑائی تو تاریخی کہانی کے بعد کاشف زبیر غائب، آگے دیکھا تو سیکنڈ لاسٹ اسٹوری پر تھے۔ میری پسند کے رائٹر ہیں نا۔ ناہید سلطانہ کا قصہ شہر شاہاں پڑھا۔ ملکی حالات میں گھرے بے کس و معصوم لوگوں کی داستان۔ اسلام آباد اور لاہور میں کوئی فرق نہیں رہا۔ لوگ بھوک پیاس سے مر رہے ہیں اور ان لوگوں کو میٹرو بس کے بعد اب اورنج ٹرین سے فرصت ہی نہیں مل رہی۔ کیا ان کو ستم رسیدہ، مفلوک الحال، غریب عوام کیوں نہیں دکھائی دیتے؟ ہمیشہ کی طرح حساس دلوں پر چوٹ کرتی پُراثر تحریر ہی پڑھی تھی کہ بھائی کبیر عباسی کی کال آئی کہ کاشف زبیر صاحب بھی ہم میں نہیں رہے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ ایک مہینے میں ادارے کے دو گوہر نایاب یکے بعد دیگرے کیسے ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ کاشف زبیر تو جاسوسی ڈائجسٹ کی جان تھے۔ ہر دفعہ جاسوسی اور سسپنس میں ان کی تحریر نہ ہوتی تو مجھے تو یہ رسالے بالکل خالی لگتے تھے سچ میں...... یا اللہ یہ کیا ہو گیا؟ بس اللہ پاک سے دعا ہے کہ مرحومین کی روحوں کو سکون و قرار پہنچائے کہ انہوں نے ہم سب کے لیے اتنی زیادہ سبق آموز تحاریر لکھیں...... اللہ پاک ان لوگوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ باقی سب قلم کاروں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

⌘ **اشفاق شاہین**، کراچی سے حاضر ہیں "موسم بہار کے آغاز کی مناسبت سے ٹائٹل بہت شاندار تھا۔ تتلی، پھول، لڑکی، موسم اور سسپنس، واہ جی خوش ہو گیا۔ جون ایلیا کے انشائیے نیکی میں تجاہل گر پر مغز باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی، من حیث القوم ہم میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن جب تک ہم سچ کا پرچار نہیں کریں گے، غلام ہی رہیں گے ذہن۔ اپنی محفل میں پہنچے جہاں پہلی خبر محی الدین نواب کی وفات کی خبر نے دل کو دکھی کر دیا، بلاشبہ وہ سسپنس کے قارئین کی نبض کو اچھی طرح سمجھتے تھے، قارئین مدتوں انہیں فراموش نہ کر پائیں گے۔ کاشف زبیر کے لیے بھی دعائے صحت۔ (آپ کی دعائیں آخرت میں کاشف کے لیے اجر کا سبب ہیں) قدرت اللہ نیازی وکٹری اسٹینڈ پر تھے۔ خطوط کے آخر میں ایڈیٹر کے ریمارکس، مزہ دوبالا ہو گیا ہے، رونق اور مزید بڑھے گی۔ صادق سعیدی محفل میں آمد پر خوش آمدید۔ زرین آفریدی، محمد انعام، منفرد خط پسند کرنے کا شکریہ۔ بلاشبہ سب سے پہلے شیش محل کا مطالعہ کیا۔ مخصوص رو دھم سے کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔ ماجد انجام کو پہنچا، شگفتلا کا معاملہ سلجھا۔ جولیٹ دکھ درد دکھوں کی لپیٹ میں ہے، اس کے دن جانے کب پھریں گے اور فاروق جس خیال کو رگ جاں بنائے بیٹھا ہے، جانے کب اس کے سامنے جلوہ نما صورت مجسم ہوتا ہے اور اینڈ پر ایک نئی انٹری، دیکھیں اب کیا برآمد ہوتا ہے اس انتظار سے۔ سلسلے بغاوت کے، بہت شاندار تاریخی کہانی تھی۔ قصہ شہر شاہاں ایک دلچسپ کہانی تھی گڈ ناہید سلطانہ اختر۔ تحریر ریاض کا کارنامہ شاندار تھا۔ بد طینت، مرزا امجد بیگ کا لازوال شاہکار تھا۔ اجمل شاہ جیسے کردار آج بھی جگہ جگہ موجود ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ناہنجار رول سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ سلیم اختر کی چلتر واقعتاً ہی بہت تیز اور شاطر نکلی۔ گڈ۔ روٹیاں سبق آموز اور دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی تحریر ہے بہت زبردست۔ محفل شعر و سخن سب انتخاب لاجواب خصوصاً انجم کمال اور عروہ۔ ثمر عباس کا تحفہ خوفناک اور عجیب تھا۔ ماروی ہم زاد کے ساتھ عقل سے ماورا، انجو سفر ہے اور دیکھیں اب مراد کیا نیا لے کر آتا ہے۔ مقبول حسین کی بے رنگ عنوان کی مناسبت سے بہترین لگی۔ ابوالعلی قطب دوراں، ضیا تسنیم ہمیشہ بہت اچھے اور خوب صورت انداز میں روح میں اتر جانے والے واقعات سے روشناس کراتے ہیں۔ ابوالعلی کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ لہو اثر، کاشف زبیر کی پُراثر تحریر تھی۔ آخری صفحات پر کفن بہ دوش کے ساتھ عبدالرب بھٹی براجمان تھے اپنے رنگ کے ساتھ، بہت خوب۔ اس ماہ کترنیں بھی لاجواب تھیں۔" (دلچسپ تبصرہ تھا...... اچھا لگا)

رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "سب سے تعزیت، میرے پسندیدہ قلم کار محترم جناب محی الدین نواب صاحب کی رحلت کی اطلاع پڑھ کر دل کو ایک دھچکا لگا۔ اتنا صدمہ تو میرے استاد محترم کے انتقال پر بھی نہیں ہوا تھا، دعا ہے اللہ تعالیٰ نواب صاحب کو جنت میں بہترین جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ ابھی تو مرحوم کو بہت کچھ کرنا باقی تھا، ماروی کو مکمل کرنا تھا اس کے بعد آج کا ارتھا شروع کرنا تھا مگر افسوس سب لائحہ عمل ادھورا رہ گیا۔ ماروی کی یہ قسط بہت زبردست تھی، کفن بہ دوش بھی دل دہلانے والی تھی۔ چھوٹی طبع زاد کہانیوں میں لہو اثر نے بہت متاثر کیا۔ قصہ شہر شاہاں یہ سرے سے کوئی کہانی ہی نہیں تھی یہ تو ایک آرٹیکل مضمون تھا کہ پہلے اسلام آباد ایک حسین و جمیل شہر تھا، بعد ازاں اس کے برعکس ہو گیا۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ نے اس بار بہت مایوس کیا۔ البتہ اسما قادری کی کہانی شیش محل نے کافی لطف بہم پہنچایا۔ کارنامہ بھی اچھی نہیں لگی۔ مرزا امجد بیگ کو اس بار ایک منفرد کیس ملا سو وہ بھی انہوں نے جیت ہی لیا۔ وہ ہارتے کب ہیں؟ چلتر، ہائے ری عورت، تو نے پولیس افسروں کو خوب الو بنایا، وہ بھی امریکن پولیس والوں کو۔ منظر امام کی کہانی کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ اف یہ روٹیاں۔ تحفہ، یا اللہ دنیا میں ونسنٹ جیسے ظالم انسان بھی بستے ہیں۔ اشعار کی محفل میں رعنا رضوی، ادریس احمد خان، زرین آفریدی کے اشعار قابلِ داد تھے۔ زرین آفریدی صاحبہ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اس ناچیز کا شعر پسند فرمایا۔ آخر میں میری جانب سے سسپنس کے عملے کے تمام افراد کو درجہ بدرجہ دعائیں اور سلام۔" (بہت شکریہ)

سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ سے محفل میں شریک ہیں "میرے والد مرحوم دیوتا کو طویل عرصہ پڑھتے رہے۔ ان سے یہ شوق ہمارے اندر بھی پروان چڑھا اور دیوتا کا سحر ہمارے پورے گھر پر طاری رہا تا دمِ اختتام۔ اندھیر نگری، آدھا چہرہ، مقدر، واپسی اور ان کے ابتدائی اور اختتامی صفحات کے ناول کی تعداد ان گنت ہے۔ وہ حقیقت میں قلم کے نواب تھے اور درحقیقت ان کو پوری دنیا میں جو نام و مقام نصیب ہوا، اس میں ادارے کے بانی جناب معراج رسول کا بہت بڑا کردار ہے۔ عذرا رسول صاحبہ جو کہ ادارے کی ذمے داریاں بڑے احسن انداز میں نبھا رہی ہیں، ان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ محی الدین نواب کی ان قلمی کامیابیوں میں، ایک عظیم کہانی کار کے جانے کا دکھ تو ہے ہی مگر یہ فخر ہے کہ وہ ہمارے ادارے کے سب سے بڑے لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ ماروی ان کا آخری ناول ہے اس امید پر کہ اس کو ضرور مکمل کیا جائے گا۔ ادارہ اور نواب مرحوم کے گھر والوں کو اور ان کے چاہنے اور پڑھنے والوں کو خدا صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین۔ ٹائٹل گرل اداس تھی مگر بہار آنے کا تاثر بھی نمایاں تھا۔ جون ایلیا ایک اور زندہ تحریر کے ساتھ نیکی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے نظر آئے۔ مدیرہ اعلیٰ بھی ملک کو گھر قرار دے رہی تھیں۔ سچ بات ہے کہ اگر ہم سب ایک قوم بن جائیں، تمام اصول و قوانین کی پاسداری کریں تو ہمارا ملک جلد ہی ترقی یافتہ اور دہشت گردی سے پاک ملک بن جائے گا۔ قدرت اللہ نیازی صاحب نے اے پی ایس اسکول کے بچوں کو ایک اچھا خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کفن بہ دوش ہی پڑھ پایا ہوں بہت اچھی تحریر تھی۔" (دیگر کہانیوں کے بارے میں آپ کی اپنی رائے ہے۔ البتہ مصنف کے خیالات میں مشابہت ہو سکتی ہے مگر انداز جدا ہوتا ہے)

محمد قدرت اللہ نیازی، جیکم ٹاؤن خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "ابھی نواب محی الدین کی وفات کی خبر سن کر ملال کم نہ ہوا تھا کہ محبوب ترین مصنف کاشف زبیر کی وفات کی خبر ملی۔ اللہ پاک غریقِ رحمت کرے۔ کسی بھی تحریر کے ساتھ ان کا نام دلچسپی، معلومات، تجسس اور سسپنس کا ضامن ہوتا تھا۔ ان کی وفات نہ صرف ان کے عزیزوں بلکہ ادارے اور قارئین کے لیے بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ اسما صاحبہ جولیٹ کی تنہائی دور کرنے میں مصروف نظر آئیں جبکہ ہمیں جولیٹ کے ساتھ فاروق کے خاندانی پس منظر جاننے کا بھی اشتیاق ہے۔ قیامِ پاکستان کا پس منظر بھی اس بار شامل رہا جو یقیناً معلوماتی رہے گا۔ تاریخی صفحات پر اکبر کے حالاتِ زندگی پیش کیے گئے۔ نئے دین کی ایجاد کے سبب سب سے بدنام ترین ٹھہرنے والے اکبر نے بڑے کروفر سے حکومت کی۔ بعض تاریخی کتب میں ہے کہ مرنے سے پہلے وہ تائب ہو گیا تھا اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کر چکا تھا۔ کاشف زبیر کی لہو اثر پڑھتے ہوئے مرحوم کی یاد آتی رہی۔ مصنف نے شہزاد کی مجرمانہ حرکت کو خون کے اثر سے منسوب کیا جو درست لگا۔ قصہ شہر شاہاں میں ناہید سلطانہ اختر نے پاکستان کے حالات کی حقیقت سے قریب ترین عکاسی پیش کی۔ کبھی پل بنانے کے لیے عوام کو مصیبت میں ڈالا گیا تو کبھی میٹرو اور اورنج ٹرین کے نام پر عوام کے گھروں کو مسمار کیا گیا اور اس سب میں کتنا کمیشن کھایا گیا، فرشتے ہی بتا سکتے ہیں۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح مزاح کے پیرائے میں نشتر زنی کرتے نظر آئے۔ جس طرح روٹیوں کی کارستانی بیان کی گئی، وہ قابلِ تعریف ہے۔ سچ کہا کہ امیر کے گھر میں ٹیڑھی میڑھی روٹیاں بھی انعام کی حقدار ٹھہرتی ہیں اور غریب کے گھر میں اس کی سزا تشدد ہے۔ تحفہ میں شیرائل اور ونسنٹ لوگوں کو بے وقوف بناتے نظر آئے۔ مصنف کو چاہیے تھا کہ ان کو کوئی سوا سیر ٹکرا ہی دیتے۔ مقبول حسین کی بے رنگ کچھ زیادہ ہی رنگ دار رہی۔ نیلا پیلا اور کئی دوسرے رنگ شاملِ تحریر رہے۔ اسٹورٹ کار کی بھاگ دوڑ کارآمد رہی اور ڈکسن بچ جانے میں کامیاب رہا۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر صاحب کی کفن بہ دوش کا آخری حصہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کشمیریوں کی مشکلات اور بے بسی کی بہت خوب صورتی سے وضاحت کی۔ محفلِ خطوط میں داخل ہوئے تو خود کو کرسی صدارت پر دیکھ کر عجیب مسرت سی ہوئی۔ زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ آپ نے ہماری تجویز کو نوٹ کر کے رسپانس دیا ہے۔ صادق معاویہ! یہ ہمارے لیے اطلاع ہے کہ آپ کو 16 تاریخ بھی 3 دن لیٹ محسوس ہو رہی ہے ورنہ ہمارے یہاں تو 18 تک ہی ملتا ہے۔ زرین آفریدی! محفلِ شعر و سخن میں تبدیلی کی وضاحت نہیں کی آپ نے؟ محمد خواجہ! آپ کی آنکھوں کا آپریشن کامیاب رہے اور اللہ آپ کو صحت دے۔ مرجا گل! آپ کی بات بجا کہ یہ شوخیاں ہی محفل کے حسن کی ذمے دار ہیں۔ رہی بات ٹیڑھے میڑھے الفاظ کی تو آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے الفاظ تو جلیبی کی طرح سیدھے ہیں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

قاسم عمر، رنچھوڑ لائن، کراچی۔ حاجی محمد اسحاق انجم، قصور۔ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ احسان سحر، میانوالی۔ آصف محمود، گوجرانوالہ۔ سید یوسف رضا کاظمی، لیہ۔ شاکر لطیف، لاہور۔ صداقت حسین ساجد، شورکوٹ۔ مشال اینڈ نوال، جہلم۔ اکرم محمود، لاہور

گریہ پیہم

الیاس سیتاپوری

یہ اللہ کی مصلحت ہے کہ اس پاک ذات نے گزرے کل میں ہمیشہ آنے والے کل کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام پوشیدہ رکھ چھوڑا ہے جسے سمجھنے کے لیے انسان کو شعور عطا کیا۔ تاکہ اس کی شان کو پہچان کر اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکیں... قرآن کریم اللہ تعالی کا ایسا کلام ہے جس میں اس نے نہ صرف مکمل ضابطۂ حیات دیا بلکہ اپنے پیغمبروں کی زندگی کا بھی ایسا احاطہ کیا جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے... انہی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی ذکر مبارک ہے... آپ کی تمام حیات اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر گامزن رہی اور ایسی آزمائش سے گزرتی رہی جس پر پورا اتر کر آپ نے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ درج ذیل داستان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود بھی انسان کے جذبات، احساسات اور خیالات وہی ہیں جس میں رشک و حسد اور پھر کسی کا خاص طور پر اللہ پر توکل... بس یہی وہ نقطہ ہے جس سے اللہ کے عام اور خاص بندوں میں فرق نمایاں ہوجاتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

باپ نے اپنے بیٹے یعقوبؑ کو خاص طور پر یہ نصیحت کردی تھی کہ وہ کسی کنعانی لڑکی سے شادی نہ کرے۔ شریف بیٹے نے باپ سے پوچھا۔ "پھر میں کس سے اور کہاں شادی کروں گا؟"

بوڑھے باپ نے کھڑے ہوکر اپنی گھنی ابرو اور بڑی بڑی پلکوں والی آنکھوں سے شمال مشرق میں دیکھا اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹے یعقوبؑ! تو ادھر چلا جا، یہاں تک کہ تو فرات کو عبور کرکے حاران میں داخل ہوجا۔ حاران میں ایک بستی فدان ارم نامی ہے، اس بستہ میں تیرا ماموں لابن رہتا ہے۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں، تو ان میں سے کسی ایک سے شادی کرسکتا ہے۔"

کنعان میں لڑکیوں کی کمی نہیں تھی لیکن باپ کی ہدایت پر سعادت مند بیٹے نے حاران کی راہ لی۔ جس اونٹ پر یعقوبؑ سفر کررہے تھے، اس پر اپنے آگے پیچھے کچھ ضروری سامان بھی رکھ لیا تھا۔ اونچے نیچے، سرسبز و بنجر، آباد اور غیر آباد علاقوں سے گزرتے ہوئے جب آپؑ فرات



کے کنارے پہنچے تو اسے پار کرتے میں خاصی زحمتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ فرات کے کنارے انہی کی طرح کچھ اور لوگ بھی کشتی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

صبح سے سہ پہر تک کشتی کے انتظار میں کھڑے رہنے کے بعد جب وہ نظر بھی آئی تو یہ مشکل پیش آگئی کہ کشتی والا ان کے اونٹ کو دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یعقوبؑ نے اپنا اونٹ یہیں چھوڑا اور خود دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے فدان ارم کی راہ لی۔ یہ سفر بڑا دلچسپ تھا۔ انہوں نے جگہ جگہ کنوؤں پر عورتوں اور لڑکیوں کا جمگھٹا دیکھا اور آسودہ حال امیرزادوں اور شوقین مزاج نوجوانوں کو اپنے گھوڑوں پر سوار اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھا۔ کنوؤں پر موجود لڑکیاں انہیں مسکرا مسکرا کر دیکھتیں اور آپس میں سرگوشیاں کر کے بے معنی اشارے کرنے لگتیں۔

راہ میں زیتون کے درختوں کی بھرمار تھی اور کھجور کے اونچے اونچے، سیدھے اور خمیدہ درخت تیز ہوا کے جھکڑوں سے ہل ہل کر یعقوبؑ کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اس وقت آپؑ کو بھوک اور پیاس مل کے پریشان کر رہی تھیں۔ آپؑ نے ایک چھوٹے سے نخلستان میں بیٹھ کر چند کھجوریں کھائیں اور پانی پی کر اپنی منزل کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نخلستان سے ایک عورت نکلی۔ اس کے ہاتھوں میں کھجوروں سے بھرا ہوا ٹوکرا تھا۔ اس نے یعقوبؑ کو ذرا غور سے دیکھا اور جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تو مسافر ہے؟''

یعقوبؑ نے نرمی سے جواب دیا۔ ''ہاں، میں مسافر ہوں اے مہربان خاتون! جہانوں کا رب تجھے نیکی کی ہدایت دے، کیا یہ نخلستان تیرا ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''یہ میرا تو نہیں، میرے ماموں کا ہے۔''

''خوب!'' یعقوبؑ کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ ''میں بھی اپنے ماموں لابن کے پاس جا رہا ہوں۔''

عورت نے نہایت اشتیاق سے یعقوبؑ کو دیکھا اور پوچھا۔ ''تیرا ماموں لابن وہی تو ہے جو فدان ارم میں رہتا ہے اور جس کی دو بیٹیاں بھی ہیں، لیاہ اور راحیل۔ لیاہ شاید بڑی ہے اور راحیل چھوٹی۔''

یعقوبؑ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ جوش میں کھڑے ہو گئے، بولے۔ ''بخدا تو تو ان سے بہت زیادہ واقف معلوم ہوتی ہے۔ تو تو ان کے نام اور عمروں تک سے واقف ہے۔ اب ذرا یہ تو بتانا کہ لیاہ اور راحیل میں اچھی کون ہے؟ واقعہ دراصل یہ ہے کہ میں اپنے باپ کی ہدایت پر ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔''

عورت نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ''لیاہ ذرا چندھی ہے، ہاں راحیل البتہ خوب صورت ہے لیکن کیا تو چندھی لیاہ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گا؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''پہلے میں ان دونوں کو دیکھوں گا اس کے بعد جو پسند آئے گی اس سے شادی کر لوں گا۔''

عورت نے طنزاً کہا۔ ''خدا تجھے تیرے ارادوں میں کامیاب کرے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تو جیسا سوچ رہا ہے تیرے لیے ویسا ہی ہو۔''

یعقوبؑ نے چلنے کی تیاری کی۔ اپنا سامان اٹھا لیا اور عورت سے پوچھا۔ ''ہاں تو خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے، اب یہ اور بتا دے کہ فدان ارم یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت نے شمال کے افق میں نظر آنے والی سبز پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو حدِ نظر پر درختوں کی پٹی نظر آرہی ہے، یہی فدان ارم ہے۔ اس خوب صورت بستی کو چاروں طرف سے باغات نے گھیر رکھا ہے۔''

یعقوبؑ نے اسے خدا حافظ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی وہاں ایک اور مرد آگیا۔ یعقوبؑ نے نخلستان سے نکل کر شمالی افق کی سبز پٹی پر نظریں جما کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

شام سے ذرا پہلے یعقوبؑ نے شمالی افق کی سبز پٹی کو پا لیا لیکن اب یہ سبز پٹی بڑے بڑے گھنے درختوں کے طویل سلسلے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس سے گزر کر یعقوبؑ ایک کنوئیں پر پہنچ گئے۔ اس وقت کنوئیں پر بڑی بھیڑ تھی۔ ہر عمر اور اچھی بری شکل کی عورتوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ انہوں نے یعقوبؑ کے گرد آلود لباس، دھواں دھواں چہرے اور خاک اور دھول سے اٹے پیروں سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ اجنبی مسافر کسی لمبے سفر سے چلا آرہا ہے۔

یعقوبؑ نے ان بہت سارے چہروں کو سرسری نظر سے دیکھا اور ان سے پوچھا۔ ''اے فدان ارم کی عورتو اور لڑکیو! میں تمہارا مہمان ہوں، ذرا یہ تو بتاؤ یہاں لابن کہاں رہتا ہے؟''

ایک نہایت حسین و جمیل، مجسمہ حسن و رعنائی ان عورتوں اور لڑکیوں کے ہجوم سے باہر نکلا اور موسیقی جیسی رسیلی آواز میں پوچھا۔ ''تو لابن کے پاس کہاں سے آیا ہے اور اس سے تیرا کیا کام اٹکا ہے؟''

یعقوبؑ کے دل پر اس حسین لڑکی نے پہلی ملاقات اور پہلی نظر ہی میں قبضہ جمالیا۔ یہ مبہوت گم صم اس کی شکل ہی دیکھتے رہ گئے۔ دوسری عورتیں اور لڑکیاں آپؑ کی محویت پر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ آپؑ نے لڑکی کا سوال تو سن ہی لیا تھا، جواب دیا۔ ''اے مہربان لڑکی! میں لابن کی بہن کا بیٹا ہوں اور کنعان سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔''

لڑکی کا چہرہ شرم وحیا سے گلنار ہوگیا، کچھ اور قریب چلی گئی، بولی۔ ''میں لابن کی بیٹی راحیل ہوں، آ میرے ساتھ گھر چل۔ میرا باپ تجھ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوگا۔''

کنوئیں کی دوسری عورتیں اور لڑکیاں ایک دم سنجیدہ ہوگئیں، کیونکہ وہ لابن کے بھانجے پر ہنسنے کی جرأت نہیں کرسکتی تھیں۔

راستے میں یعقوبؑ سے نہیں رہا گیا، راحیل کا ہاتھ پکڑلیا اور فرطِ جذبات میں اسے چوم لیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''راحیل! تو یقین کر، میں نے تیرے حسن کا چرچا فدان ارم میں داخل ہونے سے پہلے ہی سن لیا تھا اور اب میں اپنے رب کی قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ تو اس سے کہیں زیادہ حسین ہے، جتنی تیری تعریف کی گئی تھی۔''

راحیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یعقوبؑ کو اپنے گھر لے چلی گئی۔ یعقوبؑ کے بوڑھے ماموں نے اپنے خوب صورت بھانجے کو گرم جوشی سے گلے لگالیا اور کہا۔ ''یعقوبؑ! اب تو یہیں رہ۔''

اس نئے مہمان کو دیکھنے اور ملنے کے لیے گھر کے دوسرے لوگ بھی وہیں آگئے۔ ان میں راحیل کی بڑی بہن لیاہ بھی شامل تھی۔ یعقوبؑ نے دیکھا لیاہ کی آنکھیں واقعی بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اور وہ انہیں کچھ دبا کر دیکھ رہی تھی۔ یعقوبؑ نے ہنستے ہوئے لیاہ کو مخاطب کیا۔ ''غالباً تیرا نام لیاہ ہے اور تو راحیل کی بڑی بہن ہے؟''

ماموں لابن، اپنے مہمان بھانجے کی رہائش کے لیے جگہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔

چھوٹی آنکھوں والی لیاہ نے ناگواری سے تیوریاں چڑھالیں اور پوچھا۔ ''تو نے مجھے کس طرح پہچانا کہ میں لیاہ ہوں؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''تیری چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے، کیونکہ مجھے راستے کے ایک نخلستان میں ایک عورت ملی تھی۔ جب میں نے اس سے ماموں لابن کا پتا دریافت کیا تو اس نے تفصیلی پتا بتاتے ہوئے یہ بھی بتادیا تھا کہ ماموں لابن کی دو بیٹیاں ہیں، راحیل اور لیاہ۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ راحیل بہت خوب صورت ہے لیکن لیاہ کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔''

لیاہ کے دل کو سخت تکلیف پہنچی اور وہ منہ بنا کر سامنے سے ہٹ گئی۔ راحیل نے کہا۔ ''لیاہ تیری باتوں سے ناراض ہوکر چلی گئی ہے۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''پھر کیا ہوا؟ اب تو میں یہیں رہوں گا، کبھی نہ کبھی من بھی جائے گی۔''

اس گھر نے یعقوبؑ کو نہایت عزت اور محبت سے رکھا۔ یعقوبؑ ان لوگوں سے بہت جلدی گھل مل گئے۔ رات کو کام دھندوں سے فرصت پا کے یہ سب ایک جگہ اکٹھے ہوجاتے اور دیر تک خاندانی تذکرے چھڑے رہتے۔ لابن کو اپنی بہن، یعقوبؑ کی ماں کی یاد آجاتی اور وہ بتاتے کہ ان دونوں بھائی بہن میں کتنی زیادہ محبت ہوا کرتی تھی۔ لابن کی آنکھیں بھیگ گئیں اور انہوں نے گلوگرفتہ آواز میں کہا۔ ''اور جب وہ تیرے باپ اسحاقؑ سے وابستہ ہوکر کنعان چلی گئی تھی تو میں کافی عرصے تک اس کے لیے بہت پریشان اور مضطرب رہا تھا۔'' پھر ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ ''جہانوں کے رب نے ہمیں نسیان کی خوبی عطا فرما کر بڑا کرم کیا ہے ورنہ انسان اپنے ماضی کے غموں کے بوجھ ہرگز نہ اٹھا سکتا اور یہ پہاڑ اسے کچل کر رکھ دیتے۔''

یعقوبؑ کچھ بولنے کے بجائے اپنے ماموں کی باتیں سنتے رہے۔ دونوں بیٹیاں بھی بے دلی سے اپنے باپ کی داستان سن رہی تھیں اور انہیں اس میں ذرا بھی مزہ نہ آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد ماموں لابن نے خود بھی یہ محسوس کرلیا کہ ان کے سوا سبھی خاموش ہیں، انہوں نے ہنس کر کہا۔ ''ارے یہ صرف میں ہی بول رہا ہوں، یعقوبؑ! تو بھی تو کچھ کہہ، کچھ اپنے ماں باپ کے قصے سنا، کنعان کے تذکرے چھیڑ۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''ماموں! جیسا کہ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ آپ کی بہن اور میری ماں ربقہ ایک عرصے تک اولاد کی نعمت سے مایوس رہی تھیں۔ شادی کے بیس سال بعد میرے باپ اسحاقؑ نے جب رو رو کر خدا کی بارگاہ میں گریہ وزاری کی تو انہیں دو جڑواں بیٹے عطا کیے گئے۔ وہ جڑواں بیٹے میں اور میرا بڑا بھائی عیسوادوم تھے۔''

ماموں نے کہا۔ ''ہاں، میں یہ ساری باتیں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرے باپ نے تیرا نام یعقوبؑ کیوں رکھا تھا؟''

یعقوبؑ کی دونوں ماموں زاد بہنوں نے بھی اب دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ راحیل تیز مشعل کی روشنی میں یعقوبؑ کو نہایت اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ راحیل کی بڑی بہن لیاہ ان دونوں کو رشک وحسد سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اپنی چھوٹی بہن راحیل کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔

ماموں کہہ رہے تھے۔ ''اور چونکہ تو اپنے بھائی کے بعد پیدا ہوا تھا، یعنی تو اس کے عقب میں تھا اس لیے تیرے باپ نے تیرا نام یعقوبؑ (بعد میں نے آنے والا) رکھ دیا۔''

یعقوبؑ نے کہا۔ ''اور آپ کو میرے باپ اسحاقؑ کی اس پیش گوئی کا بھی ضرور علم ہوگا کہ جب ہم دونوں بھائی اپنی ماں کے پیٹ میں تھے تو انہوں نے میری ماں سے کہا تھا کہ دو قومیں تیرے پیٹ میں ہیں۔''

ماموں نے پوچھا۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے، ذرا صاف صاف بات کر۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''دو قوموں سے میرے باپ کی یہ مراد تھی کہ ہم دونوں بھائیوں کی نسلیں آخرکار قوموں کی شکل اختیار کرلیں گی۔'' وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہوگئے۔

ماموں نے کہا۔ ''ہاں ہاں کہو کہو، جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔''

یعقوبؑ نے کرتے کا دامن پکڑ کے پلٹنا شروع کردیا، بولے۔ ''میں چاہتا تو کنعان ہی میں شادی کرلیتا کیونکہ وہاں بھی نہایت حسین لڑکیاں موجود ہیں لیکن میرے باپ نے کہا کہ مجھے اپنی ماموں زاد.... سے شادی کرنا چاہیے اور اس سے جو قوم پیدا ہوگی وہ نہایت نامور اور اعلیٰ قوم ہوگی۔''

ماموں نے اپنے بھانجے کو ذرا غور سے دیکھا۔ مشعل کی روشنی میں یعقوبؑ کے چہرے کی شرم وحیا کو اچھی طرح محسوس کیا جاسکتا تھا۔ دونوں لڑکیاں وہاں سے ہٹ کر ذرا دور جا بیٹھیں۔

ماموں نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔ ''تو میری کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟''

یعقوبؑ نے غیرارادی طور پر دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا اور راحیل پر مستقل نظریں ٹکادیں، آہستہ سے جواب دیا۔ ''راحیل سے۔''

لیاہ غصے میں اٹھی اور اندر چلی گئی۔ ماموں کچھ دیر خاموش کچھ سوچتے رہے، پھر کہا۔ ''اگر تو راحیل کی جگہ لیاہ کو پسند کرلے تو اچھا ہو۔''

ماموں کو فکروں نے گھیر لیا تھا اور یعقوبؑ کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی، آخر کچھ سوچ کر کہا۔ ''لیکن اس کی ایک شرط ہے۔ تجھے میری ایک شرط پوری کرنا ہوگی۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''میں تیار ہوں، اپنی شرط بیان کیجیے۔''

ماموں نے کہا۔ ''تجھے سات سال تک میری خدمت کرنا ہوگی۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''میں تیار ہوں۔''

جب اس معاملے کی دونوں بہنوں کو خبر ہوئی تو راحیل کو تو بہت خوشی ہوئی مگر لیاہ حسد ورقابت کی آگ میں جلنے جھلنے لگی۔ یعقوبؑ نے حسب وعدہ اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں اور اپنے ماموں کی سپرد کی ہوئی ذمے داریاں پوری کرنے لگے۔

☆☆☆

یعقوبؑ نے جس لگن اور محبت سے اپنے ماموں لابن کی خدمات انجام دیں، اس سے بھی خوش اور متاثر ہوئے لیکن جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، لیاہ کی آتش حسد بھڑکتی جارہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی چھوٹی بہن راحیل پر گرم ہوجاتی اور تلخ وترش سنا دیتی۔ راحیل سب کچھ صبر وتحمل سے برداشت کرجاتی۔ یعقوبؑ راحیل کو تسلیاں دیتے۔ ''بس تھوڑے دنوں کی اور بات ہے، میں شادی کے بعد تجھے کنعان لے جاؤں گا جہاں تو نہایت آرام اور سکھ سے رہے گی۔''

سات سال پورے ہوگئے۔ یعقوبؑ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے راحیل سے کہا۔ ''راحیل! سات سال پورے ہوچکے ہیں اور میں اپنے رب کا شکرگزار ہوں، جس نے مجھ سے میرا عہد پورا کرادیا۔''

راحیل نے کہا۔ ''لیکن کتنی قیامت کے تھے یہ سات سال!''

یعقوبؑ نے ہنس کر جواب دیا۔ ''مگر مجھے تو ایسا محسوس ہورہا ہے گویا یہ سات سال پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔''

ماموں اپنے مویشیوں کے باڑے میں ان کی گنتی کر رہے تھے، ان کے پیچھے یعقوبؑ کھڑے تھے۔ ماموں نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور کہا۔ ''تو یہاں کھڑا کیا کررہا ہے؟ کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟''

یعقوبؑ نے پوچھا۔ ''کیا کوئی مویشی کم ہے؟''

ماموں نے جواب دیا۔ ''نہیں تو۔''

یعقوبؑ نے کہا۔ ''ماموں! ایک بات اور بتایئے۔''

ماموں نے کہا۔ ''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم دونوں یہاں سے چل کر، کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

یہ دونوں وہاں سے نکل کر گھر کے اس چبوترے پر جا بیٹھے جہاں بیٹھ کر گھر اور بستی کے مسائل پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ شام تیزی سے رات میں بدلتی جارہی تھی۔ ماموں نے مشرقی افق سے دوڑتی ہوئی سیاہی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اب پوچھ تو کیا جاننا چاہتا ہے؟''

یعقوبؑ نے پوچھا۔ ''میں اپنے سات سالہ عہد میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں؟''

ماموں نے جواب دیا۔ ''تو نے جس لگن اور محنت سے اپنی ذمے داریاں پوری کی ہیں، میں اس سے بہت خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔''

یعقوبؑ نے کہا۔ ''اب وہ مدت پوری ہو چکی ہے، آپ اپنا وعدہ پورا کیجیے۔''

ماموں نے جواب دیا۔ ''میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا...... تو بالکل مطمئن رہ۔''

شادی کا اعلان ہوگیا۔ رشتے داروں کو مطلع کر دیا گیا۔ اس خوشی کے موقعے پر یعقوبؑ نے راحیل کو بہت اداس دیکھا لیکن اس کی بڑی بہن لیاہ بہت خوش تھی۔ یعقوبؑ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس خوشی کے موقعے پر راحیل اداس کیوں ہے؟

اس موقعے پر لیاہ کا رویہ بڑا جارحانہ ہوگیا تھا۔ وہ راحیل کو دیکھ کر طنز سے مسکرانے لگتی تھی۔

یعقوبؑ نے راحیل سے پوچھا۔ ''آخر تو اداس کیوں ہے؟''

راحیل نے نہایت کرب سے یعقوبؑ کو دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔ ایک سادہ سی تقریب ہوئی اور یعقوبؑ کی شادی کی رسم انجام پاگئی۔ یعقوبؑ انتہائی اشتیاق سے جب اپنی بیوی کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر پریشان ہوگئے کہ راحیل کی جگہ لیاہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ یعقوبؑ نے غصے میں لیاہ سے پوچھا۔ ''لیاہ! تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ راحیل کہاں ہے؟''

لیاہ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے یعقوبؑ کی طرف دیکھا اور خوشی سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تیری بیوی ہوں۔''

یعقوبؑ نے پوچھا۔ ''اور راحیل کہاں ہے؟''

لیاہ نے جواب دیا۔ ''راحیل اپنے بستر پر ہوگی۔''

''لیکن یہ ہوا کیا؟'' یعقوبؑ نے پریشان ہوکر سوال کیا۔ ''شادی تو راحیل سے ہوئی تھی۔''

''نہیں، تیری شادی مجھ سے ہوئی ہے۔''

وہ رات یعقوبؑ نے نہایت بے چینی میں گزاری۔ صبح ہوتے ہی اپنے ماموں لابن کے پاس پہنچ گئے اور نہایت خفگی سے پوچھا۔ ''ماموں! یہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے میری شادی کس سے کردی؟''

ماموں نے جواب دیا۔ ''لیاہ سے۔''

یعقوبؑ نے بے چینی سے کہا۔ ''لیکن میرا آپ سے طے تو ہوا تھا راحیل سے شادی کا، اور میں نے آپ کی سات سال خدمت راحیل کی خاطر کی تھی۔''

ماموں نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''لیکن یعقوبؑ میں بھی بہت مجبور تھا، اگر میں ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔''

یعقوبؑ نے پوچھا: ''آخر وہ مجبوری کیا تھی؟''

ماموں نے کہا۔ ''یعقوبؑ! میں اپنے خاندانی رسم ورواج سے مجبور تھا۔ میرے لیے ضروری یہ تھا کہ میں پہلے اپنی بڑی لڑکی لیاہ کی شادی کرتا، اس کے بعد راحیل کی۔''

یعقوبؑ نے کہا۔ ''لیکن ہم دونوں کا عہد وپیمان تو راحیل کے سلسلے میں ہوا تھا۔''

''ہاں!'' ماموں نے تاسف زدہ آواز میں کہا۔ ''لیکن بعد میں جب میں نے اس کے نتائج پر غور کیا تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ راحیل کی جگہ لیاہ کو تم سے وابستہ کردوں۔''

یعقوبؑ نے صدمے سے سر جھکا لیا۔ ماموں کچھ دیر تک یعقوبؑ کی شکل دیکھتے رہے، آخر کہا۔ ''تو ایک ہفتہ لیاہ کے ساتھ ہنسی خوشی رہ، اس کے بعد میں اپنا سابقہ وعدہ بھی پورا کردوں گا۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''اب لیاہ میری بیوی ہے اور خدا کے سامنے اس بات کا پابند ہوں کہ لیاہ کا پورا پورا خیال رکھوں لیکن راحیل مجھے ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔''

ماموں نے کہا۔ ''کیا مجھے تیرا کوئی خیال نہیں۔ مجھے اپنی بیٹی لیاہ کا بھی بڑا خیال ہے، وہ تیرے پاس سکون سے ہنسی خوشی رہے گی۔ میں نے تم دونوں کے آرام کی خاطر لیاہ کو ایک کنیز بھی دی ہے۔ کنیز زلفہ، وہ تم دونوں کی خدمت کرے گی۔''

یعقوبؑ نے سکوت اختیار کیا۔ ماموں بھی کچھ سوچتے رہے، آخر انہوں نے ایک عجیب وغریب فیصلہ سنا دیا۔ ''یعقوبؑ! جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا تو لیاہ کے ساتھ ایک ہفتہ رہ، اس کے بعد میں راحیل کی شادی بھی تجھ سے کردوں گا۔''

یعقوبؑ نے اس فیصلے پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ خوش ہو کر پوچھا۔ ''کیا سچ؟''

ماموں نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ نہیں کہہ رہا میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے لیکن اس کی شرط بھی سن لے۔''

یعقوبؑ ماموں کی شرط سننے کے لیے گوش بر آواز ہو گئے۔

ماموں نے کہا۔ ''لیاہ کی شادی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد راحیل بھی تیری بیوی بن جائے گی لیکن اس کے لیے تجھے مزید سات سال میری خدمت کرنا ہوگی۔''

یعقوبؑ نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ''میں اس کے لیے تیار ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح میں اپنے عہد پر پہلے پورا اترا ہوں۔ میرے رب نے چاہا تو ایک بار پھر پورا اتروں گا۔''

یہ ایک ہفتہ بھی جیسے تیسے گزر گیا اور یعقوبؑ سے راحیل کی شادی بھی کر دی گئی اور جس طرح بڑی بہن کو کنیز زلفہ عطا ہوئی تھی، ماموں نے ازراہِ عدل و انصاف راحیل کو بھی ایک کنیز عطا فرمائی۔ اس کا نام بلہاہ تھا اور یعقوبؑ اس کنیز کو دیکھ کر دنگ رہ گئے، کیونکہ یہ وہی عورت تھی جو انہیں نخلستان میں مل چکی تھی اور جس نے انہیں لابن کے گھر کا پتا بتایا تھا۔

اس نے یعقوبؑ سے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا میں نے تجھے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ لابن کی بڑی بیٹی لیاہ کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں اور راحیل بہت خوب صورت ہے۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''تو نے تو یہ سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا لیکن اب تجھے یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ لیاہ بھی میری بیوی ہے اور تو نے اس وقت مجھ سے ایک بات چھپائی تھی۔''

کنیز بلہاہ نے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''یہ بات کہ تو راحیل کی کنیز بھی ہے۔''

کنیز بلہاہ نے کہا۔ ''لیکن راحیل کی کنیز تو میں اب ہوئی ہوں، پہلے تو نہیں تھی۔''

یعقوبؑ نے کہا۔ ''لیکن اب لیاہ اور راحیل دونوں ہی میری بیویاں ہیں اور تجھے ان دونوں کا خیال رکھنا ہے۔''

کنیز بلہاہ نے جواب دیا۔ ''میں راحیل کی کنیز ہوں اس لیے میں راحیل ہی کی خدمت کروں گی اور اسی کا خیال بھی رکھوں گی اور زلفہ چونکہ لیاہ کی کنیز ہے اس لیے حق اور انصاف کی رو سے زلفہ کو لیاہ کا وفادار اور خدمت گزار رہنا چاہیے۔''

یعقوبؑ، لیاہ اور راحیل کے ساتھ خوش خوش رہنے لگے۔ اب ان کے سامنے ماموں کی خدمت گزاری کے سات سال اور تھے لیکن یہ سات سال ایسے تھے کہ مشروط چیز انہیں پہلے مل گئی تھی اور شرط بعد میں پوری کرنا تھی۔

☆☆☆

مویشیوں کو چراتے اور دوسری خدمات انجام دیتے ہوئے انہیں کنعان کی یاد بہت ستاتی رہتی تھی۔ گھر میں ایک تنازعہ بھی رہتا تھا۔ لیاہ اور راحیل میں ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ یعقوبؑ اکثر و بیشتر ان دونوں کو ایک دوسرے سے متنفر اور بیزار دیکھتے۔

لیاہ کو شکایت تھی کہ یعقوبؑ کو راحیل سے بڑی محبت ہے اور راحیل کا خیال تھا کہ یعقوبؑ کو لیاہ سے بھی محبت ہو گئی ہے لیکن حقیقت یہی تھی کہ یعقوبؑ کو راحیل سے بڑی محبت تھی۔

دن بھر کی محنت کے بعد رات کو یعقوبؑ نے راحیل کو سامنے بٹھا کر بڑی پیاری پیاری باتیں کیں۔ اسے کنعان کے قصے سناتے رہے، اپنی ماں کی محبت کی داستانیں سناتے رہے اور یہ بھی بتایا کہ ان کے بوڑھے باپ اسحاقؑ نے انہیں کیسی کیسی دعائیں دی ہیں۔ وہ راحیل کو کنعان کی فضا سے مانوس کر رہے تھے۔ لیاہ کی کنیز زلفہ دیوار کے پیچھے کھڑی یہ پیار و محبت کی باتیں سن رہی تھی، وہ بھاگی بھاگی اپنی مالکہ کے پاس پہنچی اور اسے پوری داستان سنا کے کہنے لگی۔ ''میری آقا زادی! میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ راحیل نے تیرے شوہر کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ جتنا راحیل کو چاہتا ہے تجھ کو نہیں، کیا یہ ناانصافی نہیں ہے؟''

لیاہ نے صدمے سے جواب دیا۔ ''یقیناً میرے حق پر ڈاکا پڑا ہے اور میں خود بھی اپنے خلاف اس زیادتی کو برابر محسوس کر رہی ہوں۔''

اسی وقت راحیل کی کنیز بلہاہ، لیاہ کے پاس پہنچی اور کہا۔ ''تیرا شوہر تجھے بلا رہا ہے۔''

لیاہ کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''اپنے آقا سے کہہ دے کہ لیاہ کہہ رہی ہے تو پہلے میرا شوہر ہے، بعد میں راحیل کا لیکن اپنے طور طریقوں سے تو یہ ثابت کر رہا ہے کہ تو راحیل کا شوہر پہلے ہے، بعد میں میرا اور اب میں اس زیادتی کو مزید نہیں برداشت کر سکتی۔''

جب کنیز نے لیاہ کا یہ جواب یعقوبؑ تک پہنچایا تو یعقوبؑ نے ہنس کر کہا۔ ''جا اپنی آقا زادی سے میری طرف

سے پوچھ کہ جب میں اس کی بستی فدان ارم میں داخل ہوا تھا تو یہاں میں سب سے پہلے کس سے ملا تھا؟ اور یہ بھی دریافت کر کہ میں نے پہلے سات سال تک جو اپنے ماموں لابن کی خدمت کی ہے وہ کس کے لیے کی تھی؟ اس طرح میری پہلی بیوی تو راحیل ہی ہے دوسری لیاہ۔"

جب کنیز نے یعقوبؑ کا یہ جواب لیاہ کو پہنچایا تو اس نے کہا۔ "جا، میرے شوہر سے کہہ دے، اب میں اس سے کوئی شکایت نہ کروں گی، میں تو اپنے اللہ سے انصاف طلب کروں گی اور پھر جو حق پر ہوگا میرا رب اسی کو عزت بخشے گا اور جو حق پر نہیں ہوگا خدا اسے دنیا کے سامنے سبک سار کر دے گا۔"

کنیز نے یہ پیغام بھی یعقوبؑ تک پہنچا دیا۔ یعقوبؑ نے اٹھ کر لیاہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن راحیل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ "ابھی نہیں، تو لیاہ کا بھی شوہر ہے، اس نے تیرا حکم نہ مان کر تیری بے عزتی کی ہے۔ کیا تو اس کے پاس جا کر مزید بے عزت ہونا گوارا کرے گا؟"

یعقوبؑ نے راحیل کی بات مان لی کیونکہ وہ راحیل سے واقعی محبت کرتے تھے۔ دوسرے دن یعقوبؑ تھکے ہارے جب گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج لیاہ کے پاس وقت گزاریں گے۔ ان کے اس ارادے کی اطلاع راحیل کو بھی ہوگئی۔ اس نے آپ کا راستہ روکنا چاہا لیکن آپؑ نے جواب دیا۔ "تجھے لیاہ کے پاس جانے سے مجھے روکنا نہیں چاہیے، وہ بھی میری بیوی ہے اور ایسا کر کے میرے انصاف کی راہ میں تو رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کر۔"

راحیل نے جواب دیا۔ "وہ مجھ سے حسد کرتی ہے۔"

"اور تو؟ کیا تو اس سے نہیں حسد کرتی؟"

راحیل نے کہا۔ "نہیں، میں اس سے ذرا بھی حسد نہیں کرتی۔"

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ "اگر تو اس سے حسد نہیں کرتی تو پھر مجھے اس وقت اس کے پاس کیوں نہیں جانے دے رہی؟"

"لیکن کیا تو نے کل نہیں کہا تھا کہ حق اور انصاف کی رو سے میں تیری پہلی بیوی ہوں۔"

"میں اس سے انکار کب کرتا ہوں لیکن لیاہ بھی میری بیوی ہے۔"

راحیل ناراض ہوگئی۔ اس نے یعقوبؑ کی راہ چھوڑ دی، بولی۔ "جا، میں تجھے نہیں روکوں گی۔ جا، لیاہ کے ساتھ حق وانصاف کر۔"

یعقوبؑ نے جب یہ دیکھا کہ راحیل ناراض ہو کر اپنے بستر پر دراز ہوگئی ہے تو اس پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے لیاہ کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا، لیاہ سجدے میں پڑی آہ وزاری کر رہی تھی۔ "اے ابراہیمؑ کے رب! تو میرا انصاف کر۔ میں یعقوبؑ سے انصاف کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ میں تجھ سے کہوں گی کہ راحیل اور میری طرف انصاف کی نظر سے دیکھ اور پھر جو زیادتی کر رہا ہے اسے سزا دے اور جو مظلوم ہے اسے اپنے کرم سے نواز دے۔"

یعقوبؑ نے اس کے بائیں طرف کھڑے ہو کر آواز دی۔ "لیاہ! میں تیرے پاس آگیا ہوں، آخر تو اتنی پریشان کیوں ہے؟"

لیاہ گڑگڑاتی رہی۔ "اے میرے رب! میں نے اپنے باپ سے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ تو راحیل کے بجائے یعقوبؑ سے میری شادی کر دے لیکن میرے باپ نے دنیا کی شرم اور دستور کے مطابق بڑی بہن ہونے کی وجہ سے میری شادی یعقوبؑ سے کر دی۔ اب یعقوبؑ مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اس کی پہلی بیوی اصولی طور پر راحیل ہی ہے، میں اس کی دوسری بیوی ہوں۔ اگر یعقوبؑ درست کہتا ہے تو تو راحیل کو اپنے لطف وکرم سے نوازتا رہ لیکن اگر اس میں کسی قسم کی زیادتی کا عنصر موجود ہے تو میں تجھ سے درخواست کروں گی کہ اس معاملے میں جو زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے، اسے زمانے کے سامنے شرمندہ کرا دے۔"

یعقوبؑ نے پھر آواز دی۔ "لیاہ! کیا میں چلا جاؤں؟"

لیاہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "تیری مرضی، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

یعقوبؑ نے کہا۔ "لیکن اس وقت تو میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔"

لیاہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ "تیری خوشی۔"

یعقوبؑ لیاہ کا دل بہلانے کی خاطر دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، پھر کہا۔ "لیاہ! میں تجھ سے بھی محبت کرتا ہوں، اب تو اس پر یقین کرے یا نہ کرے۔"

لیاہ نے آزردگی سے جواب دیا۔ "میں نے اپنا معاملہ اپنے رب کے سپرد کر دیا ہے، وہی میرا انصاف کرے گا۔"

یعقوبؑ نے کہا۔ "میں بھی تیرے ساتھ انصاف ہی

کر رہا ہوں، کیا مجھے اپنے خدا کا خوف نہیں ہے؟"

لیاہ نے اسی اداس لہجے میں کہا۔ "میں یہ کب کہتی ہوں کہ تو میرے ساتھ انصاف نہیں کرتا، مجھے تو اپنی بہن راحیل سے شکایت ہے جو خود کو حسین اور مجھے حقیر سمجھتی ہے۔ وہ تجھ پر مجھ سے زیادہ اپنا حق سمجھتی ہے۔"

یعقوبؑ نے کہا۔ "راحیل کیا سمجھتی ہے، تجھے یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔ میں تو تیری اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی راحیل کی۔"

لیاہ نے جواب دیا۔ "میں تو اپنے رب سے عزت چاہتی ہوں۔ وہ جس کو چاہے ذلت دے اور جسے چاہے عزت دے۔"

یعقوبؑ نے ہر ممکن کوشش سے لیاہ کے دل پر چھائے ہوئے غبار کو دور کرنے کی راہ اختیار کی لیکن لیاہ کے دل سے غموں کی تلخی دور نہ ہو سکی۔

☆☆☆

لیاہ اور راحیل کا عناد بڑھتا ہی رہا اور اس عناد نے ان کی دونوں کنیزوں میں بھی حسد و رنج کی آگ بھڑکا دی۔ زلفہ، لیاہ کی طرف دار تھی اور بلہاہ راحیل کی۔ یہ دونوں اس فکر میں بھی لگی رہتیں کہ کون کیا کر رہا ہے اور ان میں ایک دوسرے کے خلاف کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔

ایک دن صبح ہی صبح راحیل کی کنیز بلہاہ نے نہایت افسوس سے اسے مخاطب کیا، بولی۔ "میری آقازادی! اب تو جتنا بھی غم کرے تیرے لیے کم ہے۔ تو ہار گئی اور تیری بڑی بہن لیاہ جیت گئی۔"

راحیل بہت زیادہ گھبرا گئی، پوچھا۔ "کیا ہو گیا؟"

کنیز نے کہا۔ "آج صبح ہی صبح میں نے ایک ایسی خبر سنی ہے جس سے اب مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ تیرا شوہر یعقوبؑ اب لیاہ کو زیادہ چاہنے لگے گا اور اس کے دل میں تیری محبت کچھ کم ہو جائے گی۔"

راحیل کو ایسا محسوس ہوا گویا اس کے جسم سے جان نکلی جا رہی ہے، بولی۔ "یعقوبؑ مجھے بے حد چاہتا ہے اور میں یہ یقین کرنے کو تیار نہیں کہ اس کے دل میں میری محبت کم ہو جائے گی۔"

کنیز نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "اب تو خود اپنے شوہر یعقوبؑ سے یہ بات سن لے گی۔"

راحیل بگڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ "کہیں تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ تو صاف صاف بات کیوں نہیں بتاتی...... آخر ہوا کیا؟"

کنیز نے جواب دیا۔ "لیاہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے اور اگر یہ بچہ، لڑکا ہوا تو لیاہ کو خدا کی طرف سے وہ عزت حاصل ہو جائے گی جس کی وہ ایک مدت سے تمنا کر رہی ہے۔"

راحیل کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ راحیل کے باپ لابن نے جو راحیل کو پریشان اور افسردہ دیکھا تو قریب آ کر دریافت کیا۔ "راحیل! کیا بات ہے، تو اتنی پریشان کیوں ہے؟"

راحیل کا دل بھر آیا، وہ اپنے باپ کے سینے سے لگ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ باپ نے شفقت سے راحیل کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا، پوچھا۔ "راحیل! آخر ہوا کیا؟ تو رو کیوں رہی ہے؟ کیا یعقوبؑ نے کوئی بات کہہ دی؟"

راحیل نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "باوا جان! ہم دونوں بہنیں یکے بعد دیگرے ایک ایسے جھولے میں ڈال دی گئی ہیں جس کے ایک سرے پر خوشیاں ہیں، مسرتیں ہیں، لطف و انبساط ہے مگر اس کے دوسرے سرے پر حسد ہے، رقابت ہے، کڑھن ہے، جلن ہے، دکھ ہے، اذیتیں ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ جب ہم دونوں بہنیں اس جھولے میں جھولتی ہیں تو ہمیں جلدی جلدی ان دونوں کیفیتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔"

باپ نے نرمی سے کہا۔ "صبر کر راحیل، صبر کر...... کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

راحیل کی ہچکیاں بندھ گئیں، بولی۔ "اے کاش ہم میں سے کسی ایک کی یعقوبؑ سے شادی نہ ہوئی ہوتی۔"

باپ نے ڈھارس بندھائی، پوچھا۔ "آخر تجھے تکلیف کیا پہنچی ہے؟ تو رو کیوں رہی ہے؟ میں تیرے ساتھ ہوں، تیری مدد کروں گا، اپنی تکلیف مجھے بتا تو سہی۔"

"باوا جان! اس تکلیف کا مداوا آپ کے بس میں نہیں ہے۔"

"لیکن تو بتا تو سہی، مجھے بھی تو تیری تکلیف کا علم ہو!"

راحیل نے شرما کے جواب دیا۔ "کیا لیاہ پر خدا نے واقعی مہربانی کی ہے اور آپ نانا بننے والے ہیں؟"

باپ نے محبت سے بیٹی کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ "بس اتنی سی بات! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ یہی خوشی تیرے گھر میں بھی آ سکتی ہے۔ تو افسردہ کیوں ہے، اپنے خدا سے مایوس کیوں ہوتی ہے؟"

راحیل نے شرما کے اشارتاً کہا۔ "میرے گھر میں اللہ کے اس کرم کا بہت کم امکان ہے کیونکہ دایہ نے یعقوب کو

میری طرف سے مایوسی کی خبر پہلے ہی سنا رکھی ہے۔"

باپ نے پیار سے اس کے دونوں گال تھپتھپائے اور کہا۔ "لیکن دایہ خدا نہیں ہے، تو خدا سے مایوس کیوں ہوتی ہے۔ خدا میں اتنی قدرت ہے کہ انسانوں کے تخمینوں کو غلط کردے اور وہ کچھ ہو جائے جس کا کسی کے دل میں وہم وشبہ تک نہ ہو۔"

باپ کے تسلی دلاسوں نے راحیل کے دل میں کسی حد تک صبر و برداشت کی قوت پیدا کردی۔ ان دنوں لیاہ کے چہرے پر ہر وقت مسرت وسرشاری کی کیفیت چھائی رہتی۔ وہ اپنی کنیز زلفہ سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ مویشیوں کے باڑے میں چلی جاتی اور ان سے اٹھکیلیاں کرنے لگتی۔ وہ راحیل کے سامنے سے اترا کر گزرتی، کبھی کبھی وہ کوئی طنز بھی کرجاتی اور راحیل کے دل میں ایک نشتر اتر جاتا یا پھر کانٹے کی نوک ٹوٹ جاتی۔

رات کے کھانے پر لیاہ کی طبیعت میں بڑی جولانی تھی۔ یعقوبؑ، راحیل، لیاہ اور لابن ایک ہی جگہ بیٹھے کھانے میں مصروف تھے۔ دونوں کنیزیں ان کے قریب ہی ادب سے کھڑی ان کے احکامات کی منتظر تھیں۔ لیاہ کی خوشی کا یہ حال تھا کہ وہ بات بات پر ہر ایک سے ہنسی مذاق کرنا چاہتی۔ راحیل اس کی خوشیوں اور چہلوں سے جل کڑھ رہی تھی۔ اس سے کھانا نہیں کھایا جارہا تھا۔ ان دونوں کا باپ لابن، راحیل کی اندرونی کیفیات کو خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس سے راحیل کی بے بسی نہیں دیکھی گئی، لیاہ کو سمجھایا۔ "لیاہ! بیٹی کیا تو جانتی ہے دنیا کا بدترین گناہ کیا ہے؟"

لیاہ نے جواب دیا۔ "یہ میں نہیں جانتی لیکن اگر آپ یہ پوچھیں کہ دنیا کی سب سے بڑی خوشی کیا ہے تو میں ابھی بتا سکتی ہوں۔"

لابن نے پوچھا۔ "اچھا بتا دنیا کی سب سے زیادہ خوشی کس چیز میں ہے؟"

لیاہ نے جواب دیا۔ "اس بات میں کہ خدا کسی مجبور اور کمزور کو اپنی قدرت سے اچانک طاقتور بنادے اور وہ کمزور اپنے طاقتور حریف کو کمزور اور بے بس بنادے۔ اس میں جو خوشی اور لذت پنہاں ہے شاید یہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔"

باپ نے کہا۔ "اب تو یہ بھی تو پوچھ کہ دنیا کا بدترین گناہ کیا ہے؟"

لیاہ نے جواب دیا۔ "باوا جان! میری سمجھ میں اس کے سوا کوئی بات نہیں آتی کہ اس گھر میں مجھ پر بہت ہنسا گیا، میرا بڑا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ میں نے وہ سب کچھ اپنے خدا کو منصف اور حاضر ناظر جان کر برداشت کرلیا تھا لیکن میں اپنے خدا کی شکرگزار ہوں کہ اس نے میرے دکھ کا احساس کرکے مجھے سرخرو اور شادماں کردیا۔ اب میں کسی کی بھی پروا نہ کروں گی۔ مجھے میرے رب نے جو خوشی بخشی ہے، اس کے مزے میں تنہا لوٹوں گی۔"

لابن نے لیاہ کو ڈانٹا۔ "تجھے خوش ہونے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا لیکن تیری خوشی میں اپنی چھوٹی بہن راحیل کو جلانے کا جذبہ نہیں شامل ہونا چاہیے۔ یاد رکھ، خدا دل آزاری نہیں پسند کرتا، تو اس گناہ کا ارتکاب نہ کر۔"

لیکن لیاہ خوش ہوہو کے راحیل کو ذہنی اذیت پہنچاتی رہی۔ کچھ عرصے بعد لیاہ سے لڑکا پیدا ہوا۔ لیاہ نے اس کا نام رابن رکھا۔ بیٹے کی پیدائش نے لیاہ کو فخر وغرور سے کچھ زیادہ ہی بے خود اور مدہوش کردیا۔ یعقوبؑ کو بھی بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ لیاہ کی کنیز زلفہ بھی بہت خوش تھی لیکن راحیل پر غم کا پہاڑ سا ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ بہت زیادہ اداس رہنے لگی تھی۔ وہ اپنی بہن لیاہ کے سامنے جانے سے کتراتی تھی۔ اس کی کنیز بلہاہ اسے تسلی دلاسے دیتی رہتی لیکن راحیل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

راحیل اور لیاہ میں حسد ورقابت کی خلیج بڑھتی جارہی تھی۔ بیٹے کی پیدائش نے اسے کچھ اور بڑھا دیا۔ لیاہ نے راحیل کو جلانے کے لیے اپنے بیٹے رابن کو اس کی گود میں لاکر ڈال دیا، ہنستے ہوئے بولی۔ "راحیل! تو کیوں کڑھتی ہے، اگر تیرے اولاد نہیں ہوتی تو اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے، تو میرے رابن سے دل بہلایا کر۔"

راحیل نے رابن کو گود میں لے تو لیا لیکن اسے گرم جوشی اور محبت سے کھلا نہیں سکی، کیونکہ وہ خوب اچھی طرح محسوس کررہی تھی کہ لیاہ کی پیشکش اور گفتگو میں اسے جلانے کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ راحیل نے رابن کو دو چار بار انگلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرکے کھلانے کی کوشش کی، جس میں ایک قسم کا تکلف اور محرومی کا کرب شامل تھا۔

لیاہ کی کنیز زلفہ نے جو یہ منظر دیکھا تو اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں اور لیاہ کو علیحدہ لے جاکر پوچھنے لگی۔ "راحیل کو یہ بچہ کس نے دیا؟"

لیاہ نے جواب دیا۔ "خود میں نے...... کیوں؟" پھر خوشی سے بولی۔ "اس طرح میں راحیل کو جلانا چاہتی ہوں اور اسے یہ جتلانا چاہتی ہوں کہ تیرا وہ غرور کہاں گیا کہ تو حسین ہے اور اصولی طور پر تو یعقوبؑ کی پہلی اور پسندیدہ

بیوی ہے اور میں نے تیرا حق غصب کرنا چاہا تھا۔"

کنیز زلفہ نے مشورہ دیا۔ "لیکن اے میری آقازادی! آپ ایسا نہ کیجیے۔ آپ رابن کو راحیل کی گود سے فوراً لے لیجیے۔"

"کیوں؟" لیاہ نے کہا۔ "مجھے میرے رب نے راحیل کے مقابلے میں اونچا کیا ہے، اب یہ میرا کچھ بھی نہیں کرسکتی۔"

کنیز زلفہ نے جواب دیا۔ "جس چیز نے آپ کو اپنی بہن راحیل پر برتری دلائی ہے، راحیل حسد سے اسے نقصان تو پہنچا سکتی ہے۔"

لیاہ ایک دم چونک گئی۔ وہ فوراً مڑی اور راحیل کی گود سے رابن کو چھین لیا اور نفرت سے بہن کو دیکھنے لگی۔

راحیل نے پوچھا۔ "کیا ہوا لیاہ؟ تو پریشان کیوں ہوگئی؟"

لیاہ نے جواب دیا۔ "راحیل! مجھے ایک بات تو بتا، کیا تو رابن کو دیکھ کر واقعی خوشی محسوس کرتی ہے یا پھر......"

راحیل نے غمزدہ آواز میں کہا۔ "لیاہ! میں شرمندہ ہوں کہ ماضی میں، میں نے تیرے خلاف کچھ تند و تلخ باتیں کی تھیں اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے، میں سمجھتی ہوں مجھے اسی کی سزا دی جا رہی ہے۔"

لیاہ نے انتہائی غرور سے کہا۔ "میں نے رابن کو پیدا کیا ہے، اب میں تجھ پر برتری رکھتی ہوں اور اب میں دیکھتی ہوں کہ اپنے شوہر یعقوبؑ کی نظر میں تو زیادہ محترم رہتی ہے یا میں؟ یعقوبؑ تجھے زیادہ چاہتا ہے یا مجھے؟"

راحیل نے عاجزی سے جواب دیا۔ "خدا جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے۔ میں تو اب رب پر شاکر ہوں اور اس سے توبہ و استغفار کرتی ہوں۔"

لیاہ نے کلکاری مارتے ہوئے رابن کو اپنی کنیز زلفہ کے حوالے کردیا۔ بولی۔ "زلفہ! تو اس کا خیال رکھ، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اسے حاسدوں کی نظر کوئی نقصان نہ پہنچا دے اور یا خود حاسد ہی اس کے خلاف کوئی الٹی سیدھی حاسدانہ حرکت کرگزریں۔"

زلفہ رابن کو لے کر سامنے سے ہٹ گئی اور لیاہ اور راحیل دونوں تھوڑی دیر آمنے سامنے کھڑی رہ کر کچھ سوچتی رہیں۔ ان میں سے ایک کے انداز اور تیور میں برتری اور تکبر شامل تھا اور دوسرے کے چہرے پر بے بسی کے آثار، اعتراف شکست اور محرومی کا دکھ۔

☆☆☆

رابن ابھی ایک سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ لیاہ ایک بار پھر امید سے ہوگئی۔ خوشی نے لیاہ کو پاگل کر کے رکھ دیا۔ اب اس کے قدم زمین پر نہیں، گویا آسمان پر پڑتے تھے۔ دایہ ہر روز لیاہ کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے آتی تو گھر میں خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی اور لیاہ اپنی کنیز زلفہ سے اترا اترا کر اور زور زور سے اس قسم کی باتیں کرتی کہ راحیل کا برا حال ہو جاتا۔

راحیل اپنی کنیز بلہاہ سے کہتی۔ "بلہاہ! کچھ تو ہی مشورہ دے کہ اب میں کیا کروں؟ یہ لیاہ تو مجھے جینے نہ دے گی۔"

بلہاہ نے بے بسی سے جواب دیا۔ "اے میری آقا زادی! اس نازک معاملے میں، میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔ میری اور ہر ایک کی نظر میں اس کا ایک ہی علاج ہے۔"

"وہ کیا؟"

بلہاہ نے جواب دیا۔ "وہ یہ میری آقازادی کہ آپ کوشش کیجیے کہ آپ بھی اولاد کی نعمت سے بہرہ یاب ہوں۔"

راحیل نے ٹھنڈی سانس بھری اور بے بسی سے کہا۔ "افسوس کہ اگر یہ بات میرے بس میں ہوتی تو میں اتنی شرمندگی ہرگز نہ اٹھاتی۔ میں بے بس اور مجبور ہوں۔ ویسے اللہ جو چاہے کرے، میں اس کی رحمت سے مایوس بھی نہیں ہوں۔"

بلہاہ نے کہا۔ "آپ اپنے شوہر یعقوبؑ سے کہیے کہ وہ آپ کو بھی صاحب اولاد کریں۔"

راحیل نے جواب دیا۔ "یعقوبؑ کے اختیار میں ہوتا تو میں اتنی شرمندگی کبھی بھی نہ اٹھاتی۔"

بلہاہ نے کہا۔ "پھر دایہ کو حکم دیجیے کہ وہ آپ کا خوب اچھی طرح تجزیہ کرے اور اگر اولاد کا امکان ہے تو پھر ہمیں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس خدا نے لیاہ کو سرخرو کیا ہے وہی ہمیں بھی شرمندگی اور ندامت سے بچائے گا۔"

راحیل نے بے دلی سے کہا۔ "اچھا، ذرا دایہ کو بلا کے میرا معائنہ اپنی نگرانی میں کرادے اور مجھے سچ سچ بتادے کہ میں کبھی اولاد پیدا کرنے کے لائق ہوسکوں گی یا نہیں؟"

بلہاہ نے تائید میں سر ہلا دیا، بولی۔ "بہرحال میں آپ کی جتنی مدد کرسکتی ہوں اس سے گریز نہیں کروں گی اور اس سلسلے میں، میں اپنی جان تک دے سکتی ہوں۔"

اس دن دایہ جیسے ہی لیاہ کو دیکھنے آئی، بلہاہ نے اس سے کہا۔ "دایہ! جب تم واپس جانے لگو تو اپنی آقازادی سے ضرور مل لینا، انہیں تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

زلفہ نے لیاہ کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا۔ ''آقازادی ذرا ہوشیار۔ کچھ دال میں کالا ہے، ورنہ راحیل کا اس سے کیا کام ہوسکتا ہے؟''

لیاہ نے جواب دیا۔ ''تو نگرانی کر اور دیکھ کہ یہ راحیل سے یا راحیل اس سے کس قسم کی باتیں کرتی ہے؟''

''آپ مطمئن رہیں، یہ میں معلوم کرلوں گی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

دایہ دیر تک لیاہ کے پاس موجود اس کی خدمت کرتی رہی اور اس دوران راحیل کی کنیز بلہاہ مستقلاً وہیں موجود ادھر ادھر کے چکر لگاتی رہی اور زلفہ بلہاہ کی نگرانی کرتی رہی۔

جب دایہ، لیاہ کے پاس سے رخصت ہوکے جانے لگی تو لیاہ نے دایہ کا ہاتھ پکڑلیا، بولی۔ ''دیکھ یہ مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ تو یہاں سے راحیل کے پاس جائے گی۔''

دایہ نے جواب دیا۔ ''میری آقازادی! پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ راحیل بھی تو آپ ہی کی بہن ہے۔''

لیاہ نے کہا۔ ''ہاں، وہ میری بہن ہے لیکن تو یہ نہیں جانتی کہ وہ مجھ سے کس قدر حسد رکھتی ہے۔''

''میری آقازادی! آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

لیاہ نے جواب دیا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ راحیل سے تیری جتنی باتیں ہوں تو انہیں میرے علم میں ضرور لا۔''

دایہ نے وعدہ کرلیا۔ بلہاہ دایہ کو لے کر راحیل کے پاس پہنچ گئی اور کہا۔ ''ذرا میری آقازادی کا خوب اچھی طرح معائنہ تو کر اور یہ بتا کہ یہ اپنے پھل سے کیوں محروم ہے؟''

دایہ نے راحیل کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا اور منہ لٹکا کے یہ مایوس کن فیصلہ سنادیا۔ ''اے میری آقازادی! افسوس کہ انسانوں کی قسمت لکھنے والے نے شاید تیرے شوہر کی اولادیں تیری بڑی بہن کی قسمت میں لکھ دی ہیں اور شوہر کی بے پناہ محبت تیری قسمت میں لکھ دی ہے۔''

راحیل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھاگیا۔

بلہاہ نے پوچھا۔ ''تو جو کچھ کہہ رہی ہے کیا تجھے اس پر پورا یقین ہے؟ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا تجھے اپنی باتوں کی صداقت پر پورا یقین ہے؟''

دایہ نے جواب دیا۔ ''میرا خاندانی تجربہ شاید مجھ سے کوئی غلط بات نہیں کہلوا رہا ہے۔''

بلہاہ نے کہا۔ ''اگر تو ایک بار اور اطمینان کرلے تو بہتر ہو۔''

دایہ نے جواب دیا۔ ''اگر میں دس بار معائنہ کروں گی تو یہی کہوں گی جو ابھی پہلے معائنے کے بعد کہا ہے۔''

راحیل بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ اس نے بلہاہ سے کہا۔ ''اب کیا ہوگا بلہاہ؟ کیا میری بڑی بہن لیاہ میرے مقابلے میں ہمیشہ کامیاب اور سرخرو رہے گی؟ کیا میں اپنے پھل سے ہمیشہ محروم رہوں گی؟''

بلہاہ نے ڈھارس بندھائی۔ ''اے میری آقازادی! اپنے رب کی مہربانیوں سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دایہ انسان ہے اور انسانی تخمینے غلط بھی ہوسکتے ہیں۔''

راحیل نے دایہ اور بلہاہ کی طرف سے منہ پھیرلیا۔

بلہاہ، دایہ کو ایک طرف لے گئی اور ترشی سے کہا۔ ''اگر یہ بات تو نے واقعی سمجھ لی تھی کہ میری آقازادی راحیل کی قسمت میں اس کا پھل نہیں لکھا گیا تو تجھے یہ بات ان کے بجائے مجھے بتانی تھی، کیونکہ اچھے معالج اپنے مریض کے منہ پر اس کے خطرناک مرض کا ذکر نہیں کرتے۔ اس سے مرض میں، مریض کا خوف کچھ اضافہ کردیتا ہے۔ یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔''

دایہ سہم گئی، بولی۔ ''اگر میں نے غلطی کی ہے تو میں اس پر شرمندہ ہوں۔''

بلہاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اچھا، اب تجھے ایک بات کا پوری طرح خیال رکھنا ہے۔''

دایہ نے پوچھا۔ ''کس بات کا؟ میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

بلہاہ نے کہا۔ ''اس کا علم زلفہ اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی آقازادی کو نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس خبر سے ان دونوں کو اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی مجھے اور میری آقازادی کو اس سے دکھ پہنچا ہے۔''

دایہ یہ وعدہ کرکے چلی گئی اور بلہاہ اپنی آقازادی کے غم میں شریک ہوکر اسے تسلیاں دیتی رہی۔

اس دن رات کو راحیل اپنے شوہر یعقوبؑ کے کاندھے پر سر رکھ کر خوب روئی۔ یعقوبؑ حیران تھے۔ انہوں نے رونے کا سبب پوچھا تو راحیل نے دایہ والی بات اپنے شوہر کو نہیں بتائی۔ یعقوبؑ نے سسکیاں لیتی ہوئی راحیل کا چہرہ اپنے چہرے کے سامنے کرلیا اور پوچھا۔ ''آخر تو رو کیوں رہی ہے؟''

اس پرسش نے راحیل کو اور زیادہ غمزدہ کردیا اور زیادہ رونے لگی۔ یعقوبؑ نے اصرار کیا۔ ''راحیل! تو جانتی ہے کہ میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں، آخر تو اپنا غم مجھے کیوں نہیں بتاتی؟''

راحیل نے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ میری بہن لیاہ ایک بار پھر اپنی قسمت کا پھل پانے والی ہے؟''

یعقوبؑ نے مسکرا کر کہا۔ ''ہاں یہ درست ہے لیکن اس سے تو کیوں خوفزدہ ہو رہی ہے؟''

راحیل نے جواب دیا۔ ''اگر لیاہ نے رابن کے بعد ایک بیٹا اور پالیا تو تیری محبت کا زیادہ حصہ لیاہ کی قسمت میں چلا جائے گا اور میں اس سے محروم ہوتی چلی جاؤں گی۔''

یعقوبؑ نے کہا۔ ''تو بالکل غلط سوچ رہی ہے۔ تیرے اندیشے بیکار اور بے سروپا ہیں۔ مجھے اللہ نے تم دونوں کے معاملے میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے پھر میں ظالم کیونکر بن سکتا ہوں۔''

راحیل نے کہا۔ ''معلوم نہیں کیوں، اندر سے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور مجھ پر وحشت کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔''

یعقوبؑ نے اطمینان دلایا۔ ''راحیل! تو میری محبت پر یقین رکھ، میں ظالموں میں سے نہیں ہوں۔''

راحیل نے التجا کی۔ ''تب پھر تو میرے ساتھ انصاف کر۔''

''بتا، میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

راحیل نے کہا۔ ''جس طرح تو نے میری بڑی بہن لیاہ کو اس کا پھل دیا ہے، اسی طرح میرا پھل مجھے بھی دے۔ میں اپنی قسمت کا پھل تجھ سے مانگ رہی ہوں، اب میں مزید تاخیر اور محرومی کو نہیں برداشت کرسکتی۔''

یعقوبؑ نے پھر تسلی دی۔ ''راحیل! تو مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہے، تو اپنی باری کا انتظار کر۔ اس باری کا، جو تیرے پھل کے لیے تیرے رب کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا رب تجھے زیادہ دنوں تک محروم نہیں رکھے گا۔''

راحیل نے دایہ کا فیصلہ اپنے شوہر کو سنا دیا، بولی۔ ''دایہ نے آج مجھے بتا دیا ہے کہ قسمتیں لکھنے والے نے میری قسمت میں کوئی پھل لکھا ہی نہیں۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''دایہ خدا نہیں ہے، تو اپنے رب کی رحمت سے مایوس کیوں ہوتی ہے؟''

راحیل نے اصرار کیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی، میں اولاد چاہتی ہوں، میں بیٹا چاہتی ہوں۔''

یعقوبؑ نے ذرا ناراضگی سے کہا۔ ''راحیل! تو کتنی نادانی اور ناسمجھی کی بات کر رہی ہے۔ آخر تجھے ہو کیا گیا ہے؟''

راحیل کسی بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگی، بولی۔ ''میں بار بار یہی کہوں گی کہ میں کچھ نہیں جانتی، مجھے بھی اولاد دے، ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

یعقوبؑ کو غصہ آگیا، بگڑ کر جواب دیا۔ ''راحیل! تو نادانوں میں سے نہ بن، کیا میں خدا کی جگہ ہوں جس نے تجھے اولاد سے محروم رکھا ہے۔ میں ایسی باتیں تیری زبان سے نہیں سننا چاہتا۔''

راحیل نے خاموشی اختیار کی۔ لیاہ نے دایہ سے یہ معلوم کرلیا کہ راحیل کی قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور اس خبر نے دونوں بہنوں میں حسد و رقابت کی آگ اور زیادہ بھڑکا دی۔

لیاہ سے دوسرا بچہ بھی پیدا ہوگیا۔ یہ بھی لڑکا تھا۔ لیاہ نے اس کا نام شمعون رکھا۔ خاندان کے لوگوں نے یعقوبؑ کو دوسرے لڑکے کی پیدائش پر مبارکبادیں دیں اور لیاہ سے پیار محبت کی باتیں کیں۔ اس موقعے پر راحیل اور اس کی کنیز بلہاہ اپنے کمرے میں روپوش رہیں۔

مبارکباد دینے والوں میں سے ایک بڑی بی نے پوچھا۔ ''یہ راحیل کہاں ہے؟ کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔''

لیاہ کی کنیز زلفہ نے جواب دیا۔ ''خدا کی یہ مہربانیاں جو میری آقازادی کے حال پر ہیں، راحیل کو گراں گزر رہی ہیں اس لیے وہ اپنی کوٹھری میں منہ چھپا کر بیٹھ رہی ہے۔''

لیاہ کے انگ انگ سے خوشی ٹپک رہی تھی، بولی۔ ''جب میرے خدا نے یہ دیکھا کہ مجھ سے نفرت کی جا رہی ہے تو اس نے مجھے یکے بعد دیگرے دو لڑکے عطا فرمائے اور دایہ سے یہ مایوس کن اعلان کرا دیا کہ خدا نے اس کی قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں۔''

اس وقت راحیل کی حالت واقعی بہت خراب ہو رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر وہ کرے کیا؟

☆☆☆

شمعون کے بعد لیاہ کے ایک لڑکا اور ہوا اور اس نے اس کا نام لاوی رکھا۔ اس نے فخریہ کہا۔ ''لوگو! اب میں تین بیٹوں کی ماں ہوں اور اب میں پوری طرح مطمئن ہو کر یہ کہہ سکتی ہوں کہ میرا شوہر مجھ سے بہت زیادہ محبت کرے گا، اتنی کہ لوگ حسد اور رقابت سی محسوس کریں گے۔''

راحیل پر قیامت پر قیامت ٹوٹ رہی تھی۔ وہ اپنی اس غلطی پر بہت نادم تھی جب اس نے اپنے حسن و خوبصورتی پر ناز کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی بڑی بہن لیاہ اس کے مقابلے میں یعقوبؑ کی محبت جیتنے میں ناکام رہے گی۔ اب خدا اسے برابر شرمندہ

کیے جارہا تھا۔ وہ ہر بار اپنی کنیز بلہاہ سے یہی سوال کرتی۔
"بلہاہ! اب کیا ہوگا؟"

بلہاہ جواب دیتی۔ "اے میری آقا زادی! اپنے رب کے نام پر آپ صبر کریں، یہاں تک کہ آپ کا صبر آپ کا رب خود بھی محسوس کرے اور صبر کرنے والوں کے لیے رب کے پاس عظیم اجر ہے۔"

راحیل کہتی۔ "بلہاہ! غم اور صدمے سے میرا سینہ پھٹا جارہا ہے۔ برداشت اور صبر کی گرفت کمزور ہوتی جارہی ہے۔ تو اس غم کی شکار نہیں ہے جس میں، میں مبتلا ہوں اس لیے تیری عقل صحیح کام کررہی ہوگی۔ تو اپنی صحیح عقل سے مجھے یہ مشورہ دے کہ میں کیا کروں؟"

بلہاہ نے بے بسی سے جواب دیا۔ "اے میری آقا زادی! میں پریشان ہوں کہ صبر کے سوا میں آپ کو کیا مشورہ دوں۔"

راحیل نے کہا۔ "اگر لیاہ کے چوتھی بار بھی لڑکا ہی ہوا تو پھر میں نے ایک تدبیر سوچ لی ہے۔ میں اپنے لیے کسی بھی قیمت پر اولاد حاصل کرکے رہوں گی۔"

بلہاہ نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

"یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی، ذرا صبر کر۔"

بلہاہ نے کہا۔ "اے میری آقا زادی! میں آپ کی رازدار ہوں، آپ کی کوئی تکلیف یا کوئی مصیبت مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے پھر آپ اس میں بھی مجھے اپنا رازدار کیوں نہیں بناتیں؟"

راحیل نے جواب دیا۔ "بس تو چند دن تک خاموش رہ اور اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کر کہ میں کیا چاہتی ہوں یا کون سا قدم اٹھاؤں گی، تجھے بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔ ہاں میں اس معاملے میں اک ذرا تیری مدد ضرور چاہوں گی۔ اگر تو نے میری مدد کردی تو میں تجھے دکھلا دوں گی کہ میں بھی اولاد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔"

بلہاہ نے کچھ ایسا محسوس کیا گویا شدتِ غم نے راحیل کو اتنا پریشان کردیا ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، خود اسے بھی پتا نہیں۔ جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔

بلہاہ نے پوچھا۔ "اے میری آقا زادی! آپ مجھے ابھی سے وہ بات کیوں نہیں بتا دیتیں، جس کا کل بتا دینا ناگزیر ہوگا۔"

راحیل نے جواب دیا۔ "نہیں بلہاہ! اگر وہ بات میں قبل از وقت بتا دوں گی تو اس کی افادیت مجروح ہوجائے گی اور میرے حاسد اسے بے اثر بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔"

بلہاہ خاموش ہوگئی اور لیاہ کے گھر میں چوتھی ولادت کا انتظار کرنے لگی۔ یعقوبؑ کی شب و روز کی محنت اور دیانت خوب رنگ لارہی تھی۔ ماموں لابن کے مویشیوں میں غیر معمولی اضافہ ہوچکا تھا۔ کبھی کبھی جب ان مویشیوں میں سے کوئی مویشی کسی درندے کی خوراک بن جاتا تو ماموں لابن کسی نہ کسی طرح یعقوبؑ سے یہ نقصان پورا کرالیتا۔ ایک دن یعقوبؑ کے ریوڑ سے کوئی درندہ ایک بھیڑ دبوچ کرلے گیا۔ شام کو جب ان کی تعداد گنی گئی تو اس میں ایک بھیڑ کم تھی۔ ماموں لابن نے ڈانٹ کر پوچھا۔
"یعقوبؑ! ایک بھیڑ کہاں چلی گئی؟"

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ "ماموں! اسے ایک بھیڑیا اٹھالے گیا۔"

ماموں لابن کو ایک دم غصہ آگیا، بولے۔ "ارے بھائی! یہ بھیڑیا پہلے کیوں نہیں اٹھالے گیا تھا؟"

یعقوبؑ نے معصومیت سے کہا۔ "ماموں! یہ تو وقت وقت کی بات ہے لیکن میں ایک بات آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں۔"

"بتا بتا، ذرا جلدی بتا۔"

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ "میں ہر اس نقصان کا ذمے دار ہوں، جو میرے ذمے سونپے ہوئے کاموں میں ہوگا اس لیے اس گمشدہ بھیڑ کی قیمت میں ادا کروں گا، آپ فکرمند نہ ہوں۔"

ماموں لابن کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں، بولے۔ "تو کتنا سعادت مند ہے یعقوبؑ! تو نے میرا دل خوش کردیا۔"

یعقوبؑ نے ایک بھیڑ کا نقصان واقعی پورا کردیا۔ جب راحیل کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے ہمدردی سے کہا۔ "اگر تو میرے باپ کے مویشی چراتا ہے اور ان کی خدمت کرتا ہے تو اس میں اس قسم کے نقصان بھی ہوں گے اور ان نقصانوں کا ذمے دار میرا باپ اگر تجھے ٹھہراتا ہے تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ "میں نے صرف تیری خاطر مصیبتیں گوارا کی ہیں اور آئندہ بھی انہیں جھیلنے کو تیار ہوں لیکن اس کے باوجود میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ تو اداس اور پریشان سی رہتی ہے...... آخر یہ کیوں؟"

راحیل نے کہا۔ "یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے لیکن

اگر تو نے یہ ذکر چھیڑا ہی ہے تو اس کا جواب بھی سن لے۔ میں اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتی جب تک کہ میں خود بھی صاحبِ اولاد نہیں ہو جاتی اور ایسا ناممکن نظر آتا ہے۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''خدا کے ہاں ناممکن کچھ بھی نہیں، تو مایوس کیوں ہوتی ہے؟''

راحیل نے کہا۔ ''میں مایوس نہیں ہوں لیکن اپنے رب کی رحمت میں تاخیر سے تنگ ضرور آگئی ہوں۔''

باہر سے یعقوبؑ کے کسی ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ یعقوبؑ نے بے چین ہو کر کہا۔ ''راحیل! میں ابھی آتا ہوں، میرا کوئی بچہ رو رہا ہے۔''

یعقوبؑ وہاں سے چلے گئے اور راحیل اپنے غم کی آگ میں جلتی جھلستی رہی۔

☆☆☆

لیاہ کو خدا نے ایک بار پھر نوازا دیا اور اس کے گھر میں چوتھا بیٹا پیدا ہوا۔ اس نے اس کا نام یہوداہ رکھ دیا۔ راحیل پر ایک بار پھر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیاہ نے راحیل کو جلانے کی خاطر اس کو اپنی خوشی میں شریک ہونے کی دعوت دی، بولی۔ ''راحیل! تو کیوں اداس اور پریشان ہوتی ہے؟ تو خدا کی حمد و ثنا اور ستائش کر کہ اس نے تجھے حسن کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور میں بھی خدا کی حمد و ثنا اور تعریف کروں گی کہ اس نے مجھے یکے بعد دیگرے چار بیٹوں سے نوازدیا۔''

راحیل نے جواب دیا۔ ''اے کاش! میں خوب صورت ہونے کے بجائے صاحبِ اولاد ہوتی۔''

لیاہ نے کہا۔ ''تو کیا تو اپنے رب سے گلہ کر رہی ہے؟ مجھے دیکھ کہ میں چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے عیب کے باوجود ہر وقت اپنے رب کی شکر گزار رہتی ہوں۔''

راحیل سے باتیں نہیں کی جا رہی تھیں، ایک طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنے رب سے اپنی محرومی کا گلہ ہرگز نہیں کر رہی ہوں۔ ہاں، اس کی رحمت کی تاخیر سے گھبرا ضرور رہی ہوں۔''

راحیل چلی گئی تو لیاہ نے طنزاً کہا۔ ''تو گویا تو ابھی تک یہ امید رکھتی ہے کہ تو اولاد پیدا کر سکے گی حالانکہ دایہ یہ بتا چکی ہے کہ تیری قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں گیا۔''

اس رات یعقوبؑ سے ایک بار پھر تلخ کلامی ہو گئی۔ راحیل کی آنکھیں مسلسل روتے رہنے سے سرخ ہو گئی تھیں، اس نے یعقوبؑ سے کہا۔ ''آخر میں کب تک انتظار کروں گی؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''یہ سوال تو مجھ سے نہیں، اپنے رب سے کر، وہ شاید جواب دے دے۔''

راحیل نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی، میں اولاد چاہتی ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تو میری بڑی بہن لیاہ، طعنے دے دے کر اور جلا جلا کر مجھے مار ڈالے گی۔ میں مر جاؤں گی۔ کیا تو بھی یہی چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں؟''

یعقوبؑ نے آگ بگولا ہو کر جواب دیا۔ ''راحیل! تو کیسی باتیں کرتی ہے، یہ لین دین تو آسمانوں میں رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ کیا میں تیرا رب ہوں جس نے تجھے اولاد کی نعمت سے محروم کر رکھا ہے؟''

راحیل نے اسی وقت اپنی کنیز بلہاہ کو آواز دی۔ وہ بھاگی بھاگی آئی تو راحیل نے یعقوبؑ سے کہا۔ ''میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بہر قیمت اولاد حاصل کر کے رہوں گی۔ میں اب زیادہ دنوں تک محرومیت کی شکار نہیں رہوں گی۔''

بلہاہ نے پوچھا۔ ''آپ نے مجھے یاد کیا تھا؟''

راحیل نے جواب دیا۔ ''ہاں، تو ایک طرف بیٹھ جا۔ میں نے تجھے ایک ضروری کام سے بلایا ہے۔'' پھر یعقوبؑ سے پوچھا۔ ''میں جو فیصلہ سنانے والی ہوں کیا تو بھی اسے منظور کر لے گا؟''

''پہلے تو اپنا فیصلہ تو سنا، اس کے بعد میں کوئی جواب دوں گا۔''

راحیل نے بلہاہ سے کہا۔ ''بلہاہ! تجھے یاد ہے کہ ایک دن میں نے تجھ سے کوئی وعدہ لیا تھا؟''

بلہاہ نے جواب دیا۔ ''مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے، آپ فرمائیں میں ہر طرح آپ کے کام آنے کو تیار ہوں۔''

راحیل نے یعقوبؑ اور بلہاہ کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔

''تم دونوں جانتے ہو کہ میں نے اپنے رب کی رحمت کا بے حد انتظار کیا لیکن اس میں تاخیر ہوتی جا رہی ہے اور ادھر میری بڑی بہن لیاہ کے گھر میں اولاد کی بارش سی ہو رہی ہے۔ ان حالات میں، میں جس کرب و اذیت میں مبتلا ہوتی جا رہی ہوں اس کا تم دونوں کو معمولی سا احساس تک نہیں ہو سکتا۔'' پھر بطورِ خاص یعقوبؑ سے کہا۔ ''اس لیے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تجھ سے اولاد حاصل کر کے رہوں۔''

اس کے بعد بلہاہ سے کہا۔ ''اور بلہاہ تو میری کنیز ہے، میرے جملہ دکھ درد میں شریک۔ میں تیری مرضی جانے بغیر تجھے اپنے شوہر یعقوبؑ کے حوالے کر رہی ہوں، آج سے یعقوبؑ کو تیرے جسم پر تصرف کا حق بھی حاصل ہوگا اور اس

طرح تجھ سے جو اولاد ہوگی، وہ میری اولاد ہوگی۔ اسے میں اپنی اولاد کہوں گی۔ شاید میں اسی طرح اپنی بہن لیاہ کے مقابلے میں سرخرو ہوسکوں۔“

یعقوبؑ اور بلہاہ نے ایک دوسرے کو سرسری نظر سے دیکھا۔ اس کے بعد دونوں راحیل کی طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت راحیل کی حالت واقعی بڑی قابلِ رحم تھی۔

راحیل نے یعقوبؑ سے پوچھا۔ ”کیا تجھے میرے اس فیصلے سے اختلاف ہے......؟“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ بلہاہ تیرے فیصلے کو کس حد تک مانتی ہے؟“

راحیل نے نہایت مطمئن لہجے میں کہا۔ ”بلہاہ سے میں نے پہلے ہی سے یہ وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ میرے لیے قربانی دے گی۔“ پھر بلہاہ کو مخاطب کیا۔ ”کیوں بلہاہ! کیا تجھے میرے اس فیصلے سے اتفاق نہیں ہے؟ کیا تو میرے لیے یعقوبؑ کے اشتراک سے اولاد نہیں پیدا کرسکتی؟“

بلہاہ نے سر جھکالیا، آہستہ سے بولی۔ ”میں لیاہ کے مقابل آپ کو بھی خوش دیکھنا چاہتی ہوں اے میری آقا زادی۔“

راحیل نے یعقوبؑ سے کہا۔ ”بلہاہ کو لے جا اور اس سے مجھے اولاد دے۔“

جب لیاہ کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی چھوٹی بہن راحیل نے بلہاہ کو یعقوبؑ کے حوالے کردیا ہے اور اس سے اولاد حاصل کرنے کی فکر میں ہے تو خوب ہنسی اور راحیل کا مذاق اڑایا۔ ”واہ! خود تو ناکام رہی، اب اپنی کنیز کے ذریعے میرا مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔ میں بلہاہ کو بھی شکست دے دوں گی، پھر دیکھوں گی کہ راحیل اور کون سا قدم اٹھاتی ہے۔“

بلہاہ کی حاملگی کے بعد کا عرصہ پورے خاندان میں سب کے لیے تجسس اور سنسنی کا مرحلہ بنا ہوا تھا۔ ادھر لیاہ کو پانچویں بیٹے کا انتظار تھا لیکن راحیل اس دوران پورے اعتماد سے ایک بات کہنے لگی تھی، وہ کہتی تھی۔ ”اب میرا رب مجھے اور زیادہ شرمندہ نہیں کرے گا۔“

لیاہ کو یقین تھا کہ اس کے ہاں پانچویں اولاد بھی ہوگی لیکن اس وقت یہ غرور چکنا چور ہوگیا جب بلہاہ سے ایک لڑکا پیدا ہوگیا۔ اس دن راحیل کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور لیاہ خفت میں مبتلا ہوگئی۔ راحیل اکڑتی ہوئی بلہاہ کے پاس پہنچی۔ وہاں خاندان کے اور لوگ بھی موجود تھے اور یہ لوگ بلہاہ کے بجائے راحیل کو مبارکباد دے رہے تھے۔

لیاہ نے اپنی خفت مٹانے کے لیے مہمانوں سے کہا۔ ”راحیل خوامخواہ اترا رہی ہے، لڑکا بلہاہ سے ہوا ہے، اس میں راحیل کے خوش ہونے کی کیا بات ہے؟ میں تو تب جانوں جب راحیل کے لڑکا ہوتا۔ وہ تو وہی بے اولاد ہی رہی۔“

راحیل نے اکڑ کر جواب دیا۔ ”بلہاہ کو میں نے اپنے شوہر کے حوالے کیا تھا اس لیے اس کی اولاد میری اولاد ہے۔ میری بڑی بہن لیاہ خوامخواہ تکبر میں مبتلا تھی۔ بلہاہ کو بیٹا دے کر خدا نے میری فریاد سنی اور میرے ساتھ انصاف کیا۔ اب یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس کا نام دان رکھ رہی ہوں۔“

اس دن دونوں بہنوں میں خاصی نوک جھوک رہی اور دیکھنے والے خوب اچھی طرح یہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ اب لیاہ کی باتوں میں ایک قسم کی شکست خوردگی پائی جاتی تھی اور راحیل کا انداز فاتحانہ بلکہ جارحانہ تھا۔

لیاہ نے کہا۔ ”راحیل! تو زیادہ نہ اترا، اب بھی میری چار اولادیں ہیں اور میں آج بھی اپنے شوہر کی نظر میں تجھ سے زیادہ برگزیدہ اور چہیتی ہوں۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”جب میں نے غرور کیا تھا تو خدا نے مجھے بے اولاد رکھ کر بڑی کربناک شکست دی تھی لیکن بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں اپنے کیے پر نادم ہوکر اپنے رب سے توبہ واستغفار کرنے لگی اور پھر میرے رب نے ہی میرے دل ودماغ میں یہ تجویز ڈالی کہ میں اپنی کنیز بلہاہ سے اپنے لیے بیٹا طلب کروں، چنانچہ میں اس اشارے پر عمل کرکے صاحبِ اولاد ہوچکی ہوں اور بلہاہ کا بیٹا دان میرا اپنا بیٹا ہے۔“

لیاہ ناراض ہوکر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی اور راحیل اپنی کنیز بلہاہ سے محبت کی باتیں کرنے لگی۔ یعقوبؑ نے لیاہ کو سمجھایا کہ راحیل اور بلہاہ کے مقابلے میں بہت زیادہ جذباتی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن لیاہ کا یہ کہنا تھا کہ وہ چونکہ یعقوبؑ کے چار بیٹوں کی ماں ہے اس لیے بلہاہ اور راحیل کے مقابلے میں اس سے زیادہ ترجیحی سلوک ہونا چاہیے۔ یعقوبؑ یہ کہتے تھے کہ ان کے نزدیک سبھی برابر ہیں۔ وہ کسی کو کسی پر فوقیت دینے کو تیار نہیں ہیں۔

لیاہ مہینوں اس انتظار میں رہی کہ خدا اس کی قسمت کو کھول دے اور وہ پانچواں بیٹا پیدا کرکے راحیل اور بلہاہ کو شرمندہ کردے لیکن اس کے بے جا تکبر سے خدا اس سے روٹھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ بلہاہ سے دوسرا بیٹا بھی پیدا ہوگیا

اور ایک بار پھر راحیل کو زبردست خوشی حاصل ہوئی۔ اس نے اس خوشی میں خاندان والوں کی شاندار ضیافت کی۔ اس میں قریب اور دور کے بہت سارے رشتے دار شریک ہوئے۔ ایک کھلی جگہ میں ان سب کو جمع کر کے مزے مزے کی باتیں کی جانے لگیں۔ لیاہ اور اس کی کنیز زلفہ اس ضیافت میں شریک نہیں ہوئیں۔ یہ دونوں اپنی کوٹھری میں، اپنے چاروں بچوں سمیت بند بیٹھی رہیں۔ جب یعقوبؑ نے ان لوگوں کو محفل میں نہیں دیکھا تو وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے ان کی کوٹھری تک پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ لیاہ کی کنیز زلفہ نے دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے دیکھا، لیاہ منہ چھپائے بستر پر دراز ہے اور اس کے آس پاس اس کے چاروں بچے چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ یعقوبؑ نے دریافت کیا۔ ”تم لوگ محفل سے الگ تھلگ یہاں منہ چھپائے کیوں پڑے ہو؟ آخر عزیز رشتے داروں میں کیوں نہیں بیٹھتے؟“

لیاہ نے ترشی سے کہا۔ ”راحیل نے یہ محفل مجھے، میرے بچوں اور زلفہ کو جلانے کے لیے منعقد کی ہے کیا تم بھی چاہتے ہو کہ راحیل اور اس کی کنیز بلہاہ کو خوش ہونے کا موقع فراہم کیا جائے؟“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”تیرے چار لڑکے ہیں اور اگر عورت کی برتری اور کمتری کا مرتبہ اس کی اولادوں ہی سے متعین ہوتا ہے تو تو ان دونوں پر اب بھی فوقیت رکھتی ہے، کیونکہ بلہاہ کے تو ابھی دو ہی لڑکے ہیں اور راحیل کے ایک بھی نہیں۔“

لیاہ نے بہت زیادہ تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر راحیل یہ سمجھتی ہے کہ میں اس طرح سے ہار مان لوں گی تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔ میں چاہوں تو اب بھی اس کی اس معمولی سی فتح کو اس کی ہار میں بدل دوں۔ میرے رب نے مجھے بھی عقل دی ہے۔“

یعقوبؑ نے کہا۔ ”اچھا تو تقریب میں تو چل، یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”جب میں نے ایک بار یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اور زلفہ اپنے بچوں سمیت اس تقریب میں نہیں بیٹھیں گی تو اس میں شمولیت کے لیے کوئی ہمیں مجبور بھی نہیں کر سکتا۔“

یعقوبؑ نے افسوس سے کہا۔ ”لیاہ! میں جبر سے بھی کام نہیں لے سکتا اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور بھی نہیں کر سکتا لیکن میری دوربین نظریں ایک بات ضرور دیکھ رہی ہیں۔ ایک خطرناک بات ایک افسوسناک منظر۔ تم لوگوں کی یہ باہمی منافرت، رنجشیں اور حسد، تمہاری اولادوں میں پیدا ہو جائیں گی اور ایک زمانہ آئے گا جب تمہارے بیٹے، بلہاہ کے بیٹوں سے برسرِ پیکار ہو جائیں گے لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔“

یعقوبؑ کے مایوس چلے جانے کے بعد لیاہ کا باپ لابن، لیاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت لابن کے ساتھ اس کے دونوں بیٹے بھی آئے تھے۔ لیاہ اور راحیل کے دونوں بھائی ایک عرصے بعد اپنے گھر فدان ارم واپس آئے تھے اور انہوں نے اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

لابن نے پوچھا۔ ”لیاہ! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے، باہر کیوں نہیں چلتی؟ کیا تقریب میں شرکت سے تجھے کسی نے روک دیا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں بابا جان! میں سوچتی ہوں کہ اگر میں اپنے حاسدوں سے دور ہی رہوں تو زیادہ سکون سے رہوں گی۔“

”نہیں بیٹی!“ لابن نے کہا۔ ”تیرا اس طرح کوٹھری میں چھپ کر بیٹھ رہنا اچھی بات نہیں ہے۔“

دونوں بھائیوں نے کہا۔ ”نہیں بہن! ہم دونوں بھی تو وہاں موجود ہوں گے۔ کسی کی کیا مجال کہ وہ آپ کو پریشان کرے یا کسی قسم کا دکھ پہنچائے۔“

لیاہ نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے بھائیو! تم اس معاملے میں مت پڑو۔ ہم بہنوں اور کنیزوں کے معاملوں میں تم دونوں کو نہیں پڑنا چاہیے۔ میں خود ہی مقابلہ کر لوں گی اور انہیں نیچا دکھا کے رہوں گی۔“

لابن اور اس کے بیٹوں نے بڑی کوشش کی کہ وہ لیاہ اس کے چاروں بیٹوں اور کنیز زلفہ کو لے کر اس تقریب میں شریک ہوں لیکن لیاہ نہیں مانی۔ ضیافت بہت شاندار رہی اور بلہاہ کے دونوں بچوں کو ان کے رشتے داروں نے خوب خوب پیار کیا۔

عزیز رشتے داروں نے محفل میں لیاہ، اس کے بچوں اور اس کی کنیز زلفہ کو نہ دیکھ کر، ان کی عدم شرکت کی وجہ پوچھی تو راحیل نے چند عورتوں کو ساتھ لیا اور ان سے کہا۔ ”میں نے تو بڑی کوشش کی کہ میری بہن لیاہ، اس کے بچے اور اس کی کنیز زلفہ بھی میری اس خوشی میں شریک ہوں لیکن وہ معلوم نہیں کیوں مجھ سے ناراض ہیں۔ ذرا تم لوگ میرے ساتھ چل کر، محفل میں شریک نہ ہونے کا سبب خود ہی معلوم کر لو۔“

راحیل نے دروازہ تھپتھپایا اور ہنستے ہوئے کہا۔

"لیاہ! دروازہ کھول، میں تجھے لینے آئی ہوں۔ کیا تو ہماری خوشیوں میں نہیں شریک ہوگی؟"

لیاہ نے اندر سے جواب دیا۔ "راحیل! تو زیادہ نہ پریشان کر، کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں تیری اور بلہاہ کی موجودگی میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں میں شرمندگی اٹھاؤں؟"

راحیل نے ہنس کر کہا۔ "نہیں، میں ایسا نہیں چاہتی بلکہ سارے رشتے دار تجھے اور تیرے بچوں کے لیے طرح طرح کے سوالات کر رہے ہیں اس لیے اس تقریب میں تیری شرکت ضروری ہے۔"

لیاہ نے غصے میں جواب دیا۔ "راحیل! تو چلی جا۔ میں نہیں آؤں گی، مجھے تنگ نہ کر۔"

راحیل نے ساتھ کی عورتوں سے کہا۔ "دیکھا تم نے، میری بڑی بہن لیاہ حسد سے اندر بند ہے۔ جب اس کے یکے بعد دیگرے چار بیٹے ہوئے تو وہ میرے ساتھ حسد سے پیش آئی اور میں پانچ چھ سال تک اس کے حسد کی آگ میں جلتی رہی۔ آخر میں نے یہ محسوس کر کے کہ میں خود بیٹا نہیں دے سکتی تو میں نے اپنی کنیز بلہاہ کو اپنے شوہر کے حوالے کر دیا اور اس سے میں نے دو بیٹے حاصل کر لیے۔"

لیاہ نے اندر سے چیخ کر کہا۔ "راحیل! تو اسی وقت یہاں سے چلی جا، ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گی۔"

راحیل نے اپنی بہن کی دھمکی پر کوئی توجہ ہی نہ دی، ہنس ہنس کے مہمان عورتوں سے کہنے لگی۔ "اے معزز عورتو! میں نے اپنی بڑی بہن لیاہ سے نہایت زور مار مار کر کشتی لڑی ہے اور تم سب دیکھ رہی ہو کہ آخر کار میں نے فتح پالی ہے۔ میں اپنے دوسرے بیٹے کا نام نفتالی رکھتی ہوں۔"

اندر لیاہ نے اپنی کنیز زلفہ سے کہا۔ "زلفہ! تو دیکھ رہی ہے کہ راحیل میرے ساتھ کس طرح پیش آرہی ہے۔"

زلفہ نے جواب دیا۔ "اے میری آقازادی! میں خوب دیکھ رہی ہوں، ہم سب کے رب کی مرضی یہی ہے کہ راحیل ہم پر ہنسے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

لیاہ نے غصے سے کہا۔ "لیکن میں یہ سب نہیں برداشت کر سکتی۔"

زلفہ نے کہا۔ "آخر آپ کی بہن راحیل بھی تو ایک عرصے تک اس آگ میں جلتی رہی ہے۔"

لیاہ نے اسے ڈانٹا۔ "تو چپ رہ، اپنی زبان بند رکھ۔ کیا تو بھی راحیل اور بلہاہ سے مل گئی ہے؟"

زلفہ نے عاجزی سے جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات

نہیں اے میری آقازادی! میں تو اس طرح آپ کو صبر و تحمل کی تلقین کر رہی ہوں۔''

لیاہ نے پوچھا۔''زلفہ! کیا تو میرا ساتھ دے گی؟''

زلفہ نے جواب دیا۔''بالکل ساتھ دوں گی اے میری آقازادی!''

باہر راحیل اور دوسری مہمان عورتیں، لیاہ کی شرکت کی طرف سے مایوس ہو کر واپس جا رہی تھیں کہ یعقوبؑ نے راحیل کو ڈانٹا۔''راحیل! تجھے لیاہ کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔''

راحیل نے کہا۔''پھر وہ میری خوشیوں میں شریک کیوں نہیں ہوتی؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔''اچھا تو مہمانوں میں واپس جا، میں لیاہ، اس کے بچوں اور اس کی کنیز زلفہ کو اپنے ساتھ لے کر تیرے پاس آتا ہوں۔''

راحیل چلی گئی اور یعقوبؑ کوٹھری کا دروازہ کھلوا کے اندر داخل ہوئے۔

لیاہ نے کہا۔''آج مجھے راحیل نے بہت زیادہ شرمندہ کیا ہے۔ میری کنیز زلفہ اس بات کی گواہی دے گی۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔''میں چاہتا ہوں کہ تم سب مل جل کر رہو اور حسد و رقابت سے توبہ کر لو۔''

لیاہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔''راحیل کہتی ہے کہ اس نے مجھ سے نہایت زور مار مار کر کشتی لڑی ہے اور اس نے آخر کار مجھ پر فتح پالی ہے۔ اب میں بھی اس سے اسی طرح زور مار مار کر کشتی لڑنا چاہتی ہوں اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گی جب تک کہ میں اسے شکست نہ دے دوں۔''

لیاہ کے چاروں بچے اپنی ماں کی آزردگی سے خود بھی آزردہ ہو رہے تھے۔

یعقوبؑ نے کہا۔''ایک تو یہ طریقہ ہے کہ تم دونوں آپس کے اختلافات اور حسد دور کر دو اور مل جل کر رہنے کی کوشش کرو اور اگر تم اس پر عمل کرنے سے قاصر ہو تو وہ دوسری تدبیر کیا ہے جس سے تمہاری آزردگی دور ہو سکتی ہے؟''

لیاہ نے زلفہ کو مخاطب کیا۔''زلفہ! ادھر آ میرے پاس۔''

زلفہ، لیاہ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اب لیاہ نے یعقوبؑ کو مخاطب کیا۔''جس طرح میری بہن راحیل نے اپنی کنیز بلہاہ کو تیرے حوالے کر کے یہ جنگ جیتی ہے اسی طرح میں بھی اپنی کنیز زلفہ تیرے حوالے کرتی ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا رب کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو گیا ہے جس سے میں پانچواں بیٹا نہیں پیدا کر سکی۔ اب میں بھی اپنی کنیز زلفہ کے ذریعے پانچویں اولاد حاصل کروں گی۔ تو زلفہ کو بیوی بنا اور اس سے اولاد پیدا کر۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔''لیاہ! تو جیسا چاہتی ہے ویسا ہی ہوگا لیکن تو بشاش رہ اور دل سے کدورتیں نکال دے۔''

لیاہ خوشی خوشی اٹھی اور یعقوبؑ کے ساتھ راحیل کی ضیافت میں شریک ہوئی۔ اس کے چاروں لڑکے بھی اس کے ساتھ تھے اور اس کی کنیز زلفہ اس طرح یعقوبؑ کے ساتھ کھڑی تھی جس طرح بیوی شوہر کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔

راحیل کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ایک دم اٹھی اور بھاگ کر یعقوبؑ کے پاس آئی، پوچھا۔''یہ زلفہ تیری کون ہے؟ کیا میری بہن لیاہ نے اسے تیری دلہن بنا دیا ہے؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔''ہاں، بالکل اسی طرح، جس طرح تو نے اپنی کنیز بلہاہ کو میری دلہن بنا دیا تھا۔''

راحیل نے اپنی بہن لیاہ کی طرف دیکھا اور کہا۔''تو تو میری ہی تدبیر سے میرا مقابلہ کرنا چاہتی ہے؟''

لیاہ نے جواب دیا۔''ہاں، لیکن یہ یاد رہے کہ پہل تیری ہی طرف سے ہوئی تھی۔''

راحیل نے کہا۔''بہرحال کچھ بھی ہو، میں تو اپنے رب پر بھروسا کروں گی، کیونکہ عزت اور ذلت اسی کی طرف سے ملتی ہے اور وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔''

☆☆☆

اگلے سال زلفہ سے بھی ایک لڑکا ہوا۔ لیاہ نے مارے خوشی کے نعرہ بلند کیا۔''زہے قسمت!''

راحیل اور بلہاہ کو افسوس تو ہوا لیکن پہلے جیسا نہیں کیونکہ وہ دونوں اس مقابلے سے عاجز آ گئی تھیں۔ لیاہ نے اس لڑکے کو اپنے باپ لابن اور بھائیوں کی خدمت میں باری باری پھرایا اور عزیز رشتے داروں کو بلا کے مبارکبادیں وصول کیں۔ لیاہ نے اس کا نام جَدر رکھا۔

دوسرے سال زلفہ سے ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ اب لیاہ کا خوشی سے برا حال ہو رہا تھا، اس نے کہا۔''آہ! میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ عورتیں مجھے خوش قسمت کہیں گی۔''

لیاہ نے اس کا نام آشر رکھا۔ اس دوران لیاہ کے اپنے بیٹے بڑے ہو رہے تھے اور سب سے بڑا بیٹا رابن اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ کھیتوں میں جانے لگا تھا۔ راحیل اور بلہاہ نہایت صبر و شکر سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اب پانسا پلٹ چکا تھا اور لیاہ جس انداز میں رہ رہی تھی اور اس نے جو روش اختیار کر رکھی تھی، اس سے ایک شانِ تمکنت جھلکتی تھی۔ وہ کسی

کو خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ وہ ہر ایک سے اس طرح پیش آتی گویا وہی گھر کی بڑی اور اہم شخصیت ہے۔

لیاہ کا بڑا بیٹا رابن گیہوں کے کھیت میں گھسا ہوا معلوم نہیں کیا کررہا تھا کہ وہاں سے ایک خاص قسم کی گھاس مل گئی۔ اس گھاس کی شکل آدمی سے ملتی جلتی ہے اس لیے اسے مردم گیاہ کہتے ہیں۔ رابن مردم گیاہ لے کر گھر میں جو داخل ہوا تو اس پر راحیل کی نظر پڑ گئی۔ وہ رابن سے تو کچھ بولی نہیں لیکن اپنی بڑی بہن لیاہ سے کہا۔ ''دیکھ، میں نے تجھ سے مفاہمت کرلی ہے اور اب میرا تیرا کوئی مقابلہ نہیں ہورہا۔''

لیاہ نے چڑ کے پوچھا۔ ''آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟ اپنا مطلب بیان کر۔''

راحیل نے جواب دیا۔ ''تیرا بیٹا رابن مردم گیاہ لے کر آیا ہے، یہ مجھے بہت اچھے لگے، کیا تو ان میں سے چند مجھے بھی دے دے گی؟''

لیاہ نے غصے میں جواب دیا۔ ''راحیل! اب تک تو میں خاموش تھی اور تو طعنے دے دے کر مجھے چپ ہورہنے پر مجبور کیے ہوئے تھی لیکن اب میں خاموش نہیں رہوں گی۔ کیا یہ معمولی بات ہے کہ تو نے میرے شوہر پر پہلے ہی قبضہ جما رکھا ہے، اب تو میرے بیٹے کے مردم گیاہ سے بھی حصہ بٹا کرنا چاہتی ہے۔''

راحیل نے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی یہ کہہ دیا ہے کہ اب میں تجھ سے جھگڑنا نہیں چاہتی۔ میں یہاں تک مفاہمت پر آمادہ ہوں کہ اگر تو مردم گیاہ میں سے کچھ مجھے دے دے تو میں آج کی اپنی باری تجھے دے سکتی ہوں۔''

لیاہ نرم پڑ گئی، اس نے اپنے بیٹے کے لائے ہوئے مردم گیاہ میں سے کچھ راحیل کے حوالے کردیا اور شام کو آتے ہوئے یعقوبؑ کو راستے ہی میں روک لیا، بولی۔ ''آج تو میرے پاس رہے گا۔''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''یہ انصاف کے خلاف ہے، آج کی رات راحیل کی ہے اور میں عدل کے خلاف نہیں کرسکتا۔''

لیاہ نے پورا واقعہ سنا کے جواب دیا۔ ''میں نے راحیل سے تجھے آج کی رات مانگ لیا ہے اور اسے اس کی اجرت ادا کردی ہے اس لیے اب انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ تو میرے ساتھ رہ۔''

تحقیق کے بعد جب لیاہ کی بات کی تصدیق ہوگئی تو وہ لیاہ کے ساتھ چلے گئے۔ یعقوبؑ کی یہ شب بسری لیاہ کے حق میں بہت بڑی خوشی کا باعث بن گئی کیونکہ اس شب کے عوض اسے پانچواں لڑکا عطا ہوا۔ اس لڑکے کا نام لیاہ نے اشکار رکھا۔ اس نے راحیل اور بلہاہ کو چڑانے کی خاطر یہ آوازِ بلند کہا۔ ''لوگو! خدا نے میری اجرت عطا فرمادی۔ میں نے اپنے شوہر کو اپنی کنیز زلفہ دے دی تھی۔ آج ایک عرصے بعد خدا نے مجھے پانچویں بیٹے سے سرفراز کیا جبکہ راحیل ابھی تک محروم ہے۔''

گویا راحیل کو ایک بار پھر ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اب اس نے صبر کو اپنا شعار بنالیا تھا اور اپنی بڑی بہن سے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے خدا سے کہا۔ ''اے میرے رب! میں نے تو یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ تو مجھے جس حال میں بھی رکھے گا، خوش رہوں گی۔ میں اپنی قسمت اور قسمت لکھنے والے سے نہیں لڑسکتی۔''

بلہاہ کو سوگوار دیکھ کر اسے بھی تسلی دی، کہا۔ ''بلہاہ! تو اپنے دونوں بچوں میں مگن رہ، تو کیوں اداس ہوتی ہے۔ میری طرح تو بھی صبر وشکر کو اپنا شعار بنالے اور دیکھ کہ اس میں کتنا سکون ہے۔''

پانچویں بیٹے اشکار کے بعد لیاہ کے چھٹا بیٹا بھی پیدا ہوگیا۔ لیاہ نے اس کا نام زبولون رکھا۔ اس بار وہ بہت زیادہ اترائی۔ اس نے زور زور سے اعلان کیا۔ ''لوگو! کان کھول کر سن لو، میں اپنے چھٹے بیٹے کو اپنے مہر کی جگہ سمجھتی ہوں، جو خدا کی طرف سے مجھے عطا ہوا ہے۔ اب مجھے یہ حق خدا کی طرف سے مل چکا ہے کہ میں اپنے شوہر کو اپنے پاس ہی رکھ لوں۔'' پھر اس نے فخریہ کہا۔ ''لوگو! یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ میں یعقوبؑ کے چھ بیٹوں کی ماں ہوں۔''

ان تیز اور ترش باتوں سے تنگ آکر بلہاہ نے اپنی آقازادی راحیل سے کہا۔ ''اے میری آقازادی! ہمارے مقابلے کی دوڑ میں لیاہ اتنا آگے نکل گئی ہے کہ اب یہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ اس نے ہم چاروں کے شوہر کو محض اپنا شوہر کہنا شروع کردیا ہے۔ اس کے حسد اور غرور کو توڑنے کے لیے کوئی تدبیر کیجیے، کوئی راہ نکالیے۔''

راحیل نے جواب دیا۔ ''اب تک میں نے جتنی تدبیریں کی ہیں ان سے میں نے کبھی کبھی وقتی فتح حاصل کی ہے۔ شاید میرے رب کو میری یہ بات ناگوار گزرتی رہی ہو اس لیے اب میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ لیاہ جو کچھ کہتی یا کرتی ہے میں اس کا کوئی جواب نہ دوں اور اپنے رب پر تکیہ کیے رہوں کیونکہ میں خوب جانتی ہوں کہ میرا رب

مظلوموں کا ساتھی ہے۔ اگر میں حق پر نہیں ہوں تو مجھے میرا رب ہمیشہ مایوس رکھے گا لیکن اگر میں حق پر ہوں تو پھر میرا رب مجھے ہمیشہ مایوس بھی نہیں رکھے گا۔"

بلہاہ نے سوچا کہ یہ اس کی آقازادی کو ہو کیا گیا ہے؟ یہ سرد کیوں پڑتی جا رہی ہے؟ اپنے چھ بیٹوں کو لے کر لیاہ جب راخیل کے سامنے سے اکڑتی ہوئی گزرتی تو وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے رب کو پکارتی کہ تو کہاں ہے؟

یعقوبؑ نے لیاہ کو سمجھایا کہ دیکھ تو راخیل کو مت ستا، ورنہ اندیشہ ہے کہ خدا تجھ سے ناراض ہو جائے۔

لیاہ اور راخیل کے بھائی سمجھاتے۔ "لیاہ! تو اپنی اولاد پر اتنی زیادہ نہ پھول، اپنے رب سے ڈر، جو مظلوموں کا ساتھی ہے اور بڑبولوں اور سرکشوں کا دشمن ہے۔"

اسی دوران میں ان کا باپ لابن بھی آگیا اور اس نے اصل معاملے سے واقفیت حاصل کر کے لیاہ کو ڈانٹا۔ "لیاہ! آخر تو یہ کیا کرتی ہے؟ اب راخیل نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور خود کو صبر وتحمل کے حوالے کر دیا ہے۔ تو نے دیکھا کہ اس سے پہلے جب تو جھگڑتی تھی اور تجھ سے راخیل بھی بولتی تھی تو ہم سب خاموش رہتے تھے لیکن اب راخیل نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے تو اس کی طرف سے ہم سب بولنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیاہ اپنے رب سے ڈر کہ کہیں وہ تجھ سے ناراض ہو کر راخیل کا مددگار بن جائے۔"

لیاہ نے بگڑ کر جواب دیا۔ "باوا جان! میں کس طرح خاموش رہ سکتی ہوں۔ راخیل میرے شوہر کی حصے دار بن گئی مگر میں خاموش رہی، پھر میرے خدا نے مجھے چھ بیٹے دیے۔ کیا خدا یہ نہیں سمجھ رہا کہ کون کس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ اس نے کس خطا میں راخیل کو اس کے پھل سے محروم رکھا؟ آپ لوگ میری طرح کیوں نہیں سوچتے۔"

لیاہ کے باپ لابن نے کہا۔ "میں نہیں کہہ سکتا کہ کس نے کس سے زیادتی کی، یہ سارا معاملہ تیرے سامنے کا ہے۔ تو خود ہی بتا کہ یعقوبؑ نے پہلے سات سال جو میری خدمت گزاری میں صرف کر دیے تھے تو وہ کس کی خاطر کیے تھے، کیا اس نے یہ خدمت راخیل کے لیے نہیں کی تھی لیکن میں نے زمانے کے دستور کے مطابق، یعقوبؑ کو لاعلم رکھ کر اس سے تیری شادی کر دی جس پر یعقوبؑ ناراض بھی ہوا، مجھے اس پر رحم آگیا اور مزید سات سالہ خدمت گزاری کا عہد لے کر میں نے راخیل کی شادی بھی اس سے کر دی۔ اب تو ہی ایمانداری سے بتا دے کہ یعقوبؑ نے چودہ سالہ خدمت گزاری آخر کس کے لیے گوارا کی؟ راخیل یہ کہتی ہے کہ تو اس کے حق میں بلاوجہ ساجھی بنا دی گئی اور اب تو اپنے چھ بیٹوں کے زعم میں راخیل کو اپنے شوہر کا زبردستی کا حصے دار سمجھنے لگی ہے لیکن جہاں تک ہم سب کے رب کا معاملہ ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس نے کس کے ساتھ زیادتی کی اور اب کون کس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔"

لیاہ اپنے باپ سے بھی ناراض ہو گئی کہ وہ بھی راخیل کی طرف داری کر رہا ہے۔

☆☆☆

چھ بیٹوں کے بعد لیاہ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیاہ نے اس کا نام دینہ رکھا۔ بلہاہ نے اپنی آقازادی راخیل کو یہ خوشخبری سنائی کہ شاید خدا لیاہ کی طرف سے منہ پھیر رہا ہے کیونکہ اس بار اسے بیٹی دے کر ٹال دیا گیا ہے۔

راخیل نے جواب دیا۔ "بلہاہ! میں نے قسم کھائی ہے کہ اب میں اپنی بہن لیاہ سے نہیں الجھوں گی۔ میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ لیاہ کو لڑکا دے یا لڑکی، میں اس سے حسد کروں گی نہ شماتت۔ میں اپنے رب کے فیصلوں میں دخل دے کر گناہ گار کیوں بنوں۔"

لیاہ کے بھائیوں نے لیاہ کو متنبہ کیا۔ "دیکھ تیری زیادتیوں نے خدا کو کچھ کچھ تجھ سے ناراض کر دیا ہے ورنہ وہ اس بار بھی تجھے بیٹا ہی دیتا۔"

لیاہ کے باپ لابن نے کہا۔ "لیاہ! تو بھی میری بیٹی ہے اور راخیل بھی۔ میں کسی کی بے جا طرف داری نہیں کرتا لیکن اگر تو میری سچی بات سننا گوارا کرے تو میں یہی کہوں گا کہ خدا تجھ سے خوش نہیں ہے۔"

لیاہ نے جواب دیا۔ "اگر خدا مجھ سے خوش نہیں ہے تو پھر راخیل سے بھی وہ خوش نہیں ہے۔ اس نے مجھے ساتویں بار بیٹے کی جگہ بیٹی مرحمت فرمائی لیکن راخیل کو تو کچھ بھی نہیں دیا۔ اگر وہ مجھ سے ناخوش اور راخیل سے خوش ہے تو وہ راخیل کو اس کا پھل کیوں نہیں دیتا؟"

لابن کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، وہ مزید کوئی بات کیے بغیر لیاہ کے پاس سے چلا گیا اور لیاہ خوشی سے پھولی نہ سمائی کہ اس نے باپ کو لاجواب کر دیا ہے۔

راخیل کی اداسی اور صبر کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو خدا کو اس پر رحم آگیا۔ پھر پورے خاندان میں ایک ایسی خبر گشت کرنے لگی جس کے سننے کی وہ امید تک نہ کر سکتے تھے۔ دایہ نے یہ حیرت انگیز خبر سنائی کہ راخیل کو اس کا پھل ملنے والا ہے اور کسی کو اس خبر پر یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن لیاہ نے

دایہ کا مذاق اڑایا۔ ”ایسا کیونکر ہوسکتا ہے جب خدا نے راحیل کی قسمت میں اس کا پھل لکھا ہی نہیں تو یہ صاحبِ اولاد کس طرح ہوجائے گی۔“

اپنی بڑی بہن لیاہ کی یہ بات جب راحیل نے سنی تو اس نے نہایت صبر وتحمل سے جواب دیا۔ ”میرا رب تو پتھر کی جوف تک میں جاندار اوراس کی غذا کا انتظام کردیتا ہے پھر میں تو اس کی ایک بندی ہوں۔“

اور جب یہ بات وثوق سے معلوم ہوگئی کہ راحیل اپنا پھل پانے ہی والی ہے تو یعقوبؑ، راحیل کے باپ لابن اوراس کے بھائیوں کو بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے کہا۔ ”خدانے راحیل پر رحم کیا ہے اوراس نے اسے محسود ہونے کا صلہ عطا فرمایا۔“

راحیل سے ایک نہایت حسین بچہ پیدا ہوا، پورا گھر مسرت کدہ بن گیا۔ لیاہ نے جب اس حسین ترین بچے کو دیکھا تو حسد سے کہا۔ ”بچہ تو واقعی بہت خوب صورت ہے لیکن بات تو جب کی ہے، جب یہ بڑا ہوکر بھی حسین نکلے۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”لیاہ بہن! میں یہ نہیں جانتی کہ میرا بچہ بڑا ہوکر کیسا نکلے گا، میں تو اپنے رب سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ جس طرح تو نے اسے حسن وجمال کی دولت سے نوازا ہے، اسی طرح جب یہ بڑا ہوجائے تو اسے دولتِ کردار سے بھی نواز دیجیو۔“

خاندان کی عورتوں نے راحیل کو مبارکبادیں پیش کیں تو اس نے ان سب سے کہا۔ ”میں تو اپنے رب کی اس لیے بہت زیادہ شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ سے رسوائی دور کردی۔“

راحیل نے اپنے اس حسین بچے کا نام یوسفؑ رکھا۔ اب یعقوبؑ کو لابن کی خدمت کرتے ہوئے چودہ سال پورے ہوچکے تھے۔ انہیں کنعان کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ جب راحیل کے بچے کی خوشی میں سارا خاندان ایک جگہ جمع ہوا تو یعقوبؑ، راحیل کے باپ لابن کو تخلیے میں لے گئے اور کہا۔ ”جناب! اب مجھے رخصت کیجیے، میں اپنے وطن کنعان واپس جانا چاہتا ہوں۔“

لابن نے جواب دیا۔ ”تو شوق سے کنعان واپس جا، میں نے تجھے روکا تو نہیں ہے۔“

یعقوبؑ نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میرے بیوی بچے، جن کی خاطر میں نے اب تک آپ کی خدمت کی ہے، میرے حوالے کردیجیے۔ میں انہیں اپنے ساتھ کنعان لے جاؤں گا۔“

لابن نے ذرا تشویش سے کہا۔ ”تیرے بیوی بچے؟ کیا تو لیاہ، راحیل، زلفہ، بلہاہ اوران کی اولاد، سبھی کو کنعان لے جائے گا؟“

”ہاں، میں ان سب کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، کیونکہ میں نے انہی کی خاطر آپ کی چودہ سال تک خدمت کی ہے اور آپ یہ بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے آپ کی کیسی خدمت کی ہے۔“

لابن نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ ”یعقوبؑ! اگر تو پسند کرے تو ابھی کچھ اور رہ جا میرے پاس، کیونکہ میں ایک عرصے سے یہ بات محسوس کررہا ہوں کہ تو بہت ہی بابرکت ہے۔ خدا نے تیری وجہ سے مجھے بھی برکت بخشی ہے۔ اگر تو اپنے دل میں یہ محسوس کرتا ہے کہ تیری نظرِ کرم میرے حال پر رہنی چاہیے تو میں تجھ سے درخواست کروں گا کہ تو یہیں رہ، اب میرے پاس کوئی بیٹی بھی نہیں ہے ورنہ میں وہ بھی تیرے حوالے کردیتا لیکن پھر بھی میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو مزید رہنا گوارا کرے گا تو میں اس کی اجرت ضرور دوں گا۔“

یعقوبؑ نے پوچھا۔ ”اگر میں چند سال اور رہ جاؤں تو آپ اس کی کیا اجرت دیں گے؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”اجرت تو ٹھہرائے گا، جو کہے گا میں دیا کروں گا۔“

یعقوبؑ نے کہا۔ ”یہ تو آپ مانتے ہی ہیں کہ میرے آنے سے پہلے آپ کے پاس تھوڑے سے جانور تھے لیکن اب یہ بہت ہوچکے ہیں لیکن اب چونکہ میں خود بھی ایک خاندان والا بن چکا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ اپنے خاندان کے لیے بھی کچھ کروں۔“

لابن نے فراخ دلی سے اجازت دی۔ ”وہی تو میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ میں تجھے کیا دوں؟“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”اگر آپ میری تجویز مان لیں گے تو میں آپ کی مزید خدمت کے لیے تیار ہوں۔“

لابن نے سوالیہ نظروں سے یعقوبؑ کو دیکھنا شروع کیا۔ یعقوبؑ نے ذرا تامل کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”میں آپ کے مویشیوں میں گھوم پھر کر اپنا معاوضہ الگ کرلوں گا۔ اگر آپ نے اس معاوضے کو پسند فرمایا تو میں آپ کی خدمت کروں گا، ورنہ پھر اپنے خاندان کو لے کر کنعان چلا جاؤں گا۔“

اس کے بعد یعقوبؑ نے اپنے سسر لابن کو ساتھ لیا اور مویشیوں کے گلے سے چتلی، چتکبری اور کالی بھیڑیں اور بکریاں الگ کرکے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”یہ میرے مویشی ہیں

اور ان سے جو بچے پیدا ہوں گے، وہ میری اجرت ہوں گے ان کے علاوہ جو بچے ہوں گے وہ آپ کے ہوں گے۔"

لابن نے وضاحت چاہی۔"ان کے وہی بچے جو انہی کی طرح چتلے، چتکبرے اور کالے ہوں گے، وہ تیرے ہوں گے باقی میرے۔"

یعقوبؑ نے تائید کی۔"بیشک بیشک، میں اس کی تائید کرتا ہوں۔"

یعقوبؑ نے اسی دن سے اپنی خدمات سنبھال لیں اور وہ اپنے سسر لابن کی خدمت گزاری میں مشغول ہو گئے۔

☆☆☆

اس معاہدے کے بعد مویشیوں کے بیشتر بچے اسی رنگ میں پیدا ہونے لگے جو معاہدے کی رو سے یعقوبؑ کے حصے میں جاتے تھے۔ چند سالوں میں یعقوبؑ کی مالی حالت اتنی مضبوط ہو گئی کہ انہیں کسی چیز کی کمی نہ رہی۔ نوکر چاکر، مویشیوں کے ریوڑ غرض ہر چیز یعقوبؑ کے پاس آ گئی۔

اس آرام اور آسائش کے باوجود راحیل مطمئن نہیں تھی۔ خوش تو لیاہ بھی نہیں تھی لیکن اپنی ناخوشی کا اظہار بھی نہ ہونے دیتی تھی۔ راحیل نے لیاہ سے کہا۔"لیاہ! میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تو ذرا خلوص کے ساتھ ان پر غور کر اور بتا کہ میں غلطی پر ہوں یا میرے بھائی وغیرہ۔"

لیاہ نے جواب دیا۔"راحیل! تو میرے شوہر کی دوسری بیوی اور میری بہن ہے۔ ہم دونوں میں شدید اختلاف بھی رہا ہے لیکن اس کے باوجود میں تجھے خود سے بہت قریب محسوس کرتی ہوں، بول، تو مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟"

راحیل نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔"کیا تو نے اپنے بھائیوں کی باتیں سنیں؟"

"کیسی باتیں؟" لیاہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "بھائیوں نے کیا باتیں کیں اور کس کے خلاف کیں؟"

راحیل نے جواب دیا۔"آج وہ ہم دونوں کے شوہر کے خلاف کچھ باتیں کر رہے تھے۔"

لیاہ بھونچکا رہ گئی، پوچھا۔"راحیل! تو مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دے، مجھ سے کچھ چھپا نہیں۔"

راحیل نے جواب دیا۔"آج میرے بھائی ہم دونوں کے شوہر کے خلاف یہ کہہ رہے تھے کہ یعقوبؑ نے ہمارے باپ کا سب کچھ لے لیا ہے اور اس کے سارے ٹھاٹ اور اس کی پوری شان و شوکت ہمارے باپ کے مال کی بدولت ہے۔ تو جانتی ہے کہ ہمارے شوہر نے ہمارے باپ کی کیسی خدمت کی ہے، اس کی ان خدمات کے بعد بھائیوں کا یہ کہنا بہت افسوس ناک ہے۔"

لیاہ بھی فکر مند ہو گئی، پوچھا۔"پھر ہمیں کرنا کیا چاہیے؟"

راحیل نے جواب دیا۔"اب ہم دونوں آپس کے اختلافات دور کرتے ہیں اور ان حالات میں ہمارا جو قدم بھی اٹھے گا، اتفاقِ رائے سے اٹھے گا۔"

لیاہ نے کہا۔"میں تیار ہوں۔"

راحیل نے کہا۔"ہم دونوں یعقوبؑ کو آمادہ کریں کہ وہ یہاں سے کنعان واپس جائے، ہم بھی اس کے ساتھ ہی جائیں گے۔ بس یہی ایک فرار کی راہ رہ گئی ہے۔"

لیاہ نے پوچھا۔"یعقوبؑ سے یہ بات تم کہو گی یا میں کہوں؟"

راحیل نے جواب دیا۔"ہم دونوں ہی لیکن الگ الگ وقتوں میں تاکہ یعقوبؑ پر ہماری باتوں کا زیادہ اثر ہو۔"

یعقوبؑ نے بھی اپنے سسر لابن اور لیاہ اور راحیل کے بھائیوں کی بدلی ہوئی نظریں محسوس کر لی تھیں۔ انہوں نے اپنے طور پر ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کنعان واپس چلے جائیں گے۔

چودہ سالہ خدمت گزاری کے بعد چھ سال اور گزر گئے۔ اس طرح یعقوبؑ نے اپنی بیویوں کے باپ لابن کی بیس سال خدمت کی۔

صبح طلوعِ آفتاب سے قبل یعقوبؑ مویشیوں کو لے کر چراگاہ کی طرف چلے گئے۔ چند ساعتوں بعد یعقوبؑ کا ایک غلام لیاہ اور راحیل کے پاس پہنچا اور کہا۔"تم دونوں کو یعقوبؑ نے اپنے مویشیوں کے پاس بلایا ہے۔"

لیاہ اور راحیل ایک ساتھ یعقوبؑ کے پاس پہنچ گئیں۔ یعقوبؑ نے پوچھا۔"اس وقت تمہارا باپ لابن کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟"

لیاہ نے جواب دیا۔"اپنی بھیڑوں میں گھسا ان کی اون اتار رہا ہے۔"

یعقوبؑ نے کہا۔"لیاہ اور راحیل! اس وقت میں تم سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

راحیل نے کہا۔"ہم تیار ہیں۔"

یعقوبؑ نے لیاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"لیاہ! یہ مسئلہ لابن اور میری ذات سے تعلق رکھتا ہے، کیا تو اس پر آمادہ ہے کہ اپنے باپ کے بارے میں تلخ حقیقتیں بھی برداشت کر لے؟"

لیاہ نے جواب دیا۔"ہم دونوں بہنیں ہر طرح آمادہ ہو کر آئی ہیں، تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے آزادی سے کہو۔"

یعقوبؑ نے دونوں کو باری باری دیکھا اور ان سے

نظریں ہٹا کر کہنا شروع کیا۔ "لیاہ اور راخیل ! تم دونوں جانتی ہو کہ میں نے تمہارے باپ کی کیسی خدمت کی ہے لیکن میں نے ہی نہیں، شاید تم دونوں نے بھی یہ محسوس کیا ہوگا کہ تمہارے باپ نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس نے بدرجہ مجبوری چودہ سال کے بعد میری جو اجرت مقرر کی تھی، وہ اسے بہت پہلے دے دینی چاہیے تھی۔ اب میں نے اپنی چھ سالہ محنت اور خدمت کے عوض جو کچھ حاصل کیا ہے تمہارے باپ اور بھائیوں نے اس کے لیے آپس میں یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ میں نے انہیں لوٹ لیا ہے۔ میں ان سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں سے تنگ تھا کہ رات خواب میں، میں نے دیکھا کہ میرا رب مجھے حکم دے رہا ہے کہ یعقوبؑ اپنی بیویاں، مویشی اور اپنا سب کچھ لے کر کنعان واپس جا۔"

اتنا کہہ کر یعقوبؑ نے سکوت اختیار کیا اور دونوں کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔

لیاہ نے پوچھا۔ "تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

یعقوبؑ نے کہا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم دونوں مجھ سے کہاں تک متفق ہو؟"

لیاہ اور راخیل نے ایک ساتھ کہا۔ "اب ہم دونوں کا اپنے باپ کے گھر میں کوئی حصہ یا میراث ہے بھی یا نہیں؟" اور پھر رک کر بولیں۔ "شاید کچھ بھی نہیں۔ ہمارے باپ کے پاس جو کچھ بھی ہے، بھائیوں کا ہے۔ ہم دونوں ہی ایک مدت سے یہ محسوس کر رہی ہیں کہ ہم اپنے ماں باپ کے گھر میں گویا دو اجنبی ہیں۔"

یعقوبؑ نے خوش ہو کر کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ مجھے تم دونوں کو زیادہ سمجھانا نہیں پڑا۔"

لیاہ نے کہا۔ "میرے باپ نے تو ہم دونوں بہنوں کو اپنی سات سات سالہ خدمات کے عوض تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور اجرت میں سے ہم دونوں کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس لیے تمہارے پاس اب جو کچھ بھی ہے وہ ہمارا ہے، ہماری اولاد کا ہے۔"

یعقوبؑ نے ان دونوں سے دریافت کیا۔ "تب پھر میں اپنے خدا کے حکم کی تعمیل کروں؟"

لیاہ اور راخیل نے بیک آواز جواب دیا۔ "ہاں، ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں۔"

یعقوبؑ نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ "تب پھر ادھر آؤ، میرے ساتھ...... میں نے ساری تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔"

وہ دونوں یعقوبؑ کے ساتھ چراگاہ کے اس باڑے میں داخل ہوئیں جہاں دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے آسودہ مویشیوں کو کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ وہاں کا منظر بالکل اس قافلے جیسا تھا جس نے پڑاؤ کو چھوڑنے کی تیاریاں مکمل کرلی ہوں۔ یعقوبؑ نے کہا۔ ”میں تمہارے باپ اور بھائیوں کو بتائے بغیر اسی وقت یہاں سے روانہ ہوجانا چاہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر انہیں میرے ارادے کا علم ہوگیا تو وہ رخنہ ڈالیں گے اور میرے سامان میں سے معلوم نہیں کیا کچھ روک لیں اور نہ لے جانے دیں۔“

لیاہ اور راحیل نے کہا۔ ”ہم دونوں اپنے بچوں کو لے کر اسی وقت تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔“

چنانچہ اسی وقت ان دونوں نے اپنی اولاد، زلفہ، بلہاہ اور کنیزوں غلاموں کو ساتھ لیا اور یعقوبؑ کے ساتھ ہی اپنے باپ کی سرزمین فدان ارم کو چھوڑ دیا۔

لیاہ اور راحیل کے باپ لابن کو بھیڑوں کی اون کترنے میں تین دن لگ گئے۔ جب وہ گھر واپس آیا تو اسے یہاں کا نقشہ ہی عجیب دکھائی دیا۔ وہ تین کوس دور اس چراگاہ میں پہنچا جہاں یعقوبؑ کے مویشی رہتے تھے تو وہاں اب خاک اڑ رہی تھی۔ اس نے کنعان جانے والی راہ پر اپنا گھوڑا ڈال دیا تو آس پاس کے بستی والوں نے اسے بتایا کہ ہاں، ہم نے ایک ایسا قافلہ جنوب میں جاتے دیکھا ہے جس میں انسانوں سے زیادہ مویشی تھے۔

لابن نے واپس آکے اپنے رشتے کے بھائیوں اور بیٹوں کو ساتھ لیا اور تیز رفتار گھوڑوں پر یعقوبؑ کا تعاقب شروع کر دیا۔ لابن سخت مشتعل تھا اور اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ یعقوبؑ کو کوئی سخت سزا دے گا۔

☆☆☆

یعقوبؑ نے ساتویں منزل پر پہنچ کر، کوہِ جلعاد پر ڈیرا ڈالا اور یہاں ذرا سی دیر میں ایک چھوٹی سی بستی قائم ہوگئی۔ لابن ان کا پیچھا کرتا ہوا جب کوہِ جلعاد کے نشیب میں پہنچا تو اس نے بلندی پر ایک ایسی بستی فروکش دیکھی، جس کے سامنے مویشی چتلے، چتکبرے اور کالے تھے تو اس نے پورے یقین سے یہ سمجھ لیا کہ یہ یعقوبؑ ہی کا قافلہ ہے۔ وہ اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ کوہِ جلعاد پر چڑھ گیا اور یعقوبؑ کے خیموں کے مقابل ذرا فاصلے پر اپنے خیمے نصب کرنے لگا۔

راحیل نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بہن لیاہ سے کہا۔ ”لیاہ! کیا یہ نیا قافلہ تجھے اپنے باپ لابن کا نہیں محسوس ہو رہا؟ میں تو اپنے باپ کے ساتھ اپنے بھائیوں کو بھی دیکھ رہی ہوں۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تو ان کے خیموں ہی سے پہچان لیا کہ یہ میرے باپ کے گھر کے خیمے ہیں۔“

ان دونوں کے ساتھ ان کی کنیزیں بھی کھڑی ہوگئیں۔ ان سب نے لابن اور ان کے ساتھیوں کو پہچان لیا تھا۔

یعقوبؑ نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم دونوں کا باپ میرے ساتھ الجھنے آیا ہے؟ اگر ایسا ہے تب بھی میں خوفزدہ نہیں کیونکہ میں نے اپنے رب کے حکم سے یہ سفر شروع کیا تھا اور اس وقت بھی وہ میرا اور میرے متعلقین کا محافظ ہے۔“

یہ لوگ ان نئے آنے والوں کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ انہوں نے لابن کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یعقوبؑ نے چند قدم چل کر لابن کا استقبال کیا۔ اس نے ترچھی نظروں سے یعقوبؑ کو دیکھا اور نہایت درشت لہجے میں کہا۔ ”یعقوبؑ! یہ تو نے کیا کیا کہ چوری سے چلا آیا؟“

یعقوبؑ نے نرمی سے جواب دیا۔ ”کیا اس طرح سرِراہ کھڑے باتیں کرنا مناسب ہے؟ میرے ساتھ میرے خیمے میں چلیے تاکہ وہاں ہم دونوں تفصیلی باتیں کر سکیں۔“

لابن نے کہا۔ ”چل اپنے خیمے میں چل۔ میں یہ باتیں ہر جگہ کرنے کو تیار ہوں۔“

دونوں ایک خیمے میں جا بیٹھے۔ ان کے آس پاس دوسرے لوگ بھی جمع ہوگئے۔ لابن نے انہیں حکم دیا۔ ”میری بیٹی لیاہ اور راحیل کے علاوہ ہر کوئی باہر چلا جائے۔“

اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔

لابن نے اپنی بات پھر دہرائی۔ ”یہ تو نے کیا کیا کہ چوری سے چلا آیا؟ اگر تو فدان ارم سے اتنا ہی اکتا گیا تھا اور تجھے اپنے آبا و اجداد کی زمین اتنی ہی یاد آرہی تھی تو، تو تنہا چلا آتا اور میری بیٹیوں کو وہیں چھوڑ آتا۔“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”لیاہ اور راحیل اب آپ کی بیٹی سے زیادہ میری بیویاں ہیں......“

لابن اور زیادہ گرم ہوگیا، بولا۔ ”مجھے تو اس پر اعتراض ہے کہ تو ان دونوں کو اس طرح کیوں لایا گویا یہ تلوار کے بل پر اسیر کرلی گئی ہوں۔“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”میں انہیں اپنے ساتھ

لانے کا حق رکھنے کے باوجود ان کی مرضی سے لایا ہوں۔ یہ دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں، آپ ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔"

لابن نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا بھی نہیں، کہا۔ "میں تو اس پر برہم ہوں کہ تو چوری سے کیوں آیا؟ تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں، اگر تو مجھے بتا دیتا تو میں ان دونوں کو تیرے ساتھ ڈھول اور بربط کی آوازوں کے ساتھ خوشی خوشی رخصت کرتا۔ تو نے مجھے اپنی بیٹیوں کو الوداعی پیار بھی نہیں کرنے دیا۔"

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ "مجھے اندیشہ تھا کہ......"

لابن نے طیش میں کہا۔ "اندیشہ وندیشہ کچھ نہیں، تو نے بہت غلط کام کیا۔ اب جبکہ میں نے تجھے پالیا ہے، میں اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ تجھے نقصان پہنچاؤں لیکن میں کل رات سے خود کو مجبور محسوس کر رہا ہوں۔"

یعقوبؑ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

لابن نے جواب دیا۔ "میں نے کل رات خواب میں دیکھا، خدا مجھے منع کر رہا ہے کہ میں تجھے کوئی دکھ نہ پہنچاؤں۔"

یعقوبؑ نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور لیاہ اور راحیل کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

لابن نے مزید کہا۔ "اگر تو میرے گھر سے چلا آیا تو خیر کوئی بات نہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تو نے میرے بت کیوں چرائے؟"

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ "میرے چوری سے چلے آنے کا سبب یہ تھا کہ میں خوفزدہ تھا کہ کہیں آپ اپنی بیٹیوں کو مجھ سے چھین نہ لیں۔ رہا بتوں کے چرانے کا معاملہ، تو مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں۔ آپ تلاشی لے لیجیے، جس کے پاس سے آپ کے بت نکلیں گے اس کے لیے میری پیش گوئی یاد رکھیے کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے۔"

لابن نے کہا۔ "میں تمہارے سامان کی تلاشی لوں گا۔"

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ "شوق سے...... اور میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ میرے سامان میں سے جو چیز بھی آپ کی نکلے، آپ اسے اپنے قبضے میں کیجیے۔"

لابن دیر تک یعقوبؑ کے سامان کی تلاشی لیتا رہا اور اس میں سے ایک بھی چیز ایسی نہ نکال سکا جسے وہ اپنی کہہ سکتا۔

یعقوبؑ نے تلخی سے پوچھا۔ "میرے سامان میں سے آپ کو کوئی اپنی چیز ملی؟"

لابن نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

یعقوبؑ کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "ابھی تک تو میں خاموش تھا لیکن اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر میرا وہ کیا قصور تھا جس کی وجہ سے آپ نے میرا پیچھا کیا، مجھ سے تلخ کلامی کی اور میرے سامان کی تلاشی لی؟ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے میرے سامان میں سے اپنی کوئی چیز ڈھونڈ نکالی ہے؟ اگر ایسی کوئی چیز آپ کو ملی ہے تو اسے اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے سامنے رکھیے تاکہ وہ انصاف کریں۔" پھر افسوس ناک لہجے میں کہا۔ "میں نے بیس سال تک آپ کی خدمت کی ہے اور آپ ہی کے بقول، میں آپ کے لیے بہت ہی بابرکت ثابت ہوا۔ میں نے گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی جھیلی اور آپ کو نقصانات سے بچاتا رہا۔ کیا میری ان خدمات کا یہی صلہ ہے جو آپ دے رہے ہیں؟"

لابن نے جواب دیا۔ "اچھا اب بس بھی کر۔ یہ جو کچھ بھی تیرے پاس نظر آ رہا ہے، سب میرا ہے لیکن اس کے باوجود میں تجھ سے ایک عہد کرنا چاہتا ہوں۔"

یعقوبؑ نے پوچھا۔ "کیسا عہد؟"

لابن نے جواب دیا۔ "پہلے عہد کا پتھر تو کھڑا کر، پھر عہد کی تفصیل بھی بتا دوں گا۔"

یعقوبؑ نے کوہ جلعاد کا ایک پتھر لے کر اسے سیدھا سیدھا کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی بہت سارے پتھر اس کے گرد جمع کر دیے، پھر اس ڈھیری کے گرد بیٹھ کر سب نے کھانا کھایا۔

آخر میں لابن کھڑا ہو گیا اور اس نے یعقوبؑ سے کہنا شروع کیا۔ "یعقوبؑ! یہ پتھر میرے اور تیرے درمیان اس عہدنامے کے گواہ رہیں گے جو ہم دونوں ایک دوسرے سے کر رہے ہیں۔"

یعقوبؑ نے کہا۔ "عہدنامے کے الفاظ دہرائیے تاکہ اس کی تفصیل معلوم ہو؟"

لابن نے کہا۔ "یعقوبؑ! ہم دونوں یہاں سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوں گے، تو ہمارا خدا ہماری نگرانی کرے گا۔ یعقوبؑ! تو قسم کھا کر یقین دلا کہ تو میری بیٹیوں کو دکھ نہیں دے گا اور ان کے علاوہ اب اور شادیاں نہیں کرے گا۔"

یعقوبؑ نے لابن کی خواہش کے مطابق قسم کھا کر عہد کیا۔

لابن نے مزید کہا۔ ''اور میں عہد کرتا ہوں کہ اس ڈھیری کے دوسری طرف میں تجھے نقصان پہنچانے نہیں آؤں گا۔''

یعقوبؑ نے کہا۔ ''اور میں بھی آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس حد کے اس پار کبھی آپ کو نقصان پہنچانے نہیں آؤں گا۔''

اس عہد و پیمان کے بعد یعقوبؑ نے سب کو کھانا کھلایا۔ وہ رات ان سب نے پہاڑ پر ہی کاٹی۔ لابن علی الصباح اٹھا اور اپنی بیٹیوں کو الوداعی بوسہ دیا اور دعائیں دیتا ہوا فدان ارم واپس چلا گیا۔

☆☆☆

لابن کے چلے جانے کے بعد لیاہ اور راحیل بہت اداس ہوگئیں۔ اس رات یعقوبؑ نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ ایک نوری شعاع یعقوبؑ کو مطلع کر رہی تھی۔ اس نے یعقوبؑ سے پوچھا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''یعقوب۔''

یعقوبؑ کو مطلع کیا گیا۔ ''لیکن اب تو یعقوب نہیں اب تو اسرائیل (خداوند ساتھ چلتا ہے یا خداوند قوت بخشتا ہے) ہے۔ میں تجھے برومند کرتا ہوں، تجھ سے ایک قوم تو کیا قوموں کے جتھے پیدا ہوں گے اور بادشاہ تیرے صلب سے ہوں گے۔''

جب یعقوبؑ نے لیاہ اور راحیل کو اس بشارت سے مطلع کیا تو لیاہ تو بہت خوش ہوئی لیکن راحیل اداس ہی رہی۔

یعقوبؑ نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ ''کیا بات ہے راحیل! تو پریشان کیوں ہے اور تیرا منہ کیوں بن رہا ہے؟''

راحیل نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کراہتے ہوئے پوچھا۔ ''دریائے فرات کتنی دور ہے؟ کیا یہ سراب جیسا منظر دریائے فرات ہی کا ہے؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ دریائے فرات ہمارے سامنے ہی بہہ رہا ہے۔''

راحیل نے پوچھا۔ ''ہماری دایہ کدھر ہے؟ اسے بلاؤ۔''

یعقوبؑ نے کہا۔ ''اب میں سمجھا۔''

اس کے بعد دایہ بلالی گئی۔ اس نے خوب اچھی طرح دیکھ بھال کے بعد راحیل کو مطلع کیا۔ ''میری آقا زادی! آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا آپ کو دوسرے پھل سے بھی نوازرہا ہے اور یہ پھل بھی لڑکا ہی ہے۔''

اس غریب الوطنی میں لیاہ اپنی بہن کو بہت چاہنے لگی تھی، پوچھا۔ ''راحیل! اب تو کیسی ہے؟''

راحیل نے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ جب میں اس درد سے نجات پاؤں گی تو میں ہوش میں بھی ہوں گی یا نہیں، اگر میں بے ہوش ہو جاؤں اور لڑکا پیدا ہو تو لیاہ! تم اس کا نام بن اونی رکھنا۔''

لیاہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ''بہت اچھا۔ ایسا ہی ہوگا تو فکر نہ کر۔''

راحیل نے دھندلائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا بیٹا یوسف کہاں ہے؟''

یعقوبؑ نے یوسفؑ کو راحیل کے روبرو کھڑا کردیا۔

راحیل نے یوسفؑ کو پے در پے کئی بوسے دیے، پھر پوچھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ''اس جگہ سے قریب ہی بیت لحم ہے، ویسے اس جگہ کا کوئی نام نہیں۔''

راحیل کی تکلیف میں اضافہ ہوگیا۔ دایہ نے بڑی کوشش کی کہ راحیل اور اس کے نومولود کو بچا لیا جائے لیکن وہ راحیل کو بچانے میں ناکام اور نومولود کو بچانے میں کامیاب ہوگئی۔

لیاہ نے اپنی بہن کا خوب خوب ماتم کیا۔ بلبلا کر زاروقطار روئی۔ یوسف کا دل پھٹنے لگا۔ یعقوبؑ نے باچشم نم لوگوں کو صبر کی تلقین کی۔

یعقوبؑ نے بیت لحم سے ذرا فاصلے پر راحیل کو زمین کے حوالے کر کے، اس پر ایک ستون کھڑا کردیا۔ دریائے فرات ان کے سامنے بہہ رہا تھا اور انہیں یہیں سے کنعان کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی اور ان کے تصور کی آنکھیں ماضی کے ماہ و سال کے ایک دریچے سے کنوئیں پر عورتوں کے ہجوم میں راحیل کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور کنعان کا غریب الدیار روتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑے بوسہ لے رہا تھا۔

وقت اور اتفاق کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی تھی کہ پہلی ملاقات پر بھی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور دائمی رخصت نے بھی دونوں آنکھوں کو تر کردیا تھا۔

ماخذات

قرآن پاک۔ عہد نامہ قدیم و جدید۔ کتاب الھدیٰ، یعقوب حسن۔ انبیائے قرآن، محمد جمیل احمد۔ قصص القرآن، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔

قیمت

کاشف زبیر

قدرت کا نظام ہے توبڑا پیچیدہ مگر... منصفانہ اصولوں پر رائج ہے... کبھی ببول کے بیج سے گلاب کا پودا نہیں پھوٹ سکتا۔ اپنی غرض میں اندھی ہوکر اس نے بھی جو کچھ حاصل کرنا چاہا اس کی وہی قیمت ادا کرنا تھی جس کا اس نے عہد کیا تھا... اب ادائیگی آسان ہو یا مشکل، کیے گئے عہد کا تو پاس بہرحال رکھنا تھا ورنہ اونچ نیچ کی صورت میں معافی کا کوئی امکان نہ تھا۔ منصفانہ اصول کے مطابق اس سے بھی وہی قیمت وصول کی گئی جس سے بچنے کی خاطر اس نے اپنی جان کی بھی پروانہ کی مگر جان کی قیمت پھر بھی جان ہی رہی۔

سفاکانہ طرزِعمل اختیار کرنے والی ایک خودغرض صنفِ نازک کا قصہ



عمیر دو مہینے بعد گھر آیا تھا مگر اسے لگ رہا تھا جیسے وہ عرصے بعد گھر آیا ہو۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی وہ ابھی چھ سال کا تھا۔ پہلی کلاس میں تھا اور نانی کے پاس ہی رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بڑے بہن بھائی دارالحکومت سے کچھ فاصلے پر واقع ہل اسٹیشن پر اپنے ہوٹل کے ساتھ بنے گھر میں رہتے تھے۔ عمیر کے نانا سول سرونٹ تھے اور صبا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ کیونکہ اس کا ایک بڑا بھائی عین نوجوانی میں بیس سال کی عمر میں اچانک ہی مر گیا تھا۔ صبا اس سے پانچ

سال چھوٹی اور اس وقت میٹرک میں تھی۔ اس نے گریجویشن کے بعد ہوٹل مینجمنٹ کا کورس کیا اور اسی کورس کے دوران اس کی ملاقات سمیر سے ہوئی۔ جلد یہ ملاقات پسند میں بدل گئی اور عمیر کے نانا، نانی نے اس رشتے کو پسند کرلیا کیونکہ سمیر اچھے خاندان کا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا تھا۔ وہ ایم بی اے کر چکا تھا اور اب ہوٹل لائن میں آنے کے لیے یہ کورس کر رہا تھا۔ شادی سے پہلے وہ جاب کرتا تھا مگر شادی کے بعد اس نے اور صبا نے مل کر اپنا ہوٹل کھولنے کا ارادہ کیا۔ کچھ رقم ان کے پاس تھی۔ ہل اسٹیشن پر ہوٹل قائم کیا۔ اس وقت صرف عمیر کا بڑا بھائی شامیر تھا۔

وہ شامیر کو نانا، نانی کے پاس چھوڑ گئے۔ شامیر کے دو سال بعد سونیا ہوئی۔ عمیر سونیا سے ڈھائی سال چھوٹا تھا۔ صبا کے تمام بچے بچپن میں نانا نانی کے پاس ہی رہتے تھے۔ البتہ جب عمیر ان کے پاس آیا تو اس کے نانا کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت وہ ڈھائی سال کا تھا۔ ان کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا مگر بہت خوب صورت اور سجا ہوا تھا۔ مکان کے چاروں طرف کیاریوں میں پھول دار پودے اور بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ مکان جس گلی میں تھا، اس کے ساتھ ہی جنگل شروع ہو جاتا تھا مگر یہ قدرتی جنگل نہیں تھا بلکہ دارالحکومت کے مختلف سیکٹرز کے ساتھ لگائے جانے والے جنگلوں میں سے ایک تھا۔ عمیر اکثر اپنے مکان کی چھت سے اس جنگل کو دیکھتا تھا مگر اسے کبھی جنگل میں جانے کا موقع نہیں ملا کیونکہ نانی جنگل میں جانے کی سخت مخالف تھیں۔

اگرچہ نانی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں اور اسے باہر بھی لے جاتیں۔ وہ نانی سے اس قدر قریب تھا جب والدین نے اسے لے جانا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا لہٰذا اسے یہیں ایک اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ مگر اب صبا اور سمیر اسے اپنے پاس لے جانا چاہتے تھے مگر وہ نانی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا اس نے نانی سے کہا۔ ”میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں، مجھے یہیں اسکول میں پڑھنے دیں۔“

”نہیں میری جان۔“ نانی نے اسے پیار کیا۔ ”اب تمہیں جانا ہوگا۔“

”کیوں؟“ اس نے پاؤں پٹخ کر پوچھا۔

”بس میرے بچے، اب وقت آ گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نانی فکرمند نظر آنے لگیں۔ انہوں نے جیسے خود سے کہا۔ ”ہاں، اب وقت قریب آ رہا ہے۔“

موسم سرما کا آغاز ہو گیا تھا۔ خزاں رسیدہ پتے جھڑ رہے تھے۔ اچانک بادل گھر کر آئے اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ نانی شام سے بہت خوف زدہ اور پریشان تھیں۔ انہوں نے گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند کر لیے۔ عمیر ان سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ نانی کیا بات ہے مگر وہ جواب دینے کے بجائے اسے لے کر کمرے میں آ گئیں۔ رات کا کھانا بھی انہوں نے کمرے میں کھایا۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش جاری تھی۔ کھانے کے بعد عمیر بستر پر لیٹ گیا۔ نانی اپنی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ رات کسی وقت عمیر کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ نانی کرسی پر ساکت بیٹھی ہیں۔ وہ بستر سے اترا اور ان کے پاس آ کر انہیں ہلایا تو اچانک ہی ان کے منہ سے تیز چیخ نکلی اور جسم یوں ہلنے لگا جیسے زلزلے کی زد میں آیا ہوا ہو۔ عمیر ڈر کر پیچھے ہٹا۔ اس نے کہا۔ ”نانو...... آپ کو کیا ہوا؟“

مگر جب نانی نے اس کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں بالکل سیاہ ہو رہی تھیں۔ عمیر ڈر کر بھاگا اور لاؤنج میں رکھا فون اٹھا کر صبا کو کال کی۔ اس کا نمبر اسپیڈ ڈائل میں تھا اور اس نے خاص طور سے عمیر کو سکھایا تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو وہ اسے کیسے کال کر سکتا ہے۔ صبا نے سوتے سے اٹھ کر کال ریسیو کی۔ وہ فکرمند ہو گئی۔ ”کیا ہوا عمیر؟“

وہ روتے ہوئے اسے نانی کی طبیعت کی خرابی کا بتانے لگا۔ صبا نے اسی وقت اپنے کزن عبداللہ کو کال کی اور اسے گھر جانے کو کہا۔ عبداللہ، صبا کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ نزدیک ہی رہتا تھا اس لیے دس منٹ میں پہنچ گیا۔ اس وقت تک عمیر ڈر کے مارے کمرے کی طرف نہیں گیا۔ کال بیل بجی تو اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ عبداللہ کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے اندر جا کر بے ہوش نانی کو چیک کیا اور انہیں اسپتال لے جانے کو کہا۔ صبح کے قریب جب اسپتال میں نانی کے مختلف ٹیسٹ ہو رہے تھے تو صبا اور سمیر بھی پہنچ گئے۔ نانی ہوش میں آ گئی تھیں مگر وہ یک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھیں۔ نہ تو کسی کی بات کا جواب دے رہی تھیں اور نہ ہی کوئی دوسرا ردِعمل ظاہر ہوتا تھا۔ وہ تین دن اسپتال میں رہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے انہیں گھر لے جانے کی اجازت دے دی وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ کسی وجہ سے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو گئی تھیں اور ان کی کیفیت نوزائیدہ بچے جیسی تھی جس کی ساری دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ انہوں نے تجویز دی کہ انہیں کسی ایسے ادارے میں داخل کرا دیا جائے جہاں ذہنی طور پر مفلوج افراد کی دیکھ بھال ہوتی ہو۔ صبا اور سمیر انہیں ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے اس لیے انہوں نے انہیں ایک

ادارے میں داخل کرا دیا جو ایسے معمر افراد کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں تربیت یافتہ عملہ تھا جو ہر طرح سے دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ ماحول اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ اس لیے صبا نے یہاں کی بھاری فیس بھی گوارا کر لی۔ ان دنوں وہ ہوٹل کے توسیعی منصوبے پر کام کر رہے تھے اور اس کی تکمیل تک سیزن میں صبا کا وہاں رہنا ضروری تھا۔ وہ بچت کر رہے تھے اور زیادہ ملازمین نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسکول سے آنے کے بعد شامیر بھی بہت سے کاموں میں صبا کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

عمیر بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ صبا نے گھر بند کر دیا تھا۔ جب عمیر آخری بار سامان لینے آیا تو وہ رو رہا تھا۔ وہ بار بار ماں سے پوچھتا کہ نانو ٹھیک ہو جائیں گی۔ صبا اسے تسلی دیتی کہ جلد نانو ٹھیک ہو جائیں گی اور وہ ان کے ساتھ رہ سکے گا مگر صبا حقیقت جانتی تھی کہ ایسا شاید کبھی نہ ہو سکے کیونکہ ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کی ذہنی کیفیت شاید ان کے مرتے دم تک جاری رہے۔ عمیر کا یہ سال ضائع جاتا مگر صبا نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے خود پڑھائے گی اور اگلے سال اسے دوسری جماعت میں جانے کے قابل کر دے گی۔ سرما میں جب شامیر اور سونیا کے اسکول تین مہینے کے لیے بند ہوتے اور ہوٹل کا بزنس بھی نہ ہونے کے برابر رہ جاتا تو صبا بچوں سمیت ماں کے پاس آجاتی تھی۔ ان تین مہینوں میں گھر میں بہت رونق ہوتی تھی مگر اس بار جب وہ سردیوں میں گھر آئے تو سب کے ہوتے ہوئے بھی رونق نہیں تھی۔ صبا نے دو مہینے کے لیے ماں کو ادارے میں داخل کرایا تھا۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ جب وہ اور بچے یہاں آئیں گے تو وہ ماں کو گھر لے آئے گی۔

ادارے کے عملے نے اسے تمام احتیاطی تدابیر اور دوائیں بتا دی تھیں جو انہیں روزانہ کی بنیاد پر یا دورہ پڑنے کی صورت میں دینا ہوتی تھیں۔ صبا نے فرسٹ ایڈ کورس کیا ہوا تھا۔ نانی کو ڈائپر باندھا جاتا تھا کیونکہ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ بہ ظاہر ہوش میں ہونے کے باوجود وہ ساکت پڑی رہتی تھیں۔ صبا ایمبولینس میں ماں کو گھر لے کر آئی۔ دو مہینے سے بند ہونے کی وجہ سے گھر گرد سے اٹا ہوا تھا۔ صبا، ماں پر بچوں کی ڈیوٹی لگا کر خود صفائی کرنے میں لگ گئی۔ اس نے سب سے پہلے ماں کا کمرا صاف کیا۔ انہیں ان کے صاف ستھرے بستر پر لٹا کر صبا گھر کے دوسرے حصوں کی صفائی میں لگ گئی۔ عمیر نانی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ چہرہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا مگر اس وقت وہ اسے اجنبی سا لگ رہا تھا۔ نانی کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ یک ٹک چھت کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ عمیر نے نزدیک آ کر ان کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔ اچانک نانی نے سر گھما کر اسے دیکھا اور بولیں۔

"عمیر تو یہاں کیوں آیا ہے، یہاں سے چلا جا...... وہ آنے والا ہے۔"

عمیر ایک لمحے کو ڈرا پھر اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ "کون نانو؟"

"عمیر۔" باہر سے صبا کی آواز آئی تو نانی نے سر سیدھا کر لیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے نہ تو اس کی طرف دیکھا ہو اور نہ ہی کوئی بات کی ہو۔ عمیر باہر آیا۔ وہ ماں کو بتانے کے لیے بے تاب تھا کہ نانی نے ابھی اس سے بات کی ہے مگر صبا مصروف تھی۔ اس نے کہا۔ "تم کھانا کھا لو، ابھی مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

"ماما! نانو نے مجھ سے بات کی ہے۔"

شامیر ہنسا۔ "تمہیں خواب آیا ہوگا۔"

"جاگتے میں۔" سونیا نے بھائی کی تائید کی۔ وہ دونوں ساتھ رہتے تھے اس لیے ان میں ذہنی ہم آہنگی تھی اور عمیر ان کے ساتھ اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ وہ اس سے الگ انداز میں پیش آتے تھے۔

"عمیر پلیز! کھانا کھا لو۔" صبا نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے عمیر کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ عمیر نے دیکھا کہ ماں اس کی بات سننے اور ماننے کو تیار نہیں ہے تو وہ کھانے کی میز پر چلا آیا جہاں شامیر اور سونیا موجود تھے۔ صبا نے ان کے لیے سینڈوچز بنائے تھے۔ انہیں کھاتا چھوڑ کر صبا ماں کو کھانا کھلانے چلی گئی۔ عمیر نے بے دلی سے سینڈوچز کھائے اور پھر نانی کے کمرے میں آ گیا۔ صبا نے انہیں کھانا کھلا دیا تھا اور اب خود کھانے گئی تھی۔ عمیر کرسی گھسیٹ کر نانی کے پاس بیٹھ گیا۔ شامیر اور سونیا بھی وہیں تھے اور وہ برابر میں دراز پر رکھی ان کی دوائیاں اٹھا کر چیک کر رہے تھے اور آپس میں مذاق کرنے کے انداز میں بات کر رہے تھے کیونکہ وہ عرصے سے نانی کے ساتھ نہیں رہے تھے اس لیے ان کے لیے وہ فکر اور محبت نہیں تھی جو عمیر میں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں تاکہ وہ نانی سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ وہ متجسس تھا کہ نانی کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ آنے والا ہے۔ خدا خدا کر کے شامیر اور سونیا کمرے سے نکلے تو عمیر جلدی سے نانی کے پاس آیا۔

"نانو! آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

مگر نانی ساکت رہیں۔ ان کی کھلی آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں اور چہرہ سپاٹ تھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمیر نے پھر پوچھا اور اس بار بھی جواب نہیں ملا تو وہ مایوس ہو کر واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد شامیر نے اندر جھانکا۔ "ہم باہر جا رہے ہیں، چلو گے؟"

عمیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں جا رہا، میں نانو کے پاس ہوں۔"

"کیا فائدہ۔" سونیا بھی آگئی۔ "ان کو پتا تھوڑی ہے کہ کوئی ان کے پاس ہے۔"

"ان کو پتا ہے۔" عمیر نے یقین سے کہا۔ "نانو نے مجھ سے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ وہ کسی کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ آنے والا ہے۔"

شامیر اندر آیا۔ "تمہیں لگا ہوگا۔ نانو تو ہوش میں ہی نہیں ہیں، وہ بات کیسے کرسکتی ہیں؟"

"یہ چھوڑ رہا ہے۔" سونیا ہنسی۔

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا نانو نے کہا تھا۔" اسے غصہ آگیا۔

"اچھا تم بیٹھو ہم جا رہے ہیں۔"

سونیا بولی۔ "ہم جنگل میں بھی جائیں گے۔"

"نانو وہاں جانے سے منع کرتی ہیں۔" عمیر نے خبردار کیا۔ "وہ کہتی ہیں، وہاں کوئی بری چیز ہے۔"

"تم کبھی گئے ہو؟" سونیا نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تب تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"نانو نے کہا تھا...... اور نانو غلط نہیں کہتی ہیں۔" عمیر کی بات پر وہ دونوں ہنسے اور پھر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ عمیر نے پہلے سوچا کہ ماں سے کہے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ صبا مصروف تھی اور ایسے میں اسے چھیڑا جاتا تو اسے غصہ آجاتا۔ اس لیے عمیر صبر کر کے رہ گیا۔

وہ بہت صبح سویرے ہل اسٹیشن سے روانہ ہوئے تھے اور جلدی اٹھنے کی وجہ سے عمیر تھکن اور نیند محسوس کر رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ کچھ دیر بعد صبا کمرے میں آئی تو اس نے عمیر کو سوتا پا کر محبت سے اسے دیکھا۔ اس نے جھک کر اسے چوما۔ "نانو کا دیوانہ۔"

صبا نے اسے گود میں اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے آئی۔ یہ تین بیڈ رومز کا گھر تھا۔ اس میں سے ایک مستقل صبا کے لیے مخصوص تھا۔ وہ جب آتی تو یہیں رکتی تھی۔ تیسرا... بیڈ روم بچوں کے استعمال میں آتا تھا۔ تین بیڈ رومز کے علاوہ اس میں ایک بڑی سی نشست گاہ تھی اور لاؤنج بھی جس کے ساتھ ہی کچن بھی تھا۔ شروع میں جب یہ گھر صبا کے والد کو الاٹ ہوا تھا تو اس میں صرف تین کمرے تھے اور وہ بھی پرانی طرز کے۔ پلاٹ سات مرلے کا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ صحن پر مشتمل تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اسے بڑھاتے گئے اور امان کی موت سے کچھ پہلے ہی یہ مکمل ہوا تھا۔ صبا اور اس سے پہلے امان اسی گھر میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔ صبا کو امان کی موت کا دن یاد تھا جب ان کے گھر میں قیامت برپا تھی۔ جوان اولاد کی موت ماں باپ کے لیے قیامت ہی ہوتی ہے۔ صبا نے اس کے بعد اپنے باپ کو بہت ہی کم مسکراتے دیکھا تھا اور ایک دن امان کے غم میں وہ گھلتے گھلتے دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔

باپ کا خیال آیا تو صبا کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اسے شامیر اور سونیا کا خیال آیا۔ وہ باہر گئے تھے اور سردی کے دن چھوٹے اور جلد تاریک ہو جانے والے تھے۔ وہ گیٹ تک آئی اور باہر جھانکا تو وہ اسے نظر نہیں آئے۔ وہ باہر جانے کا سوچ رہی تھی کہ اندر سے آنکھیں ملتا ہوا عمیر آیا۔ صبا نے اس سے پوچھا۔ "شامیر اور سونیا کہاں گئے ہیں؟"

"ماما! وہ جنگل میں گئے ہیں۔"

صبا پریشان ہو گئی۔ اگرچہ یہ روایتی خطرناک جنگل نہیں تھا مگر وہاں ویرانی تو تھی۔ عمیر کو گیٹ کے پاس رہنے کا کہہ کر وہ باہر آئی اور جنگل کے کنارے سے ہی انہیں آواز دی۔ "شامیر...... سونیا! کہاں ہو تم؟"

دوسری بار آواز دینے پر وہ اندر سے برآمد ہوئے۔ دونوں بہت خوش اور شوخ ہو رہے تھے۔ صبا نے انہیں ڈانٹا کہ وہ جنگل میں کیوں گئے تھے۔ وہ ماں کی ڈانٹ کو خاطر میں لائے بغیر ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے اس کے ساتھ چلے آئے۔ گھر آ کر صبا نے انہیں اور ڈانٹا تو عمیر نے کہا۔ "ماما! نانو جنگل میں جانے سے منع کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کبھی جنگل میں جانے نہیں دیا۔"

"نانو کا چمچہ۔" سونیا نے آہستہ سے کہا مگر عمیر نے سن لیا۔ اس نے ماں سے شکایت کی۔

"ماما! سونیا مجھے چمچہ کہہ رہی ہے۔"

"سونیا! بری بات ہے۔ ایسا کسی کو نہیں کہتے اور یہ

آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔"

"یہ میرا بھائی نہیں ہے۔" سونیا نے چڑانے کے انداز میں کہا۔ "میرا بھائی صرف شامیر بھائی ہے۔"

"سونیا......" صبا نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا تو سونیا جلدی سے کان پکڑ کر مسکرانے لگی۔ اس کے چہرے پر ایسی معصومانہ شرارت تھی کہ صبا بھی مسکرانے لگی۔ "ناٹی گرل۔"

صبا نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ عمیر اپنے بہن بھائی سے دور ہے اور وہ بھی اسے زیادہ لفٹ نہیں کراتے ہیں۔ اس لیے اس نے عمیر سے کہا۔ "اب آپ نانو کے پاس نہیں جائیں گے، سونیا اور شامیر کے ساتھ کھیلیں گے۔"

"ماما! اسے کھیلنا نہیں آتا ہے۔"

"مجھے لوڈو اور کیرم آتا ہے۔" عمیر نے فخر سے کہا۔ "میں نانو کے ساتھ کھیلتا تھا اور انہیں ہرا بھی دیتا تھا۔"

"وہ نانو ہیں۔" شامیر نے اسے گھورا۔ "مجھے ہرا کر دکھاؤ۔"

لاؤنج میں کیرم بورڈ موجود تھا۔ وہ بورڈ پر آگئے۔ شامیر بھی اچھا کھیلتا تھا مگر چھ سالہ عمیر زیادہ ماہر نکلا اور اس نے شامیر کو لگاتار دو گیم ہرا دیے۔ وہ حیران رہ گیا۔ شامیر جھنجلایا تھا مگر سونیا نے عمیر کی سائڈ لی۔ "یہ تم سے اچھا کھیلتا ہے اس لیے جیت گیا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔"

"میں رو نہیں رہا ہوں۔" شامیر غصے سے بولا۔

"تو اور کیسے روتے ہیں۔" سونیا ہنسی اور پھر شامیر سے بچنے کے لیے ماں کے پاس بھاگی۔ شامیر اٹھا تھا مگر پھر بیٹھ گیا اور اس نے عمیر سے کہا۔

"تم کھیلنا جانتے ہو۔"

"میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔" عمیر نے آہستہ سے کہا۔ "یہ بتاؤ تم لوگوں نے جنگل میں کچھ دیکھا؟"

شامیر نے ماں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "بتاتا ہوں لیکن یہاں نہیں۔"

صبا کچن میں ڈنر تیار کر رہی تھی۔ وہ تھک گئی تھی مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ اپنے بچوں کو دوسرے وقت بھی سینڈوچز کھلائے۔ وہ افغانی پلاؤ بنا رہی تھی۔ ہوٹل میں یہ ڈش اور چند اور ڈشیں وہ خود تیار کرتی تھی۔ اب تک بیشتر کام وہ اور سمیر کرتے رہے تھے۔ سیزن کے پیک دنوں میں صبا نے لانڈری تک کی ہوئی تھی۔ اس محنت اور بچت کا صلہ انہیں یہ ملتا کہ ان کا بارہ کمروں والا ہوٹل توسیع کے بعد بتیس کمروں کا ہوجاتا اور انہوں نے ڈائننگ والا حصہ بھی بڑھا کر اسے باقاعدہ ریستوران کی صورت دے دی تھی۔ اب وہاں تینوں وقت کا کھانا اور صبح چھ سے رات بارہ بجے تک ریفریشمنٹ دستیاب ہوتی۔ توسیع کا کام اس سرما میں مکمل ہو جاتا۔ اب ان کے پاس اتنی گنجائش تھی کہ زیادہ اسٹاف رکھ سکتے تھے۔

اب تک صبا نے سمیر کا پورا ساتھ دیا تھا مگر بچے بڑے ہو رہے تھے اور ہل اسٹیشن کے آس پاس زیادہ اچھے اسکول نہیں تھے اس لیے اس نے سمیر سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب دارالحکومت میں رہے گی اور بچوں کو یہیں اسکول میں داخل کرائے گی۔ ہل اسٹیشن ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا اس لیے وہ ہر ہفتے ہی ایک دوسرے کے پاس آجا سکتے تھے۔ وہ یہیں رہتی تو وہاں کی دیکھ بھال بھی خود کرسکتی تھی۔ درحقیقت اس کی یہاں منتقلی کے فیصلے میں ماں کی بیماری کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ ماں سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کی خدمت کرنا چاہتی تھی مگر فی الحال انہوں نے بچوں کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد اسے اس وقت تک کے لیے واپس جانا پڑتا جب تک بچوں کے پیپرز نہیں ہوجاتے اور اس دوران میں وہ ماں کو دوبارہ دیکھ بھال کرنے والے ادارے میں چھوڑ کر جاتی۔ بچوں کے پیپرز کے بعد وہ مستقل یہاں آسکتی تھی۔

صبا ورکنگ وومین تھی اور وہ سارے کام کرسکتی تھی۔ اس کے پاس چھوٹی کورے کار تھی اور وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔ ہوٹل کے بہت سے کاموں کے ساتھ بچوں کو اسکول سے لانے لے جانے کا کام بھی وہی کرتی تھی۔ اس لیے اکیلے رہ کر گھر اور بچوں کی ذمے داریاں پوری کرنا اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے سمیر کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ سب کرلے گی اور وہ اپنی ساری توجہ ہوٹل پر لگائے۔ ڈنر تیار کر کے اس نے بچوں کو آواز دی تو وہ اوپر سے دوڑے آئے۔ سردی سے ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ شام ہوتے ہی درجۂ حرارت بہت تیزی سے گرتا تھا۔ انہیں اندر لانے کے بعد صبا نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کرلیے تھے۔ اس نے حیرت سے کہا۔ "تم اوپر گئے تھے اور وہ بھی اتنی سردی میں؟"

"ہاں ماما، شامیر ہمیں......" سونیا بتانے جا رہی تھی کہ شامیر نے اسے کہنی ماری اور جلدی سے بولا۔

"ماما! میں انہیں ائرپورٹ پر اترنے والے طیاروں کی روشنیاں دکھا رہا تھا۔"

"اب شام کے وقت باہر مت جانا۔ یہاں بھی بہت سردی ہوتی ہے۔"

"لیکن ماما وہاں جیسی تو نہیں ہوتی ہے اور اسنو بھی نہیں گرتی۔" سونیا نے شکوہ کیا۔ شامیر نے اسے اصل بات

بتانے سے روک دیا تھا۔ جب وہ جنگل میں گئے تھے تو وہاں انہوں نے ایک بہت پرانی اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی دیکھی تھی۔ اس میں بہت بو تھی اور وہاں دیواروں پر عجیب عجیب سی چیزیں لٹکی ہوئی تھیں جیسے کپڑے کی بنی گڑیائیں اور مٹی کے بنے ہوئے پتلے، ہڈیاں اور پرندوں کے پر۔ وہاں ایک ڈھانچا ہو جانے والا سانپ بھی تھا۔ شامیر نے عمیر کو سب بتایا وہ بھی تجسس تھا۔ شامیر نے اس سے اگلے دن وہاں چلنے کو کہا مگر عمیر راضی نہیں تھا۔ اسے اب بھی خیال تھا کہ نانی نے وہاں جانے سے منع کیا تھا۔ سونیا اور شامیر نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ ماما کو یہ بات نہیں بتانی ہے ورنہ ان کے باہر جانے پر بھی پابندی لگ سکتی تھی۔ عمیر نے ان سے کہا۔ ”نانو ٹھیک کہتی تھیں کہ جنگل میں کوئی بری چیز ہے۔“

”پاگل، وہ صرف ایک جھونپڑی ہے۔“ شامیر نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

”وہاں کوئی نہیں تھا نہ اچھی چیز اور نہ بری چیز۔“ سونیا نے یقین سے کہا۔ ”مجھے بہت مزہ آیا، میں پھر جاؤں گی۔“

ڈنر کی میز پر وہ خاموش رہے۔ کھانے کے بعد صبا نے برتن سمیٹتے ہوئے ان سے کہا۔ ”آپ سونے کی تیاری کریں۔“

”ماما! ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔“ شامیر نے احتجاج کیا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمیں امان ماموں کی تصویریں دکھائیں گی۔“

”او کے آپ سب چینج کر کے برش کرو اور بستر پر لیٹو میں البم لے کر آتی ہوں۔“

وہ خوش ہو گئے اور کمرے کی طرف بھاگے۔ صبا نے ان کی الماری سیٹ کر دی تھی جس میں ان سب کے نائٹ سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے کپڑے نکالے اور باری باری باتھ روم جا کر تبدیل کیے۔ برش کیا اور پھر بستر پر لیٹ کر ماں کا انتظار کرنے لگے۔ شامیر اور سونیا پرجوش ہو رہے تھے۔ البتہ عمیر سکون سے لیٹا ہوا تھا کیونکہ اس نے یہ البمز بہت بار دیکھے ہوئے تھے۔ شامیر اور سونیا چونکہ کم آتے تھے اور انہیں ایک دو بار ہی ان البمز کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ کچھ دیر بعد صبا اپنے لیے چائے کا مگ اور تین بڑے البمز لے کر آ گئی اور وہ تینوں ماں کے گرد جمع ہو گئے۔ صبا نے خبردار کیا۔ ”سکون سے دیکھنا میری چائے نہ گر جائے۔“

صبا نے پہلے البم سے شروع کیا جب صرف امان تھا اور نانا نانی اس وقت جوان تھے۔ پہلے البم میں ان کی شادی کی تصویریں بھی تھیں۔ ان تصویروں میں صرف وہی دونوں تھے۔ اچانک عمیر نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”ماما! نانو اور نانا کے پیچھے یہ کیا ہے؟“

صبا تیزی میں صفحے پلٹ رہی تھی اور پھر اس نے یہ تصویریں کئی بار کی دیکھی ہوئی تھیں اس لیے اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس نے رک کر دیکھا، یہ ان دنوں کی تصویر تھی جب امان پیدا ہونے والا تھا۔ تصویر میں نانی کے دائیں طرف ایک دھندلا سا سیاہی مائل ہیولا تھا اور یوں لگ رہا تھا کوئی ان کے ساتھ کھڑا ہو۔ ظاہر ہے وہاں کوئی نہیں تھا اور یہ تصویر کی ڈیولپنگ میں آنے والی خرابی تھی یا شاید اتنے عرصے میں کاغذ خراب ہو گیا تھا۔ یہ کوئی چالیس سال پرانی تصویر تھی۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”کوئی نہیں کھڑا ہے بیٹا، تصویر میں دھبا آ گیا ہے۔“

”ماما! یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔“ عمیر نے یقین سے کہا۔ ”میں نے دیکھا تھا۔ یہ ابھی آیا ہے۔“

صبا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو...... کون ابھی آیا ہے؟“

”یہ آدمی جو نانو کے پیچھے کھڑا ہے۔ یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔“

شامیر اور سونیا ہنسنے لگے۔ صبا نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ ہیولا بچ انسانی لگ رہا ہے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ یقیناً تصویر کی خرابی تھی۔ اس نے نرمی سے عمیر کو سمجھایا۔ ”تصویر بہت پرانی ہے اور اس میں دھبا آ گیا ہے اب یہ اتفاق سے آدمی جیسا لگ رہا ہے۔“

عمیر ماں کی بات سے متفق نہیں تھا مگر اس نے پھر کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے تصویریں دیکھنے لگا۔ پھر امان کی تصویریں شروع ہوئیں۔ کچھ تصویروں میں وہ بچہ تھا۔ جیسے جیسے البم آگے بڑھ رہا تھا، وہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ آخری تصویر اس کے انتقال سے دو دن پہلے کی تھی۔ وہ پڑھنے کے لیے باہر جانا چاہتا اور اس نے دو دن پہلے ہی ایک اسٹوڈیو میں خاص طور سے تیار ہو کر پاسپورٹ سائز تصویر بنوائی تھی۔ بعد میں ان لوگوں نے اس تصویر کو انلارج کرا کے اس البم میں شامل کر لیا تھا۔ جیسے ہی تصویر سامنے آئی تو اس بار صبا بھی چونک گئی۔ امان کے عقب میں بھی وہی ہیولا نما دھبا تھا اور یہ بھی سیاہی مائل تھا۔ عمیر نے جوش سے کہا۔ ”ماما! دیکھیں ماموں کے پیچھے بھی وہی آدمی ہے۔“

”یہ آدمی نہیں ہے۔“ اس بار صبا کا لہجہ تیز تھا۔ ”تمہیں بتایا ہے کہ تصویر پر اس طرح کا اسپاٹ آ جاتا ہے۔“

"لیکن ماما! یہ بالکل ویسا ہی ہے۔" عمیر نے اصرار کیا تو صبا نے البم بند کر دیا۔ وہ جھنجلا رہی تھی اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شامیر اور سونیا نے عمیر کو گھورا۔ سونیا بولی۔

"تم منہ بند کر کے نہیں بیٹھ سکتے؟"

"اب کوئی نہیں بولے گا۔" صبا نے دوبارہ البم کھولتے ہوئے کہا۔ وہ تصویریں دکھانے لگی اور اس بار سب خاموش تھے۔ صبا انہیں تصویریں دکھاتی رہی اور ان کے بارے میں بتاتی رہی۔ عمیر اب بور ہو رہا تھا، وہ ذرا سرک کر لیٹا اور کسی وقت سو گیا۔ جب صبا نے آخری البم بند کیا تو وہ گہری نیند میں تھا۔ سونیا کو اپنے بستر پر بھیج کر صبا نے عمیر کو سیدھا کیا اور پھر اسے پیار کیا۔ اسے ندامت ہو رہی تھی کہ اس نے عمیر پر غصہ کیا۔ شامیر شرارت سے بولا۔

"کیا بات ہے ماما، آپ کو اس پر زیادہ ہی پیار آ رہا ہے۔"

"کیونکہ یہ میرا بیٹا ہے اور مجھ سے اتنے عرصے دور رہا ہے۔" صبا نے عمیر کو دوبارہ چوما۔ "اب میں اسے خود سے دور نہیں کروں گی۔"

صبا باہر آئی اور اس نے ماں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ خاصی دیر سے ایک کروٹ پر تھیں، اس نے انہیں دوسری کروٹ پر کیا۔ موسم سرد تھا اور امکان نہیں تھا کہ انہیں پسینا آئے گا، اس کے باوجود انہیں ہر چند گھنٹے بعد کروٹ دلائی جاتی تھی۔ صبح عمیر کی آنکھ کھلی تو سب سو رہے تھے۔ وہ جلد اٹھ جانے کا عادی تھا اور سات بجے تک بستر سے نکل آتا تھا۔ اس نے ماں کے کمرے میں دیکھا صبا سو رہی تھی۔ پھر وہ نانی کے کمرے میں آیا۔ وہ جاگ گئی تھیں اور چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ عمیر بستر پر چڑھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور انہیں کل کی روداد سنانے لگا۔ اس نے شامیر اور سونیا کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ جنگل میں گئے تھے۔ حالانکہ اس نے انہیں منع کیا تھا۔ پھر اس نے تصویروں کے بارے میں بتایا اور جب اس نے تصویروں میں نظر آنے والے ہیولوں کا ذکر کیا تو اچانک نانی نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور سرگوشی نما لہجے میں بولیں۔

"وہ آ گیا ہے، تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ کہتے ہوئے رکیں اور پھر کھرکھراتی آواز میں کہا۔ "یہاں سے چلے جاؤ، مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔"

"نانو! آپ بول رہی ہیں۔" عمیر خوش ہو گیا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ نانی نے کیا کہا ہے اور اس کا کیا مطلب ہے۔ "آپ نے کل بھی مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے ماما کو بتایا مگر انہوں نے یقین نہیں کیا۔ نانو! آپ کیوں بات نہیں کرتیں؟"

"میں بات نہیں کر سکتی۔" انہوں نے بے بسی سے کہا۔ "میری زبان بند کر دی گئی ہے۔ عمیر میرے بچے، یہاں سے چلے جاؤ۔"

"کیوں نانو؟"

"وہ پھر آ رہا ہے جان لینے کو۔" نانی کو کہتے ہوئے جھٹکا لگا اور وہ سر اوپر کر کے چھت کو گھورنے لگیں۔ عمیر انہیں ہلانے لگا۔

"نانو مجھ سے بات کریں۔ مجھے بتائیں کون آ رہا ہے؟"

اسی لمحے صبا نے کمرے میں جھانکا اور تیزی سے اندر آئی اس نے عمیر کو روکا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"ماما! نانو بات کر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کوئی آ رہا ہے اور ہم یہاں سے چلے جائیں۔۔۔"

صبا نے ماں کو دیکھا مگر ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے عمیر سے کہا۔ "بیٹا نانو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ ابھی بات نہیں کر سکتیں۔"

"مجھ سے بات کی ہے اور نانو ہمیں جانے کو کہہ رہی تھیں۔" عمیر نے یقین دلانے کی کوشش کی مگر صبا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ واش روم میں لے آئی۔ اپنے سامنے۔۔۔ منہ ہاتھ دھلوایا اور برش کر کے باہر جانے کو کہا مگر نانی کے کمرے میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آیا اور بستر میں گھس گیا۔ وہ کڑھ رہا تھا کہ ماما اس کی بات کیوں نہیں مان رہی ہیں۔ دو بار نانو نے اس سے بات کی اور دونوں بار ماما نے اس کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ نانو نے دونوں بار انہیں یہاں سے جانے کو کیوں کہا؟ کیا انہیں ان کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ عمیر کا ننھا سا ذہن اس بارے میں زیادہ سوچ نہیں سکتا تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ کچھ انوکھی بات ہے جو صرف نانو جانتی ہیں اور دوسرا کوئی اس سے واقف نہیں ہے۔ وہ اس وقت تک لیٹا ہوا سوچتا رہا جب تک صبا نے کمرے میں جھانک کر سب سے اٹھنے اور ناشتے کے لیے تیار ہونے کو نہیں کہا۔ وہ اس دوران میں ماں کو صاف کر کے اور ان کو ناشتا کرا کے آ چکی تھی۔

سونیا اور شامیر بھی اٹھ گئے اور کچھ دیر بعد سب

ناشتے کی میز پر تھے۔ صبا نے ان کے سامنے ابلے ہوئے انڈے، جام اور جیلی لگے توس اور دودھ کے گلاس رکھے تھے۔ آج اسے سامان بھی لانا تھا۔ اس لیے وہ جلدی کر رہی تھی۔ اس نے خود برائے نام ناشتا کیا۔ جیسے ہی بچے ناشتے سے فارغ ہوئے، صبا نے اپنی چادر اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اس نے جانے سے پہلے ان تینوں سے کہا کہ وہ نہ باہر جائیں گے اور نہ ہی چھت پر جائیں گے اور نانی کا خیال رکھیں گے۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو فوری اس کے موبائل پر کال کریں گے۔ جیسے ہی صبا کی گاڑی باہر نکلی۔۔۔ شامیر نے گیٹ بند کیا۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ''جنگل چلو گے؟''

عمیر نے انکار کیا۔ ''نہیں، گھر میں نانو کے پاس کوئی نہیں ہوگا۔''

''یہ ڈرپوک ہے۔'' سونیا نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا۔ ''نانو نے اسے ڈرایا ہے کہ وہاں بری چیز ہے اس لیے یہ ڈر کر نہیں جا رہا۔''

''میں ڈرتا نہیں ہوں۔'' اس نے غصے سے کہا۔ ''مجھے نانو کا خیال ہے۔''

''ہم جا رہے ہیں۔'' شامیر نے کہا۔ ''لیکن تم ماما کو کچھ... نہیں بتاؤ گے۔''

عمیر جانتا تھا کہ جھوٹ بولنا اتنی ہی بری بات ہے جتنی کہ ماں باپ کا حکم نہ ماننا۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''اگر ماما نے پوچھ لیا تو؟''

''تب بھی تم نہیں کہو گے ورنہ ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں کھلائیں گے۔'' شامیر نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ وہ اور سونیا گیٹ کے چھوٹے دروازے سے باہر نکل گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ ماں سودا لینے گئی ہے اور اسے آنے میں دیر لگے گی۔ عمیر دروازہ بند کرکے اندر آیا اور نانی کے کمرے میں جھانکا تو وہ ساکت لیٹی تھیں۔ عمیر صبا کے کمرے میں آیا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی نچلی دراز کھول کر اس میں رکھے البم باہر نکالے اور وہ البم کھولا جس میں ہیولے والی تصویریں تھیں۔ البم بھاری تھا اور اس سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا اس لیے اس نے نیچے قالین پر رکھ کر اسے کھولا اور صفحے پلٹتا ہوا نانی اور نانا کی اس تصویر تک آیا۔ تصویر والا صفحہ کھول کر وہ چند لمحے کے لیے اسے گھورتا رہ گیا۔ تصویر میں نظر آنے والا ہیولا اب غائب تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے امان ماموں کی تصویر نکالی مگر اس میں بھی ہیولا نہیں تھا۔ کاغذ بالکل صاف اور پہلے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے البمز واپس دراز میں رکھے اور دراز بند کرکے نانی کے کمرے میں آیا۔ اس نے بستر کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔

''نانو! گھر میں کوئی نہیں ہے۔ ماما شاپنگ پر گئی ہیں شامیر اور سونیا جنگل میں گئے ہیں۔ وہاں بری چیز ہے نا؟ نانو پلیز مجھ سے بات کریں۔''

نانی ساکت رہیں۔ عمیر نے دوبارہ کہا اور جواب نہیں ملا تو وہ مایوس ہو کر باہر جانے لگا۔ اچانک عقب سے ہلکی سی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو نانی بستر پر بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کا چہرہ عمیر کی طرف تھا۔ ان کی آنکھیں بالکل اسی طرح سیاہ ہو رہی تھیں جیسے دورہ پڑنے والی رات ہو گئی تھیں۔ وہ بولیں تو ان کی آواز پھٹی ہوئی اور کرخت تھی۔ ''میں آگیا ہوں۔''

عمیر بے ساختہ باہر کی طرف بھاگا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ چھوٹا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور دل بہت رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ نانو بستر سے اٹھ کر اس کے پیچھے نہ آجائیں۔ اسی لیے وہ بہت تیزی سے بھاگا۔ گیٹ پر کھڑے ہو کر وہ خوفزدہ نظروں سے مکان کے داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساری توجہ اسی طرف تھی اس لیے وہ شامیر اور سونیا کو آتے نہیں دیکھ سکا۔ شامیر دبے قدموں اس کے پاس آیا اور عمیر کے کان میں زور سے بولا۔ ''ہاؤ۔''

عمیر کی چیخ نکل گئی۔ اس موسم میں بھی اسے پسینا آیا ہوا تھا اور رنگت سفید ہو رہی تھی۔ اس کی صورت اور حالت دیکھ کر شامیر اور سونیا کو احساس ہوا کہ انہوں نے اسے زیادہ ہی ڈرا دیا ہے اور اس ڈر سے وہ اس سے سوری کرنے لگے کہ کہیں وہ ماما کو ان کے جنگل میں جانے کا نہ بتا دے۔ عمیر ان کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اندر آئے اور لاؤنج میں چلے گئے مگر عمیر صحن میں ہی رہا۔ اسے اندر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ نانو کی آواز کیسے بدل گئی۔

وہ نانو نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ ان سے محبت کرتا تھا اور اسے کبھی ان سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا مگر آج وہ ایسا ڈرا تھا کہ اب تک خود پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ شامیر اور سونیا کے ہوتے ہوئے بھی اسے اندر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شامیر اندر سے فٹ بال لے آیا اور اسے بھی دعوت دی مگر عمیر کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''تم اسی جگہ گئے تھے؟''

''ہاں، آج ہم وہاں سے ایک چیز بھی لائے ہیں۔'' شامیر نے کہا اور نزدیک آتے ہوئے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی اور عمیر کے سامنے کی۔

اس کی ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا پتلا رکھا ہوا تھا اور اس پتلے کے پیٹ میں ایک چھوٹی سی سوئی پیوست تھی۔ پتلا شاید آٹے سے بنا تھا اور بہت پرانا تھا کیونکہ سوئی بری طرح زنگ آلود ہو رہی تھی اور اس کا پچھلا حصہ ٹوٹ بھی گیا اب معمولی سا حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ پتلا بہت گندا ہو رہا تھا اور شامیر اسے کوشش کے باوجود صاف نہیں کر سکا۔ عمیر کو نہ جانے کیوں اس سے خوف محسوس ہوا۔ شامیر نے اس کی طرف بڑھایا تو اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ شامیر نے ہاتھ واپس کر لیا۔ ''کیسا ہے؟ میں اسے اپنے پاس رکھوں گا۔''

''یہ گندا ہے اسے پھینک دو۔''

''پاگل، یہ ایک یونیک چیز ہے۔ میں واپس جا کر اپنے دوستوں کو دکھاؤں گا۔''

شامیر نے پتلا واپس جیب میں رکھ لیا اور اکیلے ہی فٹ بال کھیلنے لگا۔ عمیر کو پیاس لگ رہی تھی اور پانی اندر کچن میں تھا۔ وہ ہمت کر کے اندر آیا۔ سونیا ٹی وی آن کر کے کارٹون نیٹ ورک دیکھ رہی تھی۔ عمیر نے کولر سے پانی پیا اور اس کے پاس آیا۔ اس نے سونیا سے پوچھا۔ ''تم بھی کچھ لائی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہاں سب گندا تھا۔ میں نے شامیر بھائی کو منع کیا تھا مگر انہوں نے اٹھا لیا۔''

''میں نے ان سے کہا وہ پھینک دیں مگر وہ نہیں مان رہے۔''

''وہ مجھے ملا تھا۔'' سونیا نے انکشاف کیا۔ ''میں نے اس کے پیٹ سے سوئی نکالنے کی کوشش کی تو وہ ٹوٹ گئی۔ مجھے چبھی تھی، تھوڑا سا خون بھی نکلا تھا۔'' سونیا نے اپنی انگلی آگے کی جس پر ہلکا سا سرخ نشان تھا۔ ''پھر شامیر بھائی نے مجھ سے لے لیا۔''

عمیر کو کارٹون اچھے لگتے تھے۔ وہ سونیا کے ساتھ کارٹون دیکھنے میں لگ گیا۔ اچانک سونیا صوفے سے اچھلی اور اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ عمیر نے اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''

''میرے...... پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولی۔

''تمہارا پیٹ خراب ہے۔''

''میرا پیٹ ٹھیک ہے۔ عجیب سا درد ہے۔'' سونیا نے کہا اور جا کر پانی پیا تو اسے سکون آیا۔ وہ پھر سے کارٹون دیکھنے میں مگن ہو گئی اور کچھ دیر میں بھول گئی کہ اس کے پیٹ میں تکلیف ہوئی تھی۔ صبا دوپہر تک واپس آئی۔ ہارن کی آواز سن کر وہ دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ شامیر نے گیٹ کھولا اور گاڑی اندر آ کر رکی تو وہ تینوں ماں کے ساتھ مل کر سامان اٹھانے لگے۔ صبا تھکی ہوئی مگر خوش تھی۔ ہر عورت کی طرح اسے بھی شاپنگ کرنا اچھا لگتا تھا اور خاص طور سے اپنے گھر اور بچوں کے لیے۔ وہ بھی سامان اندر لا رہی تھی اور ساتھ ہی ان سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ کیا کرتے رہے؟ شامیر اور سونیا نے ماں سے کہا کہ وہ گھر میں رہے اور کھیلتے رہے۔ جب صبا نے عمیر سے پوچھا تو ان دونوں نے اسے معنی خیز انداز میں دیکھا جیسے خبردار کر رہے ہوں کہ ماں سے مت کہنا۔ سونیا ایک شاپر لے کر اندر جا رہی تھی اور شامیر تھک کر لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ اچانک سونیا نے چیخ ماری اور اس کے ہاتھ سے شاپر چھوٹ گیا۔ ساری چیزیں فرش پر بکھر گئیں۔ صبا اس کی طرف لپکی۔

''کیا ہوا میری جان؟''

''ماما! میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔''

''کیسا درد اور کہاں ہو رہا ہے؟''

''یہاں۔'' سونیا نے ناف کی جگہ ہاتھ رکھا۔ شامیر اور عمیر بھی اس کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے عمیر نے ماں کو بتایا۔

''اسے کارٹون دیکھتے ہوئے بھی درد ہوا تھا۔''

''لگتا ہے تم نے کچھ الٹا سیدھا کھایا ہے۔ آؤ میں تمہیں دوا دوں۔'' صبا اسے اندر لے گئی اور ان سے سامان کچن میں رکھنے کو کہا۔ شامیر فکر مند تھا۔ اس نے عمیر سے کہا۔

''اب یہ ماما کو سب بتا دے گی۔''

''ماما سے چھپانا اچھی بات نہیں ہے۔'' عمیر نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے نانی کو کس حال میں دیکھا تھا اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ ماما کو بتائے یا نہیں۔ اس نے نانی کے حوالے سے انہیں پہلے بھی جو بتایا تھا، انہوں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ شامیر سامان کچن میں ترتیب سے رکھ رہا تھا تو عمیر نانی کے کمرے کی طرف آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا۔ نانی حسب معمول بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کی کھلی آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں لیکن اب آنکھیں نارمل تھیں۔ عمیر بستر کے پاس آیا اور دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جھک کر نانی سے کہا۔ ''پلیز مجھ سے بات کریں، مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ کی آنکھیں کالی ہو گئی تھیں۔ نانو! آپ کی آواز بھی بدل گئی تھی۔''

نانی کے سپاٹ چہرے پر کشمکش کے آثار نمودار

ہوئے جیسے وہ بولنا چاہ رہی ہوں مگر بول نہیں پا رہی تھیں۔

کچھ دیر کوشش کرنے کے بعد وہ تھک گئیں اور تیز تیز سانسیں لینے لگیں۔ اس دوران میں عمیر مسلسل انہیں بولنے پر اکسا رہا تھا۔ انہوں نے کسی قدر سر گھما کر عمیر کی طرف دیکھا اور زیرِ لب کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگیں۔ عمیر نے کان قریب لے جا کر سننے کی کوشش کی۔ ان کی آواز بہت مدھم تھی۔ وہ بہ مشکل اتنا سن سکا۔ ”سرخ سوٹ کیس۔“

”سرخ سوٹ کیس؟“ اس نے تصدیق کے لیے پوچھا مگر اس دوران میں نانی کا سر دوبارہ اوپر کی طرف ہو گیا تھا اور چہرہ سپاٹ ہو چکا تھا۔ عمیر نے انہیں ہلایا۔ کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ عمیر نے مایوسی سے انہیں دیکھا۔ ”نانو! آپ کو کیا ہوا ہے، پلیز جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اور میرے ساتھ رہیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پلیز نانو پلیز۔“ عمیر رونے لگا۔ اسی وقت صبا ماں کے کمرے کی طرف آ رہی تھی اور کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے عمیر کو اس طرح روتے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا اس نے عمیر کو بازوؤں میں لے لیا۔

”میری جان! نانو ٹھیک ہو جائیں گی۔ اب ہم یہاں آ گئے ہیں۔ ہم سب مل کر ان کی دیکھ بھال کریں گے تو یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”ماما! نانو ٹھیک ہیں، ان کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔“ عمیر نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ”نانو نے ابھی مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔“

صبا نے اسے پیچھے کیا اور غور سے اسے دیکھا۔ ”عمیر کیا کہہ رہے ہو؟ نانو ہوش میں نہیں ہیں۔“

”ماما! وہ میری بات سنتی ہیں اور کبھی کبھی جواب بھی دیتی ہیں۔“ عمیر نے زور دے کر کہا۔ ”ابھی انہوں نے مجھے سرخ سوٹ کیس کہا ہے۔“

صبا چونکی۔ ”سرخ سوٹ کیس؟“

”ہاں ماما! نانو نے بہت کوشش کے بعد بتایا ہے۔“

صبا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے عمیر کو گود میں اٹھایا اور کمرے سے باہر لے آئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ سونیا اب ٹھیک تھی اور لاؤنج میں اپنی گڑیوں کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ صبا نے عمیر کو بھی صوفے پر بٹھا دیا۔

”اب تم سب یہیں رہو گے جب تک میں لنچ نہیں بنا لیتی۔ کوئی باہر یا چھت پر نہیں جائے گا۔“

شامیر نے آہستہ سے عمیر سے پوچھا۔ ”ماما نے نانو کے کمرے کا دروازہ کیوں بند کیا ہے؟“

”پتا نہیں، نانو نے مجھ سے بات کی تھی۔“

”احمق، وہ ہوش میں نہیں ہیں۔“

”وہ ہوش میں ہیں۔“ عمیر نے دھیمی آواز میں کہا پھر اس نے شامیر کو بتایا کہ نانو نے بہت کوشش کے بعد اسے کیا کہا تھا۔

”سرخ سوٹ کیس۔“ شامیر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ وہ جس اسکول میں پڑھتا تھا، وہاں معیارِ تعلیم زیادہ اچھا نہیں تھا مگر شامیر ماں باپ کے ساتھ ہوٹل میں ہوتا تھا اور کم عمری میں اس نے بھانت بھانت کے لوگ اور ان کے رویے دیکھ لیے تھے اس لیے ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں وہ اپنی عمر سے زیادہ عقل مند ہو گیا تھا۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”اگر یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس ہوا تو تمہاری بات سچ ہو گی ورنہ تم لمبی لمبی چھوڑ رہے ہو۔“

نیچے کا پورا پورشن عمیر کا دیکھا بھالا تھا اور اسے ایک ایک چیز کا علم تھا۔ اس نے کبھی یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اوپری منزل پر ایک کمرا تھا اور اس کے دروازے پر ہمیشہ تالا لگا رہتا تھا۔ عمیر کبھی اس کمرے میں نہیں گیا تھا۔ نانی نے ہمیشہ اسے یہی بتایا کہ اس کمرے میں کاٹھ کباڑ ڈالا جاتا ہے مگر عمیر نے کبھی اس میں کاٹھ کباڑ ڈالتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے شامیر کو اس کمرے کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔ ”اگر سوٹ کیس ہے تو وہیں ہو گا۔“

”مگر اس پر تالا لگا ہوا ہے۔“

”احمق، گھر کی چابیوں میں اس کی چابی بھی ہو گی۔“ شامیر نے کہا۔ ”جب ماما لنچ کے بعد ہمیں کمروں میں بھیج دیں گی، تب ہم چپکے سے اوپر جائیں گے۔“

عمیر ڈر گیا۔ ”اگر ماما کو پتا چل گیا تو؟“

”تو کچھ نہیں۔“ شامیر کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ ”ماما بس ڈانٹتی ہیں، مارتی نہیں ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ عمیر نے کہا۔ ”پر ڈانٹ سننا بھی تو اچھا نہیں ہے۔“

”ماما کو پتا نہیں چلے گا۔“ شامیر نے یقین سے کہا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے لنچ کیا اور صبا نے انہیں اپنے کمرے میں جانے کو کہا۔ سونیا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ نانی کو دن میں دو بار کھانا دیا جاتا تھا کیونکہ وہ بستر پر لیٹی رہتی تھیں اور ان کا نظامِ ہضم زیادہ خوراک برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے ڈاکٹرز نے ان کی خوراک دن میں دو بار کر دی تھی۔ انہیں ایک انجکشن صبح شام دیا جاتا تھا اور دورہ پڑنے کی صورت میں انہیں ایک اور دوا کا انجکشن دیا جاتا تھا۔

ادارے والوں کا کہنا تھا کہ انہیں ہفتے میں ایک بار دورہ پڑتا تھا۔ صبا نے دونوں دوائیں کمرے میں رکھی تھیں تاکہ دورہ پڑنے کی صورت میں فوری دی جا سکیں۔ جب صبا سونیا کو لے کر اپنے کمرے میں گئی تو شامیر اور عمیر دبے قدموں کمرے سے باہر آئے۔ انہوں نے لاؤنج میں لٹکے کی ہولڈر سے چابیوں کا گچھا اتارا اور اسی طرح دبے قدموں سیڑھیوں سے اوپر آئے۔ شامیر نے عمیر سے کہا۔

"چھت پر زور سے مت چلنا، ماما کو پتا چل جائے گا۔"

شامیر کی ہدایت کے مطابق وہ دبے قدموں سیڑھیوں سے مخالف آخری حصے میں واقع کمرے تک آئے۔ یہ خاصا پرانا سا کمرا تھا اور کیونکہ اسے اسٹور کے طور پر بنایا گیا تھا اس لیے اس کا دروازہ لوہے کا تھا۔ اس پر ایک پرانا زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ شامیر چابیوں میں سے اس کی چابی تلاش کرنے لگا اور پھر اس نے ایک چابی لگائی۔ یہ واحد چابی تھی جو تالے میں فٹ آئی مگر تالا نہ جانے کب سے بند تھا۔ کھل ہی نہیں رہا تھا۔ شامیر نے عمیر کو گچھا دیا۔ "تم رکو، میں نیچے سے آئل لاتا ہوں۔ اس میں آئل ڈالیں گے تو یہ کھل جائے گا۔"

شامیر نیچے سے جا کر مشین آئل کی کپی لے آیا اور اس نے چند قطرے تالے کے سوراخ میں ڈالے پھر چابی لگا کر اسے بار بار گھمانے لگا۔ اس کی ترکیب نے کام کیا اور تالا کھل گیا۔ وہ دونوں خوش ہو گئے لیکن جب زنگ آلود دروازہ کھلا اور اندر تاریکی نظر آئی تو عمیر سہم گیا۔ اسے لگا کہ اندر تاریکی میں کوئی ہے مگر شامیر نے بے فکری سے پورا دروازہ کھول دیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ باہر تیز دھوپ سے اندر سائے میں آئے تو چند لمحے کے لیے انہیں کچھ نظر نہیں آیا اور پھر عمیر کی نظر ایک کونے میں کھڑے آدمی پر گئی تو اس نے چیخ مار کر شامیر کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"وہ آدمی......" عمیر نے اشارہ کیا۔

شامیر نے دیکھا مگر ڈرا نہیں۔ وہ آگے بڑھا اور ہنس کر بولا۔ "احمق، نانا جان کا اوورکوٹ ہے۔"

اب عمیر کو بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ جھینپ گیا۔ "ہاں یہ تو نانا ابو کا اوورکوٹ ہے۔"

شامیر اب وہاں دوسرا سامان دیکھ رہا تھا اور چیزیں اِدھر اُدھر کر رہا تھا۔ اس کی توجہ سرخ سوٹ کیس کے بجائے دوسری چیزوں پر زیادہ تھی۔ سرخ سوٹ کیس وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت کم روشنی اندر آ رہی تھی۔ عمیر سوٹ کیس دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف چند پرانے سوٹ کیس رکھے تھے مگر ان میں کوئی سرخ رنگ کا نہیں تھا اور دوسرے یہ سب کھلے ہوئے اور خالی تھے۔ شامیر نے کہا۔ "دیکھ لو یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس نہیں ہے۔"

"نانو نے کہا تھا...... پھر پتا نہیں وہ کہاں ہو گا؟" عمیر نے مایوسی سے کہا...... مگر وہ تلاش کر رہا تھا۔ ایک طرف کچھ پرانے قالین تھے اور ان پر مٹی سی جم گئی تھی مگر قالین اس طرح اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے ان کے نیچے کچھ ہو۔ عمیر نے انہیں ہٹانا چاہا مگر یہ خاصے وزنی تھے اور چھ سالہ بچے کے بس کا روگ نہیں تھے۔ اس نے شامیر سے کہا۔ "میرے ساتھ انہیں اٹھاؤ۔"

شامیر آگے آیا اور اس نے عمیر کے ساتھ مل کر قالین اوپر کیے۔ عمیر نے نیچے جھانکا تو اسے ایک چھوٹا سوٹ کیس نظر آیا۔ اس نے شامیر سے قالین پکڑے رہنے کو کہا اور خود سوٹ کیس باہر کھینچنے لگا۔ نیم تاریکی میں اس کا رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے مٹیالا سا سوٹ کیس باہر کھینچ لیا اور شامیر نے قالین چھوڑا تو وہاں گرد و غبار کا ایک بادل سا اٹھا جو سانس کے راستے ان کے حلق میں گیا اور وہ کھانسنے لگے۔ عمیر نے سوٹ کیس اٹھایا۔ یہ وزنی نہیں تھا مگر اس میں کچھ تھا۔ شامیر نے سوٹ کیس عمیر سے لے لیا۔ اس نے سوٹ کیس کو جھٹکا تو اس پر موجود گرد ہٹ گئی اور نیچے سے اس کا سرخ رنگ جھلکنے لگا۔ عمیر نے جوش سے کہا۔ "وہی ہے۔"

شامیر اور عمیر سوٹ کیس باہر لائے۔ یہ کھٹکے سے بند ہونے والا سوٹ کیس تھا مگر لاک نہیں تھا۔ شامیر نے کھٹکا ہٹا کر اسے کھولا اور دونوں نے بیک وقت اندر جھانک کر دیکھا تو اس میں ایک گڑیا اور اس کے نیچے کسی بچی کی بہت پرانی فراک تھی۔ گڑیا بھی پرانے انداز کی اور کپڑے سے بنی ہوئی تھی۔ گڑیا اور فراک دونوں کا رنگ خراب ہو چکا تھا۔ عمیر نے گڑیا اٹھائی اور شامیر نے فراک تو ان کے نیچے سے سیاہ جلد والی ایک چھوٹی سی ڈائری نکل آئی۔ اچانک نیچے سے صبا کی آواز آئی۔ "شامیر اور عمیر...... تم لوگ کہاں ہو؟"

انہوں نے جلدی سے دونوں چیزیں واپس سوٹ کیس میں ڈالیں اور شامیر نے اسے بند کر کے جلدی سے کمرے میں رکھ دیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اس میں تالا لگایا۔ عجلت میں اس نے تیل والی کپی بھی اندر کمرے میں چھوڑ دی تھی۔ ادھر وہ تالا لگا کر وسط میں کھڑے عمیر کے پاس آیا اور ادھر نیچے سیڑھیوں سے صبا نمودار ہوئی۔ اس

نے آتے ہی انہیں غور سے دیکھا اور بولی۔ ''تم دونوں یہاں ہو، میں نے آواز دی تو جواب کیوں نہیں دیا تھا؟''

شامیر نے چابی پتلون کی جیب میں ڈال لی تھی۔ ''سوری ماما! ہمیں سنائی نہیں دیا۔''

صبا نے چھت کا جائزہ لیا اور بولی۔ ''نیچے چلو۔''

وہ نیچے آئے تو صبا کے کمرے سے سونیا کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ پریشان ہوکر گئی اور اس کے جاتے ہی شامیر نے چابی نکال کر واپس کی ہولڈر پر ٹانگ دی۔ عمیر نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں نے ٹھیک کہا تھا نا...... نانو مجھ سے بات کرتی ہیں۔''

''ہاں لیکن وہ ہم سے کیوں نہیں کرتیں؟''

اپنی بات تسلیم کیے جانے پر عمیر اتنا خوش ہوا کہ اس نے صبح والا واقعہ بھی شامیر کے گوش گزار دیا جب نانی نے اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ بستر سے اٹھ کر کہا تھا کہ وہ آگیا ہے۔ شامیر حیران ہوا۔ ''نانو نے یہ کہا؟''

''ہاں اور ان کی آنکھیں بالکل سیاہ ہورہی تھیں جیسے کنچے ہوتے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگا اسی لیے تو میں گیٹ سے باہر آگیا تھا۔''

''تم نے ماما سے کہا؟''

''نہیں، ماما کو دوبار بتایا تو انہوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔''

سونیا کے چلانے کی آواز رک گئی تھی۔ عمیر سوچ رہا تھا کہ نانو نے جنگل میں جانے سے منع کیا تھا۔ شامیر اور سونیا کو وہاں ایک جھونپڑی ملی تھی اور انہوں نے اسے سرخ سوٹ کیس کا بتایا جو اوپر کمرے میں نہ جانے کب سے رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد صبا اندر سے آئی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''پتا نہیں سونیا کو کیوں رہ رہ کر پیٹ میں درد اٹھ رہا ہے۔''

''ماما! اس نے زیادہ کھالیا ہوگا۔'' شامیر نے کہا۔

''نہیں، اسے دوپہر سے درد ہورہا ہے، جب اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور ہم کارٹون دیکھ رہے تھے۔'' عمیر نے بتایا۔

''شاید اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوگا۔'' صبا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''خیر ابھی تو وہ ٹھیک ہے۔''

صبا پھر اندر چلی گئی۔ شامیر صوفے پر بیٹھا ہوا ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ اس نے جیب سے آٹے کا پتلا نکالا اور اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پتلے کے پیٹ میں لگی سوئی نکالنے کی کوشش کی اور جیسے ہی اس نے سوئی ہلائی، اندر سے پھر سونیا کے چلانے کی آواز آئی۔ صبا اس سے پوچھ رہی تھی کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے پیٹ میں پھر تکلیف ہورہی ہے۔ صبا پریشان ہوکر باہر آئی تو شامیر نے جلدی سے پتلا دو صوفوں کے درمیان خلا میں ڈال دیا کہ ماں اس کے ہاتھ میں نہ دیکھے۔ اگر صبا دیکھ لیتی تو وہ لازمی اس سے سوالات کرتی اور پھر وہ اس سے اصل بات اگلوا کر ہی رہتی۔ وہ فریج سے دوا کی شیشی لینے آئی تھی۔ سونیا اب خاموش تھی اور جب صبا دوا لے کر گئی تو اس نے کہا کہ اس کی تکلیف اب ختم ہوگئی ہے۔ اس کے باوجود صبا نے اسے پیٹ درد کا سیرپ پلا دیا۔ عمیر یہ سب غور سے دیکھ رہا تھا۔ ماں کے جانے کے بعد شامیر نے صوفوں کے درمیان سے پتلا نکالنے کی کوشش کی اور ناکام ہونے کے بعد اس نے ارادہ ملتوی کردیا اور صحن کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے سنسنی خیز لہجے میں اطلاع دی۔

''بادل آرہے ہیں، بارش ہوگی۔''

شامیر کو بارش پسند تھی اور وہ نہانا پسند کرتا تھا مگر یہ سرما کی بارش تھی۔ اسے نہانے کی اجازت نہیں ملتی۔ اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ موسم تاریک ہوا تو صبا باہر آئی۔ اس نے باہر جھانکا اور کھڑکیاں دروازے بند کرنے لگی۔ شامیر نے التجا کی۔ ''ماما! کیا میں برآمدے میں جاسکتا ہوں؟''

''نہیں، آج سردی بہت ہے اور بارش کے بعد مزید ٹھنڈ ہوجائے گی۔ تم باہر رہے تو بیمار پڑ سکتے ہو۔ میں پہلے ہی سونیا کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

شامیر کا منہ لٹک گیا۔ عمیر نے اسے تسلی دی۔ ''تم کھڑکی سے دیکھ سکتے ہو۔''

''ہاں لیکن میں اسے محسوس تو نہیں کرسکتا۔'' وہ جھنجلایا۔

عمیر صبح سے ایک دوبار ہی نانی کے کمرے میں گیا تھا اسے ڈر لگ رہا تھا۔ صبا نے اسے آواز دی اور اس سے کہا کہ وہ نانی کے پاس رہے تو عمیر نانی کے کمرے میں آگیا۔ اس نے بستر سے ذرا دور اپنی کرسی رکھی اور دروازہ کھلا رکھا تھا۔ نانی ساکت لیٹی تھیں۔ اچانک باہر سے بادل گرجے تو عمیر ڈر گیا۔ لائٹ ایک لمحے کو مدھم ہوئی اور پھر ٹھیک ہوگئی۔ عمیر کی توجہ نانی کے ہاتھ پر گئی، ان کی انگلیاں ہل رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس آیا اور غور سے انگلیاں دیکھنے لگا۔ انگلیاں یوں بار بار کھل اور مڑ رہی تھیں جیسے کسی چیز کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہوں۔ عمیر نے ڈرتے ڈرتے انگلیوں کو چھوا تھا کہ نانی کا ہاتھ مڑا اور انہوں نے عمیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا مگر نانی کی گرفت بہت سخت تھی اور اچانک ہی وہ بستر پر اٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے سر گھما کر عمیر کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں ویسی ہی سیاہ ہو رہی تھیں۔

عمیر نے چیخ ماری مگر وہ بادل کی گرج میں دب گئی۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو نانی نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر عمیر کا گلا پکڑ لیا۔ اس نے چلانے کی کوشش کی مگر گرفت اتنی سخت تھی کہ عمیر کی آواز ہی نہیں نکلی اور اب بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے۔ عمیر کی سانس رکنے لگی۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے مچل رہا تھا مگر چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ چھڑا نہیں پا رہا تھا۔ نانی کی گرفت بہت سخت تھی۔ خود کو چھڑانے کی کوشش میں وہ پیچھے بیٹھا تو نانی کا بستر پر توازن خراب ہوا اور وہ نیچے لڑھک گئیں۔ عمیر کی گردن اور ہاتھ دونوں ان کی گرفت سے نکل گئے۔ اس کی گردن آزاد ہوئی تو اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں اور وہ فرش سے اٹھ کر دیوانہ وار بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کی چیخیں اتنی بلند ضرور تھیں کہ صبا کے کانوں تک پہنچ گئیں اور وہ پریشان ہو کر کمرے سے باہر آئی۔ ”عمیر! کیا ہوا؟“

مگر وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ البتہ اس نے ہاتھ سے نانی کے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو صبا اس طرف لپکی۔ ماں کو فرش پر گرے اور لرزتے دیکھ کر وہ تیزی سے ان کے پاس پہنچی اور انہیں فرش سے اٹھانے کی کوشش کی مگر ان کا وزن خاصا تھا۔ اس نے چلا کر شامیر کو آواز دی۔ شور سن کر وہ پہلے ہی آ گیا تھا۔ اس نے صبا کی مدد کی اور انہوں نے نانی کو اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھیں، صبا کو لگا کہ اگر اس نے انہیں چھوڑا تو وہ پھر نیچے نہ گر جائیں، اس نے شامیر سے کہا۔ ”اوپر چڑھ کر انہیں قابو کرو۔ عمیر! تم بھی آؤ۔“

”میں نہیں آؤں گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے انکار کیا۔ وہ دروازے پر کھڑا تھا۔

”پلیز بیٹا، مجھے انجکشن بنانا ہے۔ تم بھائی کے ساتھ مل کر نانو کو پکڑے رکھو۔“ صبا نے التجا کی تو وہ بادل ناخواستہ ----- آگے آیا اور اس نے شامیر کے ساتھ مل کر نانی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ اب بستر پر سر دائیں بائیں مار رہی تھیں۔ صبا نے جلدی سے دراز سے سرنج نکالی اور اس کا ریپر کھول کر دوا کی شیشی اٹھائی۔ صبا نے شیشی رکھ کر سرنج سے ہوا خارج کی۔ اس دوران میں شامیر اور عمیر نانی کا جسم دبائے ہوئے تھے۔ صبا نے ان کا ایک بازو کس کر پکڑا اور جیسے ہی نس ابھری اس نے سوئی داخل کر کے پسٹن دبا دیا۔ چند لمحے بعد نانی ڈھیلی پڑنے لگیں اور ان کا لرزہ کم ہو گیا۔ ایک منٹ بعد وہ ساکت ہو گئیں اور ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ شامیر اور عمیر نے انہیں چھوڑ دیا اور بستر سے نیچے اتر آئے۔ صبا نے ماں کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اور سر کے نیچے تکیہ درست کیا۔

باہر گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اندر بھی اتنی سردی ہو گئی تھی کہ صبا نے ہیٹر آن کر دیے۔ اس نے تمام بچوں کو اپنے کمرے میں جمع کر لیا کیونکہ وہ گیس ہیٹر صرف اپنی نگرانی میں چلاتی تھی۔ نانی کے کمرے میں اس نے الیکٹرک فین ہیٹر آن کر دیا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور ابھی اسے رات کا کھانا بھی بنانا تھا۔ وہ بچوں کو کمرے میں رہنے کا کہہ کر باہر آ گئی۔ شامیر اور عمیر آپس میں بات کر رہے تھے اور سونیا سن رہی تھی۔ جب انہوں نے اوپر والے کمرے میں موجود سرخ سوٹ کیس کی بات کی تو وہ چونک گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”تم دونوں اوپر گئے تھے؟“

”وہاں ایک سوٹ کیس میں ایک گڑیا اور ایک فراک ہے۔“ عمیر نے انکشاف کیا۔

”ماما کی ہو گی۔“ سونیا نے یقین سے کہا۔ ”جب وہ چھوٹی ہوں گی تو گڑیا سے کھیلتی ہوں گی۔ میں ماما سے کہوں گی کہ وہ گڑیا مجھے دے دیں۔“

”تم ماما کو نہیں بتاؤ گی کیونکہ ہم نے انہیں نہیں بتایا ہے۔“ شامیر نے کہا۔ ”اگر تم نے بتایا تو ماما کو پتا چل جائے گا۔“

”اچھا میں نہیں کہوں گی لیکن تم مجھے گڑیا دکھانا۔“

”وہ خراب اور بیکار ہے۔“ شامیر نے اسے ٹالنا چاہا مگر جب وہ مصر رہی تو مجبوراً شامیر مان گیا کہ وہ اسے اگلے دن گڑیا دکھائے گا۔ سردی زیادہ ہو رہی تھی اس لیے صبا نے ڈنر سات بجے ہی تیار کر لیا۔ ڈنر ڈائننگ ٹیبل پر کیا جاتا اور یہاں سردی زیادہ تھی۔ اس نے بچوں کے گرم کپڑے نکال لیے تھے۔

کھانے کے بعد صبا نے بچوں کو کمرے میں بھیج دیا اور ماں کے کمرے میں آ گئی۔ انجکشن لگنے کے سات آٹھ گھنٹے تک وہ بے ہوشی کی نیند سوتیں۔ اس کے بعد انہیں ہوش آیا تو وہ انہیں کھانا کھلا سکتی تھی۔ انہیں شام پانچ بجے دورہ پڑا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ وہ بارہ یا ایک بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتی تھیں۔ پہلے صبا نے سوچا کہ کچھ دیر آرام کر لے مگر وہ یہ سوچ کر رک گئی کہ اگر اس کی آنکھ لگ گئی تو وہ سوتی رہ جائے گی۔ وہ جا کر اپنے کمرے سے ایک

کتاب لے آئی اور بستر کے برابر میں کرسی رکھ کر پڑھنے لگی۔ نو بجے وہ جا کر اپنے لیے چائے بنا لائی۔ اس وقت بارش رک گئی تھی مگر موسم بدستور بارش والا ہو رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور دور پہاڑوں کی طرف بجلی چمک رہی تھی۔ صبا نے جان بوجھ کر چائے اسٹرانگ بنائی تا کہ اس کی نیند بھاگ جائے کیونکہ وہ سارا دن مصروف رہتی تھی اس لیے اسے جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کی عادت تھی۔

چائے بھی اس کی نیند بھگانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ گیارہ بجے تک وہ باقاعدہ اونگھنے لگی۔ کسی وقت اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور پھر اسے لگا جیسے کوئی اس کے آس پاس سرگوشی کر رہا ہے۔ ''میں آ گیا ہوں...... میں آ گیا ہوں۔'' وہ چونک کر بیدار ہوئی تو وہاں کوئی نہیں تھا اور ماں بدستور بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اچانک بچوں کے کمرے سے صبا کو چیخ سنائی دی۔ صبا بے اختیار اٹھ کر بھاگی اس نے بچوں کے کمرے کا دروازہ کھولا تو سونیا اپنے بستر پر گٹھری سی بنی پڑی تھی اور اونچی آواز میں چلا رہی تھی۔ صبا اس کی طرف لپکی۔ ''کیا ہوا سونیا؟ کیا ہوا میری جان؟''

''ماما! میرا پیٹ......'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''بہت درد ہو رہا ہے۔''

صبا اس کا پیٹ ٹٹولنے لگی۔ پیٹ نرم تھا اور بہ ظاہر کوئی اور علامت بھی نہیں تھی مگر سونیا بہت تکلیف میں تھی۔ صبا نے پوچھا۔ ''کیسا لگ رہا ہے؟''

''ماما! ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی نکیلی چیز چبھو رہا ہے۔''

شامیر اور عمیر بھی بستر پر اٹھ بیٹھے تھے۔ عمیر سونیا کی بات پر چونکا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ صبا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''اٹھو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔''

عمیر سہم گیا۔ ''ماما! ہم اکیلے رہیں گے؟''

''ہم نہیں، آپ یہاں رہیں گے۔'' صبا نے سونیا کو گرم کپڑے پہناتے ہوئے کہا۔ ''شامیر! آپ تیار ہو، آپ میرے ساتھ جاؤ گے۔ راستے میں آپ سونیا کو دیکھو گے۔''

عمیر اکیلا رہنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر وہ ماں کی پریشانی کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ شامیر تیار ہونے لگا۔ سونیا کو تیار کرا کے صبا نے اپنا گرم کوٹ پہنا اور پرس و چابیاں لے کر سونیا کو گود میں اٹھا لیا۔ عمیر شامیر کے ساتھ لگا ہوا دروازے تک ساتھ آیا مگر صبا نے اسے باہر آنے سے روک دیا۔ ''آپ یہیں سے دروازہ بند کر لیں اور جب تک میری آواز نہ سنیں دروازہ مت کھولیے گا۔''

''یس ماما۔'' عمیر نے کہا۔

''آپ نانو کا خیال رکھنا اور کوئی بات ہو تو مجھے فون کرنا۔'' صبا نے کہا اور باہر نکل گئی۔ عمیر نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ صبا گھر کی چابیاں لے گئی تھی۔ اس نے شامیر کو گیٹ کھولنے کو کہا اور خود سونیا کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ جب تک وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور گاڑی اسٹارٹ کی، شامیر نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی باہر نکلنے کے بعد اس نے باہر تالا لگایا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ سونیا بدستور رو رہی تھی اور تکلیف کی شکایت کر رہی تھی۔ صبا نے اسے تسلی دی۔ ''بس میری جان، ابھی ہم ڈاکٹر کے پاس جائیں گے تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

گاڑی گیٹ سے آگے نکلی تو عمیر نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا اور لاؤنج کے صوفے پر آ گیا۔ اس کی خوفزدہ نظریں نانی کے کمرے پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ صبا نے انہیں بتایا تھا کہ نانی اب بارہ بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گی، اس کے باوجود عمیر ڈر رہا تھا کہ کہیں نانی جاگ نہ جائیں اور ان کی آنکھیں سیاہ نہ ہوں۔ اس لیے وہ ماں کی ہدایت کے باوجود ان کے کمرے میں نہیں گیا اور لاؤنج میں بیٹھا رہا۔ ابھی ان لوگوں کو گئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اچانک بادل زور سے گرجے اور بجلی کی چمک ایسی تیز تھی کہ پورا لاؤنج روشنی سے بھر گیا۔ انرجی سیورز کی روشنی اس کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔

پھر جیسے ہی چمک ختم ہوئی، اچانک ہی تاریکی چھا گئی۔ عمیر خوف سے چلا اٹھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لائٹ چلی گئی تھی اور اب اندر گھپ اندھیرا تھا۔ باہر سے تیز بارش کی آواز آئی، اس کی شدت پہلے سے زیادہ تھی۔ عمیر کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا پھر وہ ہمت کر کے اٹھا اور کچن کی طرف بڑھا۔ اس کی ایک دراز میں ٹارچ رکھی تھی۔ وہ ٹارچ کی مدد سے ایمرجنسی لائٹس تلاش کر سکتا تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا کچن کی دراز تک پہنچا اور اسے کھول کر اندر سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ اس کی روشنی سے عمیر کو حوصلہ ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ ایمرجنسی لائٹس صبا کے بیڈ روم کے ساتھ ایک ریک پر رکھی ہوتی ہیں۔ وہ ریک تک آیا اور ایک بڑی ایمرجنسی لائٹ اٹھا کر آن کی اور اسے لا کر لاؤنج میں رکھ دیا۔ اس کی روشنی ہر طرف جا رہی تھی۔ اس نے ٹارچ بند کر دی لیکن اسے اپنے پاس ہی رکھا۔

وہ سونیا کی تکلیف کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اچانک اسے اس پتلے کا خیال آیا جو شامیر لایا تھا اور جس

کے پیٹ میں سوئی چبھی ہوئی تھی۔ وہ لاؤنج میں دو چھوٹے صوفوں کے درمیان گر گیا تھا۔ عمیر نے جھک کر دونوں صوفوں کے درمیان خلا میں دیکھا اور پھر ٹارچ روشن کر کے اس میں جھانک رہا تھا کہ اچانک ہی نانو کے کمرے سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی شیشہ فرش پر گرا ہو اور ٹوٹ گیا ہو۔ چھناکے نے عمیر کو سہا دیا۔ پھر وہ ہمت کر کے اٹھا اور ٹارچ آن کر کے نانو کے کمرے تک آیا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے ٹارچ سے روشنی اندر ڈالی تو نانو کا بیڈ خالی تھا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ میں لرز گئی۔ نانو کہاں تھیں؟ اس نے جلدی سے پورے کمرے میں ٹارچ گھمائی مگر نانو وہاں کہیں نہیں تھیں۔ عمیر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نانو! آپ کہاں ہیں؟“

کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر آیا تو اچانک کسی نے اسے عقب سے دھکا دیا۔ وہ بستر کے قریب جاگرا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو نانو دروازے کے پیچھے کھڑی تھیں اور وہیں سے انہوں نے اسے دھکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی اور گر کر بند ہوگئی مگر باہر سے آتی ایمرجنسی لائٹ کی روشنی میں نانو کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چند لمحے تک ساکت کھڑی رہیں اور پھر پلٹ کر کمرے سے نکل گئیں۔ عمیر فرش سے اٹھا اور اس نے ٹارچ اٹھائی پھر باہر آیا۔ نانو کچن کی طرف جا رہی تھیں۔ عمیر جھکا ہوا لاؤنج میں آیا اور عقب سے چھوٹے صوفوں کے پیچھے آگیا۔

☆☆☆

صبا فکر مند تھی کیونکہ سونیا مسلسل رو رہی تھی اور وہ پچھلی نشست پر گول مول سی ہو کر لیٹی ہوئی تھی۔ ان کے روانہ ہونے کے چند منٹ بعد ہی بہت تیز بارش شروع ہوگئی تھی۔ اس نے وائپر چلا دیے تھے اور ہیڈ لائٹس فل کر دی تھیں۔ اس کے باوجود اسے گاڑی بہت دھیمی رفتار سے چلانی پڑ رہی تھی کیونکہ اوپر سے جیسے پانی کی چادر گر رہی تھی۔ شامیر جو سونیا کے پاس بیٹھا تھا۔ اسے عمیر کی فکر ہو رہی تھی۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”ماما! عمیر نانو کے بارے میں ٹھیک کہتا ہے۔ وہ اس سے بات کرتی ہیں۔“

سونیا چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”ماما! نانو نے اسے سرخ سوٹ کیس کا بتایا اور وہ ہمیں اوپر اسٹور والے کمرے میں ملا۔ اس میں ایک پرانی گڑیا، ایک فراک اور ایک بلیک ڈائری تھی۔“

صبا سامنے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”شامیر اتم کیا کہہ رہے ہو؟“

”ماما! نانو کی آنکھیں بلیک ہو جاتی ہیں اور انہوں نے عمیر کا گلا بھی دبایا تھا۔ تبھی وہ بستر سے نیچے گری تھیں۔ عمیر نے مجھے سب بتایا ہے۔ ابھی جب ہم آ رہے تھے، تب بھی وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں۔“

صبا نے اور باتوں پر توجہ نہیں دی تھی مگر یہ سن کر وہ پریشان ہوگئی کہ اس کی ماں نے عمیر کا گلا دبایا تھا اور اس وقت عمیر ان کے ساتھ گھر میں اکیلا تھا مگر اس نے خود کو تسلی دی کہ ماں انجکشن کے زیر اثر ہیں اور انہیں رات بارہ بجے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ وقت پر اسے گھڑی کا خیال آیا اور اس نے ڈیش بورڈ میں لگی گھڑی دیکھی تو اس میں پونے بارہ ہو رہے تھے۔ اس کا اطمینان ہوا ہو گیا۔ بارہ تو بجنے والے تھے اور انہیں کسی وقت بھی ہوش آ سکتا تھا۔ صبا نے اپنا موبائل نکالا اور گھر کے فون پر کال کرنے لگی۔ بیل جا رہی تھی مگر دوسری طرف سے کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ وہ بے تاب ہونے لگی کہ عمیر کال کیوں نہیں ریسیو کر رہا تھا۔ پھر کسی نے کال ریسیو کی۔

☆☆☆

انکار ہی سمجھو

ایک میراثی کے لڑکے کو ایک زمیندار کی لڑکی سے محبت ہوگئی، تو اس نے باپ کو مجبور کیا کہ چودھری صاحب سے میرے لیے رشتہ مانگ آئے۔ آخر کار باپ تھا، بیٹے کی خاطر رشتہ مانگنے چلا گیا۔ چودھری صاحب مہمانوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ میراثی نے آداب سے سلام کیا۔ بلند آواز میں کہا۔

”چودھری صاحب! میں اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگنے آیا ہوں۔“ چودھری صاحب یہ بات سن کر جلال میں آگئے۔ کہاں میراثی اور کہاں علاقے کا زمیندار۔ چودھری صاحب نے اپنے حواریوں کو اشارہ کیا۔ حواریوں نے میراثی کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو کہا۔

”چودھری اسی ہون انکار سمجھیے۔“

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

عمیر صوفوں کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔ نانو کچن میں کچھ تلاش کر رہی تھیں اور پھر وہ پلٹیں تو ان کے ہاتھ میں ایک چھری تھی۔ چھری سے زیادہ خوفناک ان کے چہرے کے تاثرات تھے۔ ان کی آنکھیں پوری سیاہ اور چہرہ جیسے پتھر کا ہو رہا تھا۔ عمیر کو لگا وہ اس کی نانو نہیں کوئی اور ہیں۔ وہ چھری لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔ جیسے ہی وہ کمرے میں گئیں، عمیر صوفوں کے درمیانی خلا میں ہاتھ ڈال کر پتلا نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ کر نیچے گری اور خاصی آواز ہوئی... فوراً ہی دروازے پر نانو نمودار ہوئیں۔ وہ لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے تعین کر رہی ہوں کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ عمیر نے ٹارچ پکڑ لی اور پھر خلا میں ٹٹولنے لگا۔ صوفے کے نیچے سے وہ دیکھ رہا تھا کہ نانو اسی طرف آ رہی تھیں اور جیسے ہی وہ صوفوں کے پچھلے حصے میں نمودار ہوئیں، عمیر کا ہاتھ پتلے سے ٹکرایا۔

عمیر اسے پکڑتے ہوئے سیدھا ہوا اور اٹھ کر تیزی سے دوڑ لگائی۔ وہ کچن کے پاس سے ہوتا ہوا نشست گاہ میں آیا اور اس کے بڑے صوفے کے پیچھے دبک گیا۔ خوف سے اس کا سانس تیز ہو رہا تھا اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ اس نے ٹٹول کر پتلے کے پیٹ میں پیوست سوئی تلاش کی اور اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر سوئی کا بہت کم حصہ اب باہر تھا جو اس کی انگلیوں کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ نشست گاہ کی کھلی آرچ پر نانو کا ہیولا نمودار ہوا اور وہ کھڑے ہو کر نشست گاہ میں دیکھنے لگیں۔ یہاں سے ایک دروازہ پیچھے راہداری میں کھلتا تھا جس میں بیڈ رومز تھے۔ نانو نے عجیب کھرکھراتی سی آواز میں کہا۔ ”عمیر! تم کہاں ہو، سامنے آؤ میرے بچے۔“

عمیر نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی آواز نہ نکل جائے اور نانو کو پتا چل جائے کہ وہ صوفے کی سائڈ میں موجود ہے۔ نانو آگے آئیں اور انہوں نے پہلے چھوٹے صوفوں کے پیچھے جھانکا جب وہاں عمیر نظر نہیں آیا تو وہ بڑے صوفے کی طرف بڑھیں اور جب اس کے بالکل نزدیک آ گئیں تو عمیر نے پکڑے جانے کے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک ہی فون کی بیل بجی اور نانو رک گئیں۔ فون لاؤنج میں رکھا ہوا تھا۔ وہ پلٹیں اور لاؤنج کی طرف جانے لگیں۔ ان کے جانے کے بعد عمیر نے نہ جانے کب سے رکا ہوا سانس لیا اور دوبارہ پتلے سے سوئی نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس طرح نہیں نکلے گی۔ اسے کچن میں اوزاروں والی دراز کا خیال آیا جس میں پلاس تھا اور وہ اس کی مدد سے سوئی نکال سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ سونیا کی تکلیف اور نانو کی اس کیفیت کی وجہ یہی پتلا اور اس کے پیٹ میں پیوست سوئی تھی۔ اس لیے وہ اسے نکالنے کے لیے بے تاب تھا۔

وہ اٹھ کر دبے قدموں آرچ والے دروازے تک آیا اور لاؤنج میں جھانک کر دیکھا تو نانو فون کے پاس کھڑی تھیں۔ پھر انہوں نے ریسیور اٹھایا اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔ ان کی پشت عمیر کی طرف تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور فریج کی سائڈ میں چلا گیا۔ وہ فریج سے بالکل لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد نانو اس کے سامنے سے گزر کر نشست گاہ کی طرف چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی وہ فریج کی سائڈ سے نکلا اور جھک کر کچن کی اس دراز تک آیا جس میں اوزار رکھے ہوتے تھے۔ اس نے آہستہ سے دراز کھولی اور اس میں پلاس ٹٹولنے لگا۔ اوپر دوسرے اوزار تھے اور اسے پلاس نہیں مل رہا تھا۔ وہ زیادہ ہاتھ مارتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں آواز نہ پیدا ہو۔ بالآخر اسے پلاس مل گیا۔ اس نے ذرا عجلت سے کام لیا اور اسے کھینچ کر نکالنے لگا تھا کہ چند اوزار آپس میں ٹکرائے اور آواز پیدا ہوئی۔

عمیر کا سانس ایک لمحے کو رک گیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا مگر نانو نشست گاہ میں ہی تھیں۔ اس نے جلدی سے پلاس پکڑا اور پتلے کے پیٹ سے سوئی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک اسے لگا کہ اس کے عقب میں کوئی ہے اور وہ بے ساختہ آگے ہوا۔ اسی لمحے چھری آ کر کیبنٹ سے لگی۔ نانو کب وہاں آئیں اسے پتا نہیں چلا تھا۔ انہیں اتنے پاس دیکھ کر عمیر گھبرا کر پیچھے ہوا تو اس کے ہاتھ سے پلاس چھوٹ گیا۔ اس نے پلاس اٹھانا چاہا مگر نانو نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے دور پھینک دیا۔ عمیر چلایا۔

”نانو! یہ کیا کر رہی ہیں؟“

”میں آ گیا ہوں۔“ نانو نے کھرکھراتی آواز میں کہا۔ ”مجھے قیمت چاہیے۔“

نانو کہتے ہوئے آگے آنے لگیں۔ عمیر پیچھے سرکا۔ ”کون ہو تم؟“

”میں وہی ہوں جس سے معاہدہ کیا تھا۔ میں اس کی قیمت لینے آیا ہوں۔“

”میں آپ کا عمیر ہوں۔“ وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں پتلا موجود تھا۔ اب پلاس نہیں رہا تھا کہ وہ اس سے سوئی نکالتا۔ اچانک اسے خیال آیا اور وہ پتلا منہ تک لایا۔ نانو اس کی طرف جھپٹیں مگر وہ جھکائی دے کر بچا اور تیزی سے

لاؤنج کی طرف بھاگا۔ نانو اس کے پیچھے تھیں مگر ان کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ان کی پہنچ سے دور جاتے ہی عمیر نے دانتوں سے سوئی پکڑ کر پوری قوت سے کھینچی اور وہ پتلے سے نکل گئی۔ نانو چھری سمیت اس پر جھپٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

''ہیلو..... ہیلو۔'' صبا بول رہی تھی۔ ''کون ہے..... فون کس نے ریسیو کیا ہے؟ عمیر! یہ تم ہو بیٹا...... بولتے کیوں نہیں ہو؟''

مگر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ صبا نے کار سائڈ پر روک دی اور کال کاٹ کر دوبارہ ملائی مگر اس بار انگیج ٹون آ رہی تھی۔ سونیا کی حالت بدستور خراب تھی مگر اب صبا کو زیادہ بڑے مسئلے کا سامنا تھا۔ اس نے سوچا اور کار واپس موڑ لی۔ شامیر نے اس سے پوچھا۔ ''ماما! کیا ہم واپس جا رہے ہیں؟''

''ہاں کسی نے گھر میں کال ریسیو کر کے ریسیور فون سے الگ رکھ دیا ہے۔ وہاں گڑبڑ ہے۔ سونیا! تم کیسی ہو؟''

''ماما تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولی۔

''بس بیٹا، میں جلد تمہیں اسپتال لے جاؤں گی۔'' صبا نے اسے تسلی دی۔ ''تھوڑا صبر کرلو۔''

اس بار صبا بارش کی پروا کیے بغیر کسی قدر تیز ڈرائیو کر رہی تھی اور اسے رہ رہ کر عمیر کا خیال آ رہا تھا۔ اچانک سونیا چلائی۔ ''ماما......''

''کیا ہوا میری جان؟''

''میری تکلیف ٹھیک ہوگئی ہے۔'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''ماما! بالکل بھی درد نہیں ہے اور نہ ہی چبھن ہے۔''

صبا نے سکون کا سانس لیا اور پوری توجہ سے ڈرائیو کرنے لگی۔۔۔ ساتھ ہی وہ سب خیریت سے ہونے کی دعا مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

عمیر نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں۔ چھری اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بس ایک لحہ لگتا اور وہ اس کے ننھے جسم میں اتر جاتی مگر جب کچھ نہیں ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ نانو سامنے ہی ساکت کھڑی تھیں اور ان کا چھری والا ہاتھ بھی ساکت تھا۔ عمیر نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا تو ان کی آنکھیں اب نارمل تھیں اور چہرہ بھی ٹھیک لگ رہا تھا۔ پھر بھی عمیر ڈر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''نانو! اب آپ ٹھیک ہیں؟''

نانو نے سر ہلایا پھر انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود چھری دیکھی اور خود سے سوال کیا۔ ''یہ میں کیا کرنے والی تھی؟ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے والی تھی۔''

''نانو! آپ کو کیا ہوا تھا؟'' عمیر کا خوف کچھ کم ہونے لگا۔

''مجھ پر شیطان حاوی آ گیا تھا۔ جیسے بہت سال پہلے آیا تھا۔'' انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسی لمحے باہر سے کار کے ہارن کی آواز آئی تو عمیر اچھل پڑا۔ اس نے چلا کر کہا۔

''ماما آ گئیں۔''

عمیر باہر کی طرف بھاگا۔ نانی اسے جاتا دیکھ رہی تھیں پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''اب یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ میرے کسی اور بچے کو میرے گناہ کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہیے۔''

نانی پلٹیں اور صبا کے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

☆☆☆

صبا کے ہاتھ میں سیاہ ڈائری تھی۔ اس نے ڈائری کھولی۔ اس کے شروع کے صفحات خالی تھے مگر ایک صفحے پر کچھ لکھا ہوا تھا اس کے بعد اسی طرح سے وقفے وقفے سے آج سے بیس سال پہلے تک کی تاریخوں میں ایک روداد لکھی تھی جو حیران کن بھی تھی اور عبرتناک بھی۔ صفیہ اور احمد اللہ کی شادی آج سے پچاس سال پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت صفیہ پندرہ سال کی اور احمد اللہ انیس سال کا تھا۔ وہ کچھ مہینے پہلے ایک سرکاری محکمے میں ملازم ہوا تھا۔ شادی کے بعد وہ اور صفیہ دارالحکومت میں آ کر رہنے لگے۔ وقت گزرتا گیا اور اولاد کی شدید چاہ کے باوجود ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ پانچ سال گزر گئے تب احمد اللہ کو یہ گھر ملا تھا۔ اس وقت یہاں بہت کم لوگ تھے اور نزدیک ہی جنگل تھا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کے بعد وہ پیروں فقیروں کے چکر میں پڑ گئی۔ احمد اللہ اسے منع کرتا تھا اور کہتا کہ جب نصیب میں ہوگی تو اولاد ملے گی، وہ کیوں غیر اللہ سے مانگتی ہے مگر اپنی چاہ کے آگے صفیہ کو کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

ایک دن وہ دروازے پر ریڑھی والے سے سبزی لے رہی تھی کہ ایک عجیب سے حلیے کا آدمی وہاں سے گزرنے لگا اور صفیہ کو دیکھ کر رک گیا۔ جب سبزی والا آگے بڑھ گیا تو اس آدمی نے اچانک کہا۔ ''اولاد چاہتی ہے؟''

یہ صفیہ کی دکھتی رگ تھی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ ''ہاں بابا۔''

''تب ادھر جنگل میں آ جانا۔'' آدمی نے پیچھے جنگل

کی طرف اشارہ کیا۔ ”جوگی کا ٹھکانا ادھر ہے...... اور ہاں ڈرنا مت، بے فکر ہو کر آنا۔“

جوگی کہہ کر چلا گیا۔ اگر معاملہ اولاد کا نہ ہوتا تو صفیہ ساری دنیا کے خزانوں کے بدلے بھی چند سو قدم دور جوگی کی جھونپڑی تک نہ جاتی مگر اولاد کی خواہش نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ اگلے ہی دن احمد اللہ کے دفتر جاتے ہی وہاں پہنچ گئی۔ جوگی کی جھونپڑی میں وہی سب کچھ تھا جو شامیر اور سونیا نے دیکھا تھا مگر اس وقت یہ سب تازہ تھا۔ جوگی جوان آدمی تھا۔ اس نے صفیہ کو دیکھ کر کہا۔ ”اچھا ہوا تو آ گئی ورنہ میں یہاں سے جانے والا تھا۔“

”جوگی بابا مجھے بچے کی خواہش ہے۔“

”ہر خواہش کی ایک قیمت ہوتی ہے، وہ دے گی؟“

”کیسی قیمت بابا؟“ صفیہ نے فکر مند ہو کر پوچھا اور جب جوگی نے اسے قیمت بتائی تو وہ مرجھا گئی تھی۔

”میں ایسا نہیں کرسکتی بابا، کسی کی گود کا پھول کیسے لا دوں۔“

”اگر اپنی گود بھرنا چاہتی ہے تو ایسا کر لے...... تیرے پاس بس دو دن ہیں۔“

صفیہ مایوس سی گھر واپس آ گئی اگر جوگی اس سے پیسا مانگتا تو وہ اپنے پاس موجود ہر چیز اسے دے دیتی مگر اس نے تو بچہ مانگا تھا وہ کہاں سے لاتی۔ اگلے دن دوپہر میں وہ صحن کی صفائی کر رہی تھی کہ باہر سے کسی بچی کی آواز آئی۔ وہ اپنی گڑیا سے باتیں کر رہی تھی۔ صفیہ نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو ایک چار پانچ سال کی پیاری سی بچی کپڑے کی گڑیا لیے کیاری کے کنارے بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ بچی نے خوب صورت فراک پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر صفیہ کے دل میں خیال آیا اور اس نے بچی کو اندر بلا لیا۔ وہ معصومیت میں اندر آ گئی۔ اس وقت صفیہ پر شیطان پوری طرح حاوی آ گیا تھا۔ اس نے اچانک بچی کا منہ دبا دیا اور اس وقت تک دبائے رکھا جب تک وہ بے ہوش نہیں ہو گئی۔ پھر اس نے اسے اپنی چادر تلے لیا اور جوگی کی جھونپڑی تک لے آئی۔ وہ باہر ہی موجود تھا۔ ایسا لگا جیسے اسے صفیہ کی آمد کا علم تھا۔ اس نے ہاتھ آگے کیے اور صفیہ نے بچی اس کے حوالے کر دی۔ وہ بچی کو لے کر جھونپڑے میں گیا اور کچھ دیر بعد آ کر اس نے بچی کی فراک اس کے حوالے کی۔ ”یہ لے اور یہاں سے جا...... ایک گھنٹے بعد آنا، تیرا کام ہو جائے گا۔“

صفیہ دھڑکتے دل کے ساتھ واپس آئی۔ اس وقت تک محلے میں شور نہیں اٹھا تھا۔ شاید بچی کسی اور گلی کی تھی اور کھیلتے ہوئے یہاں تک آ گئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد صفیہ پھر جوگی کی جھونپڑی تک آئی۔ جوگی باہر ایک بڑا سا جھولا لیے کھڑا تھا۔ اس میں نہ جانے بچی تھی یا کچھ اور تھا۔ جوگی نے ایک پڑیا اس کے حوالے کی۔ ”اسے پھانک لینا...... اور ہاں اگر تجھے کچھ نظر آئے تو اس سے اولاد کا کہنا۔ پھر وہ تجھے اپنی قیمت بتائے گا۔“

صفیہ نے جوگی سے پوچھنا چاہا کہ اسے کیا نظر آئے گا مگر وہ اس کی بات سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ صفیہ گھر آئی اور اس نے بچی کی فراک اور گڑیا ایک ایسی جگہ چھپا دیں جہاں احمد اللہ کی نظر نہیں جاسکتی تھی۔ رات سونے سے پہلے اس نے پڑیا کھائی اور رات جب وہ باتھ روم جانے کے لیے کمرے سے نکلی تو اسے صحن میں ایک سیاہ ہیولا نظر آیا۔ صفیہ کو جوگی کی بات یاد تھی اس لیے وہ ڈری نہیں۔ ہیولے نے اس سے پوچھا۔

”کیا چاہتی ہے مجھ سے؟“

”مجھے بچے کی خواہش ہے۔“

”اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔“

”مجھے منظور ہے۔“ صفیہ نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

”جتنی اولاد اتنی قیمت...... ہر اکیس سال بعد...... یاد رکھنا۔“ ہیولے نے کہا اور اچانک غائب ہو گیا۔ اس واقعے کے ایک سال کے اندر صفیہ کے ہاں پہلی اولاد بیٹے کی صورت میں ہوئی۔ وہ اتنی خوش اور مگن ہوئی کہ سب بھول گئی۔ پانچ سال بعد بیٹی ہوئی تو اسے لگا کہ اس کا گھر مکمل ہو گیا ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ جب بیٹا بیس سال کا ہونے والا تھا تو صفیہ نے خواب میں اسی ہیولے کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ قیمت لینے آ رہا ہے اور قیمت ایک انسانی جان تھی۔ صفیہ ڈری مگر اس نے اسے خواب قرار دیا۔ البتہ جب وہی ہیولا اسے رات کی تاریکی میں سچ مچ نظر آیا تب وہ جان گئی کہ یہ حقیقت ہے مگر وہ اسے کہاں سے انسانی جان کی قربانی دیتی۔ اس کے لیے تو اس گھر کی ہر جان قیمتی تھی۔ وہ کیسے کسی کی قربانی دیتی۔ ان دنوں اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور اسے رہ رہ کر وہ ہیولا نظر آتا۔ آخری بار جب وہ نظر آیا تو اس نے کہا۔

”تم نے جان نہیں دی لیکن میں نے چھین لی ہے۔“

اس سے اگلے دن ہی اس کے بیٹے کی طبیعت خراب ہوئی اور اس نے اسپتال میں ڈاکٹروں کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ صفیہ پاگل ہو گئی۔ جب وہ اولاد کی چاہ میں پاگل ہو رہی تھی اور اس نے قیمت دینے کی ہامی

بھری تھی مگر جب قیمت دینا پڑی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس نے کیا سودا کیا تھا۔ کتنے دن صفیہ سنبھل نہیں سکی اور وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی اس لیے اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ پھر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس نے یہ ڈائری لکھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا۔ اس نے کسی کی گود اجاڑی تھی اور نتیجے میں اس کی گود اجڑ گئی۔ اس نے ڈائری، بچی کی فراک اور کپڑے کی گڑیا ایک چھوٹے سرخ سوٹ کیس میں رکھ کر اسے اوپر کباڑ والے کمرے میں ڈال دیا تھا کبھی کبھی وہ وہاں جا کر ڈائری نکالتی اور اس میں اپنے احساسات تحریر کرتی۔ جب بیٹے کی موت کو اکیس سال ہونے کو آئے تو اس خوف سے اس کی حالت خراب ہونے لگی کہ پھر اس کی واحد رہ جانے والی اولاد کی شامت آئے گی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایسا ہونے سے پہلے مر جائے مگر موت بھی اپنی مرضی سے کہاں آتی ہے۔

صبا نے گہری سانس لے کر ڈائری بند کر دی۔ اس کی ماں یعنی صفیہ کو بالآخر اس کی مرضی کی موت آ گئی اور اس نے اپنی جان دے دی۔ اس نے کمرے میں جا کر گیس ہیٹر کھول دیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ جب تک صبا کو احساس ہوتا اور وہ دروازہ تڑوا کر اندر داخل ہوتی، گیس نے صفیہ کی جان لے لی تھی۔ شامیر نے اسے پتلے کے بارے میں بتایا اور عمیر نے جب اس کی سوئی نکالی تو نہ صرف صفیہ ٹھیک ہو گئی تھی بلکہ سونیا کے پیٹ کی تکلیف بھی ٹھیک ہو گئی تھی۔ صبا نہیں جان سکی کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اپنی ماں کا تو اس معاملے سے تعلق سمجھ آ گیا تھا مگر سونیا کا اس سے کیا تعلق تھا جو اس کے پیٹ میں درد ہوا؟ پھر عمیر نے پتلے سے سوئی نکال دی تو وہ ٹھیک ہو گئی۔ صبا ان چیزوں کی قائل نہیں تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی کسی کو نہ تو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ۔ اس نے بچوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ صفیہ کی موت اس کی نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر حادثاتی قرار پائی۔ ماں نے جو کیا وہ غلط تھا اور شاید اسی کی سزا بھی بھگتی لیکن صبا اور اس کی اولاد بے گناہ تھی۔ اس لیے اوپر والے نے ان کی حفاظت کی۔ صبا نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی اور سرخ سوٹ کیس میں موجود چیزیں ضائع کر دے گی۔ ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گی۔ صفیہ کے بعد مکان اس کی ملکیت تھا اور اس نے اسے فروخت کرنے کا سوچ لیا تھا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○



جو پیدا ہوا ہے، اسے لوٹ کر اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے۔ آج کوئی اور، تو کل ہماری باری ہے۔ ادارے سے اپنا قلمی کیریئر شروع کرنے اور مسلسل وابستہ رہنے والے ہونہار، نوجوان، باشرع، پیروں سے معذور مگر عزم و حوصلے کے پیکر اور صاحب طرز کہانی نگار، کاشف زبیر کئی ہفتوں تک علالت سے نبرد آزما رہنے کے بعد 22 فروری کی سہ پہر خالق حقیقی سے جا ملے۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○

ادارہ اور اس کے جملہ اراکین مرحوم کے پسماندگان کے اس صدمے اور غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیں کہ رب العزت انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔



شیش محل

اسماء قادری

قسط:8

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہولہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی وارداتِ قلبی کی عکاس دلچسپ داستان



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہے۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”آپ نے جواب نہیں دیا۔ کون ہیں آپ اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ فاروق ابھی حیران ہی کھڑا تھا کہ اس نے تیز لہجے میں دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

”خاکسار کو فاروق کہتے ہیں۔ اس بنگلے کے مالک مسٹر بھابیہ کا مہمان ہوں اور ظاہر ہے ان ہی کی اجازت سے یہاں مقیم ہوں۔“ فاروق کی حیرت پر وہ ناگواری غالب آ گئی جو اس نے لڑکی کے تحکمانہ لہجے پر اپنے دل میں محسوس کی تھی۔

”اوہ، آئی سی۔“ جواب میں اس نے ایک ادا سے ہونٹ سکوڑے اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کروانے لگی۔

”میں بملا بھابیہ ہوں۔ مسٹر بھابیہ کی اکلوتی بیٹی اور اس بنگلے کی مالک۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ تعارف سن کر فاروق کو یہ روایتی جملہ ادا کرنا پڑا اور دل ہی دل میں تسلیم کیا کہ بملا کا جو لہجہ اسے ناگوار گزر رہا تھا، وہ ایک طرح سے اس کا حق تھا۔ وہ بھابیہ کی بیٹی تھی اور ظاہر ہے اپنے باپ کے بنگلے کے باہر کسی اور کو راستے میں ڈٹا سوال جواب کرتا دیکھ کر خود اس نے ناگواری محسوس کی ہوگی۔

”اب آپ مجھے اندر جانے کا راستہ دیں گے یا نہیں؟“ اس نے فاروق کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر ایک طرف ہو گیا۔ بملا خوشبو کے جھونکے کی طرح اس کے قریب سے گزر کر اندر داخل ہو گئی۔ ولایتی لباس کے ساتھ ہی اس نے کسی ولایتی خوشبو کا بھی استعمال کر رکھا تھا۔ اس کے نظروں سے غائب ہو جانے کے بعد فاروق نے بے ساختہ ہی اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ پہلی نظر میں بملا اسے بہت کم عمر لگی تھی اس لیے اسے سامنے پا کر اسے ذرا بھی یہ گمان نہیں گزرا تھا کہ وہ بھابیہ سیٹھ کی بیٹی ہوگی کیونکہ بملا کے متعلق جو معلومات اسے حاصل تھیں، ان کے مطابق وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کا شوہر مر چکا تھا اور وہ

ایک کالج میں لیکچرار تھی۔ پہلی نظر میں بہت کم عمر نظر آنے والی بملا اس کے ذہن میں بسی ایک پختہ عمر عورت کے خیال پر پوری نہیں اتری تھی اس لیے وہ خطا کھا گیا تھا۔ اپنی اس غلط فہمی پر کچھ کچھ جھینپا ہوا وہ ملازم کو گاڑی کی ڈکی سے بملا کا سامان اتارتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ملازم بملا کے اندر جانے کے فوراً بعد ہی باہر آیا تھا اور اب ڈکی سے اس کا بھاری بھرکم سوٹ کیس نکال رہا تھا۔

"آپ کی چائے ریڈی ہے سر۔ آپ کدھر پینا پسند کریں گے؟" سوٹ کیس میں پہیے لگے ہوئے تھے لیکن ملازم نے اسے پہیوں پر چلا کر لانے کے بجائے اپنے کاندھے پر اٹھا رکھا تھا اور فاروق کے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اندر ڈائننگ ٹیبل پر ہی لے آؤ۔" فاروق نے اسے جواب دیا اور اس کے پیچھے ہی خود بھی اندر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔ ڈرائیور کے علاوہ اس بنگلے میں یہی ایک مستقل ملازم تھا جو باورچی خانہ بھی سنبھالتا تھا۔ البتہ صفائی اور برتنوں اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے مقامی آبادی سے صبح وشام ایک عورت وہاں آتی تھی۔ ملازم ہی سے اسے علم ہوا تھا کہ کسی خاص موقع پر جب مہمانوں کی تعداد زیادہ ہو تو وہ عورت اس کے کہنے پر اس کی مدد کے لیے بھی رک جاتی تھی۔ ظاہر ہے یہ خاص موقع بھاٹیہ سیٹھ کے یہاں قیام کے دنوں میں ہی آتا ہوگا اور سیٹھ شاید سال میں ایک آدھ بار ہی یہاں آپاتا تھا۔

بملا کا سوٹ کیس اس کے کمرے میں پہنچانے کے بعد ملازم نے فاروق کو چائے پیش کی۔ وہ چائے اچھی بناتا تھا بلکہ اس کے ہاتھ میں ہی ذائقہ تھا کیونکہ اس نے اب تک جو کچھ بھی پکا کر کھلایا تھا ان لوگوں کو پسند آیا تھا۔ وہ فاروق کو چائے پیش کر کے پلٹا ہی تھا کہ اوپری منزل سے بملا نے اسے پکارا۔ وہ فوراً سیڑھیوں کی طرف دوڑ گیا۔ یہاں رہتے ہوئے یہ بات پہلے ہی فاروق کے علم میں آچکی تھی کہ بنگلے کی اوپری منزل پر مالکوں کے کمرے ہیں۔

مالکان سے مراد بملا، منوہر اور بھاٹیہ سیٹھ خود تھا۔ مہمانوں کو عام طور پر نچلی منزل کے کمروں میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ چائے پینے کے دوران فاروق بملا کی یہاں آمد کے بارے میں غور کرنے لگا۔ بھاٹیہ کی زبانی جو حالات اس کے علم میں آئے تھے، ان کے مطابق بملا اچھی خاصی باغی لڑکی تھی جس نے پہلے باپ کی مرضی کے خلاف اپنی پسند سے اپنے سے کم مالی حیثیت رکھنے والے لڑکے سے شادی کی اور اس لڑکے کی خاطر باپ کی اتنی بڑی جائداد کو ٹھوکر مار کر چلی گئی۔ بدقسمتی سے اس کا شوہر ایک حادثے کا شکار ہو کر ہلاک ہو گیا اور بیوہ ہونے کے بعد سیٹھ نے کوشش کی کہ وہ اس کے بھتیجے منوہر سے شادی کر لے لیکن اس بار بھی بملا نے باپ کی خواہش سے انحراف کیا اور دوسرے شہر جا کر کالج میں ملازمت کرنے لگی۔ اب جبکہ منوہر مر چکا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ باپ بیٹی کے بیچ کوئی سمجھوتا ہو گیا ہے جب ہی بملا یہاں نظر آرہی تھی۔ ان ہی سوچوں کے درمیان اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ کیتھرائن اور گولو بھی وہاں چلے آئے۔ صبح کے سلام کے بعد ان دونوں نے بھی ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی کرسیاں سنبھال لیں۔

"مس صاحبہ کہتی ہیں وہ آپ لوگوں کے ساتھ ہی ناشتا کریں گی۔ کیا آپ ان کے آنے تک انتظار کرنا پسند کریں گے؟" ملازم نے نہایت مؤدب لہجے میں فاروق سے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں۔ انہیں آنے دو۔ ہمیں ناشتے کی ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔" فاروق نے اسے جواب دیا تو ملازم واپس پلٹ گیا جبکہ اس کے ساتھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے کہ یہ صبح صبح کن مس صاحبہ کا تذکرہ ہے۔

"مسٹر بھاٹیہ کی بیٹی مس بملا بھاٹیہ کی سواری سویرے سویرے ہی تشریف لائی ہے اور اب غالباً وہ ہمیں اپنی میزبانی سے نوازنے کے موڈ میں ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے ان کو اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر گولو اور کیتھرائن نے اس سے بملا کے سلسلے میں سوال جواب شروع کر دیے۔ وہ اپنی معلومات کی حد تک ان کے سوالوں کے جوابات دیتا رہا۔ تھوڑی دیر میں بملا سیڑھیاں اتر کر نیچے آتی دکھائی دی۔ اس وقت اس نے سفید رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی جو اس کی سروقامت اور گندمی رنگت پر جچ رہی تھی۔ ساڑی کے ساتھ ہی اس نے سرمئی رنگ کی ایک ہلکی سی شال بھی اپنے شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ یہ سردی کا موسم نہیں تھا لیکن بہرحال شملہ کی صبح بھی اور صبح صبح غسل کرنے والا ہلکی سی خنکی محسوس کرتا تھا۔

بملا نے بھی سفر کی گرد اتارنے کے لیے غسل کیا تھا۔ اس کے سیاہ بال پشت پر کھلے ہوئے تھے اور ان میں اچھی خاصی نمی تھی۔ فاروق کو وہ اس بملا سے خاصی مختلف نظر آئی جس سے آتے کے ساتھ ہی اس کا ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ بملا ماڈرن اور کم عمر نظر آتی تھی جبکہ اس وقت جو بملا اس کے سامنے تھی، وہ خاصی گریس فل اور میچور خاتون محسوس ہو

رہی تھی۔

''آئی ایم سوری۔ آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ اصل میں، میں ناشتے سے پہلے فریش ہونا چاہتی تھی۔ آئی ہوپ کہ آپ لوگوں نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔'' ڈائننگ ٹیبل کی سربراہی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے یہ چند جملے ادا کیے۔ اس کا لہجہ بہت ٹھہرا ہوا اور دلکش تھا۔ یقیناً جب وہ کلاس میں لیکچر دیتی ہوگی تو طلبا بہت دھیان سے اس کی بات سنتے ہوں گے۔

''اٹس او کے۔ ہم میں سے کسی کو بھی آپ کا انتظار گراں نہیں گزرا۔'' فاروق نے اسے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کروانے لگا اس دوران میں ملازم نے میز پر ناشتا لگانا شروع کر دیا تھا۔

''ہوں...... کرشن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کچھ بیمار ہیں اور ڈاکٹر کے دیے گئے تبدیلی آب وہوا کے مشورے پر یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' تعارف سننے کے بعد اس نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ ظاہر ہے وہ مالکن تھی اس لیے ملازم نے اس کے پوچھے بنا بھی بنگلے میں موجود ان اجنبی افراد کے بارے میں اسے معلومات فراہم کر دی ہوں گی۔ ناشتے کے دوران ہی اس نے فاروق کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں سوال وجواب کیے اور پھر اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے بے حد مختصر ناشتا کیا تھا۔ مکھن لگا ایک سلائس اور جوس کا گلاس بس یہ اس کا ناشتا تھا۔

''معاف کیجیے گا۔ میں تھکی ہوئی ہوں اور آرام کرنا چاہتی ہوں اس لیے آپ لوگوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔'' وہ ان سے معذرت کرتی ہوئی ڈائننگ روم سے رخصت بھی ہو گئی۔

''کچھ بھی نہیں کھایا۔'' گولو نے ڈائننگ ٹیبل پر موجود ڈھیروں دیسی وبدیسی ناشتے کے لوازم پر ایک نظر ڈال کر گویا بملا کی ناقدری پر افسوس کا اظہار کیا۔

''وہ کہہ تو گئی ہیں کہ تھکی ہوئی ہیں اور تھکن میں انسان سے زیادہ کھایا پیا کب جاتا ہے۔ تم جو ہو ان چیزوں سے انصاف کرنے کے لیے۔ تم مزے کرو۔'' فاروق نے اسے جواب دیا۔

''اپن تو کھائے گا ہی۔ مالک نے کھانے کے لیے ہی یہ ساری نعمتیں اوپر سے اتاری ہیں۔'' گولو نے نہایت متانت سے جواب دیا اور ایک ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فاروق اس کا جواب سن کر مسکرایا اور چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔ اس کا ناشتا بھی اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

خوب صورت پھول دار لانگ اسکرٹ میں ملبوس جوزفین کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ تھے۔ بڑی مدت بعد ملنے والا یہ نیا جوڑا پہن کر وہ کافی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ بچپن کا دور بس ختم ہوا ہی جاتا تھا اور نوجوانی کی آمد آمد تھی اور اسی حساب سے اس کے چہرے پر وہ روپ نظر آنے لگا تھا جو کسی منہ بند نوخیز کلی کا خاصہ ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ آج اسے خود بھی اپنا آپ اچھا لگا تھا اور وہ اپنے اندر کسی تبدیلی کی آہٹیں سن رہی تھی۔ یہ آہٹیں آتی جوانی کی آمد کا اعلان تھیں لیکن عموماً بدرنگ وبوسیدہ لباس سے تن ڈھانپنے والی جوزفین کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ خوب صورت ہے اور ہر گزرتا دن اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ اپنے آپ سے بے نیاز دن بھر وہ یا تو اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی یا اپنے اور جوزف کے گھر کے کام نمٹاتی رہتی۔ اسے تو یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ہمیشہ ہی سے اس کی محبت کا دم بھرنے والے جوزف کی محبت کے رنگ بدلنے لگے تھے اور وہ کچھ خاص نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کے لیے تو اب بھی جوزف ایک ایسا دوست تھا جس سے وہ خود بھی بے حد محبت کرتی تھی لیکن جوزف کی طرح ابھی اس کے دل نے اس محبت کو کوئی عنوان نہیں دیا تھا۔ وہ اس سے بڑی بے ریا محبت کرتی تھی اور جانتی تھی کہ جوزف بھی اسے بے تحاشا چاہتا ہے اور جوزف کی محبت سے تو سب ہی واقف تھے اسی لیے تو کسی نے جوزف کے اس کے لیے کرسمس کا خصوصی تحفہ لانے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا، نہ ہی اس بات میں کوئی معنی خیزی محسوس کی تھی۔

''یو آر لکنگ سو پریٹی۔'' تو لیا فیکٹری میں دن بھر مشقت کرنے والی اس کی ماں کو بھی آج بہت عرصے بعد فرصت ملی تھی کہ اس کی طرف غور سے دیکھ سکے اور دیکھا تھا تو بے ساختہ ہی تعریف بھی کر ڈالی تھی۔

''تھینک یو سو مچ مام۔ جوزف کی چوائس اچھی ہے۔ وہ میرے لیے اتنا بیوٹی فل ڈریس لایا ہے کہ اسے پہن کر مجھے اچھا لگنا ہی تھا۔'' اس نے ماں کی بات کا جواب دیا اور پیروں میں جوتے پہننے لگی۔ یہ جوتے پچھلے کرسمس پر اسے دلائے گئے تھے لیکن بے حد احتیاط سے پہننے کے بعد اب بھی اچھی حالت میں تھے۔ جوتے پہن کر

وہ سیدھی کھڑی ہوئی اور دیوار میں نصب گول دھندلے سے آئینے میں ایک بار پھر اپنا چہرہ دیکھا۔ آئینہ لمبائی کے رخ چٹخا ہوا تھا چنانچہ جب وہ اس میں اپنا عکس دیکھتی تھی تو وہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود سچائی اپنی جگہ قائم تھی اور آئینہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ اسے آواز دیتا ہوا جوزف گھر کے اندر آیا تو اس کی آنکھوں نے بھی یہی سچ کہا جسے اپنی دھن میں مگن جوزفین سن نہیں سکی۔

''تم ریڈی ہے جوزفین تو اب چلنے کا ہے۔ لیٹ ہو گیا تو پورا انجوائے نہیں کر سکے گا۔'' جوزف نے اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''یہ تو کب سے ریڈی ہے۔ بس مرر میں خود کو دیکھنے میں بزی ہے۔ کہتی ہے ممی جوزف نے اتنا بیوٹی فل ڈریس گفٹ کیا ہے کہ اس کو پہن کر میں بھی بیوٹی فل لگنے لگی ہوں۔'' جوزفین کی ماں نے ہنس کر جوزف کو بتایا۔

جوزف اس بات کو سن کر محض ہنس پڑا اور اسے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ خریدتے وقت اسے یہ ڈریس جتنا اچھا لگا تھا جوزفین کے تن پر سجنے کے بعد اس سے کئی گنا زیادہ خوب صورت لگ رہا ہے۔ اسے جوزفین کی سوچ اور طبیعت کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ پڑھ لکھ کر اپنے حالات بہتر بنانے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس کے لیے اس طرح کے براہِ راست اظہار بہت قبل از وقت بات ہو جاتی اور ممکن تھا کہ وہ ڈسٹرب ہو جاتی اس لیے جوزف کچھ کہنے میں احتیاط ہی کرتا تھا۔ پھر وہ خود بھی تو ابھی ایک نوعمر سا لڑکا ہی تھا جس کی اپنی بھی ایسی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے اپنے ہم عمر لڑکوں کو گلی کے نکڑ، دکانوں کے تھڑوں اور اسکول کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر لڑکیوں سے متعلق بہت کھلی گفتگو کرتے سنا تھا لیکن وہ خود جوزفین کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت خاص اور مقدس تھی۔

''اب چلو بھی۔ کیا یہیں کھڑے ہنستے رہو گے؟'' جوزفین کو ممی کے تبصرے اور جوزف کی ہنسی نے جھینپ میں مبتلا کر دیا تھا اور اسی جھینپ کو مٹانے کے لیے وہ جوزف سے تیز لہجے میں بولی تھی۔

''ہاں چلو، چلتے ہیں۔'' جوزف اس کے لہجے پر بوکھلاتا ہوا فوراً باہر کی طرف لپکا۔ جوزفین اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ دونوں اپنے کرسمس کو انجوائے کرنے جا رہے تھے۔ وہ ایسی غریب بستی کے باشندے تھے جہاں سانتا کلاز بھی مشکل ہی سے اپنی شکل دکھاتا تھا۔ مشنری سے وابستہ افراد کو اگر اس محلے کا خیال آ جاتا تھا اور وہ چندے کی رقم سے تحائف سے لدے پھندے سانتا کلاز کو اس طرف روانہ بھی کر دیتے تھے تو سانتا کے پاس موجود تحفے اس محلے میں بے سہارا پھرتے ننگ دھڑنگ بچوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں کم پڑ جاتے تھے اور یہ تحفے کوئی ایسے قیمتی بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ سستے چاکلیٹوں کا پیکٹ، کریم لگے بسکٹ، رنگ برنگی گولیاں، کچی پنسلیں، لکھنے کی تختیاں، پلاسٹک کے ہار بندے بس یہی کچھ ہوتا تھا سانتا کے پاس ان کے لیے۔ بچے ان تحفوں پر بھی ٹوٹ پڑتے تھے کیونکہ انہیں کوئی تحفے دینے والا تھا ہی نہیں۔ زندگی کے پہیے کو کسی نہ کسی طرح متحرک رکھنے کی مشقت میں مبتلا ان کے والدین کی اتنی استطاعت ہی نہیں تھی کہ کرسمس منا سکیں۔ وہ کرسمس کی صبح جاگنے پر اپنے بچوں کو ان کی کوئی من پسند شے یہ کہہ کر تحفتاً نہیں دے سکتے تھے کہ رات سانتا ان کے لیے یہ تحفہ دے گیا ہے۔ باپ کی زندگی میں جوزفین کے لیے پھر بھی چھوٹے موٹے تحفے آ جاتے تھے لیکن اس کے بعد اب کہیں جا کر اسے کسی نے کچھ دیا تھا اور اسے یہ تحفہ بہت پسند آیا تھا۔ اس کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ سردی کا موسم ہونے کے باوجود اس نے اپنے لباس پر کوئی گرم سوئیٹر یا شال نہیں لی تھی۔ اصل میں وہ اس بوسیدہ لباس پر اپنا گھسا ہوا، رنگ اڑا سوئیٹر پہن کر اس کی شان نہیں گھٹانا چاہتی تھی اس لیے سردی برداشت کرنا قبول کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے جوزف نے البتہ گرم کپڑے پہن رکھے تھے یہ اور بات کہ کپڑے اپنی بدرنگی اور خراب فٹنگ کے باعث خود یہ گواہی دے رہے تھے کہ انہیں لنڈا بازار سے خریدا گیا ہے۔ لنڈا بازار سے اس گھسے ہوئے سوٹ کی خریداری اس لیے ممکن ہو سکی تھی کہ ماں کا بخار غیر متوقع طور پر جلد اتر گیا تھا اور وہ دوا کے خرچ سے بچ جانے والے روپوں سے اپنے لیے یہ لباس خرید لایا تھا۔ باقی کے چند روپے اس نے اس سرکس میلے میں جانے کے لیے بچا لیے تھے جو خصوصاً کرسمس کی وجہ سے لگا تھا اور وہ جوزفین کو اس میں گھمانا چاہتا تھا۔

''تم نے کبھی سرکس دیکھا ہے جوزف؟'' اس کے ساتھ ساتھ چلتی جوزفین نے اس سے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں دیکھا ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

"وہاں بہت مزہ آتا ہے کیا؟" جوزفین نے دریافت کیا۔

"ہاں، بہت مزہ آتا ہے۔" اس کے معصوم اشتیاق کا جواب دیتے ہوئے وہ کبھی بھی یہ بتانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سرکس مزہ کرنے نہیں، جز وقتی کام کرنے جاتا تھا جس سے اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ کر سکے۔ ان کاموں میں سب سے اہم کام صفائی کا ہوتا تھا اور یہ صفائی کوئی معمولی نہیں ہوتی تھی۔ اسے انسانوں کے پھیلائے گند سے لے کر سرکس کے جانوروں کی غلاظت تک سب کچھ صاف کرنا پڑتا تھا۔

"تم کو بوائے ہونے کا بہت بینیفٹ ملتا ہے جوزف۔ تمہارا جو دل چاہتا ہے کرتے ہو اور جہاں دل چاہتا ہے چلے جاتے ہو۔" جوزفین نے اس پر رشک کیا۔ اس بار بھی جوزف بس مدبرانہ انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

راستے بھر جوزفین اس سے ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی اور پھر جب وہ سرکس والے میدان میں داخل ہوئے تو جوزفین گویا جہانِ حیرت میں داخل ہو گئی۔ مختلف کھانے پینے کی اشیا کے اسٹال، آرائش و زیبائش کی سستی اشیا کی دکانیں اور مختلف تماشوں کے لیے اعلان کرتے سرکس کے منتظمین و مداریوں کے علاوہ جھولوں والے۔

ڈولی والے جھولے کے قریب پہنچ کر تو جوزفین کا دل مچل مچل گیا۔ لکڑی کی ڈولیاں جن میں چھوٹی بڑی عمروں کے بچے بیٹھے ہوئے تھے، جھولے والے کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ یہ ڈولیاں اوپر نیچے حرکت کرتی تھیں اور لمحوں میں اوپر والے نیچے اور نیچے والے اوپر پہنچ جاتے تھے۔ حرکت کرتی ڈولیوں میں بیٹھے بچے پُرمسرت چیخیں مار کر اور بھی جوزفین کے دل کو لبھاتے تھے لیکن وہ اس جھولے پر بیٹھنے کی اپنی خواہش کو اس لیے پورا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی مٹھی میں گنتی کے چند ہی سکے دبے تھے جو اس کی ماں نے اسے اس میلے سے لطف اندوز ہونے کے لیے عنایت کیے تھے لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ان سکوں کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے چنانچہ اپنی خواہش کو دل میں ہی دبانے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا مگر جوزف نے اس کی خواہش کو اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا تھا چنانچہ اصرار کر کے اسے جھولے میں بٹھایا اور پیسے اپنے پلے سے دیے۔ خود وہ یہ کہہ کر ساتھ نہیں بیٹھا تھا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اور ایسے بچوں والے شوق نہیں رکھتا۔ جھولا جھلانے کے بعد وہ اسے اسٹالز کے درمیان لیے گھومتا رہا تھا۔ خریداری تو دونوں ہی کو نہیں کرنی تھی کہ جیب اجازت نہیں دیتی تھی لیکن وہاں موجود ہر شے کو انہوں نے بہت شوق سے دیکھا اور ان کی قیمتیں بھی معلوم کیں۔

"تو ادھر بیٹھ جوزفین۔ اپن تیرے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہے۔" جب وہ اسٹالز کے درمیان بہت دیر تک گھوم چکے تو جوزف نے اس سے کہا۔ وہ اس چھولداری کے قریب بیٹھ گئی جس میں سنا تھا کہ جل پری یعنی مچھلی کے دھڑ والی عورت رکھی گئی تھی۔ اس عورت کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کے شوق میں کئی من چلے اس چھولداری کا رخ کر رہے تھے۔ یہاں ترپالوں کی مدد سے کئی ایسے پارٹیشن بنائے گئے تھے جن کے باہر بڑے بڑے باتصویر بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ایک بندہ بھونپو پر اعلان بھی کرتا جاتا تھا کہ ترپال کے اس پار آنے والوں کے لیے کیسی حیرت و مسرت سے بھرپور لمحے منتظر ہیں۔

کہیں موت کا کنواں تھا تو کہیں رسی پر چلتے بازی گر......

کہیں بات بات پر مجمعے کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دینے والے جوکر کا تذکرہ تھا تو کہیں آگ کے دائروں سے گزر جانے والے ماہر انسان و حیوان کے قصے۔ اس نے اور جوزف نے سرکس کے اس میدان میں گھومتے ہوئے ہر طرح کا اعلان سنا تھا۔ ان کے دل اندر ہی اندر للچائے بھی تھے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں سے ایسے عجوبوں کو دیکھیں لیکن ایسے ہر تماشے کو دیکھنے کے لیے الگ سے ٹکٹ لینا پڑتا اور ٹکٹ کے لیے رقم ان کی جیبوں میں نہیں تھی۔ خالی جیبیں رکھنے والوں کے دل ناتمام خواہشات سے بھرے انہیں دبائے رکھنے میں ماہر ہوتے ہیں سو ان دونوں نے بھی اپنی خواہش کو دل میں دبا لیا تھا۔

جل پری والی چھولداری کے قریب بیٹھی جوزفین نے جوزف کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس اسٹال پر پہنچ گئی جہاں اس نے مختلف رنگوں کے نگوں والی انگوٹھیاں دیکھی تھیں۔ پلاسٹک کے نگینوں والی ان انگوٹھیوں کے نرخ ایسے تھے کہ وہ ان میں سے ایک عدد انگوٹھی خرید سکتی تھی۔ انگوٹھی اس نے پہلے ہی پسند کر لی تھی لیکن جوزف کی موجودگی میں خریدنے سے گریز کیا تھا۔ اب جو موقع ملا تو جھٹ پٹ جا کر خرید ڈالی۔ سلور کے ہلکے سے دھاتی رنگ میں جڑا کلیجی جیسے رنگ کا بیضوی نگینہ دیکھنے میں آنکھوں کو بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ انگوٹھی خرید کر واپس آئی تو جوزف ابھی واپس نہیں آیا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ کھانے پینے کی اشیا کے اسٹالز پر بہت زیادہ رش ہے، اس رش میں کچھ خرید کر لانے میں وقت تو لگنا ہی تھا چنانچہ وہ اطمینان سے بیٹھی جل پری سے متعلق بھونپو پر کیے جانے والے انکشافات سنتی رہی۔ بھونپو میں بولنے والے کا زورِ بیاں ایسا تھا اور اس نے جل پری کی اتنی خصوصیات گنوا ڈالی تھیں کہ لوگ اس طرف کھنچے چلے آرہے تھے۔ جوزفین نے جتنے پیسوں سے انگوٹھی خریدی تھی اتنے میں جل پری کو بھی دیکھ سکتی تھی لیکن اسے اپنی خریداری پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ یہ انگوٹھی اس نے جوزف کے لیے لی تھی اور جوزف کے لیے اتنی سی قربانی دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

''لے پکڑ، اسپیشل چنا چاٹ کی پلیٹ بنوا کر لایا ہوں تیرے لیے۔ ساتھ یہ ٹھنڈی سوڈے کی بوتل بھی ہے۔'' وہ اردگرد پھیلی رونق دیکھنے میں مگن تھی کہ اپنے قریب سے جوزف کی آواز سن کر چونکی۔ وہ چینی کی سفید پلیٹ اور سوڈے کی ہری بوتل ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا۔ جوزفین نے چینی کی پلیٹ کو تھام لیا۔ اس میں چنا چاٹ موجود تھی۔ پلیٹ میں رکھے سلور چمچے سے اس نے چاٹ کا مسالا ملایا اور پہلا چمچہ منہ میں ڈالا۔ پتلی دال، موسم کی سب سے سستی سبزی، موٹے چاول اور بے چھنے آٹے کی روٹی کھانے کی عادی جوزفین کی زبان کو اس تیسرے درجے کی چنا چاٹ کا ذائقہ بھی بہت عمدہ معلوم ہوا۔

''بہت ٹیسٹی ہے۔ تم بھی کھاؤ۔'' بے ساختہ تعریف کرتے ہوئے اس نے پلیٹ جوزف کی طرف بڑھائی جو سوڈے کی بوتل ہاتھ میں پکڑے اب اس کے برابر میں ہی بیٹھ گیا تھا۔

''تو کھا۔ اپن کا پیٹ ذرا گڑبڑ ہے تو اپن یہ نہیں کھا سکتا۔'' جوزف نے انکار کیا۔

''یہ تو بڑا برا ہوا۔'' جوزفین کو افسوس ہوا کہ جوزف کو اتنے مزے کی چیز سے محروم رہنا پڑے گا خود اسے چاٹ اتنی پسند آئی تھی کہ یکے بعد دیگرے تین چار چمچے منہ میں ڈالتی ہی چلی گئی۔ مرچیں ذرا زیادہ تیز تھیں، اس کی زبان جلنے لگی۔ جوزف نے فوراً اس کی طرف سوڈے کی بوتل بڑھائی۔ اس نے جلدی سے ایک بڑا سا گھونٹ لیا پھر خیال آنے پر بولی۔

''تم سوڈا تو پی سکتے ہو جوزف۔ سوڈے سے تو سنا ہے کہ پیٹ کی خرابی ٹھیک ہو جاتی ہے۔''

''نہ بھئی نہ۔ اپن نہیں پیتا سوڈا ووڈا۔ پی کر گلا خراب ہوگیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' اس نے فوراً ہی انکار کر دیا۔

''اور جو میرا گلا خراب ہوگیا؟'' چنا چاٹ اور سوڈے کی بوتل کے خوشگوار تجربے سے لطف اندوز ہوتی اس بار وہ ذرا سی ٹھٹکی اور جوزف کو غور سے دیکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''نہیں ہوگا...... تو آرام سے پی۔'' جوزف نے اسے تسلی دی۔

''نہیں۔ اگر تم نہیں کھاؤ پیو گے تو میں بھی کچھ حلق سے نیچے نہیں اتاروں گی۔'' وہ مضبوطی سے منہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

''تجھے بولا ہے نا کہ اپن کے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔'' جوزف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ سب میں نہیں جانتی۔ بس تمہیں بھی میرے ساتھ کھانا پینا ہوگا۔'' اس نے ضد کی کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہمیشہ اس کی خاطر قربانی دینے والا جوزف اس وقت بھی قربانی دے رہا ہے۔ یقینی طور پر اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ دونوں کے لیے الگ الگ چیزیں خرید سکتا اس لیے صرف جوزفین کے لیے لے آیا تھا اور خود اس لیے حصے دار نہیں بن رہا تھا کہ وہ دل بھر کر کھا پی لے۔

''کبھی کبھی تو بہت تنگ کرتی ہے۔ لا کھلا اور اگر میرے پیٹ کا درد بڑھا تا تو تم ذمے دار ہوگی۔'' جوزف کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ان دونوں نے مل کر چنا چاٹ کی پلیٹ اور سوڈے کی بوتل ختم کی۔ جوزفین کا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ گھر چلنے کو کہے گا لیکن اس نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ وہ اسے ایکروبٹ (بازی گر) کے کرتب دکھانے لے جا رہا ہے۔

''تمہارے پاس اس کے لیے پیسے ہیں؟'' جوزفین نے اس کا پروگرام سن کر تشکک سے پوچھا۔

''نہیں پر اپن کی، ٹکٹ دیکھ کر پبلک کو اندر چھوڑنے والے لڑکے سے فرینڈ شپ ہے۔ اس نے اپن کو بولا تھا کہ آجانا۔ موقع لگا کر وہ اپنے کو ایسے ہی اندر بھیج دے گا۔'' جوزف نے اسے بتایا۔ بغیر ٹکٹ کے تماشا دیکھنے جانے کا تجربہ جوزفین کے لیے انوکھا تھا۔ اسے آخری لمحے تک یہ ڈر رہا تھا کہ کوئی انہیں اندر جانے سے روک لے گا۔ وہ ذرا سیدھے سیدھے راستے پر چلنے والی کچھ کچھ ڈرپوک لڑکی تھی۔ اگر اسے کرتب دیکھنے کی اتنی شدید خواہش نہ ہوتی تو شاید کبھی اتنا خطرہ نہ مول لیتی۔ اندر جاتے ہوئے اس کے دل میں یہ خواہش بھی جاگی تھی کہ کاش جل پری کے ٹکٹ چیکر

سے جوزف کی دوستی ہوتی تو وہ کہانیوں میں سنی جل پری کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتی لیکن وہ ٹکٹ چیکر تو کوئی بڈھا پھونس تھا۔ اس سے بھلا جوزف کی کیسے دوستی ہو سکتی تھی۔

یہاں تو اس نے تقریباً اپنے ہی ہم عمر ٹکٹ چیکر سے یارانہ گھانٹ کر مطلب پورا کر لیا تھا۔ بازی گروں والے حصے میں آ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بازی گر نے ایسے ایسے کرتب دکھائے کہ اسے کئی بار اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بغیر کسی سہارے کے تنی ہوئی رسی پر چلنا اور مختلف کرتب دکھانا کوئی مذاق نہیں تھا۔ بازی گر کے فن نے اس کا دل موہ لیا اور جب وہ وہاں سے باہر نکل رہی تھی تو اس کے دل سے جل پری کو نہ دیکھ پانے کا غم نکل چکا تھا۔ واپسی کے راستے میں وہ جوزف سے بازی گر کے ایک ایک کرتب کو ڈسکس کرتی رہی اور وہ مدبرانہ انداز میں مسکراتا رہا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر اسے جوزف کے لیے خریدی گئی انگوٹھی یاد آئی۔

''ہیپی کرسمس جوزف۔'' اس نے انگوٹھی اس کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا؟'' جوزف انگوٹھی کو دیکھ کر بیک وقت حیران اور خوش ہوا۔

''میں نے تمہارے لیے کرسمس کا گفٹ لیا ہے۔ میرے پاس پیسے کم تھے نا تو بس یہی لے سکی۔'' اس نے کچھ جھینپتے ہوئے شرمندہ سے انداز میں بتایا۔

''اپن کے لیے تو یہ بھی بہت قیمتی ہے کیونکہ یہ تو نے اپن کے لیے لی ہے۔'' جوزف کی آنکھیں جھلملا سی گئیں اور اس نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔

''بہت بیوٹی فل ہے۔'' ساتھ ہی اس نے تعریف بھی کی۔

''سچ۔'' جوزفین اس کی تعریف پر کھل اٹھی۔

''بالکل سچ۔ اپن اسے ہمیشہ سنبھال کر رکھے گا۔'' جوزف نے اسے یقین دلایا۔ وہ اپنے قول میں کتنا سچا تھا، اس کی گواہ ڈائری پڑھتی جولیٹ خود تھی۔ لڑکپن کے دور میں جوزفین کی طرف سے تحفتاً ملی وہ انگوٹھی جس کا سلور رنگ کالا پڑ چکا تھا، ہمیشہ جوزف کے پاس رہی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس دور میں جو انگوٹھی اس کی درمیانی انگلی میں آتی تھی، وہ تنگ ہو جانے کے باعث بعد میں اپنی چھوٹی انگلی میں پہننے لگا تھا۔ مرتے وقت بھی وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں موجود تھی اور باوجود کوشش کے اتاری نہیں جا سکی تھی کیونکہ اس انگلی میں بھی وہ بے حد تنگ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے دعوے میں اتنا سچا اور پکا نکلا تھا کہ جوزفین کی دی ہوئی اس انگوٹھی کو مر کر بھی خود سے جدا نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

''فاروق بھائی کی طبیعت کیسی تھی؟ وہ ٹھیک تو تھے نا؟'' ربن کو شربت کا گلاس پیش کرتے ہوئے بجو نے اس سے دریافت کیا۔ ربن کو بمبئی پہنچے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر اڈے پر موجود افراد کھل اٹھے تھے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ خوب بھینچ بھینچ کر اس سے گلے ملیں لیکن اول تو ربن کا احترام اور دوسرے راموں کی سختی نے انہیں اپنے جذبات پر بند باندھنے پر مجبور کر دیا۔ رامو نے ان سب کو ربن کے گرد جمع ہوتے دیکھ کر ڈپٹ دیا تھا کہ دادا ابھی سفر سے تھکا ماندا واپس آیا ہے اس لیے اسے نہا دھو کر سفر کی دھول اور گرد اتارنے اور آرام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ربن بھی شاید ابھی میل ملاقات کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے اس نے رامو کو انہیں ڈپٹنے پر نہیں ٹوکا۔ وہ سارے خاموشی سے منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد ربن نے غسل کر کے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد اس نے رامو کو اپنے کمرے میں بلوایا اور اپنی غیر موجودگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ رامو اس کے کمرے میں آنے سے قبل بجو کو ہدایت دے کر آیا تھا اس لیے وہ ٹرے میں شربت کے گلاس اور کھانے کے دو تین ہلکے پھلکے آئٹم رکھ کر لے آیا تھا۔ کھانے کا وقت ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی اور رامو کا خیال تھا کہ راستے میں کھانا کھا لینے کا بتا کر آنے کے بعد کچھ کھائے پیے بغیر سو جانے والے ربن کو بھوک محسوس ہو رہی ہوگی۔ بجو نے نہایت پھرتی سے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی اور اب شربت کا گلاس ربن کو پیش کرتے ہوئے اس سے اپنے دل کی بات پوچھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہی ہے رے۔ پوری طرح ٹھیک ہو جائے گا تو لوٹ کر ادھر ہی آئے گا۔ کاہے کو اتنا پریشان ہوتا ہے۔'' ربن نے اسے تسلی دی۔

''اور گولو...... وہ کیسا ہے؟''

''مزے میں ہے سالا۔ پر تم لوگوں کو یاد بھی کرتا ہے۔'' ربن نے ہنس کر بتایا۔

''یہ اپنا بجو بے چارہ اداس ہو گیا ہے۔ اس کے فاروق بھائی اور گولو یہاں نہیں ہیں تو اس کا من ہی نہیں لگتا ہے۔ سچ بولوں استاد تو جب سے تم لوگ گئے ہو، اس کے بعد

آج رسوئی سے خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔ ورنہ تو اپن لوگوں کو تو یہ کچا پکا جلا بھنا پتا نہیں کیسا کیسا پکا کر کھلا رہا تھا۔'' رامو کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ سجو نے اس پر خفا سی نظر ڈالی اور احتجاج کے انداز میں بولا۔

''جیاذتی تو نہیں کرو استاد۔ اپن روز تم سے پوچھ کر تمہاری مرضی کا کھانا ہی پکا رہے تھے۔ ابھی کل ہی بکرے کا بھنا گوشت نہیں پکا کر کھلایا تھا کیا؟''

''سالے وہ خالی بھنا گوشت کہاں تھا۔ وہ تو جلا بھنا گوشت تھا۔'' رامو کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ اس بار سجو کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات ابھرے اور وہ آہستہ سے بولا۔

''وہ تو اپن ذرا فاروق بھائی کی طبیعت کے بارے میں سوچنے لگ گیا تھا تو دھیان ہنڈیا پر سے تھوڑی دیر کو ہٹ گیا اور ذرا سی لگ گئی۔''

''دیکھا دادا! یہاں سب کیسے دیوانے ہیں اس راجے مہاراجے کے۔ پکانے والے سے ڈھنگ سے پکایا نہیں جاتا اور کھانے والوں کے حلق سے نیچے اترنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دادا اور فاروق بھائی کے بغیر کھانے میں سواد نہیں آرہا۔'' رامو نے ہنستے ہوئے ربن کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

''اپنا ہیرو ہے ہی ایسا۔ اللہ نے کسی خاص مٹی سے اسے بنایا ہے کہ جو دیکھے اور ملے اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔'' ربن کا لہجہ بھی فاروق کی محبت سے چُور تھا۔

''بھگوان اسے جلدی اچھا کردے تاکہ اپنے اڈے کی رونق لوٹ آئے۔'' رامو نے خلوصِ دل سے دعا کی جس پر سجو اور ربن دونوں ہی کے دل آمین پکار اٹھے۔ دعا مانگنے والا کس کو پکار رہا تھا انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کیونکہ ان کے لیے اصل اہمیت اس خلوص اور محبت کی تھی جو وہ فاروق کے لیے اپنے دل میں رکھتا تھا۔

''جولی کا کیا حال ہے۔ باپ کے مرنے کا تو بہت اثر لیا ہوگا اس نے؟'' سجو کمرے سے چلا گیا تو ربن نے رامو سے دریافت کیا۔

''وہ تو لینا ہی تھا۔ جانی بتا رہا تھا کہ بالکل گم صم ہوگئی تھی۔ اپن کا تو اس سے ملنا ہوا ہی نہیں۔ بس کریا کرم میں باہر کے باہر ہی گیا تھا۔ جانی ہی ادھر کی ساری دیکھ ریکھ کرتا رہا۔ اپن کا تو ایک پیر ادھر تھا تو دوجا ادھر مجو والے اڈے پر بلکہ ادھر تو ذرا کم ہی رہا، زیادہ ادھر ہی ٹیم گزارا۔ مجو جنے کیسے چوکی پر بیٹھ گیا تھا، پر اڈا چلانے کا ڈھنگ اسے نہیں آتا تھا۔ بہت کم ڈھنگ کے بندے ہیں اس کے اڈے پر، سارے حرام خوروں کو جمع کر رکھا ہے۔ ایسے بے تھتے بیلوں کو نکیل ڈال کر رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ سالے بار بار رسی تڑاتے ہیں۔ سویرے جلدی اٹھنا، ورزش کرنا، چاقو اور خنجر زنی کی پریکٹس کرنا سب انہیں کھلتا ہے۔ علاقے میں بھی بڑی دھاندلی مچا رکھی تھی انہوں نے۔ جس کا جیسے من کرے اپنی چلا رہا تھا۔ پھل، سبزی اور گوشت والے سے لے کر نائی اور لوہار تک سب کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اپنا راج جان کر جدھر من بولے منہ مارتے پھر رہے تھے۔ مجو نے کھلا چھوڑ رکھا تھا کہ اسے اس کا حصہ پورا لا کردے دیں پھر جو چاہے موج مستی کریں۔ ایسے بے لگاموں کو اب حساب کتاب دینا پڑ رہا ہے اور اصول قاعدے سے چلنا پڑ رہا ہے تو بوکھلائے ہوئے ہیں۔ تمہارے نام کا ڈنڈا سر پر نہیں ہوتا تو رسی تڑوا کر بھاگتے۔ ابھی سمجھو سالے مجبوری میں دبے ہوئے ہیں پر کتنوں کے من میں کالک ہے کہنا مشکل ہے۔ ایک ایک پر نظر رکھنی پڑ رہی ہے۔'' رامو نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

''اپنے کو بھی یہ سب پتا ہے پر اپنے کو بھی چابک تھام کر سرکش گھوڑوں کو قابو کرنا آتا ہے۔'' ربن نے اسے جواب دیا اور حقے کی نے منہ سے لگا کر ایک ساتھ دو تین کش لیے۔ یہ حقہ سجو ہی کمرے میں رکھ کر گیا تھا۔ ربن کو اس کے استعمال پر بھی اور دوسرے معاملات کی طرح زبردست قابو حاصل تھا۔ پیتا تو یوں کہ بڑے بڑے عادی حقے بازوں کو مات دے دیتا لیکن پینے کے مواقع میسر نہ آتے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا اور نہ ہی وہ عادی افراد کی طرح طلب کے ہاتھوں ستایا ہوا نظر آتا۔

''جوزف کا افسوس کرنے اپن جولی کے پاس جائے گا۔ محلے داری میں بھی اپن کو اس کا خیال رکھنا ہی تھا، پر اپنے شہزادے کے دل کی رانی ہے تو اس کا حق اور بھی زیادہ بنتا ہے۔ یاد رکھنا رامو...... اپن بھی آگے پیچھے ہو بھی جائے تو جولی کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ کل کو شہزادہ شکایت نہ کرے کہ کوئی کمی رہ گئی۔''

''ٹھیک ہے دادا۔'' رامو نے اس کی ہدایت سن کر فرمانبرداری سے کہا۔

''اور یہ اپنی ثریا بانو کا کیا حال ہے۔ کوئی پریشانی تو نہیں اسے؟'' جولی کے بعد اسے ایک اور اہم معاملہ یاد آیا۔

''ٹھیک ہے وہ بھی۔ اپن نے اس کی طرف راشن دے کر بندہ بھیجا تھا پر اس نے شکریہ کہہ کر واپس بھجوا دیا۔ بولتی تھی سلائی کڑھائی کا کام کر کے اپنی روزی کما رہی ہے

اس لیے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' رامو نے اسے رپورٹ دی۔

''اچھی بات ہے۔ بندہ کسی کا دیا لے کر کھانے کے بجائے اپنے ہاتھ کی تھوڑی بھی کھائے تو زیادہ خوش رہتا ہے۔'' ربن کو ثریا بانو کا راشن لوٹا دینا برا نہیں لگا۔

''ہاں دادا یاد آیا۔ وہ غلامو آیا تھا۔ بولتا تھا کلکتے میں اس کے دور کے رشتے داروں میں ایک لڑکا ہے۔ اس کی بیوی بچی کو جنتے ہوئے مرگئی تھی۔ چھوٹی بچی کو ماں کے بنا پالنے میں اسے سخت مشکل ہو رہی ہے اس لیے چاہتا ہے کہ دوسری شادی کرلے۔ شادی کے لیے اس کی بس اتنی شرط ہے کہ عورت سمجھ دار اور ہمدرد ہو۔ بچی کی اچھی تربیت بھی کرے اور اس سے محبت سے بھی پیش آئے۔ غلامو بولتا تھا ثریا بانو کے لیے یہ رشتہ اچھا رہے گا۔ اپن بولا دادا آجائے تو اس کے کانوں میں بات ڈالتے ہیں۔ پھر جو دادا کی مرضی۔''

''اپنی کیا مرضی۔ اصل ہاں نہ تو ثریا بانو خود یا اس کے ماما مامی کر سکتے ہیں پر تو غلامو سے کہنا کہ اپن سے آکر مل لے۔ اپن پہلے لڑکے کے بارے میں ساری جانکاری کرلے پھر بات آگے بڑھائیں گے۔'' ربن نے اسے جواب دیا پھر دوسرے موضوع پر آگیا۔

''بھاٹیہ سیٹھ کا کام کیسا چل رہا ہے۔ کوئی شکایت تو نہیں ہے اسے؟''

''ارے نہیں دادا۔ سیٹھ تو بڑا خوش ہے۔ بولتا تھا تم لوگوں نے تو کمال کردیا۔ ایسے ایسے لوگوں سے بھاڑا نکلوا لیا جنہوں نے سال سوا سال سے ایک پائی بھی نہیں دی تھی اور جگہ خالی بھی نہیں کرتے تھے۔ اپن بولا سیٹھ چنتا نہ کرو۔ تم نے یہ ذمے داری ربن دادا کے اڈے کو دے دی ہے تو اب کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ دم بھی مار سکے۔ ہر مہینے پابندی سے کرایہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔'' رامو نے رپورٹ دی۔ بھاٹیہ سیٹھ نے اپنے اس قسم کے سارے کام ربن کے حوالے کردیے تھے۔ وہ اچھے خاصے کاروبار سے حاصل ہونے والے تگڑے منافع کو عمارتیں اور دکانیں خرید کر مزید منافع کما رہا تھا لیکن بعض کرائے دار کرایہ دینے کے معاملے میں بڑی آنا کانی کرتے تھے۔ سیٹھ کو شک تھا کہ کرائے داروں کی ہٹ دھرمی سے زیادہ یہ اس کے منشی کی نااہلی تھی جو ان لوگوں سے کرایہ وصول کرنے میں ناکام رہتا تھا چنانچہ اس نے منشی سے چارج لے کر یہ کام ربن کے حوالے کردیا تھا۔

گولڈن نمبر

سردار گھر میں داخل ہوا۔

بیوی۔ ''یہ آپ کے چہرے پہ کیا ہوا ہے؟''

سردار۔ ''کمبخت نادرہ والوں نے مارا ہے۔''

بیوی۔ ''کیوں؟''

سردار۔ ''ارے پتا نہیں، لگتا ہے پاگل ہوگئے ہیں۔ میں نے کہا کہ شناختی کارڈ کے گولڈن نمبر دکھاؤ تو پٹائی شروع کردی...... ہائے بہت درد ہو رہا ہے۔''

★...★★...★

وہم

ٹیچر۔ ''بچو! فعل ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی مثال دو۔ جیسے میں خوب صورت تھی۔ میں خوب صورت ہوں۔ میں خوب صورت رہوں گی۔''

بچہ۔ ''مس! آپ کو وہم تھا، آپ کو وہم ہے، آپ کو وہم رہے گا۔''

★...★★...★

ایک سردار کو نیند نہیں آرہی تھی، سوچا سگریٹ پی لے۔ ماچس کی تلاش میں پورا گھر چھان مارا۔ بالآخر مایوس ہو کر موم بتی بجھا کر سو گیا۔

مرسلہ۔ معراج محبوب عباسی، ہری پور، ہزارہ

تنبیہ

اسکول کے کوریڈور میں اکثر بچے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں نے ڈانٹتے ہوئے تنبیہ کی۔ ''اگر اب کوئی بچہ مجھے بھاگتا ہوا نظر آیا تو میں نے پکڑ لینا ہے اور دو لگانے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹا بچہ اکیلا بھاگتا ہوا آرہا تھا کہ میں نے پکڑ لیا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی بچے نے معصومیت سے کہا۔ ''دو لگالیں میم جی...... دو لگالیں پھر مجھے جانے دیں، مجھے جلدی ہے۔''

مرسلہ۔ عذرا ہاشمی، الائیڈ اسکول گڑھ موڑ

بھائیہ کا شمار ان دولت مندوں میں ہوتا تھا جو باقاعدہ کسی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے ذرائع آمدنی ایسے ہوتے ہیں جن پر قانون گرفت کر سکے لیکن وہ پیسے پر جان بھی دیتے ہیں اس لیے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ آتا ہوا پیسا کسی صورت رکنے نہ پائے۔ اب چاہے اس پیسے کے حصول کے لیے انہیں کسی کی گردن پر پیر ہی کیوں نہ رکھنا پڑے، اس کی انہیں پروا نہیں ہوتی۔ بے شمار ذرائع سے پیسا کمانے والے اس ساہوکار کو اس بات سے بھی تکلیف ہوتی تھی کہ دو کمروں کے فلیٹ میں رہنے والا خاندان جس کا سربراہ بیمار یا بے روزگار ہے، چند سو کی رقم ادا کرنے سے رہ جائے۔ وہ انسانی ہمدردی یا فلاحی کاموں میں پیسا خرچ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ ہاں ذاتی آرام اور عیاشی کے لیے بے دریغ دولت لٹا سکتا تھا جب ہی تو بمبئی کی فلم نگری میں بھی اپنا پیسا لگا رکھا تھا۔ بڑے بڑے پروڈیوسرز اس کے آگے پیچھے گھومتے تھے کہ وہ ان کی فلم پر پیسا لگائے کیونکہ وہ بہت دل کھول کر پیسا لگاتا تھا، یہ اور بات کہ اس کے لگائے گئے پیسے کا تاوان فلم کی ہیروئن یا کسی دوسری خوش شکل اداکارہ کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ معذور ہونے سے قبل تو وہ بہت ہی عیاش تھا البتہ اب معذوری اور آئے دن کی بیماری نے اسے لگام ڈال دی تھی۔

''سیٹھ خوش ہے تو یہ اپن کے لیے اچھا ہے۔ وہ تگڑی پارٹی ہے، اس سے بنا کر رکھنے میں اپنا فائدہ ہے۔ اب دیکھ کہ اسی کی وجہ سے فاروق شملہ میں کتنے مزے سے رہ رہا ہے۔ ان سیٹھ لوگوں کے بہت اوپر تک تعلقات ہوتے ہیں۔ اپنے کو کوئی مشکل ہوئی تو سیٹھ اپنا ساتھ دے گا۔ فاروق کی گرفتاری کا ٹیم یاد ہے نا تجھے۔ کیسے رات بھر خوار ہوئے تھے تب جا کر اس کا پتا چلا تھا۔ دیری ہو جانے کی وجہ سے اس کا اتنا نقصان بھی ہوا۔ سر کی چوٹ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اپن کا سینہ جلنے لگتا ہے اس وقت کو سوچ کر۔ اپنے پر ایسی نہیں گزرتی تو کبھی سیٹھ کی آفر کو نہیں ماننے والے تھے۔ اپنے جیسے آزاد طبیعت کے بندے کے لیے یہ ڈیوٹی بڑی بھاری ہے پر اپن فاروق کے لیے اور تم سب کے لیے راضی ہو گیا۔ حالات ویسے بھی بہت خراب ہیں۔ ایسے میں اپن بھی ذرا احتیاط سے چلے تو اچھا ہے۔'' ربن کچھ اداس تھا۔

''اپن سب سمجھتا ہے دادا۔ اپن نے اتنا ٹیم تمہارے ساتھ گزارا ہے۔ اپن کیسے نہیں سمجھے گا کہ تم نے کوئی کام کیوں کیا ہے۔'' رامو نے جیسے اس کی دل جوئی کی۔

''ادھر گورے کی بھی کوئی خبر ہے کہ نہیں۔ حرام کا جنا انگلستان سے واپس لوٹا کہ نہیں؟'' اس نے انگریز افسر ولیم کے بارے میں دریافت کیا۔ ولیم وہ شخص تھا جو مجو دادا کے ساتھ چاند بانو کے کوٹھے پر اس وقت پہنچا تھا جب فاروق چاند بانو کی پرزور دعوت پر وہاں اس سے ملنے گیا تھا۔ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہونے والی چاند بانو نے فاروق کی موجودگی میں کسی سے بھی ملاقات سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجو اور ولیم نے اس انکار کو اپنی بے عزتی جانا اور مرنے مارنے پر آ گئے۔ فاروق نے اکیلے ہونے کے باوجود بہت بہادری اور ذہانت سے ان لوگوں پر قابو پایا اور انگریز افسر ولیم کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکل گیا لیکن بعد میں ولیم نے اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے فاروق کو گرفتار کروا لیا۔ تھانے میں فاروق کو بے حد تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس تشدد کی ایک نشانی اس کے سر کی چوٹ بھی تھی۔ فاروق کے ساتھ اس سلوک کا بدلہ لینے کا ربن نے عہد کر رکھا تھا۔ مجو دادا کو اس کے اڈے پر اس کے لوگوں کے سامنے خاک چٹا کر اڈے کی گدی سے بے دخل کرنے کے علاوہ ساری عمر کے لیے چاقو پکڑنے سے محروم کر دینے کی سزا دی جا چکی تھی جبکہ ولیم اپنے انجام سے اس لیے بچ گیا تھا کہ وہ فاروق والے واقعے کے فوراً بعد اپنے خاندان کو ہندوستان سے منتقل کرنے کے لیے انگلستان چلا گیا تھا۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات کے باعث اپنے خاندان کو انگلستان واپس منتقل کر دینے والا ولیم خود واپس ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتا تھا اور ربن اس کی واپسی کا منتظر تھا۔

''ابھی کدھر سے لوٹے گا دادا... انگلستان کوئی قریب رکھا ہے کیا۔ سنا ہے ساتھ میں بہت سامان تھا اس واسطے پانی کے جہاز سے گیا ہے۔ واپس پھر کر آنے میں اسے ٹیم تو لگنا ہے نا۔'' رامو نے اسے جواب دیا تو وہ ذرا جھینپ گیا اور بولا۔

''یہ جو سینے میں آگ لگی ہے نا رامو، اس نے ساری عقل مار دی ہے۔ سامنے کی بات بھی نظر نہیں آتی۔''

''چنتا نہیں کرو دادا...... بدلہ تو اپنے کو لینا ہی ہے۔ وہ گورا افسر ہے تو اپن اسے اپنے شہزادے کی چوٹ، شا تھوڑی کر دے گا۔ پورا حساب دینا ہوگا اسے۔'' رامو نے اسے تسلی دی۔ اس کے بعد بھی وہ دونوں مختلف امور پر ایک

دوسرے سے گفتگو کرتے رہے۔ سجو نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ اٹھ کر سب کے درمیان آئے۔ دسترخوان پر بیچ بیچ بڑی رونق تھی اور سارے کمرے میں اشتہا انگیز خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ ربن کو اپنے درمیان پاکر کمرے میں موجود تمام افراد کے چہرے کھل اٹھے۔ کھانے کے دوران ربن سب کا حال احوال پوچھتا رہا اور انہیں فاروق کی طبیعت کے بارے میں تسلی دی۔ اس کی طرف سے بولنے کی اجازت پاکر سب ہی اپنی اپنی کتھا سنانے لگے۔ باتوں باتوں میں کھانا کیسے ختم ہوا پتا ہی نہیں چلا۔ خالی ڈونگے اور ڈشیں دیکھ دیکھ کر سجو کا خون بڑھتا رہا۔ وہ خوش تھا کہ آج بہت دنوں بعد اڈے پر رہنے والوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔

☆☆☆

چاند بانو نے سرخ بنارسی چوڑی دار پاجامے پر خوب گھیر دار سفید فراک پہنی ہوئی تھی۔ فراک کے دامن، آستینوں اور گلے پر سرخ موتیوں اور سنہری کلابتو کا کام بنا ہوا تھا۔ میک اپ آرٹسٹ نے لباس کے رنگ کے حساب سے اس کا شوخ میک اپ کیا تھا اور شوخ چمکتی سرخ لپ اسٹک میں اس کے بھرے بھرے ہونٹ نمایاں ہو رہے تھے۔ لباس ہی کی مناسبت سے اسے زیور بھی پہنایا گیا تھا۔ دودھیا کلائیوں میں بھر کر پہنی گئیں سرخ اور سنہری چوڑیاں، کانوں میں موجود سرخ نگینوں والے بڑے بڑے جھمکے، صراحی دار گردن میں موجود سنہری گلوبند اور ماتھے پر پورے چاند جیسا ٹیکا جس کے درمیان میں ایک بڑا سا نگ لگا تھا اور نیچے کے حصے میں چھوٹے چھوٹے سرخ موتی لٹک رہے تھے۔ میک اپ آرٹسٹ نے اسے بہت دل لگا کر تیار کیا تھا کہ ایسی پیاری شکل اور مکمل حسن فلم نگری سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی اسے کم ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔ ہر ہر زاویے سے اس کی تیاری کو جانچنے کے بعد سب سے آخر میں اس نے چاند بانو کے سر پر سرخ رنگ کا سنہری کام سے جھلملاتا دوپٹا ٹکایا۔ دوپٹا اس انداز سے اوڑھایا گیا تھا کہ صرف سر پر ٹکا ہوا تھا اور دونوں پلو پیچھے کی طرف گر رہے تھے۔

"اب کھڑی ہو کر خود کو آئینے میں دیکھو۔" ادھیڑ عمر میک اپ آرٹسٹ نے اسے قدآدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کے کہنے پر چاند بانو نے ذرا کی ذرا آئینے کی طرف دیکھا اور نظریں واپس پھیر لیں۔ اسے اپنے حسن سے آگہی تھی لیکن اس کے لیے یہ بے تحاشا حسن اس لیے اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ وہ اس کے ذریعے اپنے من کی مراد پانے کی امید نہیں رکھتی تھی۔ وہ جو پہلی نظر میں ہی اس کے دل میں کھب گیا تھا، اس پر کہاں اس حسن کا جادو چلتا تھا۔ اس نے اگر اس پر کبھی ستائشی نظر ڈالی بھی تو وہ نظر ایسی ہی تھی جیسی کسی خوب صورت منظر، تصویر، زیور، کپڑے یا برتن پر پڑنے والی نظر ہوتی ہے۔ جذبات سے خالی صرف اور صرف ستائش سے پُر نظر...... اور اس نظر کی بے اعتنائی نے اس کے لیے اس کا حسن بے معنی کر دیا تھا۔

"میں قربان جاؤں۔ یہ میری چاند بانو ہے۔ اللہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ کتنی حسین لگ رہی ہے۔ جاؤ میاں جا کر پروڈیوسر صاحب سے بولو کہ کوئی بکرا وغیرہ منگوائیں بے بی کا صدقہ دینے کے لیے۔" زمرد بائی جو کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے میک اپ روم سے باہر گئی تھی، اسی وقت واپس آئی اور چاند بانو کو دیکھ کر صدقے واری جانے لگی۔ حقیقت تھی بھی یہی کہ چاند بانو معمول سے کئی گنا بڑھ کر خوب صورت لگ رہی تھی حالانکہ آج وہ کوئی پہلی بار نہیں بنی سنوری تھی۔ ان کے پیشے میں تو کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ہی میدان مارنے کو اترا جاتا ہے لیکن اس تیاری اور اس تیاری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آج اس کا حسن فلم نگری کے معروف مشاق آرٹسٹ کے ہاتھوں سنور کر ایسی اچھوتی چھب دکھا رہا تھا کہ زمرد بائی بھی دنگ رہ گئی تھی۔

"مانتی ہیں نا بائی جی ہمارے فن کو۔" میک اپ آرٹسٹ اس کے بے ساختہ تبصرے کو سن کر فخر سے بولا۔

"کمال تو ہمارا ہے جو ہم نے ایسا نایاب ہیرا آپ کے حوالے کیا۔" زمرد بائی نے اس کی بات کا جواب دیا۔

"ہیرا جتنا نایاب ہو، اس کو تراشنے والے ہاتھوں کو اتنا ہی ماہر ہونا چاہیے بائی جی۔ نایاب ہیرا اگر کسی اناڑی جوہری کے ہاتھ لگ جائے تو اس کی قدر و قیمت بڑھنے کے بجائے گھٹ جاتی ہے۔ ایسے نایاب ہیروں کو تراشنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔" اپنے فن پر نازاں اس نے اپنے حق میں دلیل دی۔

"شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" زمرد بائی نے بات کو زیادہ طول نہیں دیا اور دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"شارٹ شروع ہونے ہی والا ہوگا۔ تم تو ریڈی ہو نا بے بی؟" اس بار اس کی مخاطب چاند بانو تھی۔ چاند بانو نے فقط اثبات میں سر کو جنبش دے کر اس کے سوال کا جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے فلم نگری میں قدم رکھنے پر زمرد بائی کتنی خوش ہے۔ اس کا تو جیسے یہ برسوں پرانا کوئی خواب تھا

جس کی تعبیر ہاتھ میں آنے پر وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ انہیں فلم اسٹوڈیو لانے کے لیے انیل کمار روزانہ گاڑی بھجواتا تھا۔ وہ گاڑی آنے سے بہت پہلے خود بھی جاگ جاتی تھی اور چاند بانو کو بھی جگا دیتی تھی کہ مبادا دیر ہو جائے اور انیل کمار کو شکایت ہو۔ خود وہ اس کی حفاظت کے لیے ساتھ ہی آتی تھی۔

انیل کمار نے کہا بھی تھا کہ وہ اپنے دھندے کا نقصان نہ کرے اور کوٹھے پر بیٹھ کر اپنا کاروبار چلاتی رہے۔ چاند بانو کا خیال وہ اپنی ذمے داری پر رکھے گا لیکن اسے یہ بات منظور نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے دُرِ نایاب کو بغیر چوکیداری کے ہرگز بھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی کہ اسے علم تھا ہر طرف چور اور لٹیرے گھوم رہے ہیں۔ کسی بھی وقت کوئی ہاتھ دکھا سکتا ہے۔ اس کے نہ ماننے پر انیل کمار نے زیادہ زور بھی نہیں دیا تھا کہ یہ تو فلمی دنیا کی ریت تھی کہ یہاں آنے والی لڑکیوں کے سرپرست ان پر کڑی نگرانی رکھتے تھے کہ کہیں کوئی ان کی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو اڑا نہ لے جائے۔

''مس چاندنی! آپ کا شارٹ ہے۔'' اسپاٹ بوائے نے ڈریسنگ روم میں جھانک کر چاند بانو کو اطلاع دی۔ انیل کمار کے مطابق چاند بانو ذرا غیر فلمی سا نام تھا اس لیے اس نے اس کے نام کو ذرا تبدیل کر دیا تھا۔ اس سے قبل چاند بانو کے لیے کوئی اور نام بھی تجویز کیا گیا تھا لیکن پھر چاندنی پر دونوں طرف کے لوگوں کا اتفاق ہو گیا اور اب وہاں سب اسے چاندنی ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

''تم چلو ہم آتے ہیں۔'' اسپاٹ بوائے کے لائے پیغام کا جواب زمرد بائی نے دیا اور پھر چاند بانو کی طرف دیکھا۔ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دے کر اپنے تیار ہونے کا اشارہ دیا اور پھر سبک سبک قدم اٹھاتی زمرد بائی کے پیچھے چل پڑی۔ چلنے سے اس کے پیروں میں پڑی سنہری پازیب کے گھنگرو بجنے لگے تھے۔ زمرد بائی کے پیچھے چلتی وہ سیٹ پر پہنچی تو عملے کو ہدایات دیتا انیل کمار اس کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اتنے مکمل حسن نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں انیل جی۔ اپنی چاندنی بے بی ہے یہ۔'' زمرد بائی کو اس کی حالت نے محظوظ کیا اور وہ ذرا تفاخر سے بولی۔

''یہ تو سچ مچ کی چاندنی ہے بائی جی۔ اس کی چکاچوند کے آگے تو سیٹ پر لگی لائٹیں پھیکی پڑ گئی ہیں۔'' انیل کمار اسے وارفتہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا تو زمرد بائی کھلکھلا کر ہنس دی البتہ چاند بانو نے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اسی طرح نظریں جھکائے گم صم سی کھڑی رہی۔

''ارے یہ اپنی چاندنی اتنی اداس کیوں ہے؟'' انیل کمار نے فوراً اس کی عدم دلچسپی کو محسوس کیا۔

''یہ تو ہے ہی خاموش طبیعت۔ کھل کر بہت کم ہنستی ہے۔'' زمرد بائی نے فوراً وضاحت کی۔

''اچھا ہی کرتی ہے۔ جس کی ادا ہی ایسی من میں کھب جانے والی ہے، وہ کھلکھلا کر ہنسے گی تو دیوانوں کا تو قتلِ عام ہو جائے گا۔'' انیل کمار ذرا عاشقانہ موڈ میں تھے۔

''شارٹ ریڈی ہے سر۔'' اس کے اسسٹنٹ نے اطلاع دی تو وہ سنجیدہ ہوا اور چاند بانو کو سین کے متعلق مختصر بریفنگ دینے لگا۔ اسکرپٹ وغیرہ تو پہلے ہی اسے دے کر ریہرسل کروائی جا چکی تھی۔ چاند بانو کی صورت میں اپنی اس تازہ دریافت پر وہ بہت خوش تھا۔ کوٹھوں سے اٹھ کر لڑکیوں کا فلمی لائن میں آنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن چاند بانو جیسا تراشا ہوا ہیرا ملنا خوش قسمتی تھی۔ اس کا لب ولہجہ دل نشین تھا اور وہ بمبئی کی عام طوائفوں کی طرح کھڑی بولی نہیں بولتی تھی بلکہ وہ تو اتنی با تہذیب تھی کہ اس پر لکھنؤ کی نواب زادی کا گماں ہوتا تھا۔ رقص اور موسیقی پر عبور تو چلو بہت سی طوائفوں کو ہوتا ہے لیکن وہ حرف آشنا بھی تھی۔ اپنے لیے لکھے گئے مکالمے نہ صرف بالکل صحیح تلفظ سے ادا کرنا جانتی تھی بلکہ ان کے مفہوم کو بھی روح کے ساتھ سمجھتی تھی، اس لیے اس کی اداکاری بہترین تھی۔ انیل کمار نے ابھی تک اس کے ایک دو مناظر ہی فلمائے تھے لیکن اس کی صلاحیتوں کو اچھی طرح بھانپ گیا تھا۔ اس نے اپنی فلم کے لیے جو کہانی منتخب کی تھی وہ بڑی اچھوتی سی تھی۔ چاند بانو کو جدید دور کی ایک ایسی لڑکی دکھایا گیا تھا جو پچھلے کسی جنم میں مغل شہزادی رہی تھی اور اپنے موجودہ جنم میں وہ بار بار ایسے خواب دیکھتی تھی جس میں اس کے پچھلے جنم کی باتیں سامنے آتی تھیں۔ انیل کمار نے اس کے پہلے جو دو مناظر فلمائے تھے، ان میں اس نے موجودہ جنم کی کالج گرل کا کردار ادا کیا تھا جبکہ آج اسے پچھلے جنم والی شہزادی کا منظر شوٹ کروانا تھا۔ اسی لیے تیاری بہت خاص تھی۔ منظر کی عکس بندی شروع ہوئی تو مغل شہزادی کے عالی شان کمرے کے سیٹ میں وہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ بیٹھ گئی۔ ایک ایسی شہزادی جس کا شوہر شادی کی پہلی رات ہی ہنگامی وجوہات کی بنا پر اسے چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ شاہی خاندان کے وقار کی خاطر شہزادی نے اس صورتِ حال پر لب سی لیے تھے لیکن اپنے محبوب سے عین ملن کی گھڑی میں جدائی پر وہ جس آزردگی اور کرب کا

شکار تھی، اس کا ہر تاثر اس کی آنکھوں میں تحریر تھا۔ کمرے کے دریچے میں کھڑی شہزادی رخصت ہوتے ہوئے محبوب کو افسردہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی آنکھوں میں افسردگی اور غم کے یہ تاثرات سجانے کے لیے چاند بانو کو اداکاری نہیں کرنا پڑی تھی۔ یہ سب تو یوں ہی اس کی آنکھوں میں لکھا تھا۔ نارسائی، جدائی، محرومی ایسی ہر شے سے وہ عمر کے اسی حصے میں واقف ہوگئی تھی۔

''شاندار۔'' سین شوٹ ہوگیا تو انیل کمار نے اسے داد دی۔ اس کے بعد اس کا دوسرا سین بھی اسی سیٹ اور اسی لباس میں تھا۔ یہ سین شہزادے کی ماں کے ساتھ تھا۔ اس کی عکس بندی بھی کامیابی کے ساتھ ہوگئی۔ اس سین کے بعد انیل کمار نے زمرد بائی اور چاند بانو کو اپنے ساتھ اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔

''ہم پہلے لباس وغیرہ تبدیل کر لیتے ہیں۔'' چاند بانو اپنی سج دھج سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس کا دل اب صرف اپنے محبوب نظر کے سامنے ہی سج سنور کر آنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن ستم یہ تھا کہ ایک وہی نہیں تھا اور دسیوں لوگ اس کے حسن کی تابناکیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ فلم بن کر ریلیز ہوجاتی تو دیوانوں کی تعداد بے شمار ہوجاتی۔

''ابھی رہنے دو۔ مجھے کہیں باہر جانا ہے اس لیے تمہارے چینج کرنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔'' انیل کمار نے بہانہ بنایا۔ وہ چاند بانو کو اسی روپ میں اپنے سامنے رکھنا چاہتا تھا اس لیے اسے چینج نہیں کرنے دے رہا تھا۔ چاند بانو نے بے بسی سے زمرد بائی کی طرف دیکھا اور اس کے اشارے پر انیل کمار کی بات ماننے پر مجبور ہوگئی۔

''ٹھنڈی بوتلیں لے کر آؤ چھوٹے۔'' انیل کمار نے آواز لگا کر اسپاٹ بوائے سے کہا پھر انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنے دفتر کی طرف چلا۔ اپنی مخصوص کرسی سنبھال کر ان دونوں کو اپنے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور باری باری ان دونوں کے چہرے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں چاند بانو کو الجھن میں مبتلا کر رہی تھیں چنانچہ اس کی جانب دیکھنے کے بجائے اپنی نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے جائزے کے بعد انیل کمار نے ایک گہرا سانس لیا اور زمرد بائی کی طرف متوجہ ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

''میں نے آپ کو ایک آفر کی تھی بائی جی...... اس کا کیا ہوا؟ آپ نے اس پر غور کیا؟''

''کیسی آفر؟'' زمرد بائی نے تجاہل برتا۔

''وہی ہیروئن کی ماں کے رول کی آفر۔ سچ کہتا ہوں بائی جی آپ اس رول کے لیے بالکل پرفیکٹ ہیں۔'' وہ جانتا تھا کہ زمرد بائی جان بوجھ کر تجاہل برت رہی ہے پھر بھی بڑے سکون سے اسے یاددہانی کروائی۔

''اس کا تو ہم نے آپ کو جواب دے دیا تھا انیل جی۔ ہمیں فلموں میں کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بس آپ، ہماری چاند بانو کو بڑی ہیروئن بنا دیں۔'' زمرد بائی نے بھی بے حد اخلاق سے اسے جواب دیا۔

''اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ چاند بانو کو ہندوستان کی سب سے بڑی ہیروئن نہ بنایا تو میرا نام بدل دیجیے گا لیکن آپ خود تو کام کرنے کی ہامی بھریں۔'' انیل کمار اپنے مطالبے پر ڈٹا ہوا تھا۔

''اس بات کو جانے دیجیے انیل جی۔ ہم ریٹائرڈ لوگ ہیں۔ اب کوئی کام کرنے کا دل نہیں چاہتا بس ان بچیوں کی سرپرستی کر لیتے ہیں وہی بہت ہے۔'' زمرد بائی اپنے انکار پر قائم رہی۔

'سرپرستی نہیں چوکیداری کرتی ہو تم چالاک عورت۔' انیل کمار نے دل میں تپ کر سوچا لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی سجائے رکھی اور خوشامدی لہجے میں بولا۔

''آپ نے بڑی جلدی کی بائی جی ریٹائرمنٹ لینے میں۔ ابھی کہاں آپ کا شباب ڈھلا ہے۔''

''یہ تو آپ کی نظر کا کمال ہے ورنہ اب وہ پہلے سی بات کہاں۔'' زمرد بائی نے بھی مسکرا کر اسے جواب دیا۔ البتہ چاند بانو کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ اس گفتگو کے دوران سخت بیزاری محسوس کر رہی تھی۔ زمرد بائی نے اس کی بیزاری کو بھانپ لیا اور اسپاٹ بوائے کی لائی ہوئی ٹھنڈی بوتل کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے موضوع گفتگو بدلا۔

''آپ نے بتایا نہیں انیل جی کہ کس مقصد کے لیے ہمیں یہاں لائے تھے...... باتوں باتوں میں آپ کا خاصا وقت ضائع ہوگیا۔ آپ کو تو کہیں جانے کی جلدی تھی نا۔''

''اوہاں۔'' انیل کمار جس کی نظریں چاند بانو پر جمی تھیں ذرا سا چونکا اور پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ لوگوں کو یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ فلم کے کچھ مناظر اور گانے کسی خوب صورت ہل اسٹیشن پر فلمانے کا پروگرام ہے اور ظاہر ہے چاندنی کو فلم یونٹ کے ساتھ جانا ہوگا تو یہ تیار رہے۔''

''اچھی بات ہے، ہم تیاری کر لیں گے۔ آپ بس یہ بتا دیں کہ کتنے دن بعد جانے کا پروگرام ہے اور کتنا عرصہ وہاں قیام رہے گا؟''

''پندرہ دن بعد نکلنا ہے اور تقریباً پندرہ سے بیس دن

کا اسٹے رہے گا۔ شیڈول تو ہم نے پندرہ دن ہی کا بنایا ہے لیکن مختلف مسائل کی وجہ سے اکثر آؤٹ ڈور شوٹنگ میں طے شدہ شیڈول سے ہٹ کر بھی وقت لگ جاتا ہے۔'' انیل کمار نے بتایا۔

''بس تو پھر جس دن آپ کا ڈرائیور فارغ ہو، ہمیں اطلاع کر دیجیے گا۔ وہ ہمیں ضرورت کے مطابق خریداری کروا لائے گا۔ ظاہر ہے پہاڑوں پر یہاں بمبئی میں پہنے جانے والے کپڑے اور جوتے تو مناسب نہیں رہیں گے نا اس لیے نیا سامان لینا پڑے گا۔'' زمرد بائی نے فوراً ہی مطالبہ کرڈالا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' انیل کمار نے جواب تو اثبات میں دیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے اس نے کوئی کڑوی گولی چبالی ہو۔ زمرد بائی اس کے تاثرات کو نظرانداز کرگئی اور مؤدبانہ لہجے میں بولی۔

''ماشاء اللہ دل کے بڑے کھلے ہیں آپ۔ چاند بانو کی قسمت اچھی ہے کہ پہلی ہی فلم آپ جیسے دل والے شخص کے ساتھ مل گئی ہے لیکن، آپ بھی کم خوش قسمت نہیں...... دیکھیے گا جب ہماری چاند بانو فلمی پردے پر جلوہ گر ہوگی تو آپ کی تجوریاں بھر جائیں گی۔'' انیل کمار کے ہامی بھر لینے پر زمرد بائی نے اس کی تعریف کی لیکن ساتھ میں خود کو بھی نہیں گرنے دیا اور انیل کمار کو جتا دیا کہ تمہارے ہاتھ جو ہیرا نایاب آگیا ہے اس کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ادا کرنا ہی پڑے گی چنانچہ اگر وہ شاپنگ کروائے گا تو ان پر کوئی احسان نہیں کرے گا۔ بظاہر مسکرا کر سب سنتا انیل کمار اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔

''تجوریاں میری نہیں بھائیہ سیٹھ کی بھریں گی کیونکہ پیسا تو سارا اسی نے لگایا ہے۔ میرے حصے میں تو بس چند فیصد کا منافع ہی آئے گا۔ رہی دل کے بڑے ہونے کی بات تو تمہاری خریداری کا بل کونسا میری جیب سے جائے گا۔ وہ بھی سیٹھ ہی بھرے گا۔ آخر اس نے کہا تھا نا کہ تمہارا بہت خیال رکھا جائے تو اس خیال داری کا بل تو اسے ہی ادا کرنا ہوگا۔''

''ہم شوٹنگ کے لیے کون سے ہل اسٹیشن جائیں گے انیل جی؟'' اب تک خاموش سامع کا کردار ادا کرنے والی چاند بانو نے اچانک ہی سوال کیا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی ٹھنڈی بوتل کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور اسے اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ آپس میں گفتگو کرنے والے ان دو افراد کے دلوں میں کیا ہے۔ وہ تو بس ہل اسٹیشن کے لفظ

مہکتے موتی

☆ جس نے رب کے آگے جھکنا سیکھ لیا وہی علم والا ہے کیونکہ علم والے کی پہچان عاجزی ہے اور جاہل کی پہچان تکبر۔

☆ زندگی جینے کے دو راستے۔ بھول جاؤ ان کو جن کو معاف نہیں کرسکتے اور معاف کردو ان کو جن کو بھول نہیں سکتے۔

☆ مصیبت کا مقابلہ صبر سے کرو اور نعمت کی حفاظت شکر سے۔

☆ جس طرح بیمار ہونے کی صورت میں کھانے کی لذت محسوس نہیں ہوتی، اسی طرح گناہوں کی موجودگی میں عبادت کی لذت محسوس نہیں ہوتی۔

☆ جو لوگ اپنی دعاؤں میں دوسروں کو شامل رکھتے ہیں خوشیاں سب سے پہلے ان کے دروازے پر دستک دیتی ہیں۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، الفرید گارڈن، پاکپتن شریف

پر چونک گئی تھی۔

''تم کہاں جانا چاہتی ہو؟'' اس کی دلچسپی کو محسوس کر کے انیل کمار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''شملہ۔'' اس نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ ہل اسٹیشن کا ذکر سنتے ہی اسے خیال آیا تھا کہ فاروق شملہ گیا ہوا ہے اور کیا ہی اچھا ہو کہ فلم یونٹ بھی شملہ پہنچ جائے تو ملاقات کی کوئی سبیل نکل آئے گی۔

''خوش ہو جاؤ۔ ہم شملہ ہی جارہے ہیں۔'' انیل کمار نے ہنس کر اسے بتایا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس میں آنے والی اس تبدیلی کو انیل کمار نے بہت اچھی طرح محسوس کیا۔

''لگتا ہے کہ شملہ میں کچھ خاص ہے جو ہماری اداس ہیروئن کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی ہے۔''

''نن...... نہیں۔ وہ بس ہم نے شملہ کی خوبصورتی کے بارے میں بہت سن رکھا ہے تو اس لیے وہاں جانے کا سن کر خوشی ہوئی۔'' اس نے گڑبڑا کر وضاحت کی۔

''چلو۔ جیسے ہی سہی تم خوش تو ہوئیں۔'' انیل کمار نے اسے نثار ہونے والی نظروں سے دیکھا۔

''اچھا انیل جی۔ اب ہم کو اجازت دیجیے۔ کام کی

بات تو ہوگئی، اب بے بی ذرا آرام کرلے۔ دیکھ رہے ہیں نا کتنی الجھی ہوئی بیٹھی ہے۔'' زمرد بائی فوراً چونکی ہوئی اور لبوں پر بظاہر مسکراہٹ سجا کر انیل کمار سے اجازت چاہی۔

''ہاں ہاں بالکل۔ آپ لوگ جائیں۔ میں بھی اپنے کام سے نکلتا ہوں۔'' اندر ہی اندر دانت کچکچاتے انیل کمار نے بھی اخلاق سے جواب دیا۔ فلمی ہیروئن بننے کے لیے آنے والی لڑکیوں کو شیشے میں اتارنے اور اپنے دام میں پھنسانے کا ہنر وہ خوب جانتا تھا۔ اوپر والے نے شخصیت ہی اچھی دی تھی اور اسے ٹپ ٹاپ سے رہنا بھی آتا تھا اس لیے کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ اگر کوئی لڑکی اس کی شخصیت اور چکنی چپڑی باتوں کے جال میں نہیں پھنستی تھی تو دھونس اور دھمکی سے بھی کام چل جاتا تھا کیونکہ وہ ایک کامیاب فلم میکر تھا اور فلمی دنیا میں راج کرنے کی خواہش مند کوئی لڑکی اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں گنوانا چاہتی تھی۔ چاند بانو کے سلسلے میں اسے فقط اس لیے احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا کہ بھالیہ سیٹھ کی طرف سے اس کا خیال رکھنے کی خصوصی ہدایت دی گئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھالیہ سے بگڑے چنانچہ رال ٹپکنے کے باوجود خود کو باندھ کر رکھنے پر مجبور تھا۔

''بہت بدمعاش آدمی ہے یہ انیل کمار۔ اس سے بہت بچ کر رہنا ہوگا تمہیں۔'' وہ دونوں ڈریسنگ روم میں واپس آئیں تو وہاں کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر زمرد بائی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چاند بانو جواب میں کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے اپنے زیورات اتارنے لگی۔

''چالاک آدمی ہمیں فلم میں کردار کی پیشکش کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ آدمی کی آنکھیں دیکھ کر اس کے اندر تک کا حال جان لیتے ہیں۔ ہمیں بے وقوف بنانے چلا تھا جیسے ہم تو اس کی چالبازی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہم کام کرنے کی ہامی بھر لیتے تو یہ ہمیں یہاں کام میں الجھاتا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر شملہ چل پڑتا لیکن ہم نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیل رکھیں جو ایسے ہتھکنڈوں سے زیر ہو جائیں۔'' زمرد بائی بولتی جا رہی تھی اور وہ دھیمے سروں میں گنگناتے ہوئے مغل شہزادی کے گیٹ اپ سے نجات حاصل کر رہی تھی۔ اسے شہزادی بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ تو اپنے من مندر میں بسے دیوتا کی داسی بن کر رہنے میں بھی خوش تھی اور اس داسی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان فضاؤں میں پہنچ جائے جہاں اس کے دل کا شہزادہ موجود ہے۔

☆☆☆

''ہیلو۔'' براؤن پینٹ کے ساتھ چیک دار بش شرٹ زیب تن کیے فاروق ملازم کرشن سے بات کر رہا تھا کہ سیڑھیاں اترتی بملا نے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''صبح بخیر۔'' فاروق نے اس کی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ آج ناشتے کی میز پر بملا ان کے ساتھ نہیں تھی بلکہ اس نے کل دوپہر اور رات میں بھی ان کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا اور ملازم نے اس کے بارے میں صرف اتنی خبر دی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔ دونوں ٹائم ملازم کو کھانے کی ٹرے لے کر اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے البتہ سب ہی نے دیکھا تھا اور آج بھی جب وہ ناشتے میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئی تھی تو یہی سوچا تھا کہ وہ ناشتا اپنے کمرے میں ہی کرے گی۔ وہ یہاں ان کے لیے نہیں آئی تھی اور نہ ہی وہ اس کے مہمان تھے۔ اس لیے اس کے ایسے کسی رویے پر شکوہ و شکایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' اس نے فاروق کے پیروں میں گھریلو استعمال کے سلیپرز کے بجائے براؤن جوتے دیکھ کر سوال کیا۔

''بس ذرا پوسٹ آفس تک جانا ہے۔ کرشن سے اسی کا پتا سمجھ رہا تھا۔'' اس نے بملا کے سوال کا جواب دیا۔

''کچھ پوسٹ کروانا تھا تو کرشن کو دے دیتے، یہ جا کر پوسٹ کروا دے گا۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''نہیں۔ میں خود پوسٹ آفس جانا چاہ رہا تھا۔ اس بہانے تھوڑا سا شملہ بھی دیکھ لوں گا۔''

''اگر یہ بات ہے تو میرے ساتھ چلیے گا۔ میں بھی باہر گھومنے ہی جا رہی تھی۔ میں آپ کو تھوڑا نہیں بہت سارا شملہ دکھا دوں گی۔ بس آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ میں بریک فاسٹ لے لوں پھر نکلتے ہیں۔ آپ کو جلدی تو نہیں ہے نا؟'' بملا کی پیش کش اچھی تھی اس لیے اس نے انکار نہیں کیا اور بولا۔

''آپ آرام سے ناشتا کریں۔ مجھ جیسے بے کار آدمی کو بھلا کیا جلدی ہوگی۔ دن رات آرام کرنے کے علاوہ کام ہی کیا ہے۔''

''بہت بیزار لگ رہے ہیں۔'' بملا نے ڈائننگ چیئر سنبھال لی اور اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ اس وقت وہ بہت تروتازہ لگ رہی تھی۔ سیاہ پتلون پر پہنی سرخ جرسی اس کی گندمی رنگت پر جچ رہی تھی۔

ہونٹوں پر سرخ ہی رنگ کی لپ اسٹک تھی اور سیاہ بالوں کو پیچھے کی طرف سمیٹ کر ان کی پونی ٹیل بنائی گئی تھی۔ اس حلیے میں آج پھر وہ کوئی کالج گرل محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی سج دھج سے بالکل بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیوہ ہے۔ ہندو خاندانوں سے تعلق رکھنے والی بیوہ عورتوں کے بارے میں فاروق کا تجربہ تھا کہ وہ سفید لباس میں نہایت سادگی سے رہتی ہیں اور اپنی مرضی یا معاشرتی دباؤ کے باعث زندگی کی ساری خوشیوں کو خود پر حرام کر لیتی ہیں لیکن بملا کو دیکھ کر ذرا بھی یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بیوہ ہے اور عین جوانی میں اپنے محبوب شوہر کو کھونے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے لیے اس نے اپنے باپ، گھر بار اور دولت و جائداد سب کو ٹھکرا دیا تھا، اس سے چھن گیا تھا لیکن وہ غمگین نظر آنا تو دور کی بات بہت مطمئن اور تر و تازہ نظر آتی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اس نے اپنی سج دھج کے پیچھے اپنا غم چھپا لیا تھا یا وہ ترکِ رسوم کی قائل تھی اس لیے ہندومت کی روایات کے مطابق بیوہ عورت کا چولا پہننا منظور نہیں کیا تھا۔

”آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟“ کانٹے کی مدد سے توسٹ اور آملیٹ کے ٹکڑے منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بملا نے اس سے دریافت کیا تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ بملا کے ناشتے کے علاوہ ملازم اس کے اپنے سامنے پھلوں کے تازہ رس کا گلاس رکھ گیا تھا۔ یہ ملازم کو کیتھرائن کی ہدایت تھی کہ فاروق کو زیادہ چائے کافی نہ دی جائے اور خاطر کرنا مقصود ہو تو جوس پیش کیا جائے چنانچہ اس وقت اس کے آگے جوس کا گلاس رکھا تھا۔

”وہ دونوں ٹیلی ویژن پر کوئی فلم دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور شاید اسی کے انتظام میں مصروف ہیں۔“ اس نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے انہیں ان کے پروگرام کے مطابق فلم دیکھنے دیں اور آپ میرے ساتھ میرے پروگرام میں شامل ہو جائیں۔“ وہ بہت نفاست کے ساتھ کانٹے اور چھری کی مدد سے توسٹ اور آملیٹ کھا رہی تھی۔ اس کی ایک ایک جنبش سے ظاہر تھا کہ اس کی پرورش مخصوص ماحول میں ہوئی ہے۔ وہی مخصوص ماحول جو بہت زیادہ پیسے والے لوگوں کے گھروں میں ہوتا ہے اور بچوں کو ان کی ماؤں سے زیادہ تربیت یافتہ و تجربہ کار گورنس اور ٹریز زندگی گزارنے کے ادب و آداب سکھاتی ہیں۔

”میرے شامل ہونے سے آپ کا اپنا پروگرام تو ڈسٹرب نہیں ہوگا؟“ فاروق نے جوس کا ایک گھونٹ بھرا اور اس سے دریافت کیا۔ جوس واقعی تازہ اور فرحت بخش تھا۔

”اگر اس بات کا ڈر ہوتا تو میں آپ کو آفر ہی نہیں کرتی۔“ اس نے نظر اٹھا کر پل بھر کے لیے فاروق کی طرف دیکھا اور جواب دے کر اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اب وہ خود بھی پھلوں کا رس پی رہی تھی۔ آج بھی اس نے بہت مختصر ناشتا کیا تھا۔ شاید وہ تھی ہی کم خوراک اسی لیے دبلی پتلی اور نازک سی تھی اور ذرا سی خود پر توجہ دے کر اصل عمر سے کہیں کم نظر آنے لگتی تھی۔

”تو پھر چلیں۔“ چند منٹوں میں ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے فاروق سے پوچھا۔

”بالکل۔“ وہ جو پہلے ہی اپنا جوس کا گلاس خالی کر چکا تھا، فوراً کھڑا ہو گیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آئے تو کرشن گاڑی میں بڑا سا ہاٹ پاٹ اور پانی کا کولر رکھتا ہوا نظر آیا۔ بنگلے پر ڈرائیور سمیت گاڑی موجود تھی لیکن بملا نے اپنی ہی گاڑی کا انتخاب کیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس نے فاروق کے لیے اپنے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھنے کے بعد گاڑی آگے بڑھائی۔ پہلے وہ پوسٹ آفس پہنچے۔

”آپ اپنا لیٹر پوسٹ کر آئیں۔ میں یہیں آپ کا ویٹ کرتی ہوں۔“ پوسٹ آفس کی پرانی سی عمارت کے سامنے گاڑی روک کر بملا نے اس سے کہا تو وہ اپنے ہاتھ میں موجود چمڑے کا چھوٹا سا بیگ لیے گاڑی سے اتر گیا۔ پوسٹ آفس کی سیڑھیاں چڑھ کر بیگ میں موجود دو لفافوں کو پوسٹ کروانے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ اس نے اڈے کے سب ساتھیوں کے لیے ایک مشترکہ خط لکھا تھا۔ جس میں اپنا تفصیلی احوال درج کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کی فرداً فرداً خیریت دریافت کی گئی تھی۔ شملہ سے واپسی کے بعد ربن حسبِ وعدہ اس سے فون پر رابطے میں تھا لیکن دو تین منٹ کی اس کال سے اس کے ساتھیوں کی وہ تشفی نہیں ہو سکتی تھی جو اس کے ہاتھ سے لکھے اس تفصیلی خط سے ہوتی اس لیے اس نے خط کا تردد کیا تھا۔ دوسرا خط چاند بانو کے نام تھا۔ وہ یہاں آتے ہوئے اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ خط کے ذریعے اپنے احوال سے آگاہ رکھے گا چنانچہ اس وعدے کو ایفا کرنے کے لیے اس خط کی بہت ضرورت تھی۔ کیتھرائن اسے زیادہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ اس سے ذہن پر زور پڑنے کا احتمال تھا اس لیے اس نے وقفے وقفے سے یہ دونوں خطوط مکمل کیے تھے۔ خطوط پوسٹ کرنے کے بعد وہ باہر آیا۔ بملا اس کی

منتظر تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی پھر پوچھنے لگی۔

"کہاں چلنا پسند کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے شملہ میں کونسی جگہ پہلے دیکھنا چاہیں گے؟"

"جہاں آپ مناسب سمجھیں۔ میں پہلی بار شملہ آیا ہوں اور یہاں کے قابلِ دید مقامات کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا لیکن آپ تو یقیناً شملہ کو اچھی طرح جانتی ہوں گی۔"

"کیوں نہیں۔ شملہ پورے ہندوستان میں میری سب سے پسندیدہ جگہ ہے۔ جب بھی موقع ملے، میں یہاں ضرور آتی ہوں۔ یہ میری ممی کی جنم بھومی بھی ہے۔ جس بنگلے میں ہم رہ رہے ہیں وہ میرے نانا نے ممی کو جہیز میں دیا تھا اور ممی نے میرے پیدا ہوتے ہی میرے نام کر دیا تھا۔ یہاں آکر مجھے اس لیے بھی بہت اچھا لگتا ہے کہ شملہ کی خوب صورتی دیکھنے کے ساتھ ساتھ میں ممی کو بھی محسوس کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں گھومتے پھرتے ہوئے ممی بھی میرے ساتھ ساتھ ہر جگہ موجود ہیں۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی اداسی کے رنگ جھلکنے لگے تھے۔ فاروق کو اس کی بات سن کر سمجھ آیا کہ اول ملاقات میں جو اس نے خود کو بنگلے کی مالکن قرار دیا تھا تو وہ دعوئ ملکیت محض بھابیہ کی بیٹی ہونے کے زعم میں نہیں تھا وہ حقیقتاً اس بنگلے کی مالکن تھی۔ "یہ کرسٹ چرچ ہے۔" ایک قدیم عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے فاروق کو بتایا۔ عمارت خاصی پرانی لگتی تھی لیکن یہ پرانا پن بس طرزِ تعمیر کی حد تک ہی تھا ورنہ عمارت کی حالت بہت عمدہ تھی۔

"یہ چرچ 1850ء میں بنایا گیا تھا۔ شملہ میں دیکھنے کے لائق جگہوں میں سے ایک ہے لیکن میں ابھی آپ کو یہ نہیں دکھا رہی۔ ابھی ہم جاکھو مندر (Jakhu) جائیں گے۔ جاکھو شملہ میں سب سے بلند مقام ہے اور ہم وہیں سے شملہ دیکھنے کی شروعات کریں گے۔" اس نے فاروق کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

"جیسا آپ پسند کریں۔ میں تو بس آپ کے ساتھ چل پڑا ہوں۔" فاروق نے اسے جواب دیا۔

"بڑے اوبیڈینٹ ہیں۔" بملا اس کے جواب پر ہنس کر بولی۔

"اتنا زیادہ ہوں تو نہیں لیکن کبھی کبھی فرمانبرداری اور تابعداری میں حرج بھی نہیں ہوتا۔" فاروق نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ بملا کی بھی زیادہ توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی پھر اس نے ایک مقام پر گاڑی روک لی اور اسے اطلاع دی۔

"یہاں سے ہم پیدل اوپر جائیں گے۔" اطلاع دینے کے بعد وہ گاڑی سے سامان نکالنے لگی۔ ہاٹ پاٹ اور کولر کے علاوہ اس نے دو چھڑیاں بھی نکالی تھیں۔ فاروق جو اس کی پیروی کرتا ہوا گاڑی سے باہر نکل آیا تھا، کولر اور ہاٹ پاٹ اٹھانے لگا۔

"نو......نو۔ آپ صرف کولر اٹھالیں۔ ہاٹ پاٹ میں خود اٹھاؤں گی۔" بملا نے اسے ٹوکا۔

"میری موجودگی میں ایک خاتون سامان اٹھا کر چلیں، مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے مشرقی روایت نبھانی چاہی۔

"یہاں ایسے تکلفات کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم دونوں کو ایک ہاتھ میں اسٹک بھی پکڑنی ہوگی اس لیے ایک فرد کے لیے ایک بوجھ مناسب ہے۔" بملا نے اس سے کہا اور ایک چھڑی اس کی طرف بڑھا دی۔ فاروق نے اس کی بڑھائی ہوئی چھڑی تھام لی۔

"ناؤ لیٹس گو۔" اپنی چھڑی اور ہاٹ پاٹ کو تھامنے کے بعد بملا نے اس سے کہا۔

"یہ چھڑی کیوں ساتھ لی ہے؟" فاروق نے اس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ اسٹک جاکھو ہل پر جانے والوں کے لیے بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جاکھو آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ ہم جو راستہ پیدل طے کریں گے اس پر چڑھتے ہوئے اگر کہیں مشکل پیش آئی تو اسٹکس سے سپورٹ مل جائے گی۔ اس کے علاوہ بھی اسٹک بڑی امپورٹنٹ ہے۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے بملا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا مطلب؟" فاروق چونکا۔

"ہمیں جاکھو پر موجود اچکوں سے نمٹنے کے لیے ان اسٹکس کا استعمال کرنا پڑے گا ورنہ ہمارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔" وہ بڑے محظوظ سے انداز میں اسے بتا رہی تھی اور فاروق حیران تھا کہ وہ اچکوں کا ذکر بڑے اطمینان سے کر رہی ہے ورنہ خواتین تو ایسی کسی بھی چیز سے بہت گھبراتی ہیں۔

"واقعی وہاں اچکے ہوتے ہیں؟" اس نے مشکوک سے لہجے میں دریافت کیا۔

"کاؤنٹ لیس۔ آپ خود دیکھ لیجیے گا۔" وہ جیسے فاروق کی حیرانی پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"تو کیا یہاں کی انتظامیہ انہیں کچھ نہیں کہتی؟ میرا

مطلب ہے یہ تو ایک سیاحتی مقام ہے اور یہاں ایسی صورتِ حال کا ہونا خود حکومت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اچکوں کے ڈر سے سیاح یہاں آنا چھوڑ بھی سکتے ہیں۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ سیاحوں کو خود بھی وہ اچکے اچھے لگتے ہیں۔" بملا نے مسکرا کر جواب دیا تو وہ خاموش ہو رہا۔ اصل صورتِ حال سمجھ میں نہ آنے کے باوجود وہ اتنا تو سمجھ ہی چکا تھا کہ اس بات میں کوئی رمز ہے اور حقیقت خود کھل کر سامنے آجائے گی۔ اب وہ اس مسئلے پر سوچنے کے بجائے راستے پر توجہ دے رہا تھا۔ دیودار اور چیڑ کے درختوں کے درمیان سے گزرتا یہ راستہ آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ اصل میں تو شملہ میں جس طرف بھی نکل جاؤ خوب صورتی ہی خوب صورتی تھی، یہ اور بات کہ وہ یہاں آمد کے بعد آج پہلی بار ہی باہر نکلا تھا۔ انہیں کیونکہ چڑھائی چڑھنی پڑ رہی تھی اس لیے تھوڑی دیر میں ہی ہلکا ہلکا پسینا آنے لگا تھا۔ فاروق اچھے اسٹیمنا کا مالک تھا لیکن بیماری نے اسے متاثر کیا تھا۔ بہرحال صورتِ حال اتنی خراب بھی نہیں تھی کہ اس کے لیے اس راستے پر چلنا ناممکن ہوتا۔ وہ بملا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

"ذرا رک کر پانی پی لیتے ہیں۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی ہے۔" ایک جگہ بملا نے اس سے کہا تو اس نے اپنے قدم روک لیے۔ وہ دونوں ایک درخت کے تنے کے ساتھ آبیٹھے۔ بیٹھنے کے بعد دونوں نے اپنا رومال نکال کر پسینا خشک کیا پھر بملا نے اپنے بڑے سے پرس سے ایک گلاس نکالا۔ پلاسٹک کا بنا یہ گلاس شوخ سرخ رنگ کا تھا۔

"آپ کو پانی دوں؟" کولر سے گلاس بھرتے ہوئے اس نے فاروق سے پوچھا۔

"پہلے آپ پی لیجیے۔ آپ کو پیاس لگی تھی۔" فاروق نے مسکرا کر جواب دیا تو بملا نے مزید تکلف میں پڑے بغیر گلاس لبوں سے لگالیا۔ خود پانی پینے کے بعد اس نے فاروق کی طرف بڑھا دیا۔ فاروق گلاس منہ کی طرف لے جا رہا تھا کہ بملا نے قریب رکھی چھڑی پھرتی سے اٹھا کر ہوا میں چلائی۔ فاروق نے اپنی پشت پر قیں قیں کی آواز سن کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک بندر تھا جو چھڑی کی ضرب کھا کر ان سے دور جا رہا تھا۔

"اگر میں ہوشیار نہیں ہوتی تو یہ آپ کے ہاتھ سے گلاس اچک کر لے جاتا۔" بملا نے شوخی سے کہا تو فاروق چونکا۔ یعنی بملا اب تک اسے جن اچکوں سے ڈرانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ یہ بندر تھے۔

"تو یہ ہیں آپ کے سو کالڈ اچکے؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"جی ہاں اور انہیں معمولی مت سمجھیے گا۔ یہ بہت تیز ہوتے ہیں۔ پل میں انسان کے ہاتھ کی چیز اچک کر غائب ہوجاتے ہیں۔ بس چیز انہیں پسند آنے کی بات ہوتی ہے۔ بٹوا، چشمہ، ٹوپی کچھ بھی اچانک آپ کے قبضے سے نکل سکتا ہے اگر آپ ہوشیار نہ ہوں تو۔"

"بڑے تیز ہیں یہ بندر۔" فاروق نے مسکرا کر کہتے ہوئے دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گلاس چھیننے میں ناکام ہو کر جانے والا بندر کچھ آگے جانے کے بعد رک گیا تھا اور ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ ہنومان جی کی فورس ہیں۔ انہیں ہلکا لیجیے گا بھی نہیں۔" بملا نے اسے اطلاع دی تو وہ ہنس دیا۔ ہندو مذہب میں ہنومان اور ان بندروں کا کتنا گہرا تعلق تھا، اس بات کا تو اسے بھی علم تھا۔

"چلو تمہاری کچھ خاطر کرتے ہیں۔" اب بملا بندر سے مخاطب تھی۔ ہاٹ پاٹ کھول کر اس نے اس میں سے ایک کچوری نکالی اور بندر کی طرف اچھال دی۔ وہ فوراً اسے اٹھانے کے لیے لپکا۔ اچانک ہی دو تین بندر مزید وہاں آگئے۔ بملا نے ان کی طرف بھی کھانے کی اشیا اچھالیں پھر اس سے بولی۔

"چلیں اب چل پڑیں ورنہ راستے میں ہی گھر جائیں گے۔" فاروق نے فوراً اس کی بات پر عمل کیا۔ ان کا سفر پھر شروع ہوگیا۔ راستے میں انہوں نے کئی بندروں کو دیکھا لیکن وہ دور دور ہی رہے اور ان کے نزدیک نہیں آئے۔ راستے میں بملا اسے پہاڑی اور مندر کے بارے میں معلومات فراہم کرتی رہی۔

"کہتے ہیں جب ہنومان جی راون سے لڑائی میں زخمی ہوگئے تھے تو انہوں نے جاکھو ہل پر ہی بسیرا کیا تھا اور یہیں وہ حیرت انگیز بوٹی سنجیونی .... بھی پائی جاتی ہے جو ہر طرح کے زخم کے علاج کے لیے کارآمد ہے۔ ہنومان نے اسی بوٹی سے اپنے زخموں کا علاج کیا تھا اور راون سے اگلے ٹکراؤ تک یہیں پڑاؤ کیے رہے تھے۔"

بملا اسے جو کچھ بتا رہی تھی وہ بغیر تبصرے کے سن رہا تھا۔ ظاہر ہے اسے ان ہندو دیومالائی داستانوں پر یقین نہیں تھا لیکن بملا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر کے وہ اس کا دل بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور ماڈرن عورت ہونے کے باوجود اگر ان داستانوں پر یقین رکھتی تھی تو ایسا صرف عقیدے کی وجہ سے تھا اور وہ کسی کے عقیدے کو

خوامخواہ چھیڑنے کا قائل نہیں تھا سو چپ چاپ چلتا رہا۔ چلتے چلتے اس کے سر میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھنے لگیں لیکن اس نے پروا نہیں کی اور نہ ہی چہرے سے تکلیف کا اظہار ہونے دیا۔ بالآخر وہ جاکھو مندر تک پہنچ ہی گئے۔ بلندی پر بنے اس مندر کے پس منظر میں دیودار اور چیڑ کے درختوں کی موجودگی نے منظر کو مزید خوب صورت بنا دیا تھا۔ مندر کے اطراف میں ہنومان کے عقیدت مندوں کے علاوہ چند انگریز جوڑے بھی دکھائی دے رہے تھے جو یقیناً صرف تفریح کے خیال سے وہاں آئے ہوئے تھے۔ ویسے اس نے سن رکھا تھا کہ انگریزوں کو تاریخی عمارتیں اور نوادرات وغیرہ دیکھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ بملا انگریزوں کے لباس میں تھی لیکن وہ ان کی طرح یہاں صرف سیر و تفریح کے لیے نہیں آئی تھی۔ اسے ہنومان جی کی پوجا بھی کرنی تھی چنانچہ وہ مندر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ فاروق اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا اور احاطے میں ہی ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سر کی تکلیف میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھتا تو سکون محسوس ہو سکتا تھا لیکن سارا سامان اس کی تحویل میں تھا اور ہنومان جی کے بندروں کی فورس کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر کب کیا اچک کر لے جائیں اس لیے وہ چوکنا بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔

مندر کی عمارت خوب صورت تھی اور اس پر لگے رنگین جھنڈے دور ہی سے اسے نمایاں کر رہے تھے۔ دیواروں پر مختلف نقش و نگار موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نقش ہنومان اور رام جی کے تھے۔ بملا نے اسے راستے میں جو معلومات فراہم کی تھیں، ان کے مطابق یہاں ماربل کی ایک سِل پر ہنومان جی کا قدموں کا نشان بھی موجود تھا۔ اسے ہنومان کے قدموں کا نشان دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے اپنی جگہ بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ وہاں موجود افراد میں چند ایسے جوان جوڑے بھی شامل تھے جنہیں دیکھتے ہی احساس ہو جاتا تھا کہ وہ نو بیاہتا ہیں اور شملہ ہنی مون منانے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ ہی جدا تھی۔ من پسند ساتھی کے مل جانے کی خوشی چہروں سے چھلکی پڑتی تھی۔ ایسے منظر کو دیکھ کر اسے جولیٹ کا خیال نہ آتا یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر ہی خود کو اور اسے ان جوڑوں کے درمیان انہی کی طرح گھومتا پھرتا محسوس کرنے لگا۔ جاگتی آنکھوں کا یہ خواب کتنی دیر جاری رہا اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ بملا کے پکارنے پر ہڑبڑا کے چونکا تو اس خواب کا اختتام ہوا۔

"کیا آنکھیں کھول کر سو رہے تھے؟" بملا نے ہنس کر پوچھا لیکن اس کی ہنسی میں کچھ پھیکا پن تھا جسے فاروق نے فوراً محسوس کر لیا اور فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے آپ کچھ اداس لگ رہی ہیں۔"

"نہیں بس ایسے ہی!" اس نے فاروق سے نظریں چرائیں۔

"کچھ تو ہے اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں۔" اس نے ہلکا سا اصرار کیا۔

"کچھ خاص نہیں۔ اندر مندر میں ممی کی ایک پرانی جاننے والی مسز شیکھر مل گئی تھیں۔ انہیں کسی سے میرے ہزبینڈ کی ڈیتھ کا پتا لگ گیا تھا۔ اب ملیں تو مجھ سے افسوس کرنے لگیں لیکن افسوس کم کیا اور تنقید زیادہ کہ میں ایک ودھوا کے بجائے شوخ اور ماڈرن لڑکی کے روپ میں کیوں نظر آ رہی ہوں۔ پتا نہیں لوگ دوسروں کو جینے کیوں نہیں دیتے خاص طور پر عورت کو۔ اگر میرا پتی مر گیا ہے تو اب مجھے بھی جیتے جی مر جانا چاہیے اور جیون کی ہر خوشی سے منہ پھیر لینا چاہیے۔ یہ کہاں کا اصول ہے۔" وہ غم و غصے کا شکار تھی۔

"جانے دیجیے۔ یہ تو یہاں کا رواج ہے۔ آپ کے ہاں ذرا زیادہ اور ہمارے ہاں ذرا کم بیوہ عورت کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے لیکن آپ تو ایک پڑھی لکھی اور بہادر خاتون ہیں۔ آپ کو لوگوں کی ایسی باتوں کا اثر نہیں لینا چاہیے۔" فاروق نے مختصر الفاظ میں اس کی دلجوئی کی۔

اس کے لیے اتنی ہی بات کافی ہوئی اور سر جھٹک کر بولی۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ چلیں آئیں میں آپ کو یہاں کچھ اور خاص چیزیں دکھاتی ہوں پھر ہم لنچ کریں گے۔"

اپنی خراب ہوتی طبیعت کے باوجود فاروق اس کی دلجوئی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ویسے بھی یہاں تک آنے کے بعد اس جگہ کو اچھی طرح نہ دیکھنا بے وقوفی ہوتی۔ بملا اس کے آگے آگے چل رہی تھی۔ ایک اونچے چبوترے پر بنے ہنومان جی کے مجسمے کو دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیم دی اور آگے بڑھ گئی۔ لمبی دم والے ہنومان جی اپنی سینا کے اچھلتے کودتے شریر سپاہیوں میں گھرے ساکت کھڑے رہے۔

بملا اسے اپنے ساتھ مندر سے کافی آگے لے آئی۔ اس جگہ پر درخت اتنے زیادہ نہیں تھے اور بلندی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

"یہ ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائیں اور نیچے کی طرف دیکھیں۔" ایک مقام پر رک کر بملا نے اپنے زنبیل

جیسے پرس سے دوربین برآمد کی اور اس سے کہا۔ اس کے حکم کے مطابق اس نے دوربین آنکھوں سے لگا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ منظر سمٹ کر اس کی آنکھوں کے قریب چلا آیا تھا اور وہ دور تک پھیلے منظر کو خوشگوار احساسات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ سبزہ اور اس سبزے کے درمیان فاصلے فاصلے سے موجود رنگین چھتوں والے گھر آنکھوں کو بہت بھلے لگ رہے تھے۔ بالکل ایسا لگتا تھا کہ سبزے کے بیچ مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوں۔ وہ دوربین کو مختلف زاویوں پر گھما کر نیچے قصبے کے مناظر دیکھتا رہا۔

''آپ تو ایک ہی منظر کے ہو گئے اصل منظر تو ادھر ہے۔'' بملا نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا۔

''کہاں؟'' اس نے ذرا جھینپتے ہوئے آنکھوں پر سے دوربین ہٹائی۔

''اس طرف۔'' بملا نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو اس نے اس کی بتائی ہوئی سمت رخ کر کے دوربین آنکھوں سے لگالی۔ یکدم ہی اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ خوب صورت منظر اتر آیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے کسی سحر زدہ آدمی کی طرح پوچھا۔

''یہ ہمالے ہے۔'' بملا نے اتنے فخر سے بتایا جیسے اسی نے ہمالیہ کو دریافت کیا ہو۔ فاروق زبان سے مزید کچھ کہے بغیر برف پوش ہمالیہ کی چوٹی کا نظارہ کرتا رہا۔ سفید برف پر گویا سورج کی کرنوں کا رقص ہو رہا تھا۔ ہمالیہ کی سفید برف سے ٹکرا کر منعکس ہونے والی سورج کی کرنیں اردگرد رنگ سے بکھیر رہی تھیں۔

''میں جب بھی یہاں آؤں ہمالے کو دیکھے بغیر واپس نہیں لوٹتی۔'' اس کی کیفیت کو محسوس کرتی بملا نے اسے بتایا تو وہ ذرا سا چونکا اور دوربین اس کی طرف بڑھا دی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ خود دوربین پر قبضہ کیے کھڑا ہے اور بے چاری بملا کو کچھ دیکھنے کا موقع نہیں مل رہا۔

''یہاں آنے کے بعد اتنا خوب صورت منظر نظر انداز کر جانے والا کوئی بے وقوف ہی ہو سکتا ہے۔'' اس کا یہ تبصرہ حقیقت پر مبنی تھا۔ جاکھو ہل پر کھڑے ہو کر برف پوش ہمالیہ کو دیکھنے کا تجربہ واقعی بہت خوش کن تھا۔ جب بملا بھی اپنے شوق کی تکمیل کر چکی تو انہوں نے مندر کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ مندر کے احاطے میں ایک جگہ چن کر بملا نے لنچ کا فیصلہ کیا۔

''یہ کھا کر دیکھیے۔ شملہ مرچ اور پنیر سے بنائی ہوئی یہ شملہ کی ایک روایتی ڈش ہے۔'' اب وہ ایک سگھڑ اور ذمے دار میزبان کا کردار ادا کر رہی تھی۔ فاروق نے اس کی پیشکش پر ایک نوالہ منہ میں رکھا۔ ڈش یقیناً اچھی رہی ہو گی لیکن وہ اس کا ذائقہ محسوس کرنے سے زیادہ اس کوشش میں مبتلا تھا کہ منہ میں رکھے نوالے کو حلق سے نیچے اتار سکے۔ ہلکی ہلکی ٹیسوں سے شروع ہونے والا سر درد یکدم ہی بہت زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔

''لنچ کے بعد ہم جنگل میں چلیں گے۔ وہاں جا کر بہت اچھا لگتا ہے لیکن میں اکیلی ہوں تو اس طرف جانے کی ہمت نہیں کرتی اور کوشش کرتی ہوں کہ یہاں سے ہی کسی فیملی کو دوست بنا کر اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لوں۔ پہلے ممی اور میں جنگل میں ضرور جاتے تھے۔ ان کے بعد میں اکیلی شملہ آتی ہوں تو بائی چانس ہی جنگل کی طرف جا پاتی ہوں۔'' رغبت سے لنچ کرتے ہوئے بملا اسے بتا رہی تھی۔ خوب چلنے کی وجہ سے اس کی بھوک چمک اٹھی تھی اور اس نے محسوس نہیں کیا تھا کہ فاروق کچھ سست پڑ رہا ہے۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے فاروق نے بھی اپنی طبیعت کا ذکر نہیں کیا اور یونہی دکھاوے کے لیے وقفے وقفے سے چھوٹے چھوٹے نوالے منہ میں ڈالتا رہا۔

''لگتا ہے آپ کو کھانا پسند نہیں آیا۔'' بملا نے اس کی کھانے میں سست روی کو محسوس کر کے تبصرہ کیا۔

''ایسی بات نہیں۔ میں نے ناشتا خاصا بھاری کیا تھا اس لیے اس وقت زیادہ بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔'' فاروق نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''اتنا چلنے کے بعد تو پتھر بھی ہضم ہو جاتے ہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''دیکھیں، میں کیسے ندیدوں کی طرح کھا رہی ہوں۔''

''آپ نے جو چڑیاؤ جیسا ناشتا کیا تھا اس کے بعد بھوک تو لگنی ہی تھی۔'' فاروق نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن درد کی ایک تیز لہر نے اس کی مسکراہٹ کو جھپٹ لیا۔ اس پل بملا کی توجہ اس کی طرف ہی تھی، وہ چونک گئی۔

''کیا بات ہے مسٹر فاروق آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''جی بس ذرا سر میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے آہستہ سے بتایا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔'' وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں، آپ جنگل میں گھوم لیں تو پھر ہم واپس چلیں گے۔ میں واپس جا کر دوا لے لوں گا تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

''بالکل بھی نہیں، ہم ابھی ابھی واپس چل رہے ہیں۔ مجھے آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب لگ رہی ہے۔'' بملا نے فوراً اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن آپ کا جنگل میں گھومنا تو رہ جائے گا۔'' فاروق اب بھی متذبذب تھا۔

''جنگل میں گھومنے کے لیے دوبارہ بھی آیا جا سکتا ہے۔'' وہ بہت پھرتی سے سب کچھ سمیٹ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس بار فاروق نے بھی اصرار نہیں کیا۔ اسے واقعی اچھی خاصی تکلیف ہو رہی تھی' واپسی کا سفر انہوں نے نسبتاً تیزی سے طے کیا۔ درمیان میں رکے بھی نہیں۔

''کب سے ہو رہا ہے آپ کے سر میں درد؟ آپ کو مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔'' وہ دونوں جب گاڑی میں سوار ہوئے تو بملا نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے خفگی سے کہا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ بنگلے تک کا سفر بہت تیزی سے طے ہو گیا۔ یہاں کیتھرائن اور گولو منتظر تھے۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ، آپ نے تو صرف پوسٹ آفس تک جانے کا بتایا تھا مجھے۔'' اس کی شکل دیکھتے ہی کیتھرائن نے شکوہ کیا۔

''انہیں میڈیسن دو سسٹر۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' مزید سوال جواب کا موقع دینے کے بجائے بملا نے تیز لہجے میں اطلاع دی تو کیتھرائن چوکنی ہو گئی اور فوراً ہی پیشہ ورانہ مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فاروق کو دیکھنے لگی۔ معائنہ کرنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ صرف گولی اثر نہیں کرے گی بلکہ انجکشن بھی دینا پڑے گا۔ تمام ضروری دواؤں کا ذخیرہ وہ لوگ ساتھ لائے تھے پھر کیتھرائن نے ڈاکٹر سے خصوصی بریفنگ بھی لی تھی اس لیے اسے اچھی طرح علم تھا کہ کس صورت میں کیا کرنا ہے۔ اس کی کوششوں کے اثر سے فاروق آدھے گھنٹے بعد اپنے کمرے میں پُرسکون نیند سو رہا تھا۔

''صبح میرے ساتھ نکلے تو اچھے بھلے تھے۔ پھر اچانک ہی پتا نہیں کیسے طبیعت خراب ہو گئی۔'' کیتھرائن لیونگ روم میں واپس آ کر بیٹھی تو بملا نے ہاتھ ملتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

''اچانک طبیعت خراب نہیں ہوئی ہو گی۔ مسٹر فاروق کو عادت ہے کہ کم تکلیف ہو تو اسے برداشت کرتے رہتے ہیں، اسی چکر میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔'' کیتھرائن نے اداس سے لہجے میں بتایا۔ فاروق کی تکلیف کو وہ بالکل ایسے ہی محسوس کر رہی تھی جیسے وہ اس کا سگا بھائی ہو۔ فاروق نے اسے جو مان اور عزت دی تھی، اس کے بعد اسے ایسا ہی محسوس کرنا چاہیے تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ایسا ہی ہوا ہو گا۔ وہ تو میں نے خود فیل کر لیا کہ ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے لیکن کوشش کے باوجود واپس آنے میں ٹائم لگ گیا۔'' بملا کو افسوس تھا کہ اس کی تفریح خراب نہ کرنے کے چکر میں فاروق نے اپنی تکلیف بڑھائی۔

''آپ لوگ کہاں گئے تھے؟'' کیتھرائن نے چونک کر پوچھا۔

''جاکھو ہل، شملہ میں سب سے بلند جگہ ہے۔ پیدل اوپر جانے اور آنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ آئی سی۔ تب ہی تو مسٹر فاروق کی طبیعت بگڑی۔ یوں تو وہ فزیکلی بالکل ٹھیک ہیں لیکن سر کی چوٹ کی نوعیت ایسی ہے کہ ڈاکٹر نے زیادہ جسمانی مشقت سے بھی منع کر رکھا ہے۔ اصل میں انسان کا دماغ ہی تو ہے جو پورے جسم کا کنٹرول سنبھالے ہوتا ہے۔ بلندی پر چڑھنے سے زیادہ انرجی خرچ ہوتی ہے اور آکسیجن کی ضرورت بڑھ جاتی ہے لیکن بلندی پر جاتے ہوئے فضا میں آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے۔ مسٹر فاروق کو آکسیجن کی کمی نے متاثر کیا ہے۔'' کیتھرائن جیسے سارا معاملہ سمجھ گئی۔

''اگر تم فیل کرو کہ کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتانا۔ ہم کسی اچھے ڈاکٹر سے رائے لے لیں گے۔ یہاں میری پہچان کے ایک دو اچھے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔'' بملا بنا غلطی کے ہی خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی اس لیے فکرمند تھی۔

''ڈونٹ وری میڈم۔ مسٹر فاروق بہت اسٹرونگ ول پاور رکھنے والے آدمی ہیں۔ وہ جلد ری کور کر لیں گے۔'' کیتھرائن نے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

چاند بانو نے پتا نہیں کونسی بار سادہ سے صفحے پر تحریر وہ چند سطری خطوط پڑھا جو آج ہی اسے ملا تھا اور جس میں فاروق نے اپنی خیریت اور شملہ کی خوب صورتی کے مختصر سے تبصرے کے علاوہ اس سے اس کا احوال دریافت کرنے کے سوا کچھ نہیں لکھا تھا لیکن وہ یوں شاداں و فرحاں تھی جیسے کوئی محبت نامہ پڑھ رہی ہو۔ اس کے لیے اتنا خیال ہی بہت تھا کہ فاروق دور جا کر بھی اسے نہیں بھولا اور اس نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے اس کے نام علیحدہ سے خط لکھ کر بھیجا ہے۔ اس ایک خیال سے وہ اتنی خوش تھی کہ کبھی خط کی تحریر

پڑھتی، کبھی اسے آنکھوں سے لگاتی، کبھی لبوں سے چومتی اور کبھی سینے سے لگالیتی۔ یہ خط محض ایک کاغذ کا ٹکڑا تھوڑی تھا جس پر نیلی روشنائی سے چند سطریں درج تھیں۔ یہ تو پیاسے کے لیے صحرا میں پانی کی بوندوں کی طرح تھا۔ وہ اس کاغذ سے لپٹی فاروق کی خوشبو کو سونگھ سکتی تھی۔ اسے کاغذ پر موجود فاروق کی انگلیوں کا نادیدہ لمس بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں وہ خوشی سے سرشار نہ ہوتی تو اور کیا کرتی۔

"کیا بات ہے بنّو! آج کمرے سے باہر ہی نہیں نکلیں۔ کہیں ابھی سے بڑی ہیروئنوں کے نخرے تو نہیں آگئے مزاج میں کہ اپنے ساتھ والیوں سے ملنا ہی گوارا نہیں۔" وہ اپنی خوشی میں مست بستر پر نیم دراز تھی اور خط کے کاغذ کو اپنے دائیں رخسار سے لگا رکھا تھا کہ کاجل دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوئی اور اس سے شکوہ کیا۔

"اللہ نہ کرے جو ہم میں ایسے نخرے آئیں۔ ویسے بھی کونسا ہم اپنی خوشی سے فلمی ہیروئن بننے پر راضی ہوئے ہیں جو اس بات پر غرور کریں گے۔ ہمارے لیے تو بس یہ سب ایک آزمائش ہی ہے۔ اگر آپ سب لوگوں کا اتنا اصرار نہ ہوتا تو ہم کبھی اس کام کی حامی نہ بھرتے۔" کاجل کی آواز سن کر وہ بستر پر اٹھ بیٹھی اور پوری سچائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"ہم کیا اور ہمارا اصرار کیا۔ یوں کہو نا کہ "ان" کے کہنے پر راضی ہوئی تھیں۔" کاجل نے اسے چھیڑا۔

"ان کا کہنا ہم ٹال بھی کیسے سکتے تھے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں مسکرائی اور اپنی نرم و نازک انگلیوں کو سطروں پر پھیرنے لگی۔

"لگتا ہے انہوں نے محبت نامہ بھیجا ہے۔" کاجل نے فوراً ہی اس کے ہاتھ میں موجود خط کا نوٹس لیا پھر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"کیا لکھا ہے؟"

"خود پڑھ کے دیکھ لو۔" چاند بانو نے خط اس کی طرف بڑھا دیا جسے کاجل نے فوراً تھام لیا اور جلدی جلدی تحریر پر نظریں دوڑانے لگی۔ زمرد بائی کے کوٹھے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا اور شعراء کا کلام خاص طور پر پڑھنے کے لیے دیا جاتا تھا کیونکہ زمرد بائی کا کہنا تھا کہ جو شعر کو پڑھنا اور سمجھنا نہیں جانتا، وہ اسے روح کی پوری گہرائی سے گا بھی نہیں سکتا۔ سو یہاں لڑکیوں کی تعلیم کا خصوصی انتظام تھا اور انہیں اساتذہ کا کلام پڑھایا جاتا تھا۔

"میری طبیعت اچھی ہے۔ شملہ کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ تم اپنا احوال سناؤ۔ یہ بھلا کیسا محبت نامہ ہے۔" ایک نظر میں پورا خط پڑھ لینے والی کاجل نے خط اسے واپس کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"محبت نامہ تو اسے تم نے قرار دیا تھا ورنہ یہ تو ایک سادہ سا خط ہے۔" چاند بانو اس کے تبصرے پر مسکرا کر بولی۔

"وہ تو ہمیں تمہارے چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے چہرے کو دیکھ کر گمان ہوا تھا۔" کاجل نے منہ بنایا۔ وہ چاند بانو کے بستر پر اس کے عین مقابل بیٹھی اس سے مکالمہ کر رہی تھی۔

"ہمیں تو وہ ہوا بھی پیاری ہے جو ان کو چھو کر آجائے، یہ تو پھر ان کے ہاتھ سے لکھا خط ہے۔" چاند بانو نے عالم جذب میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بے خودی کی کیفیت میں خط کو سینے سے لگا لیا۔

"اللہ اللہ...... ایسا عشق۔ عشق کے سمندر میں اتنی گہرائی تک مت اترو چاند بانو...... یہ سمندر تمہیں ڈبو دے گا۔" اس بار کاجل ذرا گھبرا گئی تھی۔

"واللہ۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم اسے اپنی خوش نصیبی سمجھیں گے۔" چاند بانو نے بے ساختگی سے جواب دیا۔

"تمہاری باتوں سے مجھے تو خوف آرہا ہے۔"

"تو چھوڑو نا جانے دو ان باتوں کو اور یہ بتاؤ کہ ہمارے سفر کی تیاری کہاں تک پہنچی۔ تم گئی تھیں نا خریداری کے لیے ساتھ میں۔" اس نے خود ہی موضوع بدل دیا۔

انیل کمار نے حسب فرمائش زمرد بائی اور اس کے لیے گاڑی بھجوا دی تھی کہ وہ جا کر اپنی مرضی کی خریداری کر آئیں۔ آج چاند بانو کا کوئی سین شوٹ نہیں ہونا تھا اس لیے اس کی چھٹی تھی اور اسی لیے انیل کمار نے بھی آج گاڑی بھجوائی تھی لیکن زمرد بائی نے اسے خریداری کے لیے اپنے ساتھ بازار لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگرچہ وہ برقعوں میں خود کو چھپا کر بازار جایا کرتی تھیں لیکن زمرد بائی کے خیال کے مطابق مستقبل کی ٹاپ ہیروئن کا بازاروں میں پھرنا اس کی شان کے خلاف تھا چنانچہ وہ کاجل کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کاجل کو اس کی پسند ناپسند کا اچھی طرح علم تھا اس لیے اسے کوئی خاص فکر بھی نہیں تھی۔

"بڑی جلدی خیال آگیا آپ کو خریداری کے بارے میں پوچھنے کا؟ کتنی دیر ہوگئی بنے میاں سے پیغام بھجوایا تھا کہ ہال میں آجاؤ۔ سب وہیں جمع تھے اور تمہارے ساتھ مل کر سارا سامان دیکھنا چاہتے تھے۔"

کاجل نے خفا سے لہجے میں اسے یاد دلایا۔

''ہاں بس ہم ذرا مصروف تھے۔'' اس نے خط کو انگلیوں سے سہلایا۔

''چھٹی کے دن مصروف رہنے کا عذر...... اس کا مطلب سمجھتی ہو چاند بانو......؟ تمہارے ساتھ والیوں کو یہ گمان گزرے گا کہ تم مغرور ہوگئی ہو اور ہیروئن بننے کے بعد ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔'' کاجل کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

''لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ٹپٹائی۔

''یہ صرف میں سمجھتی ہوں۔ باقی سب کو تمہارے دل کی خبر نہیں ہے اور نہ ہی ہونی چاہیے۔ محبت ایک ایسا مقدس راز ہے جو دل میں ہی دفن رہے تو اچھا ہوتا ہے۔ لوگوں کی زبان پر آنے کے بعد یہ جذبہ تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔'' کاجل نے اسے نصیحت کی۔

''آئندہ ہم احتیاط کریں گے۔'' اس نے فوراً ہی اپنی غلطی تسلیم کرلی اور خط کا کاغذ تہ کر کے لفافے میں رکھنے لگی۔

''فاروق صاحب کو اس خط کا جواب دو گی تو اس میں اپنے شملہ پہنچنے کی خبر دو گی کیا؟'' کاجل نے اس سے پوچھا۔ اس بار اس کا لہجہ پہلے ہی کی طرح نرم تھا۔ وہ چاند بانو سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کی سچی خیر خواہ تھی۔

''ارادہ تو نہیں ہے۔ کیا خیال ہے انہیں اطلاع دینی چاہیے کیا؟'' اس نے کاجل سے رائے مانگی۔

''مت دو اطلاع۔ اچانک پہنچ کر ان کے تاثرات دیکھنا۔'' کاجل نے اسے مشورہ دیا۔

''ہم بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہے ہیں۔'' اس کے پنکھڑی کے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ چٹخی۔ وہ جیسے تصور کی آنکھ سے فاروق کا حیران چہرہ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ اس پل اس کے چہرے پر اتنے رنگ تھے کہ کاجل نے نظر لگ جانے کے ڈر سے اپنی نظریں اس پر سے ہٹالیں اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''آؤ چلو۔ چل کر سب کے درمیان بیٹھتے ہیں۔'' چاند بانو نے خط اپنے تکیے کے نیچے احتیاط سے رکھا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس کی چال کے متوالے پن میں آج ہونے والی آدھی ملاقات کی سرشاری بھی شامل تھی۔

☆☆☆

ربن کی قہربار نظریں اپنے سامنے کھڑے شخص پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت مجو دادا والے اڈے پر تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر راموبیٹھا ہوا تھا اور سامنے اڈے کے باقی افراد موجود تھے۔ اچھے خاصے افراد کی موجودگی کے باوجود وہاں ایسی خاموشی تھی کہ پن بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ اس خاموشی میں صرف ربن کی آنکھیں بول رہی تھیں اور یہ آنکھیں قہر کی جو زبان بول رہی تھیں اس کو سمجھنے والوں کے دل اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے جب انہوں نے نہیں اسی مقام پر ربن کے ہاتھوں مجو دادا کا انجام دیکھا تھا۔ ایک عرصے اڈے پر حکمرانی کرنے والے مجو دادا کو اس نے منٹوں میں چت کر دیا تھا اور بڑے بڑے دعوے کرنے والا مجو دادا اس لائق بھی نہیں رہا تھا کہ زندگی میں کبھی چاقو تھام سکے۔

''تیرے کو اڈے کے اصولوں کا پتا نہیں لگا تھا کیا؟'' سامنے کھڑے شخص کو کچھ دیر گھورتے رہنے کے بعد اس نے بھاری آواز میں اس سے استفسار کیا۔

''اپن نے کوئی نیا کام نہیں کیا ہے۔ اپن نے وہی کیا ہے جو اتنے سالوں سے کرتا آرہا ہے۔'' اس شخص نے شانے جھٹکتے ہوئے ذرا خراب مزاج کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ تقریباً چالیس سال کی عمر کا آدمی تھا۔ قد کاٹھ اچھا تھا اور ہاتھ پیروں کا بھی مضبوط نظر آتا تھا۔ اس کا نام رفیق عرف فیکا تھا اور وہ مجو دادا کے منہ چڑھے ساتھیوں میں سے ایک تھا۔

''اب وہ تیری ماں کا یار اس اڈے کی گدی پر نہیں بیٹھا ہے جس کے ہوتے تو اپنی من مانی کرتا تھا۔ اب یہ مجو کا نہیں، ربن دادا کا اڈا ہے اور یہاں صرف ربن دادا کا اصول چلنے کا ہے۔ تم ساروں کو پہلے دن ہی بولا تھا کہ جس کو ادھری رہنا ہے اپنے اصولوں کے حساب سے رہنا ہوگا ورنہ ادھر سے چلتے بنو۔ ہندوستان کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ کدھر نہ کدھر تم کو جگہ مل ہی جائے گی پر تو سمجھ رہا تھا کہ ربن دادا کی ناک کے نیچے رہ کر اپنی من مانی کرتا رہے گا اور کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ پر یہ تیری بھول تھی۔ یہ جو تیرے کو اپنے تو بڑے پر دو آنکھیں اور دو کان دکھتے ہیں، یہ دیکھنے کو صرف دو دو ہیں ورنہ اپن کی سیکڑوں آنکھیں اور سیکڑوں کان ہیں اور تیرے جیسے...... اپنے سے چھپ نہیں سکتے۔'' اس نے منہ بھر کے فیکے کو ایک بڑی سی گالی سے نوازا۔

''گالیاں مت دو دادا۔'' گالی سن کر فیکے کا منہ سرخ ہو گیا اور اس نے احتجاج کیا۔

''گالی نہ دوں تو تیرے جیسے...... کو پھولوں کا ہار پہناؤں۔'' ربن نے اسے ایک اور زوردار گالی دی۔ گالی سن کر فیکے کی آنکھوں میں طیش کی لہر دوڑ گئی اور اس نے لبوں کو یوں کھولا کہ جیسے جواب میں خود بھی کوئی سخت لفظ کہنا چاہتا

ہو لیکن پھر عین وقت پر ہونٹوں کو بھینچ لیا۔

''اپن نے بولا تھا کہ ادھر اپنی مرضی نہیں چلے گی اور کوئی ماں کا جنا اپنی مرضی سے کہیں سے ایک دھیلا نہیں لے گا۔ اپنے پاس سارا کام حساب کتاب سے ہوتا ہے اور حساب کتاب سے سب کو حصہ ملتا ہے پر تو نے اپنی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دی اور حاجی سرمد کی دکان سے ایک دو نہیں پورے درجن بھر جوڑے کٹوا ڈالے۔ تیرے کو ایسا کرنے کی اجازت کس نے دی تھی؟'' ربن اس پر بری طرح بگڑ رہا تھا۔

''اپنے کو ضرورت تھی اس لیے اپن نے ایسا کیا۔'' فیکے نے بے پروائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک واضح بغاوت تھی اور لگتا تھا وہ ربن کے رعب میں آنے کے موڈ میں نہیں ہے۔

''کیوں تیرے کو بہن بیٹی کا دھیج بنانے کا تھا جو ضرورت تھی؟ ہوتی تو اپن خود سارا انتظام کرتا پر تو حرام کا جنا تو اس رن...... کے ناز اٹھانے کو مال سمیٹ کرلے گیا تھا نا جس کے کوٹھے پر دن رات پڑا رہتا ہے اور جس کی ہوس کا پیٹ کسی طرح بھرتا ہی نہیں۔'' ربن نے کاٹ دار لہجے میں اس کا کچا چٹھا کھولا تو وہ بس سر جھکا کر رہ گیا، منہ سے کچھ بولا نہیں۔

''اسے باندھ کر چوک پر ڈال دو اور گن کر سب کے سامنے پورے سو جوتے لگاؤ تاکہ سب کو پتا چل جائے کہ ربن دادا کے اڈے پر کوئی اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔'' ربن نے اس کا باغیانہ انداز دیکھا اور جھٹ سزا تجویز کر دی۔ اس سزا کو سن کر فیکے کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اسے سر عام جوتے لگائے جانے کا مطلب تھا کہ وہ پھر اس علاقے میں سر اٹھا کر نہیں چل سکتا۔

''تم لوگوں نے سنا نہیں کہ اپن نے کیا کہا ہے۔'' فیکے کو سنائی جانے والی سزا پر دم بخود رہ جانے والوں کو اس نے قہر بار لہجے میں پکارا تو اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے لوگوں کے جسموں میں جنبش پیدا ہوئی۔ پہلے پیش قدمی کرنے والے وہ لوگ تھے جنہوں نے دل سے ربن کی اڈے پر حکمرانی کو تسلیم کر لیا تھا۔

''ہاتھ نہیں لگانا اپنے کو۔'' فیکے نے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو بھڑک اٹھا اور چاقو نکال لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں چاقو ہی چاقو نکل آئے۔ اتنے چاقوؤں کی

موجودگی میں اکیلا فیکا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اسے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ ذرا دیر میں وہ رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ پانچ چھ بندوں نے مل کر اسے اٹھایا اور ربن کے حکم کی تعمیل کے لیے چل پڑے۔ اس سارے ہنگامے کے بعد ربن زیادہ دیر سب کے درمیان نہیں ٹھہرا اور رامو کے ساتھ اٹھ کر ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔

''اپنے کو لگتا ہے یہ بات ادھر ہی ختم نہیں ہوگی۔ فیکا پھر دوبارہ کمینہ پن کرے گا۔ سالے کی آنکھوں پر سور کی چربی چڑھی صاف نظر آرہی تھی۔'' تنہائی ملتے ہی رامو نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

''اپنی جوتی کو بھی پروا نہیں ہے۔ اپن نے بھی سب دیکھا اور سمجھا ہے۔ وہ حرام کا جنا اب ادھر ٹکنے والا نہیں ہے۔ تو دیکھ لینا وہ دوبارہ ادھر شکل نہیں دکھائے گا اور یہ بہت اچھا ہوگا۔ اپن کو اس کے تیور نظر آرہے تھے۔ باقیوں کو سبق سکھانے کے واسطے اس کا یہ انجام ضروری تھا۔'' ربن نے اسے جواب دیا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''اپن اب ادھر سے چلے گا۔ اُدھر بھی دیکھنا ہے۔ تو ادھر ہی رک اور آنکھیں اور کان کھلی رکھ۔'' رامو کو نصیحت کرکے وہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اب اس کا رخ اپنے پرانے اڈے کی طرف تھا۔ شملہ سے واپسی کے بعد اس نے دونوں اڈوں میں کئی انتظامی تبدیلیاں کی تھیں جن میں سب سے بڑی تبدیلی افراد کا تبادلہ تھا۔ مجو دادا والے اڈے سے کچھ لوگ اپنے اڈے پر منتقل کیے گئے تھے اور کچھ افراد کو پرانے اڈے سے مجو دادا والے اڈے پر لایا گیا تھا۔ اس طرح نئے شامل ہونے والوں کی تربیت اور نگرانی دونوں کا انتظام ہوگیا تھا۔ ان چکروں میں الجھا وہ جولی سے ملاقات کا وقت بھی نہیں نکال سکا تھا۔ ایک تو وہ خود بھی ملازمت کرتی تھی اس لیے ایسا بھی ہوا کہ اس کے پاس ملاقات کی فرصت ہوتی تو وہ گھر پر موجود نہ ہوتی لیکن آج اسے امید تھی کہ ملاقات ہوجائے گی کیونکہ شام ہوچکی تھی اور شام تک جولی واپس گھر آجاتی تھی۔ اسے ثریا بانو کے رشتے کے سلسلے میں غلام محمد سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ اپنے علاقے میں پہنچ کر اس نے کمو کو اڈے پر جانے کا حکم دیا اور خود جانی کے ساتھ غلامو کے گھر کی طرف بڑھا۔ کمو اور جانی کو وہ مجو دادا والے اڈے سے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔

''ارے بھائی آپ آیئے اندر تشریف لایئے۔'' غلام محمد کا دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ خود باہر نکلا اور ربن کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر گرم جوشی سے دعوت دی۔

''نہیں بھائی۔ اپن کو دوسرے کام سے جانا ہے۔ آپ کے پاس بس اس لیے ٹھہرے تھے کہ پتا کریں کہ آپ نے لڑکے والوں کو بمبئی آنے کا پیغام بھیج دیا یا نہیں۔ اپن چاہتا ہے کہ وہ لوگ آئیں تو اپن ان سے ملنے کو موجود ہو۔'' ربن نے اندر جانے سے انکار کرتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''پیغام بھیج دیا ہے اور وہاں سے جواب بھی آگیا ہے۔ آنے والے سوموار کو وہ لوگ بمبئی پہنچ رہے ہیں۔ میں خود یہ اطلاع دینے آپ کے پاس آنے ہی والا تھا۔'' غلام محمد نے اسے بتایا۔

''تم آؤ کہ اپن آئے ایک ہی بات ہے۔ کام کی بات ہوگئی، یہ کافی ہے۔ یاد رکھنا کہ وہ لوگ اپنے مہمان ہوں گے اور ان کی ساری خاطر مدارت اپنے ذمے ہوگی۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' غلام محمد نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

''چلو تو پھر ابھی اپن چلتے ہیں۔'' ربن وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کا رخ اندر گلی میں جولیٹ کے گھر کی طرف تھا۔ دروازے پر تالا موجود نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ جولیٹ گھر میں ہی ہے۔ اس کے اشارے پر جانی نے دروازے پر زور سے دستک دی اور ایک طرف ہوکر کھڑا ہوگیا۔ اب ربن اکیلا دروازے کے مقابل کھڑا تھا۔ دستک کا فوری ردِعمل ظاہر ہوا اور اندر سے تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور جولیٹ کا چہرہ نظر آیا لیکن ربن کی نظروں نے جس پہلی چیز کو فوکس کیا، وہ جولیٹ کا چہرہ نہیں کچھ اور تھا۔ جولیٹ نے بھی اس کی نظر کے زاویے کو فوراً ہی محسوس کرلیا اور تیزی سے شانوں پر پڑے اسکارف کو کھینچ کر آگے پھیلایا۔ اس کے اس عمل سے قبل ہی ربن اپنی نظروں کا رخ بدل چکا تھا لیکن دونوں فریقین جانتے تھے کہ پل بھر میں کیا ہوگیا ہے۔ ربن نے تو پھر تیزی سے اپنی کیفیت پر قابو پالیا لیکن جولیٹ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا چنانچہ جب وہ بولی تو بھی اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''جی فرمایئے۔'' یہ دو لفظ ادا کرنے کے لیے بھی اسے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

شناخت

تنویر ریاض

کبھی کبھی اندھا اعتماد گہری نظر رکھنے والوں کو بھی اندھا کر دیتا ہے۔ وہ بھی ایک ذرا سی غلطی کر بیٹھی تھی مگر جب اعتماد اور یقین کی دیوار گری تو وہ خود بھی جانے کتنی پستی میں جا دبی... اور بس اس ایک پل میں اس نے یقین اور گمان کے درمیان بہت لمبا سفر طے کیا اور بالآخر صحیح مقام پر جا پہنچی لیکن... اس ایک پل کی شناخت اس کے لیے بہت بڑی آزمائش بن گئی۔

بھولے بسرے چہروں میں رشتوں کی تلاش کا کٹھن مرحلہ



"کیا تم ترتیب سے واقعات کی تفصیل بتا سکتی ہو؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا لیکن میں کوئی معقول جواب نہ دے سکی کیونکہ مجھے تفصیل یاد نہیں تھی۔ پستول کا فائر میرے قریب سے ہوا تھا اور دھماکے کی آواز اتنی زیادہ تھی

کہ میں کچھ نہ سن سکی اور نہ ہی مجھے کچھ نظر آیا۔ میرے سر کا دایاں حصہ لکڑی کے فرش سے ٹکرایا اور میں وہیں ڈھیر ہو گئی۔ کافی دیر تک حرکت کرنے کے قابل نہ رہی اور فرش پر لیٹے ہوئے یوں لگا جیسے گولی مجھے لگی ہے اور شاید میں

مر چکی ہوں کیونکہ میں کچھ محسوس کر رہی تھی اور نہ ہی سن پارہی تھی۔

کافی دیر تک میں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید مر چکی تھی یا زندہ تھی۔ جب تک حرکت کرنے کی کوشش نہ کرتی یہ کیسے معلوم ہوتا کہ میں زندہ ہوں یا مر چکی ہوں لیکن وہ اس وقت تک زندہ تھا جب میں اس سے چلے جانے کی التجا کر رہی تھی پھر ایک فائر ہوا اور گولی اس کے سینے میں جا لگی۔ اس وقت تک ٹریوس زندہ تھا لیکن وہ میری بات نہیں سن رہا تھا اور مجھ پر قہقہے لگا رہا تھا۔ میرا گلا خشک ہو گیا اور الفاظ میرے دماغ میں جم کر رہ گئے۔ ”چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔“ میں اس کی خوشامد کر رہی تھی۔

لیکن اس پر میری التجاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مسلسل قہقہے لگا رہا تھا اور اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا کیونکہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چند لمحوں بعد وہ زندہ نہیں رہے گا۔ کوئی بھی جاندار اپنی موت کے بارے میں نہیں جانتا۔ ٹریوس اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں خیال آیا کہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے اور اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ میں اسے شناخت کر چکی ہوں۔ اس لیے میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن اپنے کزن ٹریوس کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی جس نے مجھے پکڑ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک گن تھی۔

وہ منظر کبھی کبھی ایک ڈراؤنے خواب کی طرح مجھے ستاتا ہے۔ میں بے سدھ فرش پر لیٹی ہوئی ہوں۔ میرے بازو اور ٹانگیں سن یا مفلوج ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ میرے بچوں میں سے کوئی ایک میرا کندھا ہلا کر جگا دیتا ہے۔

”ممی، اٹھ جاؤ۔“ میری بیٹی اس حالت میں لیٹا ہوا دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے اور خوفزدہ ہو کر رونے لگتی ہے، تب میں ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں اور بچوں کے ساتھ مل کر قہقہے لگاتی ہوں تاکہ انہیں یقین آجائے کہ ان کی ماں خیریت سے ہے۔

”کیا تمہیں وہ گن یاد ہے؟“ مجھ سے پوچھا گیا۔

میرا جواب نفی میں تھا۔ گن نہیں البتہ فائر کی آواز یاد ہے۔ میں صاف طور پر گن نہیں دیکھ سکی کیونکہ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اسپارتا جرنل میں اس گن کی شناخت اعشاریہ تین آٹھ کولٹ ریوالور کے طور پر ہوئی تھی اور یہ چھیالیس ڈرولین ایونیو میں رہنے والے گورڈن میکڈانلڈ کی ملکیت تھا جسے 1958ء میں اس کا ہوم اونر پرمٹ جاری ہوا تھا۔ اس کے تحت مالک پر لازم ہے کہ وہ ہتھیار کو گھر میں رکھے اور اسے جیب یا کار میں رکھ کر گھر سے باہر لے جانا ممنوع ہے۔ مسٹر میکڈانلڈ کے پاس دو شکاری بندوقیں بھی تھیں جو اس کے گھریلو دفتر کی الماری میں مقفل تھیں جسے میرا کزن اور اس کا دوست نہیں کھول سکے۔

جب ریوالور سے فائر ہوا تو میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ گولی لگی یا کزن نے مجھے فرش پر گرا دیا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کسی اور کو گولی لگی۔ وہ جان بوجھ کر چلائی گئی یا کوئی حادثہ تھا۔ اس واقعے کو چھبیس سال گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا لیکن سچ یہ ہے کہ اب بھی اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ میکڈانلڈ ہاؤس آج بھی چھیالیس ڈرولین ایونیو پر موجود ہے جیسے یہ کوئی عام مکان تھا جس میں کسی کا قتل نہ ہوا ہو۔ یہ کوئی خوشگوار بات نہیں ہے اور ہر بار جب بھی میں اسپارتا آتی تو یہ مجھے پوری طرح اپنے پنجوں میں جکڑ لیتی ہے۔

اگر میں کار میں اپنے بچوں یا کسی اور کے ساتھ وہاں سے گزروں تو کسی پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرتی اور عموماً اس مکان پر دوسری نظر ڈالے بغیر وہاں سے گزر جاتی ہوں۔ میری چودہ سالہ بیٹی پوچھتی ہے کہ میں یہاں کیوں آتی ہوں جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

”اس مکان میں میری ایک پرانی ٹیچر رہا کرتی تھی۔“ میں خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوں جیسے برابر میں بیٹھی ہوئی بیٹی اور پچھلی نشست پر براجمان بیٹے کو سنانے کے بجائے خود سے مخاطب ہوں۔

میری بیٹی ایلن پوچھتی ہے کہ مسز میکڈانلڈ کیسی ٹیچر تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مسز میکڈانلڈ بہت عرصہ پہلے اسپارتا سے جا چکی تھی لیکن یہ نہیں جانتی کہ وہ دونوں میاں بیوی اب بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ شاید وہ حیات ہوں کیونکہ 1961ء میں وہ درمیانی عمر کے تھے۔

”وہ بہت اچھی ٹیچر تھیں۔“ میں سوچ کر جواب دیتی ہوں۔ ”ہم سب ان سے بہت محبت کرتے تھے۔“

”وہ کیا پڑھاتی تھیں مام؟“

”وہ ہمیں سوشل اسٹڈیز پڑھاتی تھیں اور نویں جماعت میں وہ میری کلاس ٹیچر بھی تھیں۔“

”میری زندگی میں ان کی خاص اہمیت تھی۔“ میں

نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مضبوطی سے جماتے ہوئے کہا۔

میری نظریں پرانے مکانات کی قطار پر جمی ہوئی تھیں۔ سرخ اینٹوں اور سبز دروازوں والے مکان آج بھی اسی حالت میں تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ میں جب بھی اسپارٹا آتی اور اس مکان کے پاس سے گزرتی تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگتی اور دماغ کی اسکرین پر برسوں پرانی فلم چلنے لگتی۔

☆☆☆

''صرف تم اور کوئی نہیں ماریا۔ میں نہیں سمجھتی کہ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت ہے۔ کسی اور کو اس مکان میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تم وعدہ کرتی ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

میرے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ اپنی ٹیچر کی مدد کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ان کے شوہر مسٹر میکڈ انلڈ کو بغرض علاج سیراکوس کے اسپتال میں داخل ہونا تھا اور مسز میکڈ انلڈ نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں مکان کی دیکھ بھال کرتی رہوں۔ میری ذمے داریوں میں روزانہ اسکول سے واپس آنے کے بعد میکڈ انلڈ ہاؤس جانا، اخبار اور ڈاک اٹھانا، مسز میکڈ انلڈ کی بلی کے لیے خوراک کا انتظام کرنا اور پودوں کو پانی دینا تھا۔ مسز میکڈ انلڈ کا کہنا تھا کہ وہ مجھے ان خدمات کا معاوضہ ادا کریں گی۔ معاوضے کی رقم سن کر میں حیران رہ گئی۔ یہ بے بی سٹنگ کے معاوضے سے دوگنا تھی۔ تاہم یہ ایک ہنگامی صورت حال تھی۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ مسٹر میکڈ انلڈ کو اچانک ہی آپریشن کی ضرورت پیش آجائے گی اور انہیں اپنے شہر سے پچاس میل دور سیراکوس کے ایک ہوٹل میں قیام کرنا پڑے گا جو اسپتال سے نزدیک ہی تھا۔ اس دوران کوئی متبادل ٹیچر ان کی جگہ کلاس لیتی جبکہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے وہ مجھ سے مدد کی توقع کررہی تھیں۔

وہ اپریل 1961ء کا مہینا تھا۔ اس وقت میں چودہ سال کی اور نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ مسز میکڈ انلڈ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ چالیس کی ہونے کے باوجود وہ بہت پُرکشش تھیں۔ ان کے ملبوسات، بالوں کا انداز، ذہانت اور شاندار شخصیت انہیں دوسری ٹیچرز سے ممتاز کرتی تھی۔ ان کا جسم بے حد متناسب تھا۔ اس وجہ سے ہر لباس ان پر جچتا تھا اور انہیں دیکھ کر ہالی ووڈ ایکٹریس جین کربن کی یاد آجاتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ اسپارٹا کے سب سے بہترین علاقے میں واقع ایک بڑے اور پُرکشش مکان میں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر مسٹر میکڈ انلڈ ریٹائرڈ فوجی افسر تھے جنہوں نے جنگ عظیم دوم میں خدمات انجام دی تھیں۔

مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے جب مسز میکڈ انلڈ نے کلاس روم سے نکلتے ہوئے میرا بازو پکڑ کر کہا تھا۔

''ماریا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ اگلے روز ان کے شوہر کا آپریشن ہے۔

''یہ کوئی بڑا آپریشن نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''گورڈن بہت جلد ٹھیک ہوجائے گا۔ دراصل ہم لوگ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہوگیا۔ کل صبح سات بجے اس کا آپریشن ہے۔ کیا تم میری کچھ مدد کرسکتی ہو؟''

''بالکل۔'' میں نے کہا۔ میرے لیے اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی تھی کہ انہوں نے اس اہم ذمے داری کے لیے میرا انتخاب کیا۔

جانتی تھی کہ میری ماں اس کی مخالفت نہیں کرے گی کہ میں اس ہنگامی صورت حال میں اپنی ٹیچر کی مدد کروں۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اسکول کی کوئی ٹیچر میری ذات میں دلچسپی لے اور میں دوسری لڑکیوں سے آگے نکل جاؤں۔ دراصل اس طرح وہ اپنی محرومی کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک دیہی علاقے میں پیدا ہوئی اور حالات کے سبب اسے نویں جماعت میں اسکول چھوڑنا پڑ گیا۔

مسز میکڈ انلڈ ہمارے مکان سے چند بلاک کے فاصلے پر رہتی تھیں۔ اس دن اسکول ختم ہونے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ اس علاقے میں سبھی مشہور لوگ رہا کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں اپنے والدین یا کسی قریبی رشتے دار کے بجائے ایک غیر عورت کے ساتھ کہیں گئی تھی۔ وہ کافی پریشان لگ رہی تھیں۔

انہوں نے بتایا کہ ان کے شوہر کو ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے سیراکوس کے اسپتال بھیج دیا گیا ہے جبکہ وہ اگلے روز صبح روانہ ہوں گی اور توقع ہے کہ آپریشن شروع ہونے سے پہلے اسپتال پہنچ جائیں گی۔ آپریشن معمولی نوعیت کا ہے۔ اس لیے پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے بار بار ایک ہی بات کہی۔ ''ماریا! یہ بہت اہم ہے کہ کسی اور کو مکان میں داخل نہ ہونے دو۔ سوائے تمہاری ماں کے، اگر وہ ساتھ آنا چاہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ وعدہ کرو کہ کسی اور کو اندر نہیں آنے دوگی۔''

میں نے وعدہ کرلیا۔ ویسے بھی میرا کوئی عزیز دوست نہیں تھا جسے اپنی ٹیچر کی غیر موجودگی میں ان کے گھر بلاتی۔
صبح اسکول میں مجھ سے بات کرنے کے بعد مسز میکڈانلڈ نے میری ماں کو فون کیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری ماں سے اجازت طلب کریں گی لیکن وہ ہر کام مناسب اور باوقار طریقے سے کرتی تھیں۔

وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ اوپر کی منزل کے کمرے بند رہیں گے۔ ''اوپر جانے کی ضرورت نہیں، میرے شوہر کا دفتر ہال کے آخری سرے پر ہے۔ وہ بھی مقفل رہے گا۔ جو بھی ڈاک آئے، وہ تم کھانے کی میز پر رکھ دینا۔''

وہ مجھے لے کر نچلی منزل کے مختلف حصوں میں گئیں۔ میں نے اتنا خوب صورتی سے سجا ہوا گھر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے جو کام بتائے وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھے۔ مجھے ان کی بلی کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ پودوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ سیڑھیوں پر سے اخبار اور ڈاک اٹھا کر کھانے کی میز پر رکھنا تھی۔ کمروں کی لائٹس اور ٹی وی آن کرنا تھا تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ گھر میں کوئی ہے۔

''تمہیں کم از کم ایک گھنٹا یہاں رہنا ہوگا تاکہ ساشا کو اکیلے پن کا احساس نہ ہو۔ تم یہاں صوفے پر بیٹھ کر ہوم ورک کرسکتی ہو اور چاہو تو ٹی وی سے دل بہلاؤ۔ ریفریجریٹر بھرا ہوا ہے۔ تمہارا جو دل چاہے وہ کھاؤ لیکن صرف تم...... کوئی اور نہیں۔''

وہ میرا نام لیے بغیر تیزی سے بول رہی تھیں۔ جیسے انہیں بہت جلدی ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو گھما رہی تھیں اور بھول گئی تھیں کہ میں کون ہوں۔ اس خوب صورت کمرے کے ایک سرے پر فرش سے چھت تک شیشے کی کھڑکیاں نصب تھیں جن سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس جگہ مختلف اقسام کے پودے رکھے ہوئے تھے اور عام پودوں کی نسبت ان کی نگہداشت زیادہ پیچیدہ تھی۔ مسٹر میکڈانلڈ نے اپنے دفتر میں جو پودے رکھے ہوئے تھے، وہ کافی عرصے تک پانی کے بغیر بھی رہ سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے میں اپنے ساتھ نوٹ بک لے آئی تھی لہٰذا اچھے بچوں کی طرح ان کی ہدایات نوٹ کرتی رہی۔

اس دوران میں ایک خوب صورت سیامی بلی کچھ فاصلے سے ہمیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہمارے پیچھے آئی لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی ہم سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں نیلی اور کان عام بلیوں کی نسبت کافی بڑے تھے۔ میں نے کبھی قریب سے اتنا دلکش جانور نہیں دیکھا تھا۔ مسز میکڈانلڈ نے کہا۔ ''امید ہے کہ تم ساشا کو دوست بنالوگی۔'' لیکن بہ ظاہر ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بھی بدستور فاصلے پر رہی۔ مسز میکڈانلڈ نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

ان کی ہدایت کے مطابق مجھے ہر روز بلی کی خوراک کا ایک تازہ ڈبا کھولنا تھا اور ساتھ ہی اسے خشک میوے اور تازہ پانی بھی دینا تھا۔ ساشا شاید اکیلے رہنے کی وجہ سے پریشان ہوگئی تھی اور اس وجہ سے شاید پوری طرح کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے پیالہ دھو کر اسے تولیا سے صاف کرنا ہوتا اور اس کے لیے میں ایک نیا ڈبا کھولتی۔ اسی طرح ہر روز مجھے اس کا پانی بھی تبدیل کرنا پڑتا۔

''خیال رکھنا یہ باہر نہ جانے پائے۔'' مسز میکڈانلڈ نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے جب تم دروازہ کھولو تو یہ باہر جانے کی کوشش کرے۔''

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ مسز میکڈانلڈ نے لپک کر فون اٹھالیا۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ ''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور کل صبح اسپتال کے لیے روانہ ہوجاؤں گی۔ میں نے اپنی ایک بہت ہی قابلِ اعتماد شاگرد سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھے۔ ہاں، مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔''

گھر سے باہر نکلتے وقت انہوں نے مجھے چابی سے دروازہ کھولنے کی مشق کروائی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں آمدورفت کے لیے سامنے والے دروازے کے بجائے کچن کا دروازہ استعمال کروں۔ انہوں نے مجھے ایک ٹائپ شدہ کاغذ بھی دیا جس پر ہدایات درج تھیں اور اس کے ساتھ ہی بیس ڈالر کے کچھ نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کسی بھی وقت پیسوں کی ضرورت پڑسکتی ہے۔''

وہ کل ساٹھ ڈالرز تھے اور اگر میں کئی ہفتوں تک ان کی مدد کرتی تب بھی یہ رقم بہت زیادہ تھی گو کہ میں انہیں بتا چکی تھی کہ اپنے گھر تک پیدل چلی جاؤں گی جو تھوڑے فاصلے پر ہے لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑ دیں گی۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ جو فیصلہ کرلیں، تبدیل نہیں ہوسکتا تھا۔

''اندھیرا پھیل رہا ہے اور سردی بھی ہے۔ اس لیے میں تمہیں پیدل نہیں جانے دوں گی۔''

اس رات ماں نے مجھ سے کئی سوالات کیے۔ وہ لوگ کس طرح کے گھر میں رہتے ہیں اور میری ذمے

داریاں کیا ہوں گی۔ وہ بہت خوش اور پُرجوش نظر آرہی تھی لیکن ساتھ ہی تھوڑی سی فکرمند بھی کہ اگر مسز میکڈانلڈ کی غیر موجودگی میں کوئی واقعہ پیش آگیا تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا۔

مسز میکڈانلڈ نے ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مجھے اس خدمت کا معاوضہ دے گی لیکن ماں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی ایک بڑی رقم دے چکی ہے جو کام کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماں کو ان ساٹھ ڈالرز کے بارے میں بتاؤں یا نہیں لیکن ابھی نہیں۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ اس کا بڑا حصہ لے لیتی، یہ میرے پیسے تھے۔

اگلے روز سہ پہر میں جب میں پہلی بار میکڈانلڈ ہاؤس گئی تو کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ جانے کیوں مجھے موہوم سی توقع تھی کہ وہاں کوئی ہوگا لیکن گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ سوائے اس بلی کے جو مجھے دیکھتے ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ چیزیں اس طرح نظر نہیں آئیں جیسا کہ امید کر رہی تھی۔ مسز میکڈانلڈ نے اسپرے گن اور پانی کا برتن ڈائننگ روم کے فرش پر رکھنے کے بجائے کچن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ سنک میں ناشتے کے برتن بغیر دھلے رکھے ہوئے تھے جیسے وہ بہت عجلت میں روانہ ہوئی ہو۔ کچن کاؤنٹر پر گزشتہ روز کے اخبار کے صفحات پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی الماری کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک بلب جل رہا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ گزشتہ شب وہ کتنی پریشان تھی اور فون سن کر خوفزدہ ہوگئی تھی جیسے اسے کسی بدترین بات کا ڈر ہو کہ اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ اوپری منزل کے کمرے مقفل نہیں تھے جیسا کہ مسز میکڈانلڈ کا پروگرام تھا اور ان کے دروازے بھی بند نہیں تھے۔ میں نے انہیں بند کرنے کے بارے میں سوچا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے وہ دروازے کھولے ہوں گے مگر لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھ پر بھروسا کرتی تھی۔ میں نے دروازے کے پاس سے ڈاک اور اخبارات اٹھائے اور انہیں کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ ان میں زیادہ تر مسٹر میکڈانلڈ کے نام کاروباری خطوط تھے جبکہ صرف ایک خط مسز میکڈانلڈ کے نام تھا۔ اس دوران میں ساشا کو بھی آوازیں دیتی رہی لیکن اس نے مکمل طور پر مجھے نظرانداز کردیا۔

میں نے گزشتہ روز کا بچا ہوا کھانا پلاسٹک کے پیالے سے صاف کیا اور اس کے لیے مچھلی کا نیا ڈبا کھولا اور ساتھ ہی خشک میوے اور تازہ پانی بھی رکھ دیا لیکن ساشا نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے کچن میں جاکر سنک میں رکھے ہوئے برتن دھوئے اور انہیں کپڑے سے خشک کرکے کیبنٹ میں رکھ دیا۔ میری خواہش تھی کہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں ہر چیز صاف ستھری ملے۔ اسی نفاست پسندی سے میں نے پودوں کی دیکھ بھال کی تاکہ مسز میکڈانلڈ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ وہ بہت ہی خوب صورت پودے تھے جو میکسیکو اور جنوبی امریکا سے منگوائے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ایک دن میرے پاس بھی ایسے ہی پودے اور ایسا مکان ہوگا۔

میرا ارادہ لائبریری میں رکھی ہوئی چند کتابوں کو بھی دیکھنے کا تھا جو لیونگ روم سے متصل تھی اور اس میں چاروں طرف چھت سے فرش تک کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف رکھے ہوئے تھے لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور نہ ہی میں نے ٹیلی ویژن کو آن کیا جو ہمارے گھر کے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت اور بڑا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی خرابی ہوگئی تو اس کا الزام میرے سر آئے گا۔

ٹی وی روم کے برابر میں مسٹر میکڈانلڈ کا ہوم آفس تھا جسے میری ٹیچر نے مقفل کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یوں لگا جیسے مسز میکڈانلڈ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ اچانک ہی میرے عقب میں یا سیڑھیوں کے اوپر ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بے اختیار پکارا۔ ”ہیلو، ہیلو۔“ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ مکان بہت بڑا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس میں کُل کتنے کمرے ہیں۔

میں نے سوچا کہ فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے گو کہ مجھے آئے ہوئے بہ مشکل بیس منٹ ہوئے تھے اور ابھی تک میں نے وہ سارے کام انجام نہیں دیے تھے جو مسز میکڈانلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ ان میں سب سے اہم ساشا کو کھانا کھلانا تھا لیکن وہ آواز سن کر میں اتنی گھبرا گئی کہ میرے لیے ایک سیکنڈ بھی رکنا محال ہوگیا۔ میں نے جلدی سے لائٹس آف کیں اور گھر کی طرف چل دی گو کہ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا لیکن میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ مام نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن اسے مجھ سے زیادہ مسز میکڈانلڈ کے مکان کی فکر تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”اس کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟“

میں نے وعدہ کرلیا۔ ویسے بھی میرا کوئی عزیز دوست نہیں تھا جسے اپنی ٹیچر کی غیر موجودگی میں ان کے گھر بلاتی۔

صبح اسکول میں مجھ سے بات کرنے کے بعد مسز میکڈ انلڈ نے میری ماں کو فون کیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری ماں سے اجازت طلب کریں گی لیکن وہ ہر کام مناسب اور باوقار طریقے سے کرتی تھیں۔

وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ اوپر کی منزل کے کمرے بند رہیں گے۔ ''اوپر جانے کی ضرورت نہیں، میرے شوہر کا دفتر ہال کے آخری سرے پر ہے۔ وہ بھی مقفل رہے گا۔ جو بھی ڈاک آئے، وہ تم کھانے کی میز پر رکھ دینا۔''

وہ مجھے لے کر نچلی منزل کے مختلف حصوں میں گئیں۔ میں نے اتنا خوب صورتی سے سجا ہوا گھر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے جو کام بتائے وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھے۔ مجھے ان کی بلی کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ پودوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ سیڑھیوں پر سے اخبار اور ڈاک اٹھا کر کھانے کی میز پر رکھنا تھی۔ کمروں کی لائٹس اور ٹی وی آن کرنا تھا تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ گھر میں کوئی ہے۔

''تمہیں کم از کم ایک گھنٹا یہاں رہنا ہوگا تاکہ ساشا کو اکیلے پن کا احساس نہ ہو۔ تم یہاں صوفے پر بیٹھ کر ہوم ورک کرسکتی ہو اور چاہو تو ٹی وی سے دل بہلاؤ۔ ریفریجریٹر بھرا ہوا ہے۔ تمہارا جو دل چاہے وہ کھاؤ لیکن صرف تم...... کوئی اور نہیں۔''

وہ میرا نام لیے بغیر تیزی سے بول رہی تھیں۔ جیسے انہیں بہت جلدی ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو گھما رہی تھیں اور بھول گئی تھیں کہ میں کون ہوں۔ اس خوب صورت کمرے کے ایک سرے پر فرش سے چھت تک شیشے کی کھڑکیاں نصب تھیں جن سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس جگہ مختلف اقسام کے پودے رکھے ہوئے تھے اور عام پودوں کی نسبت ان کی نگہداشت زیادہ پیچیدہ تھی۔ مسٹر میکڈ انلڈ نے اپنے دفتر میں جو پودے رکھے ہوئے تھے، وہ کافی عرصے تک پانی کے بغیر بھی رہ سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے میں اپنے ساتھ نوٹ بک لے آئی تھی لہٰذا اچھے بچوں کی طرح ان کی ہدایات نوٹ کرتی رہی۔

اس دوران میں ایک خوب صورت سیاہ بلی کچھ فاصلے سے ہمیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہمارے پیچھے آئی لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی ہم سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں نیلی اور کان عام بلیوں کی نسبت کافی بڑے تھے۔ میں نے بھی قریب سے اتنا دلکش جانور نہیں دیکھا تھا۔ مسز میکڈ انلڈ نے کہا۔ ''امید ہے کہ تم ساشا کو دوست بنالوگی۔'' لیکن بظاہر ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بھی بدستور فاصلے پر رہی۔ مسز میکڈ انلڈ نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

ان کی ہدایت کے مطابق مجھے ہر روز بلی کی خوراک کا ایک تازہ ڈبا کھولنا تھا اور ساتھ ہی اسے خشک میوے اور تازہ پانی بھی دینا تھا۔ ساشا شاید اکیلے رہنے کی وجہ سے پریشان ہوگئی تھی اور اس وجہ سے شاید پوری طرح کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے پیالہ دھو کر اسے تولیا سے صاف کرنا ہوتا اور اس کے لیے میں ایک نیا ڈبا کھولتی۔ اسی طرح ہر روز مجھے اس کا پانی بھی تبدیل کرنا پڑتا۔

''خیال رکھنا یہ باہر نہ جانے پائے۔'' مسز میکڈ انلڈ نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے جب تم دروازہ کھولو تو یہ باہر جانے کی کوشش کرے۔''

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ مسز میکڈ انلڈ نے لپک کر فون اٹھالیا۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ ''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور کل صبح اسپتال کے لیے روانہ ہوجاؤں گی۔ میں نے اپنی ایک بہت ہی قابلِ اعتماد شاگرد سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھے۔ ہاں، مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔''

گھر سے باہر نکلتے وقت انہوں نے مجھے چابی سے دروازہ کھولنے کی مشق کروائی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں آمدورفت کے لیے سامنے والے دروازے کے بجائے کچن کا دروازہ استعمال کروں۔ انہوں نے مجھے ایک ٹائپ شدہ کاغذ بھی دیا جس پر ہدایات درج تھیں اور اس کے ساتھ ہی بیس ڈالر کے کچھ نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کسی بھی وقت پیسوں کی ضرورت پڑسکتی ہے۔''

وہ کل ساٹھ ڈالرز تھے اور اگر میں کئی ہفتوں تک ان کی مدد کرتی تب بھی یہ رقم بہت زیادہ تھی گو کہ میں انہیں بتا چکی تھی کہ اپنے گھر تک پیدل چلی جاؤں گی جو تھوڑے فاصلے پر ہے لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑ دیں گی۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ جو فیصلہ کرلیں، تبدیل نہیں ہوسکتا تھا۔

''اندھیرا پھیل رہا ہے اور سردی بھی ہے۔ اس لیے میں تمہیں پیدل نہیں جانے دوں گی۔''

اس رات ماں نے مجھ سے کئی سوالات کیے۔ وہ لوگ کس طرح کے گھر میں رہتے ہیں اور میری ذمے

داریاں کیا ہوں گی۔ وہ بہت خوش اور پُرجوش نظر آرہی تھی لیکن ساتھ ہی تھوڑی سی فکر مند بھی کہ اگر مسز میکڈ انلڈ کی غیر موجودگی میں کوئی واقعہ پیش آگیا تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا۔

مسز میکڈ انلڈ نے ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مجھے اس خدمت کا معاوضہ دے گی لیکن ماں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی ایک بڑی رقم دے چکی ہے جو کام کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماں کو ان ساٹھ ڈالرز کے بارے میں بتاؤں یا نہیں لیکن ابھی نہیں۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ اس کا بڑا حصہ لے لیتی، یہ میرے پیسے تھے۔

اگلے روز سہ پہر میں جب میں پہلی بار میکڈ انلڈ ہاؤس گئی تو کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ جانے کیوں مجھے موہوم سی توقع تھی کہ وہاں کوئی ہوگا لیکن گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ سوائے اس بلی کے جو مجھے دیکھتے ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ چیزیں اس طرح نظر نہیں آئیں جیسا کہ امید کر رہی تھی۔ مسز میکڈ انلڈ نے اسپرے گن اور پانی کا برتن ڈائننگ روم کے فرش پر رکھنے کے بجائے کچن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ سنک میں ناشتے کے برتن بغیر دھلے رکھے ہوئے تھے جیسے وہ بہت عجلت میں روانہ ہوئی ہو۔ کچن کاؤنٹر پر گزشتہ روز کے اخبار کے صفحات پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی الماری کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک بلب جل رہا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ گزشتہ شب وہ کتنی پریشان تھی اور فون سن کر خوفزدہ ہوگئی تھی جیسے اسے کسی بدترین بات کا ڈر ہو کہ اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ اوپری منزل کے کمرے مقفل نہیں تھے جیسا کہ مسز میکڈ انلڈ کا پروگرام تھا اور ان کے دروازے بھی بند نہیں تھے۔ میں نے انہیں بند کرنے کے بارے میں سوچا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے وہ دروازے کھولے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھ پر بھروسا کرتی تھی۔ میں نے دروازے کے پاس سے ڈاک اور اخبارات اٹھائے اور انہیں کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ ان میں زیادہ تر مسٹر میکڈ انلڈ کے نام کاروباری خطوط تھے جبکہ صرف ایک خط مسز میکڈ انلڈ کے نام تھا۔ اس دوران میں ساشا کو بھی آوازیں دیتی رہی لیکن اس نے مکمل طور پر مجھے نظر انداز کر دیا۔

میں نے گزشتہ روز کا بچا ہوا کھانا پلاسٹک کے پیالا سے صاف کیا اور اس کے لیے مچھلی کا نیا ڈبا کھولا اور ساتھ ہی خشک میوے اور تازہ پانی بھی رکھ دیا لیکن ساشا نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے کچن میں ہی جا کر سنک میں رکھے ہوئے برتن دھوئے اور انہیں کپڑے سے خشک کر کے کیبنٹ میں رکھ دیا۔ میری خواہش تھی کہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں ہر چیز صاف ستھری ملے۔ اسی نفاست پسندی سے میں نے پودوں کی دیکھ بھال کی تاکہ مسز میکڈ انلڈ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ وہ بہت ہی خوب صورت پودے تھے جو میکسیکو اور جنوبی امریکا سے منگوائے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ایک دن میرے پاس بھی ایسے ہی پودے اور ایسا مکان ہوگا۔

میرا ارادہ لائبریری میں رکھی ہوئی چند کتابوں کو بھی دیکھنے کا تھا جو لیونگ روم سے متصل تھی اور اس میں چاروں طرف چھت سے فرش تک کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف رکھے ہوئے تھے لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور نہ ہی میں نے ٹیلی ویژن کو آن کیا جو ہمارے گھر کے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت اور بڑا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی خرابی ہوگئی تو اس کا الزام میرے سر آئے گا۔

ٹی وی روم کے برابر میں مسٹر میکڈ انلڈ کا ہوم آفس تھا جسے میری ٹیچر نے مقفل کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یوں لگا جیسے مسز میکڈ انلڈ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ اچانک ہی میرے عقب میں یا سیڑھیوں کے اوپر ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بے اختیار پکارا۔ ”ہیلو، ہیلو۔“ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ مکان بہت بڑا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس میں کُل کتنے کمرے ہیں۔

میں نے سوچا کہ فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے گو کہ مجھے آئے ہوئے بہ مشکل بیس منٹ ہوئے تھے اور ابھی تک میں نے وہ سارے کام انجام نہیں دیے تھے جو مسز میکڈ انلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ ان میں سب سے اہم ساشا کو کھانا کھلانا تھا لیکن وہ آواز سن کر میں اتنی گھبرا گئی کہ میرے لیے ایک سیکنڈ بھی رکنا محال ہوگیا۔ میں نے جلدی سے لائٹس آف کیں اور گھر کی طرف چل دی گو کہ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا لیکن میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ ماں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن اسے مجھ سے زیادہ مسز میکڈ انلڈ کے مکان کی فکر تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”اس کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟“

یہ عجیب وغریب سوال سن کر میں حیران رہ گئی۔ ''ہاں سب ٹھیک ہے، گھر کو کیا ہونا تھا؟''

''اس نے آج مجھے سیراکوس سے فون کیا تھا۔''

''تمہیں فون کیا تھا...... کیوں؟ وہ کیا کہہ رہی تھی؟''

''وہ تمہارے اور اپنے گھر کے بارے میں پوچھ رہی تھی لیکن اس نے اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ شاید وہ ذاتی باتیں کسی سے نہیں کرنا چاہتی۔''

دوسرے روز ماں نے رضاکارانہ طور پر میرے ساتھ چلنے کی پیشکش کی لیکن میں نے فوراً ہی منع کر دیا کیونکہ مسز میکڈانلڈ نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں کسی کو اپنے ساتھ لے کر نہ آؤں البتہ ماں کے لیے منع نہیں کیا تھا لیکن میں احتیاط سے کام لے رہی تھی۔

''میں نہیں سمجھتی کہ مسز میکڈانلڈ کو اس پر کوئی اعتراض ہوگا۔'' ماں نے کہا۔

''لیکن میں وعدہ کر چکی ہوں اور اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتی۔''

اس روز میں نے وہ سارے کام نمٹا دیے جو مسز میکڈانلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ مجھے اپنی ٹیچر کی ہدایت کے مطابق ایک گھنٹا وہاں رہنا تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے ساشا کو اپنے پاس بلانا چاہا لیکن وہ مجھ سے دور رہی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے تمام کمروں کی لائٹس آن کر دیں۔ اس کے بعد اپنا ہوم ورک کرنے بیٹھ گئی لیکن مجھے بے آرامی محسوس ہو رہی تھی۔ سوا سات ہو چکے تھے اور میں واپس جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سے مسز میکڈانلڈ بول رہی تھیں۔

''ہیلو، ماریا! کیسی ہو...... گھر کا کیا حال ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے وہ سارے کام کر دیے جو تم نے مجھے بتائے تھے۔''

''اور ساشا کیسی ہے؟''

''کھانا کھا رہی ہے لیکن مجھ سے اب بھی تھوڑی سی خوفزدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی ہماری دوستی ہو جائے گی۔''

انہوں نے مجھ سے ایک بار پھر مکان کے بارے میں پوچھا۔ وہ اپنی ڈاک کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھیں اور ساتھ ہی انہیں یہ فکر بھی لاحق تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی فون تو نہیں آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم سب انہیں بہت یاد کر رہے ہیں اور سب لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ تم واپس کب آؤ گی؟

''بہت جلد۔ اگلے ہفتے تک واپس آ جاؤں گی۔''

میں نے ان سے مسٹر میکڈانلڈ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ میں نے گھر کی بتیاں بجھائیں اور اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔

تیسرے روز میں نے چھ بج کر بیس منٹ پر اپنا کام ختم کر لیا۔ بلی کے برتن دھوئے اور اس میں تازہ کھانا رکھ رہی تھی کہ میں نے ساشا کو کچن کے دروازے پر دیکھا۔ وہ اضطراری طور پر اپنی دم فرش پر رگڑ رہی تھی۔ عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی جس کی آواز اس خاموش مکان میں ایک چھناکے کے ساتھ گونجی۔ کیا کوئی دروازے پر تھا؟ میں سوچنے لگی کہ میرے والدین کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ میں اس وقت یہاں ہوتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میکڈانلڈ کا کوئی جاننے والا ہو۔ کوئی سامان لانے والا شخص تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ لوگ عموماً صبح کے وقت آتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ وہ یہ سوچ کر واپس چلا جائے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ میں نے مسز میکڈانلڈ کی ہدایت کے مطابق تمام کمروں کی بتیاں روشن کر رکھی تھیں جس سے کوئی بھی شخص یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ گھر خالی نہیں ہے۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ لیونگ روم کی جو کھڑکیاں سڑک کی جانب کھلتی تھیں، وہاں پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس طرح کسی کے لیے باہر سے جھانکنا ممکن نہ تھا۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی اور بار بار بجتی رہی جو کہ ایک غیر فطری بات تھی۔ یقیناً یہ کوئی میکڈانلڈ کا دوست نہیں ہوسکتا پھر میرے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ ''ماریا!'' مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آواز کس کی ہوسکتی ہے۔ وہ میرا کزن ٹریوس ریڈل تھا لیکن اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟ یہ بات تو صرف میرے والدین ہی جانتے تھے۔ ضرور میری ماں نے اپنے کسی رشتے دار کے سامنے شیخی بگھاری ہوگی کہ میں اپنی ٹیچر کی غیر موجودگی میں اس کے مکان کی دیکھ بھال کر رہی ہوں اور اس نے میری سوتیلی خالہ لوئیس ریڈل کو بتا دیا ہوگا جو اسپارٹا سے نو میل کے فاصلے پر بیچم کاؤنٹی میں رہتی تھی لیکن دونوں بہنوں کے درمیان ملنا جلنا نہیں تھا اور وہ میرے کزن ٹریوس کی ماں تھی۔

یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ میں نے ٹریوس کو

گزشتہ ایک سال سے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ ایک ایسی جگہ کیوں آگیا جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا؟ وہ مسلسل گھنٹی بجا رہا تھا اور بار بار کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بار اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ تم اندر ہو۔ دروازہ کھول دو لڑکی۔ باہر بہت سردی ہے۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ ''دروازہ کھولو ماریا، ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔''

میں دیکھ سکتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔ وہ دونوں دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے چہرے چھپانے کے لیے ہڈ پہن رکھے تھے۔ وہ میرا آوارہ گرد کزن تھا گو کہ میں نے یہ بات کبھی اس کے منہ پر نہیں کہی ورنہ وہ ناراض ہو جاتا۔ یہ ان کے خاندان کی خاصیت تھی۔ اگر انہیں شک ہو جائے کہ کوئی ان پر تنقید کر رہا ہے تو وہ جارحیت پر اتر آتے تھے۔

ٹریوس اب سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ اس میں ایک آرٹسٹ یا کارٹونسٹ جیسی خصوصیات تھیں۔ وہ اپنی کامک بک کی نقالی کرتے ہوئے ادھوری، دلچسپ اور رنگین تصویریں بنایا کرتا تھا۔ وہ باب ڈیلن کی طرح نامور موسیقار بننا چاہ رہا تھا۔ اس نے بارہ سال کی عمر میں ایک پرانا گٹار بھی خرید لیا تھا اور اسے بجا کر وہ اپنے آپ کو موسیقار سمجھنے لگا تھا۔ بدقسمتی سے وہ گٹار ٹوٹ گیا یا چوری ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ٹریوس بھی مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اسے اپنی سے بڑی عمر کے ساتھی ویلز کے ساتھ لوٹ مار، نقب زنی اور چوری کے الزامات میں گرفتار کیا گیا تاہم انہیں نابالغ ہونے کی بنا پر اچھے چال چلن کی ضمانت پر رہائی مل گئی گو کہ میری ماں کے خیال میں وہ سخت سزا کے مستحق تھے۔

میری آنٹی لوئیس کی دو تین مرتبہ شادی اور طلاق ہو چکی تھی۔ ان کے پانچ بچے تھے جنہوں نے ان کی زندگی برباد کر رکھی تھی۔ ٹریوس ان میں سب سے چھوٹا اور ہونہار تھا۔ جی ہاں وہ میرا خاص کزن تھا۔ جانتی تھی کہ وہ میرے بارے میں اس انداز سے سوچتا ہے جس طرح میں اس کے لیے سوچتی ہوں۔

''ماریا، اچھی لڑکی۔ ہمیں اندر آنے دو۔'' وہ کسی لوہے کی سلاخ سے دروازے پر ضرب لگا رہا تھا اور مسلسل دروازہ کھولنے کی التجا کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نشے کی حالت میں ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دروازے پر آکر اس سے جانے کے لیے کہوں۔ اس طرح وہ مشتعل ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر خاموش رہوں گی تو وہ یہی سمجھے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے اور اگر میں نے انہیں اشتعال نہ دلایا تو وہ چند منٹوں میں چلے جائیں گے۔

ایسا ہی ہوا۔ پانچ یا چھ منٹ بعد دروازے پر ضربیں پڑنا بند ہو گئیں۔ اب وہ دروازے کی گھنٹی بھی نہیں بجا رہے تھے۔ میرے کزن کی التجائیں اور چیخنا چلانا بھی بند ہو گیا تھا۔ غالباً انہوں نے اپنی کوشش ترک کر دی تھی اور وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے بڑی احتیاط سے بیرونی دروازے کا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر وہاں سیڑھیوں پر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے لیونگ روم کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مجھے سامنے والے لان میں بھی کوئی نظر نہ آیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا سوچا ہی نہ تھا کہ وہ مجھے ہراساں یا نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور نہ ہی وہ یہاں سے کچھ چرانا چاہتا ہو گا کیونکہ ایسی صورت میں اس کے پکڑے جانے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتا تھا اور کبھی نہیں چاہے گا کہ میں کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤں جب تک کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ میں اب بھی اپنے کزن ٹریوس سے محبت کرتی تھی۔ اسی لیے چاہ رہی تھی کہ کم از کم آج کی رات وہ میکڈانلڈ ہاؤس میں نہ آئے۔

یہ جاننے کے بعد کہ ٹریوس اور اس کا ساتھی جا چکے ہیں، میں بھی گھر جانے کے لیے بے قرار ہو گئی۔ اب مجھے بتیاں بجھانا تھیں۔ میں نے جلدی جلدی پودوں کو پانی دیا۔ اس کے بعد کچن میں واپس آئی۔ میں گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ کچن کے دروازے پر آوازیں اور دبے دبے قہقہے سنائی دیے۔

''ماریا! ہم نے تمہیں دیکھ لیا۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازے کی ناب گھمائی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اسی دوران ٹریوس کا چہرہ کھڑکی میں نمودار ہوا۔ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے اندر آنے دو۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی زبان سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتی، اس نے کھڑکی کے شیشے پر زوردار گھونسا مارا جس سے شیشے کے ٹکڑے کچن کے فرش پر بکھر گئے۔

اب اس نے اندر ہاتھ ڈال کر دروازے کی ناب گھمائی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کوشش میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا کیونکہ خون کے دھبے دروازے اور فرش پر نظر آرہے تھے لیکن اس نے اس پر

کوئی توجہ نہیں دی۔

ٹریوس کا دوست اس کے پیچھے کچن میں نہیں آیا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ ٹریوس اتنی بداحتیاطی کا مظاہرہ کرے گا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ باہر کھڑا اسے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ غالباً ویلز تھا۔ اس کا جسم مضبوط، چوڑے جبڑے اور عمر بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ اور سر ہڈ میں چھپا رکھا تھا اور وہ دونوں آپس میں بحث کر رہے تھے پھر وہ وہاں سے جانے لگا۔ ٹریوس نے غصے سے کہا۔ ”جہنم میں جاؤ۔“

جب وہ دونوں کچن کے دروازے کے باہر بحث مباحثہ کر رہے تھے تو مجھے چاہیے تھا کہ سامنے کے دروازے سے باہر نکل کر کسی کو مدد کے لیے پکارتی۔ راہ چلتی کسی گاڑی کو روکتی یا کسی پڑوسی کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ بے حس و حرکت کھڑی اپنی پلکیں جھپکاتی رہی جیسے میری ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ سب کچھ ایک شرارت سے زیادہ نہ ہو اور میرے کزن کا ارادہ حقیقت میں نقب زنی کرنے کا نہ ہو۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو میرے لیے برائی کا سبب بنے۔ وہ میرا دوست جو تھا۔

ٹریوس دروازے سے اندر آیا اور مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ہمیں اندر کیوں نہیں آنے دیا؟ یہ سب تمہاری غلطی ہے۔“

میں نے اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن میرے بازو پر اس کی گرفت بڑی مضبوط اور تکلیف دہ تھی۔ وہ اتنا قریب تھا کہ میں اس کی سانسوں کی ناگوار بو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے کبھی اسے اتنے پُرجوش انداز میں نہیں دیکھا تھا اور مجھے اس کے ارادے خطرناک لگ رہے تھے۔ اس کے باوجود میں یہ یقین کرنا چاہ رہی تھی کہ میرا کزن مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔

میں نے اس سے چلے جانے کی التجا کی اور سمجھانا چاہا کہ میری کلاس ٹیچر اس مکان میں رہتی ہے اور میں اس کی غیر موجودگی میں یہاں کی دیکھ بھال کر رہی ہوں کیونکہ اس کا شوہر اسپتال میں ہے۔

”پریشان مت ہو ماریا۔ کوئی بھی اس مکان کو یا تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا تاوقتیکہ تم پولیس کو بلانے یا اس مقصد کے لیے باہر جانے کی کوشش نہ کرو۔ ایسی صورت میں تمہیں پچھتانا پڑے گا۔“

کیا وہ مذاق کر رہا تھا؟ بچپن میں کھیل کے دوران وہ کبھی کبھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا جن میں دھمکی کی جھلک ہوتی تھی اگر میں فوراً ہی اس کی بات مان جاتی تو وہ نہ مجھے دھکا دیتا اور نہ ہی مارتا اور اگر میں رونے لگتی تو فوراً ہی نرم پڑ جاتا اور کہتا کہ وہ تو مذاق کر رہا تھا لیکن اب گو کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ دیکھ رہا تھا کہ میں خوفزدہ و پریشان ہوں لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہ ناراض ہونے کے باوجود قہقہے لگا رہا تھا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کا دوست اسے یوں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس نے بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ شاید وہ اسے دیکھ کر کہہ سکے۔ ”بے وقوف بزدل۔“

جب میں نے اس کی گرفت سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ یہاں سے چلا جائے تو اس نے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تنگ مت کرو ماریا۔ میں اپنا کام ختم کر کے ہی جاؤں گا۔“

”ممکن ہے کہ پڑوسیوں نے تمہیں نقب زنی کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ ان میں سے کوئی بھی پولیس کو فون کر سکتا ہے۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔ یہ مکان کافی فاصلے پر بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے کسی نے کچھ نہیں سنا ہوگا اور نہ ہی کوئی اس پر توجہ دے گا۔“

ٹریوس کچن کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ شاید ہی اس سے پہلے اس نے اتنا بڑا کچن دیکھا ہو۔ اس نے الماریوں کے دروازے اور کیبنٹ کی درازیں کھولیں اور ایک ایک کر کے چیزیں نکال کر دیکھنے لگا۔ اس نے مستی میں آ کر اپنی جیکٹ اتار کر فرش پر پھینک دی۔ اس کے نیچے اس نے ایک سیاہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بال جو کبھی بہت خوب صورت ہوا کرتے تھے، اب گرد اور مٹی کی وجہ سے سخت اور بے رونق ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی پہلے کی طرح شاداب نہیں رہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ منشیات کا عادی ہو چکا تھا۔

”دوبارہ اکٹھے ہونے کی خوشی میں ایک ایک ڈرنک ہو جائے۔“ وہ جھومتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم مجھے یاد نہیں کر رہی تھیں؟ کیا میں تمہارا پسندیدہ کزن نہیں ہوں؟“

میں نے مشروب لینے سے انکار کیا تو اس نے زبردستی میرے منہ سے گلاس لگایا۔ میں نے دانت بھینچ لیے تو اس نے میرے جبڑے کھول کر تھوڑا سا مشروب میرے منہ میں ڈال دیا۔ میرے حلق میں جلن ہونے لگی اور میں نے زور زور سے کھانسنا شروع کر دیا۔ وہ مجھ پر ہنسنے لگا پھر کھینچتا ہوا ہال میں لے گیا جہاں سے گزر کر وہ ٹی وی روم میں داخل

ہوگیا۔ وہاں رکھے ہوئے ٹی وی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے خواب میں بھی اتنا بڑا اور قیمتی ٹی وی نہیں دیکھا ہوگا۔ اس نے ٹی وی آن کیا اور ..... بے ہودہ طریقے سے چینل بدلنے لگا۔

ٹریوس کی فطرت میں بے چینی تھی۔ وہ چند سیکنڈ سے زیادہ ایک چینل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ البتہ اس نے ٹیلی ویژن کی آواز اونچی کررکھی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شاید پڑوسی یہ آواز سن کر پوچھ گچھ کرنے آجائیں لیکن بہ ظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ ٹریوس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ اسے یہ ٹی وی لے جانے کے لیے دوبارہ آنا پڑے گا کیونکہ اس کے لیے اسے ایک ٹرک کی ضرورت ہوگی۔ اس نے ٹی وی سے ابھرنے والی موسیقی کی دھنوں پر تھرکنا شروع کردیا اور مجھے بھی پکڑ کر رقص کے انداز میں حرکت کرنے لگا۔ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ تم میرے لیے بالکل مناسب ہو۔“

اس نے کلائی کے پاس سے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے مجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا بازو میری گردن کے گرد ڈالا اور گلاس پھر میرے منہ سے لگایا۔ میں نے مزاحمت کی لیکن وہ میرے مقابلے میں بہت طاقتور تھا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر مزاحمت ترک کردی کہ شاید وہ رک جائے۔ شاید وہ یہاں سے چلا جائے کیونکہ وہ مجھے تنگ کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

اس نے مجھے جس طرح پکڑ رکھا تھا، وہ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اس سے پہلے اس نے شاید ہی مجھے غور سے دیکھا ہو لیکن اس وقت وہ میرے بہت قریب تھا۔ میں اس کی ناگوار سانسوں اور جسم سے پھوٹنے والی بو کو محسوس کرسکتی تھی۔

”تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟ لگتا ہے جیسے تم مجھے نہیں جانتیں؟“

میں نے قہقہہ لگا کر اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور اس کی گرفت سے بھی اپنے آپ کو نکال لیا لیکن اس سے دور جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ جانتی تھی کہ اسے وہ اپنی بے عزتی محسوس کرے گا۔ اس لمحے مجھے اچانک ہی ٹریوس سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ میرے دل میں یہ خواہش ابھری کہ کاش وہ کہیں دور چلا جائے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح جس نے فوج میں شمولیت اختیار کرلی تھی اور ویت نام کی جنگ میں چلا گیا تھا۔

گوکہ میں اب بھی اس سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی لیکن وہ مجھے گھسیٹتا ہوا ڈائننگ روم میں لے گیا۔ وہاں اس نے گملوں میں لگے ہوئے پودوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ مسز میکڈانلڈ نے یہ پودے بڑی محنت سے جمع کیے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ انہیں نقصان نہ پہنچائے چنانچہ میں نے ایک بار پھر اس سے کہا۔ ”ٹریوس! پلیز رک جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔“

”کہاں چلا جاؤں...... کیا اس کے علاوہ بھی کوئی جگہ ہے؟“

مجھے اب چکر آرہے تھے۔ گوکہ میں نے ایک دو ہی گھونٹ لیے تھے۔ پھر مجھے زور کی قے آئی۔ ٹریوس میری حالت دیکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ میں کلی کرنے کے لیے کچن یا باتھ روم جانا چاہ رہی تھی لیکن ٹریوس نے مجھے روک دیا۔ اسے مجھ پر بھروسا نہیں تھا۔ اس نے ایک کیبنٹ سے چاندی کے برتن نکالے اور بولا۔ ”کچھ لوگوں کے پاس بہت مال ہے اور کچھ بالکل قلاش ہیں۔“

ان میں سے کچھ برتن اس کی بے پروائی کی وجہ سے فرش پر گر پڑے تو اس نے انہیں ٹھوکر ماری۔ مجھ سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا اور میں نے اس سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”پلیز! گھر چلے جاؤ۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”واقعی تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی سویٹ ہارٹ اور اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا چہرہ بدصورت ہوجائے گا۔ بالکل اس پیدائشی نشان کی طرح سرخ اور بدنما۔“

اس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل پر لگے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ میرے بارے میں ایسی بات بھی کہہ سکتا ہے جبکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس پیدائشی نشان کے بارے میں کیسا محسوس کرتی ہوں۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا کہ جب مسز میکڈانلڈ واپس آئیں گی اور انہیں پتا چلے گا کہ ان کی کچھ چیزیں غائب ہیں تو بتادوں گی کہ کون لے گیا ہے۔ اس پر ٹریوس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ تم ایسا کرسکو گی اور اگر تم نے انہیں کچھ بتایا تو بہت پچھتانا پڑے گا۔“

میں نے دوسرے آدمی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بھی ٹریوس کی طرح ہوڈی پہن رکھی تھی لیکن اپنا ہڈ پیچھے نہیں کیا تھا البتہ یہ بتاسکتی تھی کہ وہ ٹریوس سے عمر میں بڑا تھا۔ میں اسے نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اس کی آواز پہچان سکی۔ اتنا وقت ہی نہیں ملا جب وہ کچن کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر گھر میں داخل ہوئے تھے۔

میں اپنے کزن کی منتیں کرتی رہی کہ وہ مسز میکڈانلڈ کے گھر سے چلا جائے لیکن وہ نہیں مانا۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اس ..... کمرے کے دروازے تک لے گیا جسے مسز میکڈانلڈ اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ مقفل نہیں تھا۔

مسز میکڈ اہلڈ شاید جلدی میں اسے لاک کرنا بھول گئی تھیں۔ ٹریوس بے دھڑک کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کتابوں سے بھرے شیلف دیکھ کر کہا۔ ”اوہ میرے خدا! اتنی ساری کتابیں، کیا کوئی شخص انہیں پڑھ سکتا ہے۔“ پھر اس نے میز کی درازیں دیکھنا شروع کردیں۔ سب سے نچلی دراز میں سے اسے ایک گن ملی جسے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑلیا اور پرجوش لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس کی ضرورت تھی۔“

میں بہت خوفزدہ ہوگئی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی گن بھی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مسز میکڈ اہلڈ اس کمرے کا دروازہ مقفل کرنا کیوں بھول گئیں۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی تاکہ سڑک پر پہنچ کر کسی کو مدد کے لیے پکاروں لیکن اگر میں نے ایسا کیا تو ٹریوس مجھے بہت سخت سزا دے گا۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ پر گولی چلادے۔ شاید وہ مجھے جان سے نہ مارے لیکن میری ٹانگ کا نشانہ لے کر زمین پر ضرور گرا سکتا ہے اور پھر فاتحانہ انداز میں قہقہے لگاتے ہوئے کہے گا۔ ”میں نے تمہیں منع کیا تھا لیکن تم نے حکم عدولی کی۔“

ٹریوس نے گن کا چیمبر کھول کر اس کا معائنہ کیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے اجتماعی خودکشی کے بارے میں سنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ محبت کا امتحان ہوگا۔“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ کسی فلمی اداکار کی طرح آئینے کے سامنے کھڑا ہوگیا اور مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے پستول کی نال اپنے سر سے لگالی پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے ریوالور نیچے کیا اور احتیاط سے گولیاں نکال کر اپنی جیب میں رکھنے کے بعد بولا۔ ”اب یہ پوری طرح بھری ہوئی نہیں ہے۔ اس لیے تمہارے بچنے کا چانس ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”پلیز اسے دور رکھو۔“

”اس میں صرف ایک گولی ہے۔“ اس نے دوبارہ آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا اور پستول کی نال دوبارہ اپنے ماتھے سے لگالی۔ لگتا تھا کہ وہ ٹریگر دبانے والا ہے پھر وہ ڈرامائی انداز میں گھوما اور گھٹنوں کے بل جھک کر نال کا رخ میری طرف کرکے ٹریگر دبا دیا۔ ایک ہلکی سی کلک ہوئی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں، موت میرے قریب سے آکر گزر گئی تھی۔

میں بہت خوفزدہ تھی۔ سردی کے باوجود پورا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا لیکن ٹریوس کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ وہ بدستور قہقہے لگا رہا تھا۔

کرتوت

دُلہا۔ ”جانتی ہو ہمارے ستارے مل گئے۔ ورنہ میرے تو شادی سے پہلے بیس لڑکیوں سے چکر تھے۔“

دُلہن شرماتے ہوئے۔ ”جی...... ہمارے ستارے ہی نہیں کرتوت بھی ملتے ہیں۔“

☆☆☆

Active,passive

وائف۔ ”سونے کی چین کب دوگے؟“

شوہر۔ ”چین سے سونے کب دوگی؟“

☆☆☆

”چلو۔ ایک کوشش اور کرتے ہیں۔“ اس نے نال کا رخ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ پلیز نہیں۔“ میں گڑگڑانے لگی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ پستول کی نال میرے چہرے سے رگڑنے لگا۔ پھر اس نے میرا منہ کھول کر نال اس میں گھسیڑ دی۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ وہ مجھے قتل نہیں کرے گا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پھر اس نے ایک ایسی حرکت کی جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر میرا سوئٹر پھاڑ دیا اور پستول میرے سینے سے لگادی۔ میں بری طرح کانپ رہی تھی پھر میں نے زاروقطار رونا شروع کردیا لیکن اس کا گن والا ہاتھ مسلسل حرکت کرتا رہا۔ اس نے پستول کی نال کو اور نیچے کیا پھر پیٹ سے ہوتا ہوا ٹانگوں تک آگیا۔ ڈر کے مارے میرا پیشاب خطا ہوگیا اور پستول کی نال بھیگ گئی۔ ٹریوس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا اور گن کرسی پر پھینک دی جیسے وہ گندی ہوگئی ہو۔

”رونا بند کرو۔ ابھی تک تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اپنے گھٹنوں پر چل کر دیکھو۔ اس طرح تم اپنے آپ کو بچا سکتی ہو۔“

میں نے چلنا شروع کیا اور کرسی کے قریب پہنچ گئی۔ پھر میں نے بے اختیار وہ گن اٹھالی۔ یہ بھی ایک معجزہ ہی تھا کہ وہ گن میرے ہاتھوں میں آگئی۔ وہ میری توقع سے زیادہ بھاری تھی۔ ٹریوس نے میرے ہاتھ میں گن دیکھی تو

چلایا۔ ''ہے...... پستول پھینک دو۔'' لیکن اس وقت تک میں ٹریگر دبا چکی تھی۔ اس بار بھی چیمبر خالی تھا۔ ٹریوس نے غصے میں آکر مجھ سے پستول چھیننا چاہا لیکن اتنی دیر میں میں دوبارہ ٹریگر دبا چکی تھی۔ اس بار کلک کے بجائے ایک دھماکا ہوا۔ ٹریوس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور وہ آناً فاناً فرش پر جا گرا۔

میں ایک خوفزدہ جانور کی طرح گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل رینگتی ہوئی اس سے دور ہونے لگی۔ میں اس کی پہنچ سے دور ہونا چاہ رہی تھی کیونکہ اگر اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ مجھے اس نافرمانی کی بہت سخت سزا دیتا۔

گن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری تھی اور ٹریوس کے بالکل قریب پڑی ہوئی تھی۔ جو آتش دان کے سامنے لیٹا ہوا کراہ رہا تھا گو کہ میں اس کے سینے سے بہتا ہوا خون دیکھ سکتی تھی لیکن یہ مجھے حقیقی نہیں لگ رہا تھا۔ میں یقین نہیں کر سکتی تھی کہ ٹریوس کو واقعی گولی لگی ہے۔ وہ میرے ساتھ چھیڑ خانی کر رہا تھا اور کسی بھی لمحے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر مجھے سزا دے سکتا تھا۔ حالانکہ گن سے فائر ہوا تھا۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ پستول ٹریوس کے ہاتھ میں تھا اور اسی کشمکش میں فائر ہو گیا۔

میں کافی دیر تک فرش پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ٹریوس کے دوست کو وہاں سے گئے ہوئے کتنی دیر ہو چکی تھی پھر دروازے پر گھنٹی کی آواز سنائی دی جو مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، میں... بمشکل اسے سن پائی۔ پھر کوئی پڑوسی عقبی دروازے پر آیا۔ اس نے کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھا جبکہ کچن کی لائٹ بھی جل رہی تھی وہ آوازیں دیتا ہوا ہال تک آیا پھر اس کمرے میں داخل ہوا جہاں میں اور ٹریوس فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ یہی سمجھا کہ ٹریوس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی گولی لگی ہے۔

مقامی اخبارات میں اس حوالے سے مختلف قیاس آرائیاں شائع ہوئیں۔ پہلے کہا گیا کہ گولی خود بخود چل گئی جو اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی اور سترہ سالہ ٹریوس موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اس کے پس منظر کے بارے میں بتایا گیا کہ پہلے وہ چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہا اور بعد میں منشیات فروشوں کے ہتھے چڑھ گیا اور کچھ عجب نہیں کہ انہی میں سے کسی ایک نے اسے قتل کیا ہو۔ اسپارٹا جرنل نے یہ انکشاف کیا کہ ٹریوس کے ساتھی نے ہی اس پر فائر کیا تھا لیکن وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔

پولیس والوں نے مجھ سے بڑے ہمدردانہ لہجے میں سوالات کیے۔ وہ مجھے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ٹریوس نے میرے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا تھا، اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ میں کافی عرصے تک نارمل نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے جو کہانی سنائی، وہ بھی الجھی ہوئی اور غیر واضح تھی لیکن میرے سینے، پیٹ اور ٹانگوں پر نظر آنے والے زخموں کے نشانات نے ساری حقیقت بیان کر دی اور اخبارات نے یہ شرمناک تفصیلات بڑے مزے لے کر شائع کیں۔

''تمہارے کزن کے ساتھ آنے والا کون تھا؟'' مجھ سے پوچھا گیا لیکن میں صرف اتنا ہی کہہ سکی کہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی اور نہ ہی اس کی آواز پہچان سکی۔

''کیا اس نے تمہیں کوئی دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے کسی کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ واپس آکر تمہیں بھی قتل کر دے گا۔'' میں کچھ نہ کہہ سکی۔

''اس کا نام کیا ہے؟ کیا تم اس کا حلیہ بیان کر سکتی ہو یا اسے شناخت کر سکتی ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا کیونکہ یہ ایک افسوس ناک بات ہوتی اگر میں غلطی سے کسی بے گناہ شخص کو اپنے کزن کی موت کا ذمے دار قرار دیتی۔

پولیس نے اس پڑوسی سے پوچھ گچھ کی جس نے انہیں فون کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان پڑوسیوں سے بھی سوالات کیے گئے جن کا کہنا تھا کہ انہوں نے کسی کار کا دروازہ بند ہونے، مردوں کی آوازیں، ایک لڑکی کے چیخنے اور سات بج کر دس منٹ پر فائر کی آواز سنی تھی لیکن کوئی بھی اس گاڑی یا ٹریوس کے ساتھی کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔

کئی مرتبہ پولیس بائیس سالہ ویلز کو پوچھ گچھ کے لیے ہیڈ کوارٹر لے کر آئی۔ انہیں یقین تھا کہ ویلز ہی وہ شخص ہے جس نے حادثاتی طور پر اپنے دوست ٹریوس ریڈلی کو ڈکیتی کے دوران گولی ماردی تھی لیکن اسے گرفتار کرنے کے لیے ان کے پاس ناکافی ثبوت تھے لہٰذا ہر مرتبہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اگر ویلز... میرے کزن کا ساتھی ہوتا تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ اس نے ٹریوس کو گولی نہیں ماری اور ممکنہ طور پر اسے معلوم تھا کہ ٹریوس کو ہلاک کرنے والا کون تھا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ اس نے اپنے دوست کو گولی نہیں ماری کیونکہ اس طرح وہ یہ تسلیم کر لیتا کہ وہ بھی ٹریوس کے ساتھ اس ڈاکا زنی میں شریک تھا لیکن وقوعہ سے پہلے ہی وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے بجائے اس نے موقف اختیار کیا کہ وہ ڈرولین پر ہونے والی ڈکیتی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اسے یہ

بھی نہیں معلوم کہ اس شام ٹریوس ریڈل کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ البتہ اس واقعے سے ایک روز پہلے اس کی اپنے دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔

اس زمانے میں چھوٹے شہروں کے پولیس سراغ رساں جائے وقوعہ سے ملنے والے شواہد کو احتیاط سے محفوظ کرنا نہیں جانتے تھے۔ جس پستول سے ٹریوس کو قتل کیا گیا، اس پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس دھندلے ہوگئے تھے اور کسی نے میرے فنگر پرنٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ میں سرے سے مشکوک افراد کی فہرست میں نہیں تھی۔ پستول مسٹر گورڈن میکڈانلڈ کو واپس کردیا گیا کیونکہ وہ ان کی قانونی ملکیت تھا۔

اگلے ہفتے مسٹر میکڈانلڈ اسپتال سے ڈسچارج ہوکر گھر واپس آگئے لیکن وہ زیادہ عرصے اس گھر میں نہیں رہے۔ اس واقعے کے بعد مکان کی شہرت خراب ہوگئی تھی۔ اس لیے مارکیٹ پرائس سے بہت کم قیمت پر اسے فروخت کرنا پڑا۔ اسے ایک ایسے جوڑے نے خریدلیا جو اسپارتا میں قیام کا خواہش مند تھا اور اسے اس حادثے کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ مکان فروخت ہونے کے بعد میکڈانلڈ فیملی اسپارتا سے چلی گئی اور پولیس کی ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد کسی نے بھی مجھ سے یہ جاننے کی زحمت نہیں کی کہ اس شام میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ البتہ یہ افواہ ضرور پھیل گئی کہ ماریا کو اس کے اپنے کزن نے ایذا پہنچائی اور جس معنی خیز انداز میں یہ بات کہی جاتی تھی، اس سے لوگ اپنی مرضی کے معنی نکال لیتے حالانکہ یہ صرف میں ہی جانتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

مسز میکڈانلڈ نے مجھے کسی بات کے لیے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ وہ جانتی تھی کہ میں نے اپنے کزن ٹریوس کو گھر میں نہیں بلایا تھا اور یہ کہ میں نے اس سے چلے جانے کی درخواست کی تھی۔ اس نے میری ماں سے کہا۔ ”بے چاری ماریا...... یہ میری غلطی تھی کہ اتنی چھوٹی لڑکی کو یہ ذمے داری سونپ دی۔“

لیکن ماں نے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”ماریا تو بہت خوش تھی۔ یہ محض ایک حادثہ تھا۔“

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ آنٹی لوئیس نے بھی میری ماں کے سامنے اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ٹریوس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، اس پر وہ خود کو مجرم محسوس کرتی ہیں اور شرمندہ ہیں۔

”یہ حقیقت ہے کہ وہ ماریا کو بہت چاہتا تھا اگر اس کا دماغ ٹھکانے پر ہوتا تو وہ کبھی ماریا کو نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچتا۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ بات سمجھتی ہو اور ماریا بھی شاید یہ جانتی ہو۔“

☆☆☆

میرے بچے ٹریوس ریڈل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انہیں تو اپنی ماں کے بارے میں بھی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ان چھبیس سالوں میں میں جب بھی اسپارتا آئی تو اسٹیو ویلز سے چند مرتبہ ہی میرا سامنا ہوا بلکہ میں اس کی جھلک ہی دیکھ پائی۔ ایک دفعہ شاپنگ مال اور دوسری مرتبہ سیون الیون اسٹور میں۔ ہم جوانی میں بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے میرا نام بھی معلوم نہیں تھا گو کہ اس واقعے کے بعد وہ اس بارے میں جان گیا ہوگا۔ جب بلوغت کو پہنچنے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ اپنی جگہ پر رک گیا اور مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ مجھے یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو۔

اس بار جب میں اسپارتا آئی تو حادثاتی طور پر اسٹیو ویلز سے میرا آمنا سامنا ہوگیا۔ میں اپنی بیٹی کے ہمراہ بینک کے عقب میں واقع پارکنگ لاٹ سے گزر رہی تھی کہ میں نے ایک درمیانی عمر کے شخص کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ اس نے گندی سی جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا تھا جیسے بڑی بے دردی سے کسی وائر برش سے صاف کیا گیا ہو۔ اب وہ ایک بھاری جسامت، ہلکے بالوں، کرخت چہرے اور اداس آنکھوں والا شخص بن چکا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی عمارت میں داخل ہوتے وقت راستہ نہیں دیتے اور نہ ہی آپ کو اپنے سے پہلے قطار میں کھڑا ہونے دیتے ہیں۔

اس نے مجھے دیکھا اور ایک اچٹتی ہوئی نظر میری بیٹی پر ڈالی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنے والا ہے لیکن جھجک رہا ہے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بدصورت شخص مجھے پہچانے۔ میں اس شہر سے اپنا تعلق ختم کرچکی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ مجھے کن لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے یا کون میرے لیے اجنبی ہے۔ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑے اس کے پاس سے گزرنے ہی والی تھی جب اس نے میرے سامنے آتے ہوئے کہا۔

”ہیلو ماریا! میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی تھیں۔“

یہ سننے کے بعد میرا بدن بُری طرح لرزنے لگا اور ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ میں نے اپنی بیٹی کا سہارا لیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

ماضی سے حال کی جانب کھلنے والے دراور داستان الم کے رنگ

راز ماضی

ملک صفدر حیات

اپنی مرضی سے شریک زندگی کا انتخاب کرنے کا اختیار اللہ نے تو انسان کو دے دیا ہے مگر انسان... جو اللہ کو تو مانتا ہے لیکن... اللہ کی نہیں مانتا کے زعم میں بعض معاملات میں اپنی ہی چلاتا ہے اور ناقابل تلافی نقصان اٹھاتا ہے... یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا، قدرت کے اشاروں کو سمجھنے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے بالآخر اپنے جگر گوشے کو ہی نظروں سے دور کر ڈالا... وہ جب ماضی کا ایک ایسا ہی راز بن کر سامنے آیا تو بہت سے پہلوئوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک نئی داستان رقم کر گیا۔ خطا کسی کی اور سزا کسی کو... غلط فیصلوں کے نتائج ایسے ہی نکلتے ہیں اور ایسی غلطیوں کو درست کرنے کے لیے ملک صفدر حیات جیسے لوگوں کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے، تب کہیں جاکر درست حقائق سامنے آتے ہیں۔

اجنبی نوجوان کی لاش نے موضع ''کوٹ فرمان'' میں کھلبلی مچادی تھی۔ وہ ماہ فروری کے ابتدائی ایام تھے تاہم موسم سرما کسی بھی طور رخصت ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ان دنوں میری تعیناتی ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک قصبے فرید آباد میں تھی۔

ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ٹھنڈے ٹھار موسم میں ایک گرما گرم خبر میری منتظر تھی۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ اے ایس آئی گل شیر میرے پاس آگیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''ملک صاحب! ادھر ایک بندے کی لاش ملی ہے جناب۔''

میں نے اے ایس آئی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ادھر کدھر گل شیر؟''

''وہ جی کوٹ فرمان میں۔'' گل شیر نے جواب دیا۔

موضع کوٹ فرمان اور قصبہ فرید آباد کے بیچ ایک نہر بہتی تھی۔ کوٹ فرمان، فرید آباد کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا کچھ پتا چلا کہ وہ کس کی لاش ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے؟''

''نہیں ملک صاحب!'' اے ایس آئی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ بندہ پورے گاؤں والوں کے لیے اجنبی ہے۔ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس بندے کی لاش اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پڑی ملی ہے اور اللہ رکھا اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔''

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

جب میں اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا تو میں نے برآمدے میں دو تین افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اے ایس آئی نے پوچھا۔

''اگر آپ کہیں تو میں اللہ رکھا کو اندر بھیجتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں......ضرور......'' میں نے جلدی سے کہا۔



تھوڑی ہی دیر کے بعد اللہ رکھا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اللہ رکھا کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ اس نے عام دیہاتی لباس پہن رکھا تھا اور سر پر سادہ سی پگڑی جسے عام طور پر ''صافہ'' کہا جاتا ہے۔ شکل صورت اور وضع قطع سے وہ مزدور پیشہ نظر آتا تھا۔ اے ایس آئی نے اس کے ساتھ آنے والوں کو باہر ہی روک لیا تھا۔ بعدازاں مجھے پتا چلا کہ وہ دیگر دونوں افراد اس کے پڑوسی تھے۔ اللہ رکھا خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہاں اللہ رکھا! یہ لاش کا کیا معاملہ ہے؟''

''معاملہ سمجھ میں نہیں آرہا تھانے دار صاحب۔'' وہ پریشانی سے بولا۔ ''صبح سو کر اٹھا ہوں تو دروازے کے سامنے ایک لاش پڑی تھی۔''

''ہوں......'' میں نے اللہ رکھا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پُرسوچ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''صبح کتنے بجے...... تم نے اپنے دروازے کے سامنے کتنے بجے اس لاش کو پڑے دیکھا تھا؟''

''جی ابھی سورج نہیں اگا تھا مگر ہلکا ہلکا اجالا ہو رہا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں فجر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ دروازے کے سامنے کسی کو سوتا ہوا دیکھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ اتنی سردی میں میرے دروازے کے سامنے کون سو رہا ہے لیکن جب میں نے اس کے قریب جا کر دیکھا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا......''

''کیسا جھٹکا اللہ رکھا؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''بندہ مرا پڑا تھا جناب۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ مر چکا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے ہلا جلا کر دیکھا تھا؟''

''نہیں تھانے دار صاحب!'' وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو اس بندے کی لاش کو ہاتھ تک نہیں لگایا جی۔ جب میں اس کے نزدیک گیا تو مجھے اس کے چہرے اور سر پر خون نظر آیا تھا۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون لگا ہوا تھا اور وہ بالکل ساکت پڑا تھا...... سانس بھی نہیں لے رہا تھا جی......'' اس نے وحشت زدہ انداز میں آنکھیں پھیلائیں اور لمحاتی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''بس جی، مجھے تو یہی لگا کہ وہ بدنصیب دوسرے جہان پہنچ چکا ہے۔ بعد میں دوسرے دیکھنے والوں نے بھی میری بات کی تصدیق کردی۔''

اللہ رکھا جو کچھ بتا رہا تھا، اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ شخص واقعی زندگی کی بازی ہار چکا تھا اور اس کے لباس اور چہرے پر نظر آنے والا خون اس امر کی جانب اشارہ کرتا تھا کہ اسے باقاعدہ قتل کیا گیا تھا۔ میں نے بہ دستور اللہ رکھا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جب تمہیں یقین ہوگیا کہ وہ بندہ مر چکا ہے تو پھر تم نے کیا کیا؟''

''کرنا کیا تھا جی......'' وہ ایک تھکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے شور مچا کر لوگوں کو وہاں جمع کرلیا۔ آج مجھے مسجد کی طرف جانے میں تھوڑی دیر ہوگئی تھی۔ اس وقت تک لوگ مسجد سے واپس آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے ہمسایوں کے علاوہ بھی وہاں کافی لوگ جمع ہوگئے۔ سب کی ایک ہی رائے تھی جناب کہ وہ بندہ مر چکا ہے۔''

''ہوں......'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''وہ بدقسمت آخر ہے کون...... مجھے بتایا گیا ہے کہ اسے کوئی بھی نہیں جانتا؟''

''جی ہاں، آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس بندے کا تعلق ہمارے گاؤں سے نہیں تھانے دار صاحب۔ وہ ہمارے لیے اجنبی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے اور...... قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ اس بندے کی لاش کو میرے دروازے کے سامنے کیوں پھینک گیا ہے......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے اپنی پھولی ہوئی اور گھبرائی ہوئی آواز کو ہموار کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ہم نے اس عجیب وغریب واقعے کی اطلاع سب سے پہلے چودھری صاحب کی حویلی میں پہنچائی تھی۔ وہاں سے ہمیں حکم دیا گیا کہ تھانے جاکر رپورٹ درج کرائیں۔ میں نے اپنے پڑوسیوں فقیر حسین اور یعقوب علی کو ساتھ لیا اور آپ کے پاس آگیا ہوں......''

کوٹ فرمان پر چودھری فیضان علی کی حکمرانی تھی۔ چودھری فیضان سے میری دو تین بار ملاقات ہوچکی تھی۔ وہ عام روایتی چودھریوں سے خاصا مختلف شخص تھا۔ اس کے اندر غرور اور تکبر نام کی چیز میں نے نہیں دیکھی تھی۔ اس کی

سوچ متوازن اور مزاج میں معقولیت پائی جاتی تھی۔ یہ گاؤں اس کے دادا فرمان علی کے نام پر تھا۔

میں نے اللہ رکھا سے پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب ہے، چودھری فیضان کو اس نامعلوم بندے کی لاش کے بارے میں بتادیا گیا ہے؟“

”چودھری صاحب خود تو حویلی میں موجود نہیں ہیں جناب۔“ اللہ رکھا نے جواب دیا۔ ”وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ بہرحال، ہم نے حویلی میں یہ خبر پہنچادی ہے۔“

میں نے اللہ رکھا سے مزید دو چار سوال کر کے اسے فارغ کردیا اور اس کے ساتھ آنے والے افراد کو اندر بلالیا۔ میں نے فقیر حسین اور یعقوب علی سے بھی دس منٹ تک پوچھ گچھ کی مگر کوئی نئی بات سامنے نہیں آسکی۔ وہ بھی اس اجنبی شخص کی لاش کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے جتنا ان سے پہلے اللہ رکھا مجھے بتاچکا تھا۔ میں نے انہیں باہر برآمدے میں انتظار کرنے کو کہا۔

”آپ تھوڑی دیر باہر بیٹھو۔ میں ابھی آپ لوگوں کے ساتھ کوٹ فرمان چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں، اس اجنبی بندے کی لاش کا کیا معما ہے......“

وہ تینوں میرے کمرے سے نکل گئے۔ میں نے اے ایس آئی گل شیر کو اپنے پاس بلا کر تھانے کے حوالے سے ضروری ہدایات دیں پھر کانسٹیبل سلیم کو ساتھ لے کر کوٹ فرمان کی جانب روانہ ہوگیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، قصبہ فرید آباد اور موضع کوٹ فرمان کے بیچ ایک نہر رواں دواں تھی اور اریب قریب اس نہر پر کوئی پل وغیرہ نہیں تھا لہٰذا فرید آباد سے کوٹ فرمان جانے کے لیے نہر کو یا تو تیر کر یا پھر چھوٹی کشتی کے ذریعے پار کیا جاسکتا تھا۔ مذکورہ نہر اچھی خاصی چوڑی تھی جو کسی دریا سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم نے کشتی کے ذریعے نہر کو پار کیا اور کوٹ فرمان پہنچ گئے۔ جب ہم نے کوٹ فرمان میں قدم رکھا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔

☆☆☆

اللہ رکھا کا گھر گاؤں کے وسط میں تھا۔ نہر کے کنارے سے گاؤں تک لگ بھگ آدھے میل کا فاصلہ تھا جو ظاہر ہے، ہم نے پیدل ہی طے کیا تھا۔ موسم خاصا خنک بلکہ خوشگوار ہورہا تھا۔ فضا میں ٹھنڈک رچی بسی تھی تاہم یہ سردی قابلِ برداشت تھی۔ آدھے میل کا یہ فاصلہ طے کرتے کے بعد ہم اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔

اللہ رکھا نے تھانے میں جس اجنبی شخص کی لاش کا ذکر کیا تھا۔ وہ ایک چادر کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی۔ اللہ رکھا نے بتایا کہ تھانے کی طرف جاتے ہوئے اس نے مردہ شخص کے اوپر یہ چادر ڈال دی تھی۔ میں نے وہاں جمع لوگوں کو ایک طرف ہٹایا اور اللہ رکھا سے کہا۔

”چاچا! یہ چادر تو ہٹاؤ......!“

اللہ رکھا نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کردی۔ میں اکڑوں بیٹھ کر اس لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ شخص اس دارِ فانی سے کوچ کرچکا تھا۔ مقتول کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور درمیانہ قد شخص تھا۔ اس نے مناسب سائز کی ڈاڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے گرم شلوار قمیص زیب تن کر رکھا تھا جس کے اوپر گرم اونی سویٹر بھی نظر آرہا تھا۔ پاؤں میں موزوں کے ساتھ تسموں والے بند جوتے تھے۔ اس جائزے کے دوران میں اس شخص کے سر اور چہرے نے میری توجہ خصوصی طور پر اپنی جانب مبذول کرلی تھی کیونکہ وہاں مجھے تشدد کے خونیں آثار دکھائی دیے تھے۔ میں بغور اس کے سر کا جائزہ لینے لگا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کا سر بری طرح زخمی تھا۔ کئی جگہ سے کھوپڑی چٹخی ہوئی تھی جہاں سے خارج ہونے والے خون نے اس کے چہرے کو بھی بھگو ڈالا تھا اور لباس کے سامنے والے حصے پر بھی جابجا خون کے دھبے نظر آرہے تھے تاہم یہ تمام تر خون جم چکا تھا۔ سر کے زخموں اور خون کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اس شخص کو زندگی کی بازی ہارے ہوئے آٹھ سے دس گھنٹے گزر چکے تھے یعنی اسے گزشتہ شب، رات کے ابتدائی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

یہ سو فیصد قتل کی ایک ہولناک واردات تھی۔ کسی نے بڑی بے دردی سے اس اجنبی جوان کی کھوپڑی کو شدید زخمی کرکے اس کی زندگی کا چراغ گل کردیا تھا مگر کیوں......؟

یہ ایک خطرناک سوال تھا جس کا جواب مجھے تلاش کرنا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک سوالات ابھی تک تشنۂ جواب تھے مثلاً یہ کہ وہ شخص تھا کون؟ کہاں سے آیا تھا؟ اسے کس نے اور کیوں قتل کر ڈالا اور قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے ہی کیوں پھینک دیا؟

میں نے زمین پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے مقتول کے لباس کی تلاشی بھی لے ڈالی۔ اس جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس بدنصیب شخص کی جیبوں سے چند ایسی اشیا برآمد ہوئیں

جنہوں نے مجھے متذکرہ بالا سوالات میں سے چند ایک کے جواب دے دیے۔

مقتول کی قمیص کے سامنے والی جیب میں سے ایک سو چالیس روپے نقدی کے علاوہ دو ٹکٹ برآمد ہوئے۔ ان ٹکٹ میں سے ایک ''راجا ٹریولز'' کی بس کا تھا جو لاہور سے لائل پور تک کے سفر کے لیے جاری کیا گیا تھا جبکہ دوسرا ٹکٹ ایک ویگن کا تھا جو ''ملک ٹرانسپورٹ'' سروس کے زیر اہتمام چلتی تھی۔ میں اس ٹرانسپورٹر ملک خدا بخش کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس بندے کی ویگن سروس لائل پور کے لاری اڈے سے مختلف دیہاتوں اور قصبہ جات کی طرف جاری تھی۔ یہ ویگنیں صرف ان قصبہ جات اور دیہاتوں تک جاتی تھیں جو کسی نہ کسی کچی یا پکی سڑک کے کنارے پر واقع تھے۔

دونوں ٹکٹس پر آٹھ فروری کی تاریخ ڈالی گئی تھی۔

آج نو فروری تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ گزشتہ روز وہ نامعلوم شخص لاہور سے ''راجا ٹریولز'' کی بس میں بیٹھ کر لائل پور پہنچا تھا اور پھر لائل پور کے لاری اڈے سے اس نے ملک ٹرانسپورٹ سروس کی ویگن پکڑ کر فرید آباد تک سفر کیا تھا اور ظاہر ہے، فرید آباد سے کوٹ فرمان تک پہنچنے کے لیے اس نے کشتی کے ذریعے بڑی نہر عبور کی تھی اور پھر وہ ایک عبرت ناک موت سے دوچار ہو کر عدم آباد روانہ ہو گیا تھا۔

دونوں ٹکٹ کی روشنی میں وہ نامعلوم شخص آٹھ فروری کو لاہور سے چل کر لائل پور اور فرید آباد سے ہوتے ہوئے کوٹ فرمان پہنچا تھا مگر کیوں......؟ جب کوٹ فرمان کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی تھا تو پھر وہ کس مقصد سے یہاں آیا تھا؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے مجھے سوچ کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانا پڑا۔ میں نے مقتول کی سائڈ پاکٹ سے برآمد ہونے والے سامان کا جائزہ لیا۔ اس سامان میں ایک رومال، ایک چابیوں والا گچھا اور ایک المونیم (ایلومینیم) کی کنگھی تھی۔ اس زمانے میں پلاسٹک کی مصنوعات کا استعمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسی چیزیں تیار کرنے کی فیکٹریاں وجود میں آئی تھیں۔ کنگھی عموماً یا تو لکڑی کی ہوتی تھی اور یا پھر ایلومینیم کی۔ چابیوں کے گچھے میں تین چابیاں پروئی ہوئی تھیں۔

مقتول کی قمیص کی سائڈ پاکٹ سے برآمد ہونے والے سامان سے مجھے کسی قسم کی تفتیشی مدد نہیں مل سکی تاہم ان تمام چیزوں کو میں نے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرا روئے سخن اللہ رکھا کی جانب تھا۔

''اللہ رکھا! اچھی طرح ذہن پر زور دے کر بتاؤ......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا واقعی تم اس بندے کو نہیں جانتے؟''

''سرکار! میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں کیا، پنڈ کا کوئی ایک بندہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے......''

''یہ کہاں سے آیا تھا، اس بات کا تو میں پتا چلا چکا ہوں اللہ رکھا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اب یہ جاننا باقی ہے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے اور قتل کرنے کے بعد قاتل نے لاش تمہارے دروازے کے سامنے کیوں پھینکی ہے؟''

''جی......'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟''

میں نے ابھی تک بس اور ویگن کے ٹکٹ کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ میں نے اس تفصیل سے اللہ رکھا کو آگاہ کر دیا اور کہا۔ ''اگر کوٹ فرمان میں رہنے والے لوگوں میں سے کوئی مقتول کو نہیں جانتا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقتول لاہور سے یہاں کیا لینے آیا تھا......؟''

''جناب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' اللہ رکھا بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ ہی اس بجھارت (پہیلی) کو حل کریں جی۔''

جس مقام پر اس اجنبی شخص کی لاش پڑی تھی وہاں پر مجھے ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اسے اسی جگہ پر قتل کیا گیا تھا۔ ایک بات طے تھی کہ قاتل نے کسی اور مقام پر اس کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا اور بعد ازاں کسی وقت اس کی لاش کو لا کر وہاں پھینک دیا گیا تھا۔

میں نے لگ بھگ آدھے گھنٹے میں موقع کی کارروائی مکمل کی اور پھر نامعلوم مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے کانسٹیبل سلیم کے ''ہاتھ'' سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ میں نے جائے وقوعہ پر موجود کم و بیش دو درجن افراد سے پوچھ گچھ کر کے اس امر کی تسلی کر لی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اس اجنبی مقتول شخص کو نہیں جانتا تھا البتہ نور حسین نامی ایک بندے نے ایک ایسی بات کی کہ مجھے چونکنا پڑا۔

''جناب! اس بندے کی لاش کو دیکھ کر پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ موئی ہے......!''

میں نور حسین کو ایک طرف لے گیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کون موئی؟''

میرے اس کڑے سوال سے وہ ایک دم گھبرا گیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی۔ مجھے

یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود کو کسی مصیبت میں مبتلا سمجھ رہا ہو۔ اس کی کیفیت کے پیشِ نظر میں نے جلدی سے کہا۔

''فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں نور حسین۔ تم موسیٰ کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو، سچ سچ مجھے بتادو۔ یہ باتیں ہم دونوں کے بیچ رہیں گی۔ میں اسی لیے تمہیں ایک طرف لے آیا ہوں......''

''جی...... مجھے مغالطہ ہوا تھا......'' اس نے الجھن زدہ انداز میں بتایا۔

''مغالطہ...... کیسا مغالطہ نور حسین؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''وہ جی...... جب میں نے اس بندے کی لاش کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے بھی لگا تھا کہ وہ موسیٰ ہے۔'' نور حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ موسیٰ نہیں جناب۔ اس میں تھوڑی بہت موسیٰ کی شباہت ضرور ہے۔''

''مگر یہ موسیٰ کون ہے؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''موسیٰ...... اللہ رکھا کا بیٹا تھا جی۔''

''بیٹا تھا...... کیا مطلب؟''

''موسیٰ کوئی چار سال پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا، تھانے دار صاحب۔'' نور حسین نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''پھر آج تک اس کی کوئی خیر خبر نہیں ہے جناب۔ موسیٰ اللہ رکھا کی اکلوتی اولاد تھا۔ دونوں بڈھا بڈھی کافی دنوں تک بیٹے کی جدائی میں آنسو بہاتے رہے پھر رفتہ رفتہ انہیں قرار آگیا۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''کیا تمہیں پکا یقین ہے کہ جس شخص کی لاش ابھی میں نے اسپتال بھجوائی ہے، وہ موسیٰ نہیں تھا؟''

''لوہے کی طرح پکا یقین جناب......'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''اس بندے میں بس موسیٰ کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی مجھے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ یہ موسیٰ ہرگز نہیں ہے۔ آپ خود سوچیں نا جناب......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے اپنی سانس ہموار کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر یہ بندہ موسیٰ ہی ہوتا تو بھلا اللہ رکھا اسے پہچاننے میں غلطی کیسے کرسکتا تھا۔ اللہ رکھا کی گھروالی کرم بی بی نے بھی اس اجنبی شخص کی لاش دیکھی ہے۔ ایک ماں اپنے بیٹے کو پہچاننے میں تو کوئی کوتاہی نہیں کرسکتی نا......!''

نور حسین کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اللہ رکھا اور اس کی بیوی کرم بی بی ضرور اس اجنبی مقتول کو اپنے بیٹے موسیٰ کی حیثیت سے پہچان لیتے۔ میں نے ایک دو سوالات کے بعد نور حسین کو فارغ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نور حسین! تم کرتے کیا ہو؟''

''ذات کا کمہار ہوں جی۔'' وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ''مٹی کے برتن بناتا ہوں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ میری روزی روٹی کا بندوبست کردیتا ہے۔''

''اگر تم کمہار ہو تو برتنوں کی تیاری کے لیے تمہیں مٹی کی ضرورت پیش آتی ہوگی۔'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''یہ مٹی تم کہاں سے حاصل کرتے ہو؟''

''نہر سے جناب...... اور کہاں سے حاصل کروں گا۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں روزانہ صبح اپنے گدھے کے ساتھ نہر کی طرف ایک چکر لگاتا ہوں۔ جتنی ضرورت ہوتی ہے، نہر سے اتنی مٹی نکال لاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''تمہارا گھر کس طرف ہے؟''

''اللہ رکھا سے دو گلی پیچھے جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم ابھی تو اپنے گھر جاؤ اور تسلی سے اپنا کام کرو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تھوڑی دیر میں فارغ ہوکر تمہارے پاس آتا ہوں پھر اس واقعے کے حوالے سے کچھ باتیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے جی، جو آپ کا حکم۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نور حسین کو چھوڑ کر اللہ رکھا کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس وقت تک جائے وقوعہ سے لوگوں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ گلی میں بس اللہ رکھا اور اس کے دو تین پڑوسی موجود تھے۔ میں نے اللہ رکھا سے کہا۔

''تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی...... بسم اللہ۔'' اللہ رکھا جلدی سے بولا۔ ''میں آپ کے لیے بیٹھک کھلواتا ہوں جناب۔''

چند منٹ کے بعد میں اللہ رکھا کی بیٹھک میں ان دونوں میاں بیوی کے سامنے بیٹھا تھا۔ کرم بی بی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ عام سی شکل صورت کی مالک ایک گھریلو عورت تھی۔ اللہ رکھا ساٹھ کا ہندسہ عبور کرچکا تھا۔ اس کی تھوڑی سی زرعی اراضی تھی جس کی کھیتی باڑی سے اس کا رزق روزگار چلتا تھا۔ میں نے ان بڈھا بڈھی کی ذہنی پریشانی کو

دیکھتے ہوئے چند تسلی اور تشفی کی باتیں کیں پھر اصل موضوع کی طرف آیا۔

''اللہ رکھا! آپ لوگوں کے بچے وغیرہ کہاں ہیں؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ ''گھر کے اندر کوئی رونق اور چہل پہل نظر نہیں آرہی......؟''

''وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ......'' اللہ رکھا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہمارا صرف ایک ہی بیٹا تھا......موسیٰ...... پتا نہیں، وہ کہاں چلا گیا ہے۔''

''کہاں چلا گیا ہے...... کیا مطلب؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

نور حسین کی زبانی مجھے موسیٰ کی گمشدگی کی خبر تو مل چکی تھی تاہم میں یہ حقیقت اللہ رکھا اور اس کی بیوی کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ کرم بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''حقیقت تو سوہنا رب ہی جانتا ہے جی۔'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''کوئی چار سال پہلے وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ جہاں تک ڈھونڈ سکتے تھے، ہم نے اسے تلاش کیا لیکن وہ ہمیں ملا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر۔ تھک ہار کر ہم بیٹھ گئے لیکن...... اس کی واپسی کی اب بھی آس لگی ہوئی ہے۔'' اتنا بتا کر کرم بی بی خاموش ہو گئی۔

''تھانے دار جی! یوں محسوس ہوتا ہے......'' اللہ رکھا اپنی بیوی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یوں لگتا ہے کہ موسیٰ کسی وقت اچانک ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جائے گا اور ہمیں حیران کر دے گا۔''

''ایسی ہی حیرت آج صبح اس اجنبی شخص کی لاش کو بھی دیکھ کر ہوئی تھی یا نہیں؟'' میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے بولا۔ ''میں سمجھا نہیں جناب......!''

''اللہ رکھا!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے ابھی جو گھنٹا، آدھا گھنٹا تفتیش کی ہے اس سے مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارا گمشدہ بیٹا شکل میں اس اجنبی مقتول سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے......؟''

''شکل میں ملتا جلتا تو نہیں کہہ سکتے جناب۔'' اللہ رکھا نے جواب دیا۔ ''البتہ اس کی جسامت موسیٰ جیسی ہی ہے۔''

''میں نے بھی اس بندے کو دیکھا ہے جی۔'' کرم بی بی نے کہا۔ ''اللہ رکھا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے موسیٰ کی اور اس بندے کی شکل ایک جیسی نہیں۔ بس جی، نین نقش کچھ ملتے جلتے ہیں ہاں...... اس کا قد کاٹھ اور بدن وغیرہ موسیٰ ہی کا لگتا ہے جی۔''

الفاظ اور بیان کا ہیر پھیر تھا لیکن کرم بی بی اور اللہ رکھا کا بیان نور حسین کے بیان کی تصدیق کرتا تھا۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''یعنی تم لوگ یہ کہہ رہے ہو کہ اگر یہ اجنبی بندہ دور سے آرہا ہو یا یہ کہیں جا رہا ہو تو پیچھے سے دیکھ کر ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ...... یہ موسیٰ ہے؟''

''جی...... جی ہاں۔'' اللہ رکھا نے اثبات میں گردن ہلائی۔

کرم بی بی نے کہا۔ ''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

اجنبی مقتول اور گمشدہ موسیٰ کے حوالے سے ان دونوں میاں بیوی کے تصدیقی کلمات نے میرے ذہن میں چند خدشات کو جنم دیا۔ میں نے پوچھا۔

''چار سال پہلے، جب آپ لوگوں کا بیٹا اچانک گم ہو گیا تھا تو کیا آپ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ وغیرہ درج کرائی تھی؟''

''رپورٹ......؟'' اللہ رکھا نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں ہاں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''موسیٰ کی گمشدگی کے حوالے سے تھانے میں کوئی اطلاع دی تھی؟''

''نہیں جی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے اپنے طور پر ہی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ آلے دوالے کے گاؤں دیہات میں جدھر جدھر بھی ہمارے رشتے دار بستے ہیں، ہم نے ہر ایک کے گھر جا کر موسیٰ کو تلاش کیا تھا۔ رشتے داروں نے بھی اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کی تھی مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا......''

''تھانے دار جی! وہی بات کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔'' کرم بی بی دکھی لہجے میں بولی۔ ''موسیٰ کو نہیں ملنا تھا، وہ نہیں ملا......'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''میں تو ہر وقت یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ جہاں بھی ہو بس زندہ سلامت ہو۔ انسان زندہ ہو تو کبھی نہ کبھی زندگی میں ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔''

ایک گمشدہ نوجوان بیٹے کی ماں کے دکھ کو میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا لیکن ان لمحات میں میرے ذہن میں جن خدشات نے جنم لیا تھا، ان کی تحقیق اور تصدیق بہت ضروری تھی۔ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے آپ لوگوں کے درد کا پوری طرح احساس ہے۔ چار سال پہلے جب آپ کا بیٹا موسیٰ گم ہوا، میں اس

تھانے کا انچارج نہیں تھا لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ موسیٰ کو تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا مگر فی الحال ایک دوسرا معاملہ درپیش ہے۔"

"دوسرا معاملہ۔" کرم بی بی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "کون سا معاملہ جی......؟"

"اس اجنبی بندے کا معاملہ۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو کل لاہور سے یہاں پہنچا تھا اور پھر شقی القلب قاتل نے پچھلی رات اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور لاش آپ کے دروازے پر پھینک کر کہیں گم ہو گیا ہے۔"

"لل...... لیکن......" اللہ رکھا لکنت زدہ انداز میں بولا۔ "موسیٰ کا اس بندے سے کیا تعلق؟"

"بہ ظاہر تو کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو بہت گہرا تعلق نکالا جا سکتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے جی آپ کا؟" کرم بی بی کی گھبرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں، اس گاؤں میں سو کے قریب گھر آباد ہیں لیکن اجنبی شخص کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو آپ کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا۔ میرے خیال میں اپنی اس حرکت سے قاتل آپ لوگوں کو کوئی سنگین پیغام دینا چاہتا ہے۔"

ان دونوں کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا۔ اللہ رکھا نے پوچھا۔ "کیسا پیغام تھانے دار صاحب۔ میں تو آپ کی بات کو بالکل نہیں سمجھ سکا؟"

میں نے ان کی الجھن دور کرنے کی غرض سے واضح الفاظ میں کہا۔ "دیکھیں، میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ میرے سوچنے کا انداز عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ میں تفتیش کے دوران میں ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہیں کروں تو پھر مجرموں تک پہنچ نہیں سکتا۔ یہ میرے پیشے کا تقاضا اور فرض کا حصہ ہے۔ میں اس اجنبی شخص کے قتل کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو آپ دونوں مانتے ہیں نا کہ یہ اجنبی شخص قد کاٹھ اور نقش و نگار میں کافی حد تک آپ کے گمشدہ بیٹے موسیٰ سے ملتا جلتا ہے......؟"

میں نے لحاتی توقف کر کے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بہ یک زبان ہو کر بولے۔

"جی...... جی ہاں۔"

"اور آپ لوگ اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکیں گے کہ کوئی کسی کو خوامخواہ قتل نہیں کرتا۔" میں نے بدستور سوالیہ نظر سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا اس اجنبی شخص کو جس کسی نے بھی قتل کیا ہے وہ یقیناً اس کا دشمن ہو گا۔ اس کے دل میں اس اجنبی شخص کے لیے شدید ترین نفرت پل رہی ہو گی اسی لیے اس نے موقع ملتے ہی اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"جی تھانے دار صاحب۔" اللہ رکھا سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے تھانے دار صاحب۔" کرم بی بی شکایتی لہجے میں بولی۔ "ان دونوں کی جو بھی آپس میں دشمنی تھی وہ ایک دوسرے سے نکالتے رہتے۔ اس بندے کی لاش کو ہمارے دروازے کے سامنے پھینکنے کی کیا تک بنتی ہے؟"

"تک بنتی ہے کرم بی بی!" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس بدبخت اجنبی شخص کو آپ کے گمشدہ بیٹے موسیٰ کے مغالطے میں کسی نے قتل کیا ہے جبھی اس کی لاش کو آپ کے دروازے کے سامنے پھینکا گیا ہے......"

"اوہ......" اللہ رکھا نے ایک پُرتشویش سانس خارج کی اور فکرمند لہجے میں بولا۔ "لیکن موسیٰ کا ایسا دشمن کون ہو سکتا ہے جو اپنے دل میں اس کے لیے اتنی نفرت رکھتا ہو کہ بے دردی سے اسے قتل کر ڈالے......"

"یہ تو آپ لوگ مجھے بتاؤ گے نا؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "موسیٰ کرتا کیا تھا؟ میرا مطلب ہے، اس کی دن بھر کی کیا مصروفیات ہوا کرتی تھیں؟"

"دیکھیں جی......" اللہ رکھا گہری سنجیدگی سے بولا۔ "موسیٰ چار سال پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ہم جہاں جہاں اسے تلاش کر سکتے تھے، ڈھونڈ کر دیکھ لیا مگر وہ ہمیں کہیں بھی نہیں ملا۔ وہ اس وقت کہاں ہے اور کیا کرتا ہو گا، اس کی ہمیں کوئی خبر نہیں جناب۔ ہاں......" تھوڑا توقف کر کے اس نے اپنی سانس درست کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"جب تک وہ یہاں ہمارے پاس تھا تو میرے ساتھ ہی کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ تھوڑی سی زمین ہے۔ اللہ

کے کرم سے اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ جب موسیٰ کام میں میرا ہاتھ بٹاتا تھا تو مجھے بڑی سہولت تھی مگر اب اکیلا ہی کام میں جتا رہتا ہوں۔ بوڑھی ہڈیاں جانے کب جواب دے جائیں......"

"جب موسیٰ ادھر کوٹ فرمان میں ہی تھا تو ظاہر ہے، لوگوں سے اس کا میل جول بھی ہوتا ہوگا۔" اللہ رکھا کے خاموش ہونے پر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "ایسا تو ممکن نہیں کہ انسان کے جہاں دس دوست ہوں وہاں اس کا کوئی ایک آدھ دشمن نہ ہو لیکن تم بتا رہے ہو کہ......اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی؟"

"تھانے دار صاحب! اللہ رکھا نے آپ کو بالکل سچ بتایا ہے۔" کرم بی بی دکھی لہجے میں بولی۔ "موسیٰ اپنے کام سے کام رکھنے والا بچہ تھا جی۔ لڑائی جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے، اس کی تو کبھی کسی سے تو تو، میں میں بھی نہیں ہوئی تھی۔"

ہر ماں کا عموماً اپنی اولاد کے بارے میں یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے مہذب اور سلجھی ہوئی شائستہ اولاد ہے۔ میں نے اس بڈھی بڈھے کو ایک اور زاویے سے کریدنے کی کوشش کی۔

"کیا آپ لوگوں نے موسیٰ کی شادی بھی کر دی تھی؟"

"جی نہیں۔" اللہ رکھا نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ "کوئی منگنی وغیرہ......؟"

"نہ شادی اور نہ منگنی جی۔" اللہ رکھا نے جواب دیا۔

میں مزید پندرہ بیس منٹ تک گھما پھرا کر ان سے مختلف سوالات کرتا رہا لیکن ایسی کوئی بھی مفید بات سامنے نہ آسکی جس سے اس اجنبی کے حوالے سے کوئی پیش رفت ہو سکتی جسے بڑی بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اگرچہ موسیٰ کے والدین کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے کسی دشمن کا وجود نہیں تھا لیکن میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ میں ان کے گھر سے اٹھ آیا۔

"ٹھیک ہے اللہ رکھا! میں اس بدقسمت شخص کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس دوران میں اگر آپ لوگوں کو کوئی خاص بات پتا چلے تو فوراً مجھے اس کی اطلاع دینا۔"

انہوں نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور میں گھر سے باہر نکل آیا۔ واپسی کا رخ کرنے سے پہلے میں نے اللہ رکھا کے پڑوسیوں فقیر حسین اور یعقوب علی سے فرداً فرداً دوبارہ پوچھ گچھ کی مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ نامعلوم اجنبی مقتول تک رسائی کا کوئی راستہ واضح نہ ہو سکا۔ اس صورتِ حال سے میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

موضع "کوٹ فرمان" بڑی نہر کے کنارے سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا اور یہ آدھا میل لہلہاتے، سرسبز وشاداب کھیتوں پر مشتمل تھا۔ نہر سے گاؤں کے اندر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک کچا راستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنا ہوا تھا۔ میں اسی راستے پر سبک خرامی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ عقب سے کسی نے مجھے پکارا۔

"تھانے دار صاحب......!"

میں نے یکا یک پلٹ کر دیکھا تو نور حسین کمہار کی صورت دکھائی دی۔ میں رک گیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب آگیا۔

"ہاں بھئی نور حسین!" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "خیریت تو ہے نا۔ یہ تمہارا سانس کیوں پھولا ہوا ہے......؟"

"وہ جی...... آپ نے کہا تھا نا کہ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد آپ میرے پاس آئیں گے۔" وہ سادگی سے بولا۔ "لیکن آپ تو واپس جا رہے ہیں۔"

نور حسین کمہار سے جائے وقوعہ پر میری مختصر سی بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اجنبی شخص کی لاش کو دیکھ کر اس کے ذہن میں پہلا خیال موسیٰ کا آیا تھا لیکن بعد میں اسے اپنے اس خیال کی تردید کرنا پڑی کیونکہ وہ موسیٰ نہیں تھا۔ اس وقت میں نے نور حسین سے کہا تھا کہ اللہ رکھا کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کے پاس آؤں گا اور تفصیلی بات چیت کروں گا۔ نور حسین بھی میری اسی بات کا حوالہ دے رہا تھا۔

"ہاں نور حسین!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے گھر نہیں آیا تو کیا ہوا۔ آؤ، ہم چلتے پھرتے بات کر لیتے ہیں۔"

وہ فرماں برداری سے میرے ساتھ چلنے لگا۔

"نور حسین! یہ بات تو طے ہو گئی کہ وہ اجنبی مقتول اللہ رکھا کا بیٹا موسیٰ نہیں ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "لیکن یہ پتا نہیں چل رہا کہ وہ آخر ہے کون...... میرا مطلب ہے، وہ تھا کون؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا جناب۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "اس بدنصیب کی شکل کافی حد تک موسیٰ سے ملتی جلتی ہے اسی لیے مجھے دھوکا ہوا تھا۔"

"اس اجنبی کو کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔" میں نے بہ دستور اس کی جانب دیکھے بغیر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ "جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کو اس اجنبی سے شدید نوعیت کی نفرت تھی اور اس کی لاش اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینکنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ رکھا کو کوئی سنگین پیغام دینا چاہتا ہے۔ میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ دراصل موسیٰ کا دشمن ہے اور موسیٰ کے مغالطے ہی میں اس نے اس بندے کو موت کے گھاٹ اتارا ہے......"

"جی......" وہ چلتے چلتے رک گیا۔ "آپ تو بڑی گہری بات کر رہے ہیں۔"

"بات کی گہرائی کو بعد میں بھی ناپا جاسکتا ہے۔" میں نے نور حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "فی الحال یہ بتاؤ کہ اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے......؟"

"آپ کی بات میں بہت وزن ہے تھانے دار صاحب۔" وہ پُرسوچ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ موسیٰ جو پچھلے چار سال سے غائب ہے، اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا اور اس کا ایسا کون سا دشمن ہے جو بے دردی سے اسے قتل کر سکتا ہے۔"

"موسیٰ کہیں سے نمودار نہیں ہوا نور حسین!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم نے شاید میری بات پر غور نہیں کیا۔ جان کی بازی ہارنے والا موسیٰ نہیں بلکہ اس سے ملتی جلتی شکل کا کوئی بندہ ہے اور اسے موسیٰ کے شبے میں قتل کیا گیا ہے۔"

نور حسین نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد بڑی عقل مندی کی بات کی۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا جناب کہ قاتل کو کہیں سے یہ اطلاع ملی ہوگی کہ پچھلی رات موسیٰ اپنے ماں باپ سے ملنے کوٹ فرمان آرہا ہے لیکن کسی بھی وجہ سے موسیٰ نہیں آیا اور یہ بدبخت قاتل کے ہتھے چڑھ گیا اور اس نے موسیٰ کے مغالطے میں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔"

"میں تم سے سو فی صد اتفاق کرتا ہوں نور حسین کیونکہ میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے نہر کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پچھلی رات، اگر موسیٰ کو کوٹ فرمان آنا تھا تو وہ کیوں نہیں آیا اور اس کی جگہ اس سے ملتی جلتی شکل کا یہ اجنبی کیوں اور کہاں سے ٹپک پڑا......؟"

"جی ہاں، یہ سوالات تو ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور یہ بھی کہ موسیٰ کا ایسا خطرناک اور جانی دشمن کون ہوسکتا ہے......" لحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر متذبذب انداز میں بولا۔

"جہاں تک میں موسیٰ کو جانتا ہوں، وہ تو بہت امن پسند اور صلح صفائی سے رہنے والا انسان تھا۔ اس کا کبھی کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا ہوں تھانے دار صاحب اور موسیٰ میری آنکھوں کے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوا ہے۔ میں نے کبھی اسے کسی کے ساتھ الجھتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"موسیٰ کے ماں باپ کا بھی یہی دعویٰ ہے نور حسین۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "لیکن میں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ میں یہ راز جان کر رہوں گا کہ موسیٰ کے خون کا پیاسا کون ہوسکتا ہے اور اس مقصد میں کامیابی کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے......"

"جی...... آپ حکم کریں۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "میں کیا تعاون کرسکتا ہوں؟"

"یہ تو تم بتا چکے ہو کہ موسیٰ سے کسی کی یا کسی سے موسیٰ کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔" میں نے پوچھ گچھ کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ چار سال پہلے جب موسیٰ اچانک غائب ہوا تھا تو اس وقت ایسا کون سا واقعہ پیش آیا تھا جسے اس کی گمشدگی کے ساتھ جوڑا جا سکے......؟"

"کوئی نہیں......" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسا کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ بس، وہ ایک دن اچانک غائب ہو گیا تھا...... چپ چاپ...... پھر اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ چار سال کے بعد آج پہلی مرتبہ اتنے زور شور سے اس کا ذکر ہو رہا ہے۔"

موسیٰ کے کسی دشمن کا سراغ نہ ملنے کی صورت میں، میں نے نور حسین سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ "کیا آج صبح تم مٹی نکالنے نہر کی طرف گئے تھے؟"

"جی...... گیا تھا۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"میرے اندازے کے مطابق قاتل نے اس اجنبی بندے کی لاش کو رات کے آخر پہر یا پھر علی الصباح لاکر اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینکا ہوگا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کیا تم نے کسی شخص کو ادھر آتے ہوئے یا جاتے ہوئے دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے، جب آج صبح تم نہر سے مٹی نکالنے گئے تھے تو تم نے گاؤں کے اندر یا گاؤں سے باہر کی فضا میں کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی تھی؟"

وہ میرے سوال کے مقصد تک پہنچ گیا اور ٹھہرے

ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جناب! میں جب اپنے گدھے کے ساتھ مٹی نکالنے بڑی نہر کی طرف جاتا ہوں تو اس وقت ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا ہوتا ہے۔ آج صبح نہر کی جانب جاتے ہوئے یا واپسی میں مجھے ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا جسے غیر معمولی کہا جاسکے۔ میں نے نہر سے مٹی نکال کر اپنے گدھے پر لادی اور واپس گھر آگیا۔“

نور حسین کی وضاحت سے یہ لگتا تھا کہ اس اجنبی نامعلوم شخص کی لاش کو رات کے اندھیرے میں کسی وقت لاکر اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا تھا اور شواہد سے میں یہ اندازہ پہلے ہی لگا چکا تھا کہ قتل کی یہ واردات کسی اور مقام پر ہوئی تھی۔ بعدازاں جب اس بدقسمت کی لاش ٹھنڈی ہوگئی اور بدن سے خارج ہونے والا لہو جم چکا تو اسے اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا...... مگر کیوں؟ اللہ رکھا کا دروازہ ہی کیوں؟

اس ”کیوں“ کا کوئی واضح جواب ابھی تک سامنے نہیں آسکا تھا۔ اگر میں اصل جائے وقوعہ تک یعنی جہاں اس اجنبی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ سکتا تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں سے مجھے کشتی کے ذریعے نہر عبور کرنا تھی۔ کشتی اس وقت نہر کے دوسرے کنارے سے اسی طرف آرہی تھی۔ میں نے نور حسین سے کہا۔

”اب تم اپنے گھر جاؤ اور میں تھانے جارہا ہوں۔ میں کل پھر ادھر کا چکر لگاؤں گا۔ تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا...... میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”جی ہاں...... بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔“

میں نے نور حسین کو واپس بھیج دیا اور نہر کے کنارے کھڑے ہوکر کشتی کا انتظار کرنے لگا۔ مذکورہ نہر کا پاٹ خاصا چوڑا تھا اسی لیے اسے بڑی نہر کہا جاتا تھا۔ جو نہیں جانتے تھے وہ اسے دریا ہی سمجھتے تھے۔

کشتی والے خادم حسین نے دو افراد کو نہر کے کنارے اتارا تو میں کشتی پر سوار ہوگیا۔ خادم حسین کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور میانہ قد شخص تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرے سے جفاکشی جھلکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کی ساری زندگی محنت کرتے گزری ہو۔

”سرکار! اگر آپ کا حکم ہو تو میں کشتی چلاؤں؟“ وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے مختصر جواب دیا۔ ”نیکی اور پوچھ پوچھ!“

اس نے کشتی کو رواں کردیا اور بولا۔ ”اگر آپ کو برا نہ لگے تو کچھ پوچھوں جناب......!“

میں نے فراخ دلی سے کہا۔ ”ہاں ہاں...... پوچھو خادم حسین۔“

اس نے پوچھا۔ ”سرکار! صبح آپ چند لوگوں کے ساتھ ادھر کوٹ فرمان گئے تھے اور ابھی آپ اکیلے ہیں۔“

”ہاں۔ وہ لوگ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔“ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”دو گھنٹے پہلے آپ کے محکمے کا ایک سنتری کسی اجنبی کی لاش لے کر فرید آباد کی طرف گیا ہے۔“ وہ کریدنے والے انداز میں بولا۔ ”کیا کوٹ فرمان میں قتل کی کوئی واردات ہوئی ہے......؟“

میں نے چونک کر خادم حسین کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں مجھے دنیا جہاں کے تجربے کے ساتھ ہی بہت گہرائی بھی نظر آئی۔ پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوا کہ خادم حسین اس واقعے کے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ضرور جانتا ہے تاہم انجان بن کر مجھ سے استفسار کررہا ہے۔ میں نے الٹا اسی کو گھیرنے کا فیصلہ کرلیا۔

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے خادم حسین۔“ میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کوٹ فرمان میں پچھلی رات ایک اجنبی شخص کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ میرے عملے کا آدمی اسی بدنصیب بندے کی لاش کو لے کر فرید آباد کی طرف گیا ہے......“ لمحاتی توقف کرکے میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

”ادھر گاؤں میں چند لوگوں کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اجنبی شخص کل شام میں، تمہاری کشتی پر سوار ہوکر کوٹ فرمان پہنچا تھا؟“

میرا یہ سوال ”اندھیرے میں چلایا ہوا تیر“ ہرگز نہیں تھا۔ فرید آباد سے کوٹ فرمان تک پہنچنے کا واحد ذریعہ خادم حسین کی کشتی ہی تھی۔ کل شام میں، سہ پہر میں یا دن میں کسی وقت وہ نامعلوم شخص اسی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان پہنچا ہوگا۔

”آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے تھانے دار

صاحب!'' وہ افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جن دو بندوں کو میں آخری پھیرے میں کوٹ فرمان پہنچا رہا ہوں، آج ان میں سے ایک کی لاش واپس جائے گی......''

''دو بندوں کو......؟'' مجھے کرنٹ سا لگا۔

''جی ہاں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ جو آپ کا سنتری جس بندے کی لاش لے کر فرید آباد گیا ہے نا، میں نے اسے اور ایک دوسرے بندے کو کل شام میں کوٹ فرمان پہنچایا تھا۔ وہ میرا آخری پھیرا تھا۔''

میں نے تھوڑی دیر پہلے خادم حسین کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا تھا، وہ اب درست ثابت ہو رہا تھا۔ یقیناً وہ اجنبی مقتول کے حوالے سے معلومات رکھتا تھا۔ میں اپنے مخصوص انداز میں اس سے سوال کرنے لگا۔

''خادم حسین! تم نے لگ بھگ کتنے بجے ان دونوں افراد کو کل کوٹ فرمان پہنچایا تھا؟''

''جی، اللہ آپ کا بھلا کرے۔'' وہ بتانے لگا۔ ''وہ ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان کا کوئی وقت تھا۔ میں صبح نو بجے کشتی نکالتا ہوں اور سورج ڈوبنے سے پہلے آخری چکر لگا کر واپس چلا جاتا ہوں کیونکہ میرا گھر ادھر فرید آباد ہی میں ہے۔''

''خادم حسین!'' میں نے گہری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ ''جن دو بندوں کو تم نے کل شام کوٹ فرمان پہنچایا تھا، ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''جی...... میں سمجھا نہیں؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''کیا تم ان دونوں کو پہچانتے ہو؟''

اجنبی مقتول کی شناخت ہی سب سے بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی لہٰذا میری تان بھی اسی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''جناب! میں ان دونوں میں سے ایک کو کسی حد تک جانتا ہوں۔''

''کس کو؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''بھولا کو......'' اس نے بتایا۔

''بھولا......!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم اس بندے کی بات کر رہے ہو جس کی لاش کچھ دیر پہلے میں نے کانسٹیبل سلیم کے ہاتھ سرکاری اسپتال بھجوائی ہے؟''

''نہیں جناب......'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''اس بندے کو تو میں نے کل پہلی بار دیکھا تھا اور دوبارہ دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ......''

اس نے افسوسناک انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''تو تم اس کے ساتھی کی بات کر رہے ہو؟''

''جی۔ اس کا اصل نام تو اسحاق ہے۔'' خادم حسین نے بتایا۔ ''مگر وہ ''بھولا'' کے نام سے مشہور ہے۔''

''تو تم اس اسحاق عرف بھولا کو کسی حد تک جانتے ہو؟'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے...... پھر بھولا ہی کے بارے میں بتا دو؟''

''یہ بھولا چاچا اسمٰعیل کا بیٹا ہے جی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''فرید آباد کے لاری اڈا پر چاچا اسمٰعیل کی چائے اور سگریٹ وغیرہ کی دکان ہے۔ بھولا بھی کئی بار مجھے ادھر دکان پر نظر آیا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر خادم حسین سے پوچھا۔ ''کیا کل وہ دونوں ایک ساتھ ہی تمہاری کشتی پر سوار ہو کر کوٹ فرمان پہنچے تھے یا الگ الگ تمہارے پاس آئے تھے؟''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا جی۔'' وہ مدبرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ دونوں ایک ساتھ ہی باتیں کرتے ہوئے میری کشتی تک پہنچے تھے اور نہر عبور کرتے ہوئے بھی ان میں بات چیت ہوتی رہی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ ہی تھے......''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اچھا تو اب یہ بھی بتا دو کہ وہ دونوں ہی نہر کے اس پار اتر گئے تھے یا بھولا واپس آ گیا تھا؟''

''دونوں ہی ادھر رہ گئے تھے۔'' خادم حسین نے جواب دیا۔ ''میں خالی کشتی لے کر واپس آیا تھا۔''

''اور آج صبح ہی سے تم اپنی کشتی پر نہر کے پھیرے لگا رہے ہو؟''

''جی ہاں...... صبح نو بجے سے میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں۔''

''کیا کوٹ فرمان سے فرید آباد کی طرف آتے ہوئے کسی پھیرے میں آج تم نے بھولا کو بھی بٹھایا ہے اپنی کشتی میں؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں جناب...... میرا خیال ہے، بھولا ابھی تک ادھر کوٹ فرمان ہی میں ہے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''اگر وہ واپس آتا تو میری کشتی میں ضرور بیٹھتا۔''

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''تھانے دار صاحب!'' خادم حسین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''آں......ہاں......'' میں نے خیالات سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''جناب! ہم کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔'' خادم حسین نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟''

جب انسان کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوتا ہے تو اس پر نئے نئے دروا ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے واپس کوٹ فرمان لے چلو۔''

چند لمحات تک وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر فرماں برداری سے بولا۔ ''جیسی آپ کی مرضی تھانے دار صاحب......''

بات ختم کرتے ہی اس نے کشتی کا رخ پھیرا اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

جب سے خادم حسین نے مجھے یہ بتایا تھا کہ بھولا ادھر کوٹ فرمان ہی میں رک گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا، میرے ذہن میں خیالات کی اٹھک بیٹھک لگی ہوئی تھی۔ گزشتہ شام میں اجنبی مقتول، بھولا کی معیت میں کوٹ فرمان پہنچتا ہے پھر اسی رات کے ابتدائی حصے میں اجنبی شخص کو بڑی بے دردی سے قتل کر کے اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا جاتا ہے اور مصدقہ اطلاع کے مطابق اسحاق عرف بھولا ابھی تک کوٹ فرمان کے اندر موجود ہے تو پھر...... یہ بھولا یقیناً، اس اجنبی کی موت کے راز سے واقف ہو گا اور بھولا ہی مجھے بتا سکتا تھا کہ وہ اجنبی مقتول آخر تھا کون......؟

اسی سوال کی روشنی میں، میں نے فوری طور پر واپس کوٹ فرمان جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ''کوٹ فرمان'' ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ لگ بھگ سو گھروں پر مشتمل ایک مختصر سا دیہات۔ بھولا کو اس گاؤں میں تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ایک بار بھولا میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر میں اس کی زبان کو ہر راز اگلنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

انہی سوچوں میں گم کشتی نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ میں نے کشتی میں سے باہر نکلنے کے بعد خادم حسین سے کہا۔

''جب تک میں واپس نہ آجاؤں، تم اپنی کشتی کے ساتھ اسی کنارے پر موجود رہو گے۔''

''جی اچھا۔'' اس نے گردن کو اثباتی جنبش دی۔ ''جو آپ کا حکم۔''

''میں تمہارے آخری پھیرے کے وقت سے پہلے ہی واپس آجاؤں گا۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''سورج غروب ہونے سے پہلے تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔''

اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نہر کے کنارے سے ''کوٹ فرمان'' کی جانب بڑھنے لگا۔ اس بار میرے قدموں میں ایک خاص قسم کی تیز رفتاری پائی جاتی تھی جو سنسنی خیز اور پُرتجسس بھی تھی۔

☆☆☆

اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ فضا کی خنکی بھی چپ چاپ کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اگرچہ سورج آسمان پر موجود تھا لیکن اس کی دھوپ میں حدت یا تپش نہیں پائی جاتی تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر میں کوٹ فرمان کے اندر موجود تھا۔

آج صبح اس اجنبی شخص کی پراسرار موت نے پورے گاؤں میں خاصی سنسنی پھیلا دی تھی۔ لوگ کام میں کم اور چہ میگوئیوں میں زیادہ مصروف تھے۔ کھیتوں کے اندر بھی وہ چہل پہل نظر نہیں آرہی تھی جو نارمل حالات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میں اللہ رکھا کے گھر پہنچا اور یہ اعلان کرا دیا کہ ہر گھر کا ایک ایک آدمی وہاں جمع ہو جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے اردگرد ایک مجمع سا لگ گیا۔ میں نے اس جم غفیر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور بہ آوازِ بلند سوال کیا۔

''تم میں سے کون کون ''فرید آباد'' آتا جاتا رہتا ہے؟''

یہ سوال اگرچہ بادی النظر میں غیر اہم اور فضول لگتا تھا لیکن اس کے پیشِ نظر میرے کچھ مقاصد تھے جو اگلے سوالات میں کھل کر سامنے آنے والے تھے۔ کوٹ فرمان میں رہنے والوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو فرید آباد نہ آتا جاتا ہو کیونکہ ان لوگوں کی ہر ضرورت فرید آباد سے تعلق رکھتی تھی۔

سب نے اثبات میں جواب دیا یعنی ان سب کا فرید آباد جانا لگا رہتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسی انداز میں پوچھا۔

''فرید آباد کے لاری اڈے پر چاچا اسمٰعیل نامی ایک بندے کی سگریٹ اور چائے کی چھوٹی سی دکان ہے۔ آپ میں سے جو لوگ چاچا اسمٰعیل کو جانتے ہیں، وہ ایک طرف ہو جائیں......''

لگ بھگ بیس افراد مجمعے میں سے الگ ہو گئے۔ سب کے چہروں پر اپنی اپنی سوچ کی نمائندگی کرنے والے سوالات چمک رہے تھے۔ میرے انداز نے انہیں عجیب

الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ایک تو آج صبح ہی سے نامعلوم شخص کی لاش نے گاؤں کی سیدھی سادی زندگی میں خاصی افراتفری مچا رکھی تھی اور پھر اوپر سے میں جس انداز میں تفتیش کر رہا تھا، وہ ان کی الجھن میں اضافے کا باعث تھا۔ چوبیس افراد الگ ہوئے تھے، ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے مجھ سے سوال کیا۔

''تھانے دار صاحب! ادھر فرید آباد میں سب خیریت تو ہے نا......''

''خیریت ہوتی تو پھر اس پوچھ گچھ کی ضرورت کیا تھی؟''

''نہ...... میرا مطلب ہے......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اسمٰعیل تو ٹھیک ہے نا؟''

میں نے گھور کر اس ادھیڑ عمر شخص کو دیکھا اور پوچھا۔ ''چاچا! تم کون ہو اور...... تمہیں اسمٰعیل کے بارے میں اتنی تشویش کیوں ہو رہی ہے؟''

''میں اسمٰعیل کا بڑا بھائی ہوں جی...... ابراہیم!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی فکر نہیں ہوگی تو اور کسے ہوگی جناب......!''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو تم اپنے بھتیجے بھولا کو بھی جانتے ہو گے؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں سرکار۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''اسمٰعیل میرا اکلوتا بھائی ہے اور بھولا اس کی اکلوتی اولاد ہے۔ میں بھلا اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کی اکلوتی اولاد کو کیسے نہیں جانتا ہوں گا۔''

ابراہیم کی شکل میں مجھے ایک کام کا بندہ مل گیا تھا۔ اس دوران میں اللہ رکھا نے ایک درخت کے نیچے میرے لیے چارپائی بچھا دی تھی۔ میں ابراہیم کو لے کر اس چارپائی کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں جمع ہو جانے والے لوگوں کو میں نے واپس اپنے گھروں کو جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

میں چارپائی پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ابراہیم نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! یہ تو بتا دیں کہ اسمٰعیل، آمنہ اور بھولا تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا......!''

آمنہ غالباً اسمٰعیل کی بیوی اور بھولا کی ماں کا نام تھا۔ بعد ازاں ابراہیم سے استفسار پر میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

''ابراہیم!'' میں نے بھولا کے تایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''وہاں تو سب خیریت ہے لیکن ادھر کوٹ فرمان میں تم بھی دیکھ رہے ہو آج صبح سے کیسی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ اجنبی شخص کی لاش نے گاؤں کے ہر شخص کا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بھی صبح اس بندے کی لاش کو دیکھا تھا۔ کسی نے بڑی بے دردی سے اس بدنصیب کو موت کے گھاٹ اتارا ہے لیکن......'' وہ بولتے بولتے تھما، ایک گہری سانس لی پھر الجھن زدہ انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس اجنبی شخص کے قتل سے میرے چھوٹے بھائی کا کیا تعلق ہے؟ آپ اسمٰعیل کے بارے میں کیوں پوچھ گچھ کرتے پھر رہے ہیں؟''

''بہت گہرا تعلق ہے چاچا......'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، اس واردات میں تمہارے بھتیجے بھولا کا ہاتھ ہے۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب......؟'' اس کی حیرت ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں......!'' میرے لہجے میں سختی اتر آئی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا......!''

''تمہارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے بہ دستور سخت لہجے میں کہا۔ ''بھولا کل شام میں اس اجنبی شخص کے ساتھ فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچا تھا۔ خادم حسین کشتی والا اس امر کا گواہ ہے۔ اس نے کل شام آخری پھیرے میں ان دونوں کو فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچایا تھا۔ میرا مطلب ہے، اپنی کشتی میں بٹھا کر بڑی نہر عبور کرائی تھی۔ خادم حسین اس وقت نہر کے کنارے کھڑا میری واپسی کا انتظار کر رہا ہے......''

''بھولا اگر یہاں آیا تھا تو مجھے خبر کیوں نہیں ہے۔'' ابراہیم کی الجھن ہر لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ''وہ مجھ سے ملے بغیر واپس کیسے چلا گیا......''

''بھولا واپس نہیں گیا ابراہیم......''

میرے اٹل لہجے نے ابراہیم کو الجھن میں ڈال دیا۔

''وہ واپس نہیں گیا تو...... پھر کہاں ہے؟''

''تم جانتے ہو، کوٹ فرمان سے فرید آباد جانے کا واحد ذریعہ یہ بڑی نہر ہی ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اور اس نہر کے اس پار یا اس پار آنے جانے کے لیے لوگ خادم حسین کی کشتی استعمال کرتے ہیں۔ کرتے ہیں یا نہیں......؟''

''جی ہاں...... بالکل کرتے ہیں۔'' اس نے اثبات

میں گردن ہلائی۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔" میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "خادم حسین کا دعویٰ ہے کہ کل شام میں آخری پھیرا لگاتے ہوئے اس نے بھولا اور اس اجنبی شخص کو کوٹ پہنچایا تھا اور آج کا پورا دن بھولا واپسی کے لیے اس کی کشتی میں نہیں بیٹھا۔ اس کا کیا مطلب ہوا......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس بات کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ بھولا ابھی تک کوٹ فرمان کے اندر موجود ہے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں......؟"

"اس سوال کا جواب تو تم دو گے ابراہیم۔"

"میں......!" وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں ابراہیم...... تم۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "بھولا تمہارا بھتیجا ہے اور بھتیجا بھی اکلوتا...... کوٹ فرمان میں تم اس کے واحد رشتے دار ہو۔ وہ جب بھی یہاں آتا ہوگا تو یقیناً تمہارے پاس ہی آتا ہوگا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ بے بسی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے، وہ مجھ سے ملنے ہی یہاں آیا کرتا ہے لیکن آپ میری بات کا یقین کریں، وہ کل کوٹ فرمان نہیں آیا۔"

"تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں۔"

"نہیں جی...... میں نے ایسا کب کہا ہے۔"

"اگر میں جھوٹ نہیں بول رہا تو پھر تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ کل شام میں بھولا اس اجنبی مقتول کے ساتھ کوٹ فرمان آیا تھا اور...... ابھی تک ادھر ہی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔"

"جناب! آپ کی باتیں بالکل میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔" وہ تقریباً روہانسا ہو گیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ اگر وہ کوٹ فرمان آیا تھا تو مجھ سے کیوں نہیں ملا۔ دوسرے، وہ اگر ابھی تک گاؤں میں موجود ہے تو پھر کہاں چھپا بیٹھا ہے......" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اس بات پر میں یقین کرنے کو تیار نہیں کہ بھولا کسی قتل کی واردات میں ملوث ہو سکتا ہے۔"

"دیکھو ابراہیم......!" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں نے بھولا کو قتل کی واردات کرتے دیکھا ہے یا یہ کہ میرے پاس اس خونیں واقعے کا کوئی چشم دید گواہ ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ کل شام بھولا اس بدنصیب مقتول کے ساتھ کوٹ فرمان کے اندر داخل ہوا تھا۔ خادم حسین کے مطابق وہ دونوں دوستوں کی طرح گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول بھولا کے لیے قطعاً اجنبی نہیں تھا۔ بالفرض، بھولا نے اگر اس شخص کو موت کے گھاٹ نہیں بھی اتارا تو وہ اتنا ضرور جانتا ہوگا کہ پچھلی رات اس بدنصیب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا اور اس کی لاش کو اللہ رکھا کے گھر کے سامنے پھینکنے کا کیا راز تھا۔"

"آپ کی بات کو میں کسی حد تک سمجھنے لگا ہوں۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "لیکن الجھن یہ ہے کہ کوٹ فرمان آنے کے بعد بھولا مجھ سے کیوں نہیں ملا اور آپ کے مطابق اگر وہ کہیں چھپا بیٹھا ہے تو کہاں......؟"

"ابراہیم!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "تھانے دار تم ہو یا میں؟"

وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے بولا۔ "جی...... تھانے دار تو آپ ہی ہیں۔"

"بس، تو پھر تھانے داری بھی مجھے ہی کرنے دو۔" میں نے بدستور تلخ آواز میں کہا۔ "یہ سوال پوچھنا میرا حق ہے کہ تمہارا بھتیجا اس وقت کوٹ فرمان میں کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ تم صرف جواب دو......"

"جناب! اگر مجھے بھولا کے بارے میں کچھ پتا ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "آپ میری بات کا یقین کریں سرکار۔"

"یہ قتل کا معاملہ ہے ابراہیم......" میں نے اسے ٹٹولنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور شاید تمہیں معلوم نہیں کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔"

"شک......!" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "تت...... تو کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں تھانے دار صاحب!"

"تفتیشی معاملات میں ایک دیانت دار پولیس والے کو بعض اوقات اپنے باپ پر بھی شک کرنا پڑ جاتا ہے ابراہیم۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں ہم اپنی ذات کو بھی معاف نہیں کرتے......" میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

"مجھے جس بھولا کی تلاش ہے وہ رشتے میں تمہارا اکلوتا سگا بھتیجا لگتا ہے۔ اس گاؤں میں اس کا اور کوئی ایسا رشتے

دار یا دوست موجود نہیں جس کے پاس وہ تمہیں نظر انداز کر کے ٹھہر جاتا۔ اس امر میں بھی کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ کل شام کو بھولا اجنبی مقتول کے ہمراہ کوٹ فرمان آیا تھا۔ میں بھولا کی تلاش کے سلسلے میں تم پر شک نہیں کروں تو پھر کس پر کروں......!''

''جناب! میں اپنی باتوں سے تو آپ کو یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اب ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ آپ اپنے شک کو دور کرنے کے لیے میرے گھر کی تلاشی لے لیں۔''

''تلاشی تو میں تمہارے گھر کی لوں گا ہی ابراہیم۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ سوچ لینا کہ بعد میں اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے کسی مرحلے پر دروغ گوئی سے کام لیا ہے تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔''

''منظور ہے، تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آپ صرف میرے گھر کی تلاشی ہی نہ لیں بلکہ میری بیوی اور بچوں سے بھی بھولا کے بارے میں پوچھیں۔ اگر کسی بھی مقام پر میری کوئی بات غلط نکلے تو جو چور کی سزا وہی میری سزا......''

میرا سالہا سال سے جرائم پیشہ افراد سے واسطہ رہا ہے...... چہرے کو سیانے دل کی کتاب کہتے ہیں۔ کچھ لوگ چہرے کو دماغ کا انڈیکس بھی کہتے ہیں۔ چہرے پر سب سے اہم چیز آنکھیں ہوتی ہیں۔ جب کوئی بھی انسان کچھ بول رہا ہوتا ہے تو آنکھیں اس کی سوچ کی ترجمانی کر رہی ہوتی ہیں۔ انسان کوشش کر کے چہرے کے تاثرات سے تو دل کی کیفیت کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن آنکھیں چغلی کھانے سے باز نہیں آتیں۔

ابراہیم کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی مخصوص زبان سے میں یہ اندازہ تو لگا چکا تھا کہ وہ بھولا کی کوٹ فرمان میں آمد کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن عملی تفتیش اور کارروائی بھی ضروری تھی لہٰذا میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

''چور کی سزا تو بہت معمولی ہوتی ہے ابراہیم...... اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے غلط بیانی کر کے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تمہیں کتنی سخت سزا دلوا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جی، مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میرا خدا جانتا ہے کہ میں سچا ہوں اس لیے مجھے کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ابراہیم کی معیت میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس گھر میں ابراہیم اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ایک بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری کی بھی اگلے سال شادی ہونے والی تھی۔ وہ منگنی شدہ تھی۔ جبکہ دونوں بیٹے کامران اور عمران کھیتی باڑی میں ابراہیم کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ کامران اور عمران دونوں جوان تھے۔ میں نے پندرہ بیس منٹ کے اندر بڑی باریک بینی سے ابراہیم کے گھر کا کونا کونا چھان مارا لیکن کہیں پر بھی مجھے بھولا نظر نہ آیا اور نہ ہی اس گھر میں اس کی آمد کے کوئی آثار دکھائی دیے۔ ''میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا جناب کہ بھولا نہ تو ہمارے گھر میں آیا ہے اور نہ ہی ہم نے اسے کہیں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔'' ابراہیم نے کہا۔

اس وقت میں گھر کی تلاشی سے فارغ ہونے کے بعد ابراہیم کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ ابراہیم کے علاوہ اس کی بیوی شگفتہ اور دونوں بیٹے بھی وہاں موجود تھے جن میں کامران، عمران سے دو تین سال بڑا تھا۔ وہ دونوں جوانی کی دہلیز پر کھڑے تھے۔

''ابراہیم!'' میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''پولیس کی تفتیش کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے اور ہم اس پر عمل ضرور کرتے ہیں۔ اب یہ تو پتا چل گیا کہ بھولا پچھلی رات اس گھر میں نہیں آیا اور نہ ہی آپ لوگوں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔''

''کون سا مسئلہ تھانے دار صاحب؟'' شگفتہ نے مجھ سے پوچھا۔

جس وقت میں خانہ تلاشی کے کام میں معروف تھا اسی دوران میں وقفے وقفے سے اس گھر کے مکینوں سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا اور میں نے انہیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں یہ پتا چل چکا تھا کہ میں نہر عبور کرنے کے بعد دوبارہ کوٹ فرمان کیوں آیا ہوں اور میری اس وقت ترجیحات کیا ہیں۔

''مسئلہ بھولا کی تلاش کا ہے۔'' میں نے شگفتہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''بھولا کل شام یہاں آیا ہے اور ابھی تک واپس نہیں گیا تو پھر وہ کہاں ہے؟''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے جناب...... کہ بھولا ادھر آیا ہی نہ ہو۔'' شگفتہ نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''کشتی والے خادم حسین نے بڑے وثوق سے اس امر کی تصدیق کی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے

ہوئے کہا۔
''کشتی والے کو مغالطہ بھی تو ہوسکتا ہے تھانے دار صاحب۔'' شگفتہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ ''خادم حسین نے کل شام اجنبی شخص کے ساتھ جس نوجوان کو کوٹ فرمان پہنچایا تھا، وہ بھولا کے علاوہ کوئی اور بھی تو ہوسکتا ہے...... بھولا سے ملتا جلتا کوئی بندہ...... ایسا ناممکن تو نہیں۔''
''ناممکن تو اس دنیا میں کچھ بھی نہیں شگفتہ۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس کیس میں پہلے ہی ''ملتی جلتی شکل'' والا ایک اتفاق موجود ہے۔ جس اجنبی بندے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینکا گیا ہے، مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کی شکل کافی حد تک اللہ رکھا کے بیٹے موسیٰ سے ملتی جلتی ہے۔''
''میں نے موسیٰ کو تو ہزار بار دیکھا ہے لیکن اس اجنبی بندے کی لاش کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا......''
''ہم نے دیکھا ہے۔'' کامران اور عمران بہ یک زبان ہوکر بولے۔ ''یہ بات صحیح ہے کہ یہ بندہ بڑی حد تک موسیٰ جیسا تھا مثلاً قد کاٹھ، چہرے کے نقش اور ڈاڑھی کا انداز وغیرہ۔''
''میرا خیال ہے۔'' ابراہیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر آپ فرید آباد میں اسمٰعیل کے گھر جا کر تفتیش کریں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔''
''آپ نے کوٹ فرمان میں تو بھولا کو اچھی طرح تلاش کرلیا ہے۔'' شگفتہ اپنے شوہر کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''وہ آپ کو کہیں نہیں ملا۔ اگر وہ ادھر فرید آباد میں موجود ہے تو پھر اس کا یہی مطلب ہوگا کہ وہ کوٹ فرمان آیا ہی نہیں اور اگر خادم حسین کسی چالاکی سے کام نہیں لے رہا تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسے بھولا کے حوالے سے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''
''اس بات میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں کہ میں فرید آباد پہنچ کر سب سے پہلے بھولا اور اسمٰعیل ہی کو چیک کروں گا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اور جہاں تک بھولا کی تلاش میں میری ناکامی کا سوال ہے تو یہ بات درست نہیں۔ میں نے صرف ابھی تک تمہارے گھر کی تلاشی لی ہے۔ باقی لوگوں سے صرف پوچھ گچھ کی ہے۔''
''آپ ضرور پورے گاؤں کے گھروں کی تلاشی لیں جناب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''لیکن بھولا ہمارا رشتے دار ہے۔ وہ جب بھی کوٹ فرمان آتا ہے تو صرف ہمارے ہی پاس آتا ہے۔ اس کا کسی اور گھر سے کوئی تعلق واسطہ نہیں

دو چیزیں

انسان اپنی طرف سے پوری کوشش پوری تدابیر اختیار کرتا ہے اور جب کامیابی اس کے قریب جا پہنچتی ہے تو دو چیزیں اس کے اور کامیابی کے بیچ حائل ہوجاتی ہیں۔ ایک موت اور دوسری تقدیر۔
اس حقیقت کو جانیے کہ آپ کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا ہے۔

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں

مصیبت

ایک سردار جی صبح سویرے کوٹ پہن کر آفس جارہے تھے۔ اچانک انہیں سڑک کے عین درمیان کیلے کا چھلکا پڑا نظر آیا۔ سردار جی وہیں یک دم رک گئے اور خود سے کہنے لگے۔
''او یار! اے کی مصیبت اے...... مجھے آج پھر پھسلنا پڑے گا۔''

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں

اس لیے اس کے کہیں اور چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''
شگفتہ کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ اس سے پہلے میں اللہ رکھا کے گھر کے سامنے ابراہیم سے بھی تفصیلی گفتگو کرچکا تھا لہٰذا اب میں نے اس کے بیٹوں کی جانب رخ کرلیا۔
''تم دونوں بھی لگ بھگ بھولا ہی کے ہم عمر ہو۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب بھولا کوٹ فرمان آتا ہوگا تو اس کا زیادہ تر وقت تم لوگوں کے ساتھ ہی گزرتا ہوگا؟''
''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' کامران نے اثبات میں گردن ہلائی۔
عمران بولا۔ ''بھولا جب یہاں آتا ہے تو وہ ہمارے ساتھ کھیتوں میں کام بھی کرتا ہے اور ہم لوگ خوب کھیلتے بھی ہیں۔''
''تم لوگ عموماً کون سا کھیل کھیلتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''کوئی کھیل مخصوص نہیں ہے جناب۔'' کامران نے جواب دیا۔ ''فٹ بال، کبڈی اور نہر میں نہانا...... سب شامل ہے۔''
''اچھا...... تو تم لوگ نہر میں نہایا بھی کرتے ہو؟''
''جی ہاں...... بالکل۔'' عمران نے جواب دیا۔
''بھولا بہت اچھا تیراک ہے۔ اسی نے ہمیں نہر میں تیرنا سکھایا ہے۔ ویسے ہم زیادہ تر فٹ بال ہی کھیلتے ہیں۔''

میں نے شگفتہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہاری بڑی بیٹی کی شادی کہاں ہوئی ہے؟''

''نسیم کی شادی میری بڑی بہن کے بیٹے سے ہوئی ہے تھانے دار صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اب تو اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے تو ماشاء اللہ چار بچے بھی ہیں۔''

''ماشاء اللہ......!'' میں نے خلوصِ دل سے کہا پھر پوچھا۔ ''اور چھوٹی بیٹی کی منگنی کہاں کی ہے؟''

''شمیم کا رشتہ میرے بھائی کے بیٹے سے طے ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اگلے سال انشاء اللہ اس کی بھی شادی کر دیں گے۔''

شگفتہ کی بات مجھے ہضم نہ ہو سکی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں اور دونوں کے رشتے ان کے ننھیال یعنی شگفتہ کے خاندان میں طے کیے گئے تھے جبکہ ابراہیم کا صرف ایک ہی بھائی تھا...... اسمٰعیل اور اسمٰعیل کا بھی ایک ہی بیٹا تھا...... اسحاق عرف بھولا...... اس قسم کی صورتِ حال میں تو ابراہیم کی محبت کو جوش مارنا چاہیے تھا۔ وہ کم از کم ایک بیٹی کی شادی تو اپنے اکلوتے بھائی کے اکلوتے بیٹے سے کر سکتا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہوا تھا تو اس کا راز کیا تھا۔ یہ راز جاننے کے لیے میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

''ابراہیم! تمہاری دو بیٹیاں ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور صرف ایک بھتیجا۔ تمہیں اپنی بیٹیوں کے رشتے طے کرتے ہوئے بھولا کا خیال کیوں نہیں آیا؟''

''مجھے تو بھولا کا بڑا خیال تھا۔'' وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آمنہ کی وجہ سے ساری گڑبڑ ہو گئی۔''

''آمنہ......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ آمنہ کون ہے؟''

''آمنہ، اسمٰعیل کی گھر والی ہے جی۔'' شگفتہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ابراہیم کی تو یہی خواہش تھی کہ شمیم کی شادی بھولا سے ہو کیونکہ شمیم اور بھولا کی عمریں ایک ہی جیسی ہیں لیکن اسمٰعیل اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے۔ آمنہ نے اس رشتے کی مخالفت کر دی تھی۔''

''مخالفت کی کوئی وجہ؟''

''جی ہاں۔'' ابراہیم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ بھولا کو اپنے خاندان میں بیاہنا چاہتی ہے۔''

''اس نے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جب شگفتہ اپنی بیٹی کا رشتہ اپنے بھانجے کو دے سکتی ہے تو میں بھولے کی شادی اپنی بھانجی سے کیوں نہیں کر سکتی حالانکہ میں نے شمیم اور نسیم کے رشتے کرتے وقت ابراہیم پر ایسی کوئی شرط عائد نہیں کی تھی۔ اب یہ بات الگ کہ ابراہیم کا صرف ایک ہی بھائی ہے اور اس کا بھی صرف ایک ہی بیٹا بھولا......''

''اسمٰعیل اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے جناب۔'' ابراہیم دکھی لہجے میں بولا۔ ''ویسے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ رشتے نصیبوں کا کھیل ہیں۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، زمینوں پر نہیں......''

''ابراہیم! یہ تو تم نے سولہ آنے درست بات کی ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر روئے سخن اس کے بیٹوں کی طرف پھیر لیا۔

''جب بھولا ادھر کوٹ فرمان میں آتا تھا تو اس کا یہاں کے لوگوں سے بھی میل جول ہوتا ہوگا؟''

''جی ہاں...... ہم سب مل جل کر ہی کھیلتے ہیں۔'' کامران نے جواب دیا۔

''یہاں کسی لڑکے کے ساتھ اس کی گہری دوستی بھی ہو گئی ہوگی؟''

''نہیں جناب! دوستی تو صرف ہم ہی سے تھی۔'' عمران نے بتایا۔

''میرا مطلب ہے......'' یہی سوال میں نے ایک دوسرے زاویے سے کیا۔ ''وہ زیادہ تر کن لڑکوں کے ساتھ گھلنا ملنا پسند کرتا ہے؟''

''زیادہ تر......'' کامران نے سوچنے والے انداز میں کہا۔ ''میرے خیال میں اس کی جمیل اور منظور کے ساتھ زیادہ بنتی تھی۔''

''جی بالکل۔'' عمران نے اپنے بڑے بھائی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''جمیل اور منظور کے ساتھ وہ گپ شپ کر لیتا ہے کیونکہ ان دونوں کے مزاج بھولا سے بہت ملتے ہیں۔''

''مزاج ملتے ہیں......'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ میں سے کوئی جمیل اور منظور کو بلا کر یہاں لا سکتا ہے؟''

''جی ضرور۔'' عمران اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں ابھی انہیں بلا کر لاتا ہوں۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ عمران اگلے ہی لمحے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں کامران، ابراہیم اور شگفتہ کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگا۔ اس دوران میں اللہ رکھا کا بیٹا موسیٰ بھی زیرِ بحث آیا۔ ان تینوں

کی رائے میں موسیٰ ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا۔ موسیٰ کے بارے میں یہی رائے باقی گاؤں والوں کی بھی تھی لیکن ان سب میں سے کوئی یہ نہیں بتا سکا تھا کہ موسیٰ اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا اور اجنبی شخص کی لاش کو اللہ رکھا کے گھر کے سامنے کیوں پھینکا گیا تھا۔

"میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آ رہی ہے تھانے دار صاحب!" ابراہیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے فوراً پوچھ لیا۔ "کون سی بات ابراہیم؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰ بہت ہی شریف اور بیبا بندہ تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس گاؤں میں اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے، یہاں سے جانے کے بعد اس نے کسی کو اپنا دشمن بنا لیا ہو اور اسی دشمن نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔"

"ابراہیم......!" میں نے گھور کر اس ادھیڑ عمر، سادہ دل دیہاتی کی طرف دیکھا۔ "موسیٰ کو کسی نے موت کے گھاٹ نہیں اتارا۔ ہم اس وقت ایک اجنبی شخص کے قتل کی بات کر رہے ہیں۔"

"وہ جی...... میرا بھی وہی مطلب تھا، بس الفاظ آگے پیچھے ہو گئے۔" وہ جلدی سے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "میں یہ کہنا چاہ رہا تھا جناب کہ اس اجنبی بندے کی شکل صورت بڑی حد تک اللہ رکھا کے بیٹے موسیٰ جیسی ہے۔ ہو سکتا ہے، کسی دشمن نے موسیٰ سمجھ کر اس کا تعاقب کیا ہو اور پھر موقع ملتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش کو اللہ رکھا کے گھر کے سامنے پھینک دیا ہو تا کہ باپ کو بیٹے کی لاش کا تحفہ دے سکے۔"

"ایک اور بات بھی تو ہو سکتی ہے جناب......!" کامران نے کہا۔

"کون سی بات؟" میں نے پوچھا۔

"جس کسی نے بھی اس اجنبی شخص کو قتل کیا ہے وہ اسی کا دشمن ہو۔" کامران وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "قاتل کہیں پیچھے سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے کوٹ فرمان پہنچا ہو اور پھر موقع ملتے ہی اسے ٹھکانے لگا دیا ہو......"

"اور پھر اس کے بعد......؟" میں نے کامران کی طرف دیکھا۔

وہ بوکھلا گیا۔ "جی، میں سمجھا نہیں؟"

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اس کے بعد قاتل کہاں گیا؟"

"وہ جدھر سے آیا تھا، واپس ادھر ہی چلا گیا ہوگا۔"

"لیکن مقتول کے ساتھ تو تمہارا چچازاد بھولا یہاں آیا تھا؟" میں نے سوالیہ نظر سے کامران کی طرف دیکھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر فرید آباد سے یہاں تک آ گیا ہو......"

کامران نے اپنی دانست میں بہت عقل مندی کی بات کی تھی لیکن میں چونکہ بہت سی حقیقتوں سے آگاہی حاصل کر چکا تھا اس لیے اس کی عقل مندانہ بات مجھے ہضم نہ ہوئی اور میں نے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا برخوردار...... اور اس کی چند وجوہات ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ابراہیم اور شگفتہ کی نگاہیں بھی مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

"نمبر ایک...... میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش کے مطابق، اجنبی مقتول کو اس گاؤں میں کوئی جانتا یا پہچانتا نہیں لہٰذا اس کے ادھر رخ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......"

"جناب! ممکن ہے، اسے اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا ہو۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کشتی میں بیٹھ کر نہر کے اس پار آنے کا فیصلہ کر لیا ہو لیکن بدقسمتی سے قاتل بھی اس کے پیچھے یہاں پہنچ گیا ہو۔"

اس کی قطع کلامی کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے نرمی سے کہا۔ "پہلے میری بات مکمل ہو جانے دو پھر تم بولنا۔ ہو سکتا ہے پھر تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔"

وہ ندامت آمیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

"جب کوٹ فرمان میں مقتول کا کوئی جاننے والا موجود نہیں تو پھر کشتی کے ذریعے نہر پار کر کے یہاں تک آنے کی کوئی منطق نظر نہیں آتی۔" میں نے اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ اگر اس گاؤں میں آیا تھا تو اس کے پیش نظر کوئی خاص مقصد تھا۔ وہ بغیر کسی کام کے یہاں نہیں آ سکتا تھا......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس بات میں شک کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی کہ کل شام خادم حسین نے اپنی کشتی کے آخری پھیرے میں صرف دو افراد کو نہر عبور کرا کے کوٹ فرمان پہنچایا تھا یعنی اجنبی مقتول اور تمہارا چچازاد اسحاق عرف بھولا۔ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص کشتی پر سوار نہیں ہوا تھا لہٰذا قاتل کے تعاقب والی بات کو درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو کیا آپ بھولا پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں؟" شگفتہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"شک کرنا تو پولیس والوں کی گھٹی میں شامل ہوتا ہے بی بی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، یہ بات ٹھیک ہے کہ مجھے بھولا پر شک ہے لیکن اس شک کی نوعیت کا تعین میں اس وقت کر سکوں گا جب بھولا میرے ہاتھ چڑھے گا......" میں نے ایک بار پھر توقف کر کے باری باری ان سب کے چہروں کا جائزہ لیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یا تو بھولا ہی نے اس اجنبی شخص کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور یا پھر وہ اس کے قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔"

"بھولا ایسا نہیں کر سکتا......" شگفتہ اضطراری انداز میں بولی۔

ابراہیم نے کہا۔ "اس کی ذات کے حوالے سے اس قسم کی مجرمانہ شکایت کبھی سننے کو تو نہیں ملی۔"

"اماں اور ابا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔" کامران جذبات سے لبریز لہجے میں بولا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ بھولا کھیل میں بے ایمانی کرنے کا ماہر ہے لیکن کبھی اس نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔ اس کی سرگرمیاں مار پٹائی تک ہی محدود ہیں۔"

"جھوٹ بولنا یا بے ایمانی کرنا میرے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "باقی تمام برائیاں اسی کے پیٹ سے جنم لیتی ہیں۔ جو شخص جھوٹ بول سکتا ہے اور بڑی صفائی کے ساتھ بے ایمانی کر سکتا ہے وہ اس سے کہیں آگے بڑھ کر کوئی بھی سنگین جرم کر سکتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بھولا نے ہی اس اجنبی شخص کو قتل کیا ہے لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ بھولا اس قتل کے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ضرور جانتا ہے۔ میں بھولا سے اسی لیے بھی پہلی فرصت میں ملنا چاہتا ہوں کہ یہ بات وہی بتا سکتا ہے کہ اجنبی مقتول کے ساتھ اس کی ملاقات کب، کیوں اور کیسے ہوئی تھی۔ اگر وہ پہلے سے مقتول کو جانتا ہے تو پھر مجھے اس کیس کو حل کرنے میں کافی آسانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ جب مقتول کا پس منظر میرے سامنے کھلے گا تو قتل کا محرک اور قاتل تک رسائی کے راستے کی تمام رکاوٹیں خود بہ خود دور ہو جائیں گی اور اگر بھولا اجنبی شخص کو پہلے سے نہیں جانتا تو......" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے باری باری ان لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر بھولا کو بتانا پڑے گا کہ وہ ایک اجنبی کے ساتھ کیسے گھل مل گیا تھا۔ وہ ایک دوست کی حیثیت سے مقتول کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر کیوں اور کس مقصد سے کوٹ فرمان آیا تھا اور یہاں سے اچانک کہاں غائب ہو گیا۔"

"تھانے دار صاحب! سچ پوچھیں تو مجھے یقین ہی نہیں آرہا کہ بھولا پچھلی رات یہاں آیا تھا۔" کامران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کس بنا پر یقین نہیں آرہا؟"

"وہ جی، ظاہری سی بات ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ایسا کیسے ممکن ہے کہ بھولا کوٹ فرمان میں آئے اور ہم سے ملے بغیر ہی واپس چلا جائے......"

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "وہ واپس نہیں گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ابھی تک نہر عبور کر کے فرید آباد نہیں گیا۔"

شگفتہ نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! آپ فرید آباد پہنچ کر تفتیش کریں گے تو انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے شگفتہ۔" میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ "میں تو خود بھی اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا چاہتا ہوں لیکن پتا تو چلے کہ تم نے یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہی ہے۔"

"وہ جی، مجھے پکا یقین ہے، بھولا آپ کو یا تو اسمٰعیل کے ہوٹل پر ملے گا یا پھر گھر پر مل جائے گا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اس سے مل کر آپ کی تسلی ہو جائے گی کہ وہ نہ تو پچھلی رات کوٹ فرمان آیا تھا اور نہ ہی وہ قتل کی کسی واردات میں ملوث ہے۔"

یہ ایک چاچی بلکہ تائی کا اپنے بھتیجے پر یقین اور اعتماد تھا کہ وہ بھولے کو بے قصور اور بے گناہ سمجھ رہی تھی۔ میں جب تک بھولا سے ایک تفصیلی تفتیشی ملاقات نہ کر لیتا، اس وقت تک شگفتہ کے اعتماد اور یقین کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری جانب خادم حسین کا وثوقی بیان تھا۔ اس نے بھولا کی معیت میں اجنبی مقتول کو اپنی کشتی کے ذریعے نہر کے پار کوٹ فرمان میں پہنچایا تھا اور اس کے بیان کے مطابق آج دن بھر اس نے جتنے بھی پھیرے لگائے تھے، ان میں بھولا اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بھولا ابھی تک گاؤں کے اندر یا گاؤں کے باہر کہیں موجود تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق اس بڑی نہر پر میلوں دور تک کوئی پل نہیں بنا ہوا تھا لہٰذا کوٹ فرمان سے فرید آباد

جانے کے لیے کشتی ہی کے ذریعے سفر کرنا پڑتا تھا۔
ایک اور موہوم سا امکان بھی تھا کہ بھولا نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ میلوں دور تک چلا گیا ہو اور پھر کسی پل کے ذریعے نہر عبور کر کے، دوبارہ میلوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد واپس فرید آباد پہنچ گیا ہو۔ اس امکان کو زیرِ غور لانے کے لیے بھی بھولا کا تفصیلی انٹرویو بہت ضروری تھا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق اجنبی مقتول کی موت گزشتہ شب رات کے ابتدائی حصے میں واقع ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی کی حالت، چہرے اور گردن کے زخموں اور وہاں سے خارج ہونے والے خون کی کیفیت بتاتی تھی کہ اس بدنصیب کو رات سات اور نو کے درمیان کسی وقت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی گردن اور لباس کے مختلف حصوں پر جمنے والے خون سے یہی اندازہ ہوتا تھا اور یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی تھی کہ اسے قتل کے فوراً بعد اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے نہیں پھینکا گیا تھا۔ جس جگہ پر میں نے اس اجنبی شخص کی لاش کا معائنہ کیا تھا وہاں پر قتل و غارت گری کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا آثار بھی دریافت نہیں ہوسکا تھا۔
جب کسی بھی شخص کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے حتی المقدور کوشش ضرور کرتا ہے۔ یہ کوشش مزاحمت کی شکل میں بھی ہوسکتی تھی اور راہِ فرار کی صورت میں بھی۔ میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ وہاں راہِ فرار اختیار کرنے کے آثار بھی ناپید تھے۔ زمین پر قدموں کے ایسے نشانات کہیں بھی دکھائی نہیں دیے تھے جن کی مدد سے کہا جاسکتا ہو کہ وہاں دو یا دو سے زیادہ افراد کے بیچ کھینچا تانی اور پکڑ جکڑ یا گتھم گتھا ہوئی ہو۔
اگر مزاحمتی کوشش کو تفصیلی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس صورت میں، کسی بے رحم قاتل کے شکنجے میں پھنسا ہوا کوئی شخص اپنی جان کی سلامتی کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں کے ساتھ ہی اپنی زبان اور حلق کا بھی بے دریغ استعمال کرتا ہے یعنی ایک طرف تو وہ ہاتھ پاؤں سے اپنے دشمن کے وار روکنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسری جانب وہ چیخ چلا کر لوگوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے واویلا بھی مچاتا ہے۔
اگر اس اجنبی کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا تو پھر لازماً اس نے بھی خود کو بچانے کے لیے چیخ و پکار کی ہوگی۔ اگر اس نے اپنے بچاؤ کے لیے یہ حربہ آزمایا ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ گلی کے دروازے دھڑا دھڑ کھل نہ جاتے اور لوگ اس کی مدد کو نہ لپکتے۔ میں نے جتنے لوگوں سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی ان میں سے ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ انہوں نے رات میں کسی قسم کی کوئی آواز نہیں سنی۔ ان شواہد کی روشنی میں بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا تھا کہ اس بدقسمت شخص کو کسی اور مقام پر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور وہ بھی رات کے ابتدائی حصے میں اور پھر رات کے آخری حصے میں اس کی تشدد زدہ لاش کو لا کر اللہ رکھا کے گھر کے سامنے پھینک دیا گیا تھا۔
ہم اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ عمران واپس آگیا۔ وہ خالی نہیں آیا تھا بلکہ اپنے ساتھ وہ ان دو بندوں کو بھی لے کر آیا تھا جن کے ساتھ بھولا کی اچھی گپ شپ تھی۔ میرا اشارہ جمیل اور منظور کی جانب ہے۔
یہ دونوں بندے عمر کے لحاظ سے انیس بیس کے فرق سے کامران کے برابر ہی تھے۔ کامران نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ بلاوا لے کر جانے والے نے انہیں راستے میں اس ملاقات کے پس منظر سے تفصیلاً آگاہ کر دیا تھا۔
وہ دونوں سلام کر کے بیٹھ گئے۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہاں کسی قسم کا خوف و ہراس یا پریشانی نہیں پائی جاتی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی قسم کے جرم یا مجرمانہ کارروائی میں ملوث نہیں تھے۔
''میں نے تم دونوں کو ایک خاص مقصد کے لیے بلایا ہے۔'' میں نے کہا۔
وہ گہری سنجیدگی سے میری جانب متوجہ ہوگئے۔
''مجھے پتا چلا ہے کہ کامران اور عمران کا چچازاد بھائی اسحاق عرف بھولا تم دونوں کے ساتھ کافی کھلا ملا ہوا ہے۔'' میں نے بہ دستور ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
''ہاں جی...... یہ بات تو بالکل سچ ہے۔'' منظور نے کہا۔ ''بھولا کھیل کے معاملے میں گڑبڑ کر جاتا ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے۔''
''اس کے ساتھ ہمارا وقت ہنسی مذاق کرتے گزر جاتا ہے۔'' جمیل، منظور کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کافی دنوں سے اس نے ادھر کا چکر نہیں لگایا۔ مجھے اس کی یاد بہت ستاتی ہے لیکن......''
وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے پوچھا۔ ''لیکن کیا جمیل؟''
''وہ جی عمران نے راستے میں ہمیں بتایا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ کل شام بھولا ادھر آیا تھا اور ابھی تک ادھر کوٹ فرمان ہی میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔'' وہ اپنے ''لیکن'' کی

وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... یہ ایک حقیقت ہے۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس اس بات کے ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ بھولا کل شام کو اس شخص کے ساتھ خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان آیا تھا جسے رات کے کسی حصے میں بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔''

''جی...... اس شخص کی لاش ہم نے بھی دیکھی ہے۔'' منظور نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''مگر بھولا ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ نہ رات میں اور نہ ہی صبح سے لے کر اب تک......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''اگر وہ کوٹ فرمان آتا تو ہم سے ملے بغیر کیسے جا سکتا تھا۔''

''منظور بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے تھانے دار صاحب!'' کامران نے اپنے مشترکہ دوست کی تائید میں کہا۔ ''وہ اور کسی سے ملے یا نہ ملے لیکن ہم تو اس کے سگے رشتے دار ہیں۔ وہ ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔''

''تم کیا کہتے ہو جمیل؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، یہ لوگ غلط تو نہیں کہہ رہے۔'' جمیل الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''بھولا جب بھی ہمارے گاؤں آیا ہے، چند دن رہے بغیر واپس نہیں گیا اور یہ تو بالکل ہی ممکن نہیں کہ وہ ہم سے ملے بغیر ہی واپس چلا جائے مگر......''

''مگر'' پر پہنچ کر وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''مگر کیا جمیل؟''

''وہ جی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس بات کی کوئی اہمیت بھی ہے یا نہیں۔''

ابھی تک اس کے لہجے سے الجھن ٹپک رہی تھی۔ میں نے بہ دستور درشت انداز میں استفسار کیا۔ ''کسی بات کی اہمیت ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ میں خود کر لوں گا۔ تم بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا جناب......!''

''منہ سے کچھ بولو گے تو پتا چلے گا نا؟''

''کل رات مجھے بھولا کا مغالطہ ہوا تھا......!'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

میں چونک اٹھا اور جلدی سے پوچھا۔ ''بھولا کا مغالطہ...... کیا مطلب؟''

''میں کھیتوں کی طرف سے گاؤں کی جانب آ رہا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

نہر اور کوٹ فرمان نامی اس گاؤں کے بیچ کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جمیل نے معتدل انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''میں کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑے فاصلے پر بھولا جا رہا ہے......'' وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے آواز دی تو اس نے میری آواز پر کان نہیں دھرے اور آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے بہ آوازِ بلند اسے پکارا لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا......'' وہ چند لمحات کے لیے تھما، ایک آسودہ سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''شاید وہ کوئی اور تھا۔ اگر وہ بھولا ہوتا تو میری آواز پر پلٹ کر ضرور دیکھتا۔ رات کی تاریکی میں کسی اور کو میں نے بھولا سمجھ لیا تھا۔ بہرحال، وہ شخص کھیتوں میں غائب ہو گیا اور میں واپس گھر آ گیا۔''

جمیل کے اس سنسنی خیز بیان نے میرا کام آسان بنا دیا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ جمیل کو مغالطہ نہیں ہوا ہوگا۔ وہ بھولا ہی تھا لیکن چونکہ وہ کسی خفیہ مشن پر تھا اس لیے اس نے جمیل کی آواز پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ کوٹ فرمان میں اپنی موجودگی کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

''کیا تم مجھے وہ جگہ دکھا سکتے ہو جہاں پچھلی رات تم نے کسی ایسے شخص کو کھیتوں میں غائب ہوتے دیکھا تھا جسے تم بھولا سمجھ بیٹھے تھے؟'' میں نے جمیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ضرور۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ آئیں میرے ساتھ۔''

اگلے چند لمحات میں، میں جمیل کی معیت میں مذکورہ مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں گزشتہ شام اس نے بھولا کی جھلک دیکھی تھی۔ کوٹ فرمان نامی یہ گاؤں نہر کے کنارے سے کم و بیش نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ گاؤں اور نہر کے بیچ میں سرسبز لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ ایک جگہ پر رک کر جمیل نے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں نے وہاں سے بھولا کو جاتے دیکھا تھا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ نہیں گئی تاہم اس کے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول سے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بھولا ہے جبھی میں نے اسے آواز بھی دی تھی لیکن وہ

رکا نہیں۔‘‘

’’تم اس وقت کھیتوں سے گاؤں کی طرف جا رہے تھے؟‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

’’جی...... جی ہاں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’اور بھولا نہر کی طرف جا رہا تھا......!‘‘

’’پتا نہیں جناب، وہ بھولا تھا بھی یا نہیں۔‘‘ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ’’اگر وہ بھولا ہوتا تو میری آواز پر رکتا ضرور......‘‘

’’وہ جو کوئی بھی تھا، ہم اس پر بحث نہیں کر رہے۔‘‘ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’تم صرف یہ بتاؤ کہ جس شخص پر تمہیں بھولے کا گمان ہوا، وہ گاؤں کی طرف سے نہر کی جانب جا رہا تھا؟‘‘

’’جی...... بالکل ایسا ہی ہے۔‘‘ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

ملاح خادم مجھے بتا چکا تھا کہ اس نے گزشتہ روز آخری پھیرے میں بھولا اور اس اجنبی نوجوان کو فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچایا تھا جس کی تشدد شدہ لاش آج صبح اللہ رکھا کی دہلیز پر پڑی ملی تھی۔ خادم کے مطابق اس نے ان دونوں افراد کو ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان کوٹ فرمان پہنچایا تھا۔ یہ لگ بھگ مغرب کا وقت تھا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جمیل نے (اس کے گمان کے مطابق) بھولا کو گاؤں سے نکل کر نہر کی سمت جاتے دیکھا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بھولا محض اس اجنبی نوجوان مقتول کو کوٹ فرمان پہنچانے ہی آیا تھا لیکن یہاں پر ایک سوال ذہن کو الجھاتا تھا کہ بھولا کہاں غائب ہو گیا؟ میری ابتدائی تفتیش کے مطابق وہ کوٹ فرمان کے کسی گھر میں موجود نہیں تھا اور اس امر کا بھی کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا تھا کہ وہ کوٹ فرمان سے کہیں چلا گیا ہو حتیٰ کہ کوٹ فرمان میں کسی نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا، سوائے جمیل کے اور...... وہ بھی ایک مغالطے کی حالت میں۔ اگر یہ بھولا میرے ہتھے چڑھ جاتا تو اس معاملے کو بہ آسانی سلجھایا جا سکتا تھا۔ شام ہونے کو آ رہی تھی لہٰذا میں نے واپسی کا قصد کیا۔

فوری طور پر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ کل کسی کھوجی کے ساتھ دوبارہ ادھر کا رخ کروں گا۔ اگر بھولا اور اجنبی مقتول کا کھرا ہاتھ لگ جاتا تو پھر یہ پتا چلایا جا سکتا تھا کہ بھولا کہاں غائب ہوا ہے اور نامعلوم نوجوان کو کیا حادثہ پیش آیا ہوگا۔

میں نے واپسی کے سفر سے پہلے ابراہیم اور اس کے

دونوں بیٹوں کو خصوصی ہدایات دیں پھر خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر فرید آباد کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

میری معلومات کے مطابق بھولا کے والد چاچا اسمٰعیل کی دکان فرید آباد کے لاری اڈے پر تھی۔ تھانے کا رخ کرنے سے پہلے میں نے اسمٰعیل سے ملنا ضروری سمجھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ بھولا بھی چائے سگریٹ کی اس دکان پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

اسمٰعیل کی شکل بڑی حد تک اپنے بڑے بھائی ابراہیم سے ملتی جلتی تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اٹینشن ہو گیا پھر فدویانہ لہجے میں بولا۔

''ست بسم اللہ سرکار۔ حکم کریں، میں آپ کی کیا خدمت کروں؟''

''اسمٰعیل!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں خدمت کرانے نہیں آیا ہوں۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ امید ہے، تم مجھ سے بھرپور تعاون کرو گے۔''

''جی ضرور......'' وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ ''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے سرسری انداز میں استفسار کیا۔ ''تمہارا بیٹا بھولا کہیں نظر نہیں آرہا......''

''وہ جی اچھا نہیں لگ رہا...... آپ پہلی مرتبہ میری دکان پر آئے ہیں۔'' وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''چائے بالکل تیار ہے اور موسم بھی خاصا ٹھنڈا ہو رہا ہے......''

''ٹھیک ہے......'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ''ایک کپ چائے چلے گی۔''

اس نے جلدی سے مجھے چائے اور کیک پیس پیش کر دیے۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''اسمٰعیل! تمہارا بیٹا کدھر ہے؟''

''وہ تو جی یہاں نہیں ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

میری معلومات اور تحقیق کے مطابق اسے فرید آباد میں ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ حالات و واقعات کی روشنی میں وہ ابھی تک کوٹ فرمان ہی میں تھا۔ میں نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

''یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟''

''وہ جی جھنگ گیا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہ کب جھنگ گیا ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''اور وہاں وہ کیا کرنے گیا ہے؟''

میں توقع کر رہا تھا کہ وہ کہے گا، بھولا کل شام کو جھنگ گیا تھا لیکن اس کے جواب نے میری توقع کی ایسی کم تیسی پھیر دی۔

''وہ آج صبح جھنگ گیا ہے سرکار۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ وہاں اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہے۔''

''آج صبح......'' میں نے اسمٰعیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ پچھلی رات اپنے گھر پر ہی تھا؟''

''جی بالکل...... وہ گھر پر ہی تھا۔'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا پھر سوال کیا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ بھولا کے بارے میں اتنی چھان بین کیوں کر رہے ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟''

''پولیس اور خیریت ایک ساتھ کیسے چل سکتی ہیں؟'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''کچھ پتا تو چلے جناب، آخر معاملہ کیا ہے؟'' اس کی پریشانی دوچند ہو گئی۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ کیا۔ اس کے چہرے پر تفکر کے سائے لہرانے لگے۔ بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! یہ بات تو میرے علم میں آچکی ہے کہ ساتھ والے پنڈ میں قتل کی کوئی واردات ہو چکی ہے لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ایسے کسی معاملے میں بھولا کا ہاتھ ہو۔''

''ادھر کوٹ فرمان میں جس نوجوان کی لاش ملی ہے، وہاں کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی ہے۔'' میں نے واقعے کی روح بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ اجنبی نوجوان تمہارے بیٹے بھولا کی سنگت میں کل شام فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچا تھا۔ اس بات کا چشم دید گواہ خادم حسین ملاح ہے جس کی کشتی میں بیٹھ کر وہ نہر کے اس پار گئے تھے اور حالات یہ بتاتے ہیں کہ بھولا ابھی تک واپس نہیں آیا جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ گزشتہ رات وہ گھر پر موجود تھا اور آج صبح جھنگ کی طرف روانہ ہوا ہے۔''

''میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا جناب۔'' وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ کہیں گے تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''قسم چھوٹی ہو یا بڑی، اس کے کھانے یا پینے سے

بات نہیں بنے گی اسمٰعیل۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ قتل کا معاملہ ہے اور مقتول گزشتہ شام تمہارے بیٹے کے ہمراہ فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچا تھا۔ خادم حسین کے مطابق وہ دونوں دوستانہ ماحول میں ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کررہے تھے۔ اگر بھولا میرے ہاتھ لگ جائے تو اس کیس کو حل کرنا آسان ہوجائے گا۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا جناب......'' وہ مریل سی آواز میں بولا۔

''اچھا یہ بتاؤ...... کیا کل شام کے وقت بھولا یہاں دکان پر تمہارے ساتھ موجود تھا؟'' میں نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

''نن...... نہیں جی۔'' اس نے متذبذب انداز میں سر کو نفی میں جنبش دی پھر اگلے ہی لمحے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ بھولا ہر وقت میرے ساتھ دکان پر موجود نہیں ہوتا۔ وہ من موجی ہے سرکار...... اس کا جب دل چاہتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے میرا ہاتھ بٹانے ادھر آجاتا ہے ورنہ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔''

''ہوں......'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تو گزشتہ شام بھولا تمہارے ساتھ دکان پر موجود نہیں تھا اور تمہارا دعویٰ ہے کہ پچھلی رات کو وہ گھر پر ہی تھا۔ وہ آج صبح جھنگ گیا ہے اور کل واپس آئے گا؟''

''جی تھانے دار صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہی حقیقت ہے۔ میں نے آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔''

''اور اگر بعد میں کسی مرحلے پر مجھے پتا چلا کہ تم نے دانستہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کی ہے تو پھر مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہیں رکھنا اسمٰعیل!'' میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''جی بالکل!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میرا دل مطمئن ہے کہ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

میں نے اسمٰعیل کو چند ہدایات دیں اور وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے اس بات کی تاکید کردی۔

''بھولا جیسے ہی جھنگ سے واپس آئے، تم پہلی فرصت میں اسے لے کر میرے پاس تھانے آؤ گے۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا۔ جب میں تھانے پہنچا، ماحول پر تاریکی چھا چکی تھی اور ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ اسمٰعیل سے ہونے والی ملاقات نے اس معاملے کو سلجھانے کے بجائے مزید الجھا دیا تھا۔ اگر اسمٰعیل کسی نوعیت کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا تو پھر بھولا نے گزشتہ رات اپنے گھر پر گزاری تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ رات ہی میں کسی وقت نہر پار کرکے کوٹ فرمان سے فرید آباد آگیا تھا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کشتی کے بغیر اس نے نہر کو کیسے عبور کیا تھا؟ وہ نام کی نہر تھی مگر اس کا پاٹ کسی دریا سے کم نہیں تھا۔ اس سوال کا بہتر جواب خود بھولا ہی دے سکتا تھا اور ...... مجھے اس جواب کو حاصل کرنے کے لیے بھولا کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ میں نے تھانے پہنچ کر متعلقہ عملے کو ضروری ہدایات دیں پھر اپنے سرکاری کوارٹر میں چلا آیا جو تھانے کے پچھواڑے میں واقع تھا۔ آئندہ روز مجھے کسی کھوجی کے ساتھ دوبارہ کوٹ فرمان کا رخ کرنا تھا تاکہ نہر کے کنارے سے بھولا اور اس اجنبی نوجوان کا کھرا اٹھایا جاسکے۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ میں فجر کی نماز کے لیے بیدار ہوا تو گرج چمک کے ساتھ بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ رات کے آخری پہر میں بارش کا سلسلہ شروع ہوا تھا جو تاحال جاری تھا۔ اپنے کوارٹر کے تربتر صحن کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال ابھرا، وہ یہ تھا کہ اب کسی کھوجی یا کھرے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بارش نے زمین پر سے ہر قدم کے نشان کو مٹا دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے مایوسی کا احساس ہوا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے ذہن سے ہر قسم کے دل شکستہ خیالات کو جھٹک دیا، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر یہ مصلحت سردست انسان کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے اپنی سمجھ کا علاج کرانا چاہیے۔ میں مایوسی اور ناامیدی کو کفر کے خانے میں رکھتا ہوں۔

وقفے وقفے سے برسات کا سلسلہ جاری تھا کہ دوپہر ہوگئی۔ اس روز مطلع ابرآلود تھا۔ تاہم سورج آسمان پر دکھائی دے یا نہ دکھائی دے، دوپہر تو ہو ہی جایا کرتی ہے۔ دس فروری کی اس یخ بستہ دوپہر کے بعد سرکاری اسپتال سے پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آگئی۔ میں نے فوری مذکورہ رپورٹ کھول کر پڑھی۔ انگریزی کی تحریر میں کچھ اس نوعیت کا مضمون تھا۔

اس رپورٹ کی روشنی میں نامعلوم نوجوان کی موت آٹھ فروری کی شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع

ہوئی تھی۔ موت کا سبب اس بدقسمت کے سر پر لگنے والی وہ شدید چوٹیں تھیں جنہوں نے اس کی کھوپڑی کو چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ مقتول کے بدن کے مختلف حصوں پر بھی چوٹوں کے متعدد نشانات پائے گئے تھے۔ لاش کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ بیک وقت دو تین افراد نے لاٹھیوں کی مدد سے اس پر تابڑ توڑ حملے کیے تھے۔ حملے کی نوعیت بتاتی تھی کہ قاتل، مقتول کے لیے اپنے دلوں میں شدید ترین نفرت رکھتے تھے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی ایک پرچہ بھی منسلک تھا۔ وہ ایک تحریری رقعہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ پرچہ مقتول کے موزوں میں سے برآمد ہوا تھا۔ جب جائے وقوعہ پر میں نے مقتول کی لاش کا معائنہ کرتے ہوئے اس کی جامہ تلاشی لی تھی تو اس کی جرابوں کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ وہ جرابوں کے ساتھ تسموں والے بند جوتے پہنے ہوئے تھا۔ مذکورہ رقعے کی تحریر نہایت ہی مختصر مگر سنسنی خیز تھی...... اس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

''ماں! میں خیریت سے ہوں۔ بہت جلد آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔''

اس مختصر سی تحریر کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ ایک بیٹے نے اپنی ماں کو اپنی خیریت سے آگاہ کرتے ہوئے عنقریب ملاقات کی نوید سنائی تھی مگر کون بیٹا اور کون ماں؟ یہ دو نہایت ہی اہم سوال تھے۔ یہ رقعہ اجنبی مقتول کے موزوں میں سے برآمد ہوا تھا لہٰذا بیٹا وہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ کوٹ فرمان میں بسنے والوں میں سے کوئی بھی شخص مقتول کو پہچانتا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول کی ماں کوٹ فرمان میں نہیں رہتی تھی۔ ہاں البتہ یہ ہوسکتا تھا کہ مقتول کسی بیٹے کا رقعہ اس کی ماں کو پہنچانے کوٹ فرمان آیا تھا مگر کون ماں؟...... کس کی ماں......؟

اچانک میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور آپوں آپ میرا دھیان اللہ رکھا کی بیوی کرم بی بی کی طرف چلا گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اللہ رکھا اور کرم بی بی کا جوان بیٹا موسیٰ چار سال پہلے اچانک غائب ہوگیا تھا۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ اجنبی مقتول کو موسیٰ ہی نے کوٹ فرمان بھیجا ہو؟ لیکن شاید ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں نے گزشتہ روز موسیٰ کی گمشدگی کے حوالے سے اللہ رکھا اور کرم بی بی سے کرید کرید کر متعدد سوالات کیے تھے لیکن انہوں نے موسیٰ کے بارے میں اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا جبکہ مذکورہ رقعے کی تحریر بتاتی تھی کہ یہ بیٹا اپنی ماں سے رابطے میں تھا جبھی تو اس نے اپنی خیریت سے مطلع کرتے ہوئے جلد ملاقات کی امید دلائی تھی۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ یا تو اللہ رکھا اور اس کی بیوی نے موسیٰ کے حوالے سے کوئی بات مجھ سے چھپائی تھی اور یا پھر اس رقعے کا گمشدہ موسیٰ سے کوئی تعلق نہیں تھا...... تو کیا کوٹ فرمان کی کسی اور ماں کا بیٹا بھی اس سے بچھڑا ہوا تھا؟

مختلف نوعیت کے سوالات میرے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ میں نے سوچا، جیسے ہی بارش کے تسلسل میں تعطل واقع ہوگا، میں کوٹ فرمان کی جانب روانہ ہوجاؤں گا اس رقعے کی روشنی میں نئے زاویے سے تفتیش کو آگے بڑھانے کی کوشش کروں گا۔

بارش نے مجھے تھانے سے نکلنے کا موقع تو نہیں دیا البتہ سہ پہر کے وقت مجھے ایک کانسٹیبل نے اطلاع دی کہ اسمٰعیل چائے والا مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔ اس کے ساتھ بھولا بھی تھا۔ اسمٰعیل نے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں آپ کے حکم کے مطابق بھولا کو لے کر آپ کے پاس حاضر ہوگیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے چاچا! تم ذرا باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں بھولا کے ساتھ علیحدگی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

چند لمحات کے تذبذب کے بعد اسمٰعیل اٹھا اور میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے بھولا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''تم صرف نام ہی کے بھولا ہو یا عمل میں بھی بھولے بھالے ہو؟''

''جی...... میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔

''جب ٹرائل روم میں تمہاری چھترول ہوگی تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں کہا۔

وہ سہم کر امداد طلب نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''آٹھ فروری کی شام تم کہاں تھے؟''

''میں ادھر ہی تھا جی۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''فرید آباد میں۔''

''لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ آٹھ فروری کی شام تم کسی نوجوان کے ساتھ خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان گئے تھے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''وہ نوجوان کون تھا؟ اور تم کوٹ فرمان سے واپس کب اور کیسے آئے تھے؟''

''میں کسی اجنبی نوجوان کو نہیں جانتا۔'' وہ باغیانہ انداز میں بولا۔ ''میں کوٹ فرمان نہیں گیا۔ میں تو اس رات اپنے گھر میں تھا اور اگلی صبح یعنی نو فروری کو میں جھنگ چلا گیا تھا اور وہاں سے ابھی واپس آیا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' میں نے خونخوار نظر سے اسے گھورا۔ ''لہٰذا مجھے کوئی ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''آپ میری بات کا یقین کریں جناب۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''تمہارے سچ اور جھوٹ کا ٹیسٹ ڈرائنگ روم میں ہوگا بھولا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تم اس طرح نہیں مانو گے۔''

میں نے ایک اہلکار کو بلا کر بھولا کو اس کے حوالے کیا اور کہا۔ ''یہ صرف نام کا بھولا ہے۔ ذرا ڈرائنگ روم میں لے جا کر اسے ابتدائی ٹیسٹ سے گزارو تاکہ پتا چلایا جا سکے کہ اس بھولے کے اندر کون کون سے گن چھپے ہوئے ہیں۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ بھولا زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکا تھا۔ وہ ابتدائی لات جوتا کھانے کے بعد ہی شرافت کی زبان بولنے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔ پولیس اہلکار اسے واپس میرے پاس چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلا تو میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں بھولا! کچھ یاد آیا، وہ اجنبی نوجوان کون تھا جس کے ساتھ تم آٹھ فروری کی شام خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان گئے تھے؟''

''میں اس نوجوان کو نہیں جانتا جناب۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

''اگر تم اسے نہیں جانتے تو پھر اس کے ساتھ کوٹ فرمان کیوں گئے تھے؟'' میں نے کڑی نظر سے اسے گھورا۔ ''خادم حسین نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس نوجوان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر بات چیت کر رہے تھے جیسے اس کے ساتھ تمہاری برسوں کی یاری ہو؟''

''وہ سب کچھ میں نے گوگا پہلوان کے کہنے پر کیا تھا۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں لالچ میں آگیا تھا جناب۔''

''یہ گوگا پہلوان کون ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''اور اس نے تمہیں کون سا لالچ دیا تھا؟''

''گوگا پہلوان ادھر گکروالی میں رہتا ہے جناب۔'' وہ بتانے لگا۔ ''وہ صدیق پہلوان کا بیٹا ہے۔ مجھے کشتی اور کبڈی کے مقابلے دیکھنے کا بہت شوق ہے تھانے دار صاحب اور میں گوگا پہلوان کو بہت پسند کرتا ہوں اسی لیے میں نے آنکھیں بند کر کے اس کا کام کرنے کی حامی بھر لی۔ اس کام کے لیے گوگا نے مجھے پورے سو روپے دیے تھے۔''

''اور اس نے تمہیں کام کیا بتایا تھا؟'' بھولا سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے سوال کر دیا۔

''چند روز پہلے وہ مجھ سے علیحدگی میں ملا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کوٹ فرمان والے موسیٰ کو جانتا ہوں۔'' بھولا تفصیلات سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جواب دیا کہ میں موسیٰ کو نہیں جانتا۔ پھر اس نے مجھے موسیٰ کے قد کاٹھ اور حلیے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں لاری اڈے پر آنے والے مسافروں پر گہری نگاہ رکھوں۔ ایک دو دن میں موسیٰ یہاں پہنچے گا۔ وہ فرید پور سے کوٹ فرمان جائے گا۔ تم نے کسی طرح اس سے دوستی کرنا ہے۔ موسیٰ کی منزل کوٹ فرمان میں اللہ رکھا کا گھر ہے لیکن تم نے کسی طرح بہلا پھسلا کر اسے چودھری فیضان علی کے ڈیرے پر پہنچانا ہے۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم اور ہاں...... بات کے اختتام پر گوگا نے مجھے تنبیہ کی تھی کہ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے تمہیں کوئی کام سونپا ہے۔ میں نے اس سے رازداری کا وعدہ کیا اور گوگا نے سو روپے نکال کر مجھے دے دیے۔ یہ ہے ساری کہانی جناب۔''

''یہ ساری کہانی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔'' میں نے گہری نظر سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم نے آٹھ فروری کی شام موسیٰ کو چودھری فیضان علی کے ڈیرے پر پہنچا دیا تھا؟''

''جی بالکل، میں نے اپنا کام مکمل کر دیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''گوگا سے ملاقات کے بعد میں نے لاری اڈے کی ایک ایک بس اور ویگن سے اترنے والے مسافروں پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ پھر آٹھ فروری کی شام مجھے موسیٰ ایک ویگن سے اترتا دکھائی دیا تو میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کوٹ فرمان کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ بھی ادھر ہی جا رہا تھا۔ موسیٰ سے دوستی کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی لہٰذا ہم خادم حسین کی کشتی میں بات چیت کرتے ہوئے نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ موسیٰ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس علاقے میں اجنبی ہے اور اسے کسی اللہ رکھا کے گھر جانا ہے۔ اس بات نے میرا

کام آسان کردیا اور میں نے اس سے کہا کہ میں نے اللہ رکھا کا گھر دیکھا ہوا ہے لہٰذا میں بڑی آسانی سے موسیٰ کو بے وقوف بنا کر چودھری کے ڈیرے پر لے گیا تھا۔"

"تم جس نوجوان کو چودھری فیضان علی کے ڈیرے پر چھوڑ کر آئے تھے وہ موسیٰ نہیں تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "موسیٰ تو اللہ رکھا کا بیٹا تھا جو چار سال پہلے اچانک کہیں گم ہوگیا تھا۔ اگر تم موسیٰ کے چہرے سے آشنا ہوتے تو گوگا پہلوان کی سازش کا شکار نہ ہوتے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ چار سال پہلے کوٹ فرمان سے کوئی لڑکا غائب ہوگیا تھا لیکن میں موسیٰ کو شکل سے پہچانتا نہیں تھا اس لیے اس کے مغالطے میں کسی اور بندے کو میں نے چودھری کے ڈیرے پر پہنچا دیا تھا......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ابا نے مجھے بتایا ہے کہ اس اجنبی نوجوان کو کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

"تمہارے ابا نے بالکل ٹھیک بتایا ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اور اس بدنصیب شخص کو مقتل تک پہنچانے والے تم تھے......!"

"جناب! میں نہیں جانتا تھا کہ گوگا کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "میں سو روپے کے لالچ میں آگیا تھا۔ قتل کی اس واردات سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔"

"تمہارا قتل کے اس معاملے سے کتنا تعلق واسطہ ہے، یہ میں بہت جلد پتا چلا لوں گا۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "فی الحال یہ بتاؤ کہ تم آٹھ فروری کو واپس فرید آباد کیسے آئے تھے...... خادم حسین کی کشتی تو تمہیں میسر نہیں تھی؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "خادم حسین نے اپنے آخری پھیرے میں ہمیں کوٹ فرمان پہنچایا تھا اور مجھے رات کو ہر صورت واپس آنا تھا لہٰذا میں نے تیر کر نہر پار کرلی تھی۔"

"اوہ......!" میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ابراہیم کے بیٹے کامران و عمران اور ان کے دوستوں جمیل و منظور کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اسحاق عرف بھولا بہت اچھا تیراک بھی تھا۔ بہرحال، سردی کے موسم میں رات کے وقت تیر کر نہر پار کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

"بھولا! جب تک میں اس کیس کو حل نہیں کر لیتا تم سرکاری مہمان رہو گے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب جناب؟" وہ ہکا بکا ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔

"مطلب یہ کہ تمہیں تھانے کی حوالات میں قیام کرنا ہوگا۔" میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔

"لیکن میرا قصور کیا ہے جناب؟" وہ احتجاجی انداز میں مستفسر ہوا۔

"تمہارے قصور کا فیصلہ ایک آدھ دن میں ہو جائے گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "فی الحال اتنا سمجھ لو کہ گوگا نے تمہیں عقیدت کی مار ماری ہے......"

وہ حیرت اور فکرمندی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ "مجھ پر رحم کریں جناب۔"

"رحم ہی کر رہا ہوں جو حوالات میں بند کر رہا ہوں۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "ورنہ اب تک میں تمہیں پھانسی چڑھا چکا ہوتا۔"

وہ خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کیس کے دوسرے میرے ہاتھ میں آگئے تھے یعنی گوگا پہلوان آف گکروالی اور چودھری فیضان علی کا ڈیرا۔ بھولا کے مطابق اس نے مقتول کو موسیٰ کے مغالطے میں چودھری کے ڈیرے تک پہنچایا تھا۔ اگر میں محتاط روی سے پیش قدمی کرتا تو قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہ ہوتا۔

میں نے اسی وقت ایک اے ایس آئی اور دو کانسٹیبلو کی ایک ٹیم بنا کر موضع گکروالی روانہ کر دی۔ گکروالی، کوٹ فرمان کے جنوب میں سات میل کے فاصلے پر واقع ایک درمیانے سائز کا گاؤں تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو تختی سے یہ ہدایت کر دی تھی کہ ہر حال اور ہر قیمت پر گوگا پہلوان کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لانا ہے۔ میں نے خود ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور بارش کی پروا کیے بغیر چودھری فیضان علی کے ڈیرے کی سمت چل پڑا۔

☆☆☆

چودھری فیضان علی کا ڈیرا نہر اور گاؤں کے درمیان کھیتوں کے اندر بنا ہوا تھا۔ یہ کچی چھتوں والے تین کمروں پر مشتمل تھا جہاں پر مال مویشیوں کے علاوہ جانوروں کا چارا وزرعی آلات بھی موجود تھے۔ ڈیرے کا ایک کمرا چودھری کے ملازموں نے اپنی رہائش کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس ڈیرے پر طفیل اور مراد حسین نامی دو ملازم رہا کرتے

تھے لیکن جب میں وہاں پہنچا تو صرف مراد حسین وہاں موجود تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ میں نے خادم حسین کو ہدایت کردی تھی کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ نہر کے کنارے پر رک کر میرا انتظار کرے گا۔

مراد حسین مجھے ڈیرے پر دیکھ کر بوکھلا گیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں سے مراد حسین کی ''خاطر تواضع'' کی اور آٹھ فروری کی رات ڈیرے پر پیش آنے والے خونچکاں واقعے کے بارے میں استفسار کیا تو وہ ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔ میں نے اسے ہتھکڑی پہنا کر کانسٹیبل کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''تم سے باقی باتیں تھانے میں ہوں گی۔''

پھر میں ڈیرے کی تلاشی میں مصروف ہوگیا۔ یہ خانہ تلاشی جلد ہی رنگ لے آئی اور چارے والے کمرے میں مجھے دو لاٹھیاں مل گئیں۔ ان لاٹھیوں کے سروں پر جما ہوا خون بھی نظر آرہا تھا۔ جب میں نے خون آلود لاٹھیوں کا بہ غور جائزہ لیا تو وہاں چند بال بھی چپکے دکھائی دیے۔ یقیناً یہ خون اور بال اسی بدنصیب نوجوان کے تھے جس کی کھوپڑی پر یہ لاٹھیاں برسا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسی دوران میں مراد حسین کا ساتھی طفیل احمد بھی ڈیرے پر پہنچ گیا۔ میں نے فوراً سے پیشتر اسے بھی آہنی زیور پہنا دیا پھر میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آگیا۔

آلۂ قتل یعنی وہ خون آلود لاٹھیاں میرے ہاتھ لگ گئی تھیں لہٰذا طفیل اور مراد کی زبان کھلوانے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے چودھری فیضان علی کے ان دونوں ملازموں کو ایک سخت گیر حوالدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے صبح تک رزلٹ چاہیے......!''

''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔'' حوالدار نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں پوری رات ان کی، ایسی مکینکی کروں گا کہ صبح تک یہ کسی ٹیپ ریکارڈ کی طرح فرفر بولنے لگیں گے۔''

حوالدار نے جو کہا تھا وہ کر بھی دکھایا۔ اگلی صبح جب میں حسبِ معمول تیار ہوکر اپنے کمرے میں پہنچا تو حوالدار نے میرے پاس آکر یہ نوید سنائی۔

''ملک صاحب! دونوں ملزموں نے اس اجنبی نوجوان کے قتل کا اقرار کرلیا ہے۔ وہ اپنا اقبالی بیان لکھوانا چاہتے ہیں۔''

میں نے طفیل احمد اور مراد حسین کو اپنے پاس بلالیا۔ چودھری فیضان علی کے دونوں ملازموں نے اجنبی نوجوان کو موت کے گھاٹ اتارنے کا اقرار تو کرلیا تھا لیکن جب میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری اس بے چارے کے ساتھ کیا دشمنی تھی تو مراد حسین نے کہا۔

''ہم تو اس کو جانتے تک نہیں تھے۔ دوستی اور دشمنی کا کیا سوال۔''

''ہم نے یہ کام دولت کے لالچ میں گوگا پہلوان کے کہنے پر کیا ہے۔'' طفیل نے بتایا۔ ''اس نے ہمیں ایک ہزار روپے دیے تھے۔''

اس زمانے کے ایک ہزار روپے آج کل کے پانچ لاکھ سمجھ لیں۔ بھولا، مراد اور طفیل کے بیانات سے یہی ثابت ہورہا تھا کہ اس اجنبی نوجوان کا اصل دشمن گوگا پہلوان ہی تھا اور اس نے یہ کام کرائے کے قاتلوں سے کرایا تھا۔ گوگا میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجانا تھا۔

''تم لوگوں نے گوگا سے پوچھا نہیں کہ وہ بندہ ہے کون اور اسے کیوں موت کی نیند سلانا ہے؟'' میں نے ناپسندیدہ نظر سے باری باری ان کے چہروں کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''پوچھا تھا۔'' طفیل نے جواب دیا۔ ''اس نے کہا تھا، تم لوگ آم کھاؤ، پیڑ نہیں گنو۔ اگر پیڑ گننے میں لگ گئے تو پھر تمہارے پیٹ میں پیڑ ہوگی۔''

مراد بولا۔ ''میں نے گوگا سے اس بندے کی نشانی پوچھی تو اس نے مذکورہ بندے کا قد کاٹھ بتانے کے بعد کہا کہ وہ چاچا اسمٰعیل چائے والے کے لڑکے بھولا کے ساتھ ڈیرے پر آئے گا۔ بھولا اسے ڈیرے پر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کے بعد تم لوگوں نے اپنا کام کرنا ہے۔ میں نے گوگا سے بندے کا نام بھی پوچھا تھا مگر اس نے بتایا نہیں۔ بس اتنا کہا کہ...... ایک ہزار روپے پر نظر رکھو اور جو کہا جارہا ہے بس وہی کرو۔''

میں نے دونوں قاتلوں کو حوالات میں بند کردیا اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس اے ایس آئی کا انتظار کرنے لگا جو گوگا پہلوان کو لینے کھروالی گیا ہوا تھا۔ یہ گوگا بہت زیادہ پراسرار ثابت ہورہا تھا۔ ایک بار وہ میرے قابو میں آجاتا تو پھر میں اس کی ساری پراسراریت ناک کے راستے نکال کر رکھ دیتا۔

اگرچہ قاتل میری گرفت میں آچکے تھے لیکن ابھی تک مقتول کی شناخت نہیں ہوسکی تھی اور پھر دوپہر تک یہ

معاملہ بھی صاف ہوگیا۔ اے ایس آئی گکر والی سے گوگا پہلوان کو گرفتار کر کے لایا تو اس کیس کی گمشدہ کڑیاں آپس میں جڑ گئیں۔

گوگا پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ وہ بھولا، طفیل اور مراد کو تھانے کی حوالات میں دیکھ چکا تھا لہٰذا اس نے زبان کھولنے ہی میں اپنی عافیت جانی۔ اس کا حلفیہ بیان سنسنی خیز اور عبرت انگیز تھا۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

چار سال پہلے جب موسیٰ کوٹ فرمان سے غائب ہوا تو اس کے ٹھیک دس دن کے بعد صدیق پہلوان کی بیٹی اور گوگا پہلوان کی اکلوتی بہن بھی گکر والی سے غائب ہوگئی تھی۔ دونوں گاؤں میں اتنا فاصلہ تھا کہ کوئی ان دونوں کی گمشدگی کو ایک دوسرے کے ساتھ نہیں جوڑ سکا۔ صدیق پہلوان مخالفین کے طعنے برداشت نہ کرسکا اور ایک روز اس نے غیرت میں آکر خودکشی کرلی۔ کچھ عرصے کے بعد گوگا کی ماں بھی اپنی بیٹی رخسانہ کی جدائی میں آنسو بہا بہا کر اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب گوگا اکیلا رہ گیا تھا۔ ان کی اتنی زمین تھی کہ کسی کی محتاجی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلوانی کے ساتھ ساتھ اس نے رخسانہ کی تلاش کا کام بھی جاری رکھا اور بالآخر چار سال بعد وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ تب اسے پتا چلا کہ وہ موسیٰ کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ آج کل وہ لاہور کے علاقے اچھرہ میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے شادی کرلی تھی اور اس دوران میں ان کے دو بچے بھی ہوگئے تھے۔ موسیٰ فرنیچر مارکیٹ میں کام کرتا تھا۔ اس صورت حال میں گوگا نے موسیٰ سے بھیانک انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ اس کام کے لیے اس نے تین افراد بھولا، طفیل اور مراد کا انتخاب کیا تھا تاکہ اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے۔ وہ پیسا خرچ کر کے مطمئن ہوگیا تھا۔

اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے موسیٰ کو ایک خط ارسال کیا جو اس کی ماں کرم بی بی کی طرف سے تھا جس میں کرم بی بی نے اپنے ایک خواب کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ اسے موسیٰ کی رخسانہ سے شادی اور دو بچوں کی پیدائش کا علم ہوگیا ہے اور کرم بی بی (گوگا) نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ موسیٰ کے سارے دشمن اس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں لہٰذا ایک ماں کی التجا ہے کہ وہ ایک دن کے لیے کوٹ فرمان آکر اسے اپنی شکل دکھا جائے۔

گوگا کو یقین تھا کہ یہ خط ملتے ہی موسیٰ لاہور سے اپنی ماں کو ملنے کے لیے روانہ ہوجائے گا لیکن اس وقت ساری گڑبڑ ہوگئی جب موسیٰ نے اپنی جگہ اپنے ایک دوست حیدر کو گاؤں جانے کے لیے تیار کیا۔ حیدر اس کے ساتھ ہی فرنیچر کا کام کرتا تھا اور قدوقامت و جسامت میں اسی کے جیسا تھا۔ دراصل موسیٰ حیدر کے ذریعے پہلے کوٹ فرمان کے حالات و واقعات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ اپنے والدین سے ملنے گاؤں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے حیدر کو ماں کے نام یہ مختصر سا پیغام دے کر کوٹ فرمان روانہ کردیا۔ ”ماں! میں خیریت سے ہوں۔ بہت جلد آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔“

موسیٰ کی احتیاط پسندی اپنی جگہ درست تھی تاہم حیدر کی شامت اعمال یا بدبختی کہہ لیں کہ وہ قربانی کا بکرا ثابت ہوا۔ عین ممکن تھا کہ اگر حیدر کی جگہ موسیٰ خود آتا تو یہ حالات پیش نہ آتے لیکن تقدیر کے سامنے اگر مگر نہیں چلتے۔ نصیب میں جو رقم ہوتا ہے وہ ہوکر رہتا ہے۔

میں نے گوگا سے پوچھا۔ ”تم انتقام میں اتنے اندھے ہوگئے تھے کہ تم نے اپنی اکلوتی بہن اور اس کے دو ننھے منے بچوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچا؟“

”کیا رخسانہ نے گھر سے بھاگتے وقت ہمارے بارے میں، گھر کی عزت کے بارے میں کچھ سوچا تھا جو مجھے اس کا احساس ہوتا۔ اس کی بے غیرتی نے میرے ماں باپ کی جان لے لی۔ میں موسیٰ کو موت کے گھاٹ اتروا کر رخسانہ کو بے آسرا و بے سہارا چھوڑ دیتا لیکن اس بار بھی اس کمبخت کی قسمت نے ساتھ دیا ہے مگر......“

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔ ”مگر کیا؟“

”ایک بار میں قانون کی گرفت سے نکل جاؤں تو اس دفعہ میں کسی بھولا، مراد اور طفیل کا سہارا نہیں لوں گا بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے موسیٰ اور اس کے بیوی بچوں کو فنا کے گھاٹ اتاروں گا......“

گوگا پہلوان کے یہ دھمکی آمیز الفاظ میں نے اس کے بیان میں ریکارڈ کے طور پر شامل کرلیے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

گڑے مردوں کو اکھڑنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ماضی کا ایک سربستہ راز چار سال کے بعد اچانک کھل کر سامنے آگیا تھا تو مستقبل میں بھی بہت کچھ پیش آسکتا تھا...... بہت کچھ!

(تحریر: حسام بٹ)



سلیم انور

مسیحا

وہ ایک ایسا جراح تھا جسے اپنے پیشے سے عشق تھا اور عشق کی خاطر تو انسان کچھ بھی کرسکتا ہے۔ بشرطیہ کہ وہ سب کچھ اس کی نظر میں درست ہو۔ لہٰذا اس نے بھی بلا خوف وخطر وہی کیا جو اس کے پیشے کا تقاضا تھا لیکن کچھ فرائض انسانیت کے ناتے بھی اسے ادا کرنے تھے، سو کیے۔ مگر اس کے نتائج وہ نہ نکلے جو بہت سے لوگ چاہتے تھے۔

بال برابر فرق سے صحیح اور غلط کی پہچان کرنے والے مسیحا کا ماجرا

بوڑھے ڈاکٹر ویلش کو جب پہلی بار وہ آواز سنائی دی تو وہ یہی سمجھا کہ یہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ وہ سوتے میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ چکا تھا اور دوبارہ اس آواز کو سننے کی کوشش میں بیڈ پر تن کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اچانک اس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی جب اس نے وہ آواز دوبارہ سنی۔ اس مرتبہ اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ کسی نے داخلی دروازے پر تین مرتبہ زوردار دستک دی تھی۔

اس کے برابر میں سوئی ہوئی اس کی بیوی مائرا کی آنکھ

بھی کھل گئی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا بازو پکڑ لیا۔

''دستک کا جواب مت دینا، ویلش۔ جو کوئی بھی ہے شاید پلٹ جائے۔''

اتنے میں باہر بجلی کڑکی اور کمرا اچانک نیلی سفید روشنی میں نہا گیا۔ یہ چمک ایک لمحے کی تھی اور اسی ایک لمحے میں ڈاکٹر نے اپنی بیوی کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے۔ اس کا چہرہ زرد، خوف زدہ اور عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔

''جواب دینا ہوگا، مائرا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شدید بیمار ہو۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

بادلوں کی گڑگڑاہٹ پھر سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے ایک بار پھر تین مرتبہ زوردار دستک دی۔

ڈاکٹر ویلش اکتائے ہوئے انداز میں بیڈ سے نیچے اترا، پاؤں میں سلیپرز پہنے اور گاؤن اٹھالیا۔ اس کی کمر میں درد ہورہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے کنٹری ڈاکٹر کے بجائے وکیل یا پلمبر بننے کو ترجیح کیوں نہیں دی۔ وہ گاؤن پہن کر لڑکھڑاتے قدموں سے ویٹنگ روم سے ہوتا ہوا داخلی دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

اتنے میں دروازے پر ایک بار پھر تین مرتبہ زوردار دستک ہوئی۔

''آل رائٹ، آل رائٹ! میں آرہا ہوں۔ اپنے منہ زور گھوڑوں کی لگامیں تھام کر رکھو۔'' اس نے چھوٹے وال لیمپ کا سوئچ آن کرتے ہوئے بلند آواز سے جواب دیا اور دروازہ کھول دیا۔

باہر زوردار بارش ہورہی تھی۔ ہوا کے زوردار سرد جھکڑوں اور بارش کے تھپیڑوں نے بوڑھے ڈاکٹر کے چہرے اور بدن پر کپکپی سی طاری کردی۔ وہ آنکھیں پھاڑے ان دو آدمیوں کو دیکھنے لگا جو دروازے کی دہلیز پر کھڑے تھے۔

''ڈاکٹر ویلش؟'' ان میں سے دراز قامت نے کہا جس کی آنکھیں بے بھروسا لگ رہی تھیں۔

''میں ہی ہوں۔'' ڈاکٹر نے دروازے کو قدرے وا کرتے ہوئے کہا۔

''ہم تمہارے لیے چھوٹا سا کام لائے ہیں، ڈاکٹر۔ تمہیں چھوٹی سی سرجری کرنی ہوگی۔'' اسی دراز قامت نے کہا۔

''سوری، میں سرجن نہیں ہوں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں، پیٹ کا درد اور بچوں کے امراض میرا خاصہ ہیں۔ تم لوگوں کو سرجری کے لیے ڈاکٹر بنجامن کے پاس ٹاؤن میں جانا پڑے گا۔ وہ سرجن ہے۔'' ڈاکٹر ویلش نے اپنے خاکستری بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کرنا چاہا۔

''اب تم ہی سرجن ہو، ڈاکٹر!''

تب ڈاکٹر ویلش کی نگاہ دراز قامت کے ہاتھ میں دبے ہوئے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور پر پڑی جس کی چمک دار نیلی نال ڈاکٹر ویلش کے پیٹ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھی اور اس کے دستے پر دراز قامت کی گرفت مضبوط تھی۔ ان دونوں نے ریوالور کے زور پر زبردستی دروازہ کھلوا لیا۔

''ایک اچھے پیارے ڈاکٹر کی طرح برتاؤ کرو تو تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر اسمارٹ بننے کی کوشش کی تو ہم تمہیں اڑا کر رکھ دیں گے...... اوکے؟''

ڈاکٹر خاموش رہا۔ پھر وہ دراز قامت اپنے پستہ قد ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ''فیلکس! جاؤ مریض کو لے آؤ۔''

اس کا ساتھی فیلکس باہر کھڑی کار کی طرف چلا گیا۔ ڈاکٹر ویلش ہال وے کی مدھم روشنی میں پیچھے آگیا اور دراز قامت کا جائزہ لینے لگا جس کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ہاتھ میں تنے ہوئے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور سے نہیں ہٹی تھیں اور وہ ڈاکٹر کی جانب سے قطعی غافل نہیں تھا۔

وہ پلمبر کیوں نہیں بنا...... ڈاکٹر سوچنے لگا۔ پلمبروں کو رات کے تین بجے بھی پیٹ میں ریوالور کی نال کھبو کر جگایا نہیں جاتا۔ انہیں پائپوں کے علاوہ کسی اور شے کی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

پھر ڈاکٹر ویلش نے راہداری میں آتے ہوئے فیلکس اور مریض کی جانب گھوم کر دیکھا۔ فیلکس اپنی سانسیں درست کرنے کے لیے چند ساعت کے لیے وہاں رک گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں بازو، مریض کے سینے کے گرد لپیٹ لیے اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ وہ بہ مشکل تمام اس مریض کو جو بظاہر بے ہوش لگ رہا تھا، گھسیٹتا ہوا ہال وے میں لے آیا۔ اس کے پیچھے فرش پر بچھے ہوئے پھول دار قالین پر بارش کے پانی اور خون کے قطروں کی لکیر بنتی چلی آرہی تھی۔

دراز قامت نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کردیا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور بدستور تھاما ہوا تھا اور اس کی نال ڈاکٹر کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

''اوکے ڈاکٹر...... ہمیں سرجری میں لے چلو اور کسی قسم کی چالبازی مت کرنا۔''

''تم لوگ سزا سے نہیں بچ سکو گے۔''

''تلقین کی ضرورت نہیں، ڈاکٹر۔ آگے بڑھو۔''

ڈاکٹر نے قدرے تذبذب کیا پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کے پاس ان کے حکم کی تعمیل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تو وہ سفید پینل والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئے جو گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور اس میں ایتھر کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔ اور تب ہی ڈاکٹر کے ذہن میں ایک آئیڈیا ابھرا۔

''کم آن ڈاکٹر...... لائٹ تو جلالو!''

''مجھے سوئچ تو تلاش کرنے دو۔ تم سے ذرا سا صبر بھی نہیں ہوسکتا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

پھر وہ کمرے کے دوسرے سرے پر دیوار گیر الماری نما خانوں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں پر ایک خانے میں کنسنٹریٹڈ امونیا کا جگ رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ لائٹ آن کرنے سے قبل اگر وہ جگ اس کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو وہ امونیا ان کے چہروں پر اچھال کر انہیں وقتی طور پر اندھا کردے گا اور چند سیکنڈ کے لیے ان کا دم گھٹ جائے گا۔

اور ڈاکٹر کو بھی صرف چند سیکنڈ کی مہلت درکار تھی۔

تب وہ ان پر دیگر چیزیں پھینکنا شروع کردے گا۔ کرسی، مزید جگ اور بوتلیں وغیرہ۔ پھر کسی نہ کسی طرح ان کے ریوالور پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ انہیں بتادے گا کہ بوڑھا، موٹا اور رحم دل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کسی کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔

پھر وہ تقریباً دبے پاؤں آہستگی سے چلتا ہوا کیبنٹ تک جا پہنچا۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر جگ کو ٹٹولا اور اس کے دستے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر اس کے ڈھکن کو گھما کر کھولنے لگا۔

اچانک کمرے کا سکوت ایک گھٹی گھٹی چیخ نے توڑ دیا۔ وہ تیزی سے گھوم گیا۔ اسے دروازے پر مائرا کا ہیولا دکھائی دیا۔

''او کے لیڈی، جہاں ہو وہیں کھڑی رہو۔'' دراز قامت نے کہا پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''کم آن ڈاکٹر...... لائٹ آن کردو۔''

اب بہادری دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں، ڈاکٹر نے سوچا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ مائرا کو کسی قسم کا نقصان پہنچائیں۔ اب اسے وہی کرنا چاہیے جیسا کہ وہ کہہ رہے ہیں۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کی زندگیاں بچ جائیں۔ وہ دل ہی دل میں مائرا کو کوسنے لگا کہ وہ خوامخواہ اس منظر میں آن کودی اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ پھر ڈاکٹر نے لائٹ کا بٹن دبا دیا۔

''آل رائٹ لیڈی۔ ادھر ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ۔'' دراز قامت نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے کہا۔

تب مائرا کی نگاہ دراز قامت کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور پر پڑی تو اس نے خوف زدہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

''کم آن، جلدی کرو۔''

''بہتر ہوگا جیسا یہ کہہ رہے ہیں، وہی کرو مائرا۔''

مائرا چھوٹے تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے دلاسا دیا۔

فیلکس اور اس کا ساتھی اپنے دوست کو جو بدستور بے ہوشی کے عالم میں تھا، گھسیٹتے ہوئے کمرے کے وسط میں موجود ٹیبل کے پاس لے آئے اور اسے اٹھا کر ٹیبل پر لٹا دیا۔

''آل رائٹ ڈاکٹر۔ آپریٹ کرو۔''

ڈاکٹر ویلش نے ایک نگاہ اپنی بیوی پر ڈالی۔ مائرا کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹ بھی کپکپا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے اس کی کمر تھپتھپائی اور قدرے ہچکچاتے ہوئے ٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔

اس نے ٹیبل پر موجود شخص کا بصری معائنہ کیا اور پھر چند ہی سیکنڈ میں صورتِ حال بھانپ لی۔

"سنو، لگتا ہے تم لوگوں نے اسے یہاں لانے میں دیر کردی ہے، لڑکو! تمہارا ساتھی مرچکا ہے۔"

"تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔" دراز قامت نے کہا۔ اس کی سیاہ آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

"تم آپریٹ کرو، ڈاکٹر۔"

"آپریٹ؟ وہ کس لیے؟ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ شخص مرچکا ہے۔"

"جیسا میں کہہ رہا ہوں وہی کرو ڈاکٹر۔ اسے چیر دو۔"

ڈاکٹر یہ سن کر الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دراز قامت کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ کیا یہ لوگ پاگل تو نہیں ہیں؟" ڈاکٹر سوچنے لگا۔

"فیلکس! بہتر ہوگا کہ تم ڈاکٹر کو وضاحت سے سمجھا دو۔" دراز قامت نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "اسے بتادو کہ اسے کیا کرنا ہے۔"

پستہ قد فیلکس ڈاکٹر کے قریب آگیا اور اپنا ریوالور اس مردہ شخص کی جانب لہراتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے کہ ہمارے دوست کے معدے میں کوئی تکلیف ہو رہی تھی، ڈاکٹر۔ اس نے کچھ ہیرے نگل لیے تھے جو اسے نگلنے نہیں چاہیے تھے۔"

ڈاکٹر ویلش اب بھی معاملے کو سمجھ نہیں پایا۔

"وہ سرحد پر واقع دریا پار کر کے پڑوسی ملک جانے کا ارادہ رکھتا تھا...... ان تمام ہیروں کے ساتھ جو اس کے پیٹ میں موجود تھے۔ ہم نے بس ایک گولی اس کی پیٹھ میں اتار دی اور اس سے سچ اگلوالیا۔ اب تم اسے چیر دو، ڈاکٹر۔ وہ ہیرے پلاسٹک کی کوٹنگ میں ہیں۔ وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔"

تب اچانک ڈاکٹر ویلش پر پوری بات واضح ہوگئی۔ وہ اس سہ پہر ٹاؤن گیا تھا تو کافی کا ایک کپ پینے کے لیے ڈیفل شاپ پر رک گیا تھا۔ وہاں اس کا سامنا شیرف سے ہوا تھا جو اپنی پسندیدہ ڈش کھانے وہاں آیا ہوا تھا۔ اس وقت بات ڈاکٹر کے سر پر سے گزر گئی تھی لیکن اب اسے وہ بات یاد آگئی تھی۔ شیرف نے جیولری اسٹور میں ایک بڑی ڈکیتی کی واردات کا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تین افراد تیس لاکھ ڈالرز مالیت کے ہیرے چھین کر لے گئے ہیں۔

تو پھر یہ تینوں وہی ڈاکو ہیں جنہیں پوری ریاست میں تلاش کیا جارہا ہے، ڈاکٹر نے دل ہی دل میں کہا۔

ڈاکٹر میز کی طرف گھوم گیا اور مردہ شخص پر نظریں جمادیں۔ لگتا ہے کہ اس شخص نے عیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے بقیہ دو ساتھیوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ہیروں پر کسی قسم کی پلاسٹک کی کوٹنگ چڑھادی تھی اور انہیں ایک ایک کر کے نگل لیا تھا۔ اس کا ارادہ تن تنہا سرحد پار میکسیکو فرار ہونے کا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھی زیادہ ہوشیار نکلے اور انہوں نے اسے مار ڈالا۔

"او کے ڈاکٹر! ہمارے پاس پوری رات کا وقت نہیں ہے۔ اسے چیر ڈالو!" دراز قامت گرجا۔

"فرض کرو اگر میں انکار کردوں تو؟"

"فرض کرو اگر تم انکار کرتے ہو تو......!" دراز قامت کے ہونٹوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ زہر خند ہنسی کے ساتھ اپنا ریوالور مائرا کی سمت لہرانے لگا۔

ڈاکٹر نے اس کا حکم ماننے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس نے ایک ریک پر سے اپنا سفید لیبارٹری کوٹ اتارا اور اسے پہن کر ٹیبل کے پاس چلا گیا۔ اس نے مردہ شخص کی قمیص اور بنیان کاٹ کر اس کے بدن سے الگ کردی۔ پھر اس کی پتلون نیچے کھسکا کر اس کے جسم کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

وہ دونوں ڈاکو پیچھے کھسک کر دیوار کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ انہیں چیر پھاڑ دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں میں ربر کے دستانے چڑھا لیے، پھر سنک کے پاس لگے ہوئے ایک کیبنٹ کے پاس چلا گیا اور ان اوزاروں کو نکالنے لگا جن کی ضرورت اسے پیش آسکتی تھی۔

لاش کے پاس پلٹ کر اس نے قدرے توقف کیا۔ اسٹین لیس اسٹیل کا چمکدار تیز دھار نشتر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک بار پھر نظریں گھما کر ان دونوں ڈاکوؤں کی طرف دیکھا جو دیوار کے پاس سائے میں کھڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر کو اپنی جانب متوجہ پا کر دراز قامت چیخ پڑا۔

"چیر ڈالو ڈاکٹر!"

تب ڈاکٹر ویلش نے اپنا کام شروع کردیا۔

لینن کیبنٹ کے برابر میں لگی ہوئی گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں...... پانچ...... دس...... پندرہ منٹ......

اور پھر ڈاکٹر ویلش نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک اطمینان تھا جو اپنا پیشہ ورانہ فرض تندہی سے سرانجام دینے پر کسی بھی ڈاکٹر کو مل سکتا......... ہے۔ وہ مردہ شخص کا پیٹ چاک کر چکا تھا اور اسے وہ مل گیا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔

"ڈاکٹر! میری انگلیوں میں کھجلی ہو رہی ہے۔ ان قیمتی پتھروں کو نکالنا شروع کر دو...... اور جلدی کرو۔"

ڈاکٹر نے چمٹیوں اور مونچے کی مدد سے گیلے پتھروں کو باری باری نکالنا شروع کر دیا۔ پھر احتیاط کے ساتھ ان پتھروں کو ایک بڑے سے گلاس کے ٹکڑے پر رکھنے لگا۔

اسے آخری پتھر چننے میں دس منٹ لگ گئے۔ گلاس پر موجود ان پتھروں کی تعداد پندرہ سے بیس کے درمیان تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی نگاہیں ان پتھروں پر جماتے ہوئے کہا۔ "تمام کے تمام بس یہی ہیں۔"

"آل رائٹ ڈاکٹر۔ اب تم ان پر سے پلاسٹک کوٹنگ علیحدہ کر دو۔" دراز قامت نے کہا۔

ڈاکٹر ایک طویل لمحے تک خاموش کھڑا رہا۔

"کام شروع کرو، ڈاکٹر!"

"اس پلاسٹک کوٹنگ کو اتارنے کے لیے تمہیں ایک گلا دینے والے محلول کی ضرورت ہے۔ میں اس کا نام لکھ دیتا ہوں۔ اس سے کوٹنگ اتر جائے گی۔" ڈاکٹر نے یہ کہہ کر قدرے توقف کیا۔ "لیکن وہ محلول اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔

تب ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ ڈاکٹر نے دراز قامت کے تیور بھانپتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ "وہ محلول تمہیں کسی بھی پرچون اسٹور سے مل جائے گا۔"

"پھر کیا کرنا ہوگا؟"

"ویل، ان ہیروں کو محلول والے پین میں ڈال دینا اور اس محلول کو پانچ منٹ تک ابلنے دینا۔ اس طرح پلاسٹک کوٹنگ علیحدہ ہو جائے گی اور ہیروں کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔"

وہ دونوں افراد ٹیبل پر پڑی اپنے ساتھی کی لاش سے نظریں چرا رہے تھے۔ دراز قامت کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس نے گلاس کو دبوچ کر اس کا ایک بنڈل سا بنایا اور اسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر بوڑھے ڈاکٹر کی جانب پلٹ گیا۔

"تم نے نہایت عمدہ کام کیا ہے، ڈاکٹر! اور تم پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ ہم تمہارے کام کی کتنی ستائش کرتے ہیں تو یہ لیں......"

ساتھ ہی اس نے اپنے ریوالور کے دستے سے اچانک ڈاکٹر کے منہ پر ایک ضرب لگا دی۔ ڈاکٹر چاروں خانے چت فرش پر گر پڑا۔ مائرا کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ اپنے شوہر کی جانب دوڑ پڑی۔

"او کے ڈاکٹر!" دراز قامت نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کو تھپتھپاتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔ "ونڈر فل سرجن!"

اور پھر وہ دونوں ڈاکو قہقہے لگاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

ڈاکٹر ویلش اس وقت تک کچھ نہیں بولا جب تک اس کے کانوں میں ان ڈاکوؤں کی کار کے اسٹارٹ ہونے اور کنٹری لین کی پتھریلی سڑک پر دوڑنے کی آواز بتدریج معدوم نہیں ہو گئی۔

پھر اس نے سر اٹھا کر اپنی بیوی مائرا کی طرف دیکھا۔ مائرا پریشان نظروں سے خون کی اس بوند کو دیکھ رہی تھی جو ڈاکٹر کے زخمی ہونٹوں سے بہتی ہوئی دھیرے دھیرے اس کی ٹھوڑی تک آ چکی تھی۔ اس کے باوجود ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔

پھر یہ مسکراہٹ ایک قہقہے میں بدل گئی۔

"جانتی ہو، مائرا۔ میں ان ڈاکوؤں کے چہرے کے تاثرات اس وقت دیکھنے کا متمنی ہوں جب وہ ان پتھریوں کو ہیرے سمجھ کر غیر قانونی طور پر فروخت کرنے کی کوشش کریں گے۔ جاؤ شیرف کو فون کر دو کہ وہ یہاں آ جائے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟" مائرا نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹیبل پر پڑی اس لاش کے پتے میں اتنی تعداد میں پتھریاں موجود تھیں کہ کسی بھی دریائی کشتی کو لنگر انداز کرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھیں۔ میں نے اصلی ہیروں کی جگہ اس لاش کے اندر سے پتے کی پتھریاں نکال کر گلاس پر اکٹھا کر دی تھیں۔ ویل، مجھے ایسی نظروں سے مت گھورو۔ شیرف کو فون کرو اور اسے بتا دو کہ ڈاکوؤں کے لوٹے ہوئے تمام کے تمام ہیرے ہمارے پاس موجود ہیں اور پھر چھوٹا خستہ کیک بھی بنا لو۔ شیرف خستہ کیک کا دیوانہ ہے۔"



محفلِ شعروسخن

❄ ماریہ چودھری......پاکپتن
سمجھدار ہی کرتے ہیں اکثر غلطیاں دلنشیں
کبھی دیکھا ہے کسی پاگل کو عشق کرتے؟

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......ہارون آباد
کس وجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کرسکے
مایوسیوں نے چھین لیے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کے ساماں نہ کرسکے

❄ محمد ابرار حسین تسیمی......جھنگ
منزلیں کسی کے گھر حاضری نہیں دیتیں
راستوں پہ چلنے سے راستے نکلتے ہیں

❄ معاویہ مغل......ایبٹ آباد
کلیاں چٹخ رہی ہیں آج کل
لگتا ہے کھل کر مسکرایا ہوگا وہ

❄ ملائکہ حریم......اوکاڑہ
اگر ہوتا ہے اتفاق تو، یہ کیوں نہیں ہوتا
وہ راستہ بھولے اور مجھ تک چلا آئے

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
اک نظر ڈال کبھی میرے مسیحا مجھ پہ
تیرا کیا جائے گا بیمار کو اچھا کرکے
میں بہت جلد بھنور میں یاد آؤں گا تجھے
اتنا خوش باش نہ رہ مجھ سے کنارہ کرکے

❄ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ
اجالا بن کے آجاؤ مرے تاریک لمحوں میں
کہ ترے بن سبھی خوشیاں مجھے غمگین لگتی ہیں

❄ سید محی الدین اشفاق......فتح پور، لیہ
اس کے نزدیک غمِ ترکِ وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ، جیسے ہوا کچھ بھی نہیں
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
وہ سمجھتا ہے مجھے اس سے گلہ کچھ بھی نہیں

❄ اشفاق شاہین......کراچی
اس کے سوا تو میں دو پل کسی کو نہ دوں
دل تو بہت دور کی بات ہے

❄ داؤد اشفاق......اوکاڑہ
ہماری روح پہ جب بھی عذاب اتریں گے
تمہاری یاد کو اس دل کی ڈھال ہونا ہے

❄ جاوید اختر رانا......پاک پتن شریف
ہمت التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی
اک تیری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

❄ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
وفا کی آس اسی یارِ بے وفا سے ہے
بدن ہے راکھ مگر دوستی ہوا سے ہے

❋ احسان سحر......میانوالی
سرِعام محبت کا اعلان کیا ہے
تیرے نام اپنا یہ دیوان کیا ہے
بن سنور کے بڑے اہتمام کے ساتھ
دل نے تیری یاد کو مہمان کیا ہے

❋ معراج محبوب عباسی......ہری پور، ہزارہ
ضدی، وحشی، الھڑ، چنچل، میٹھے لوگ، رسیلے لوگ
ہونٹ ان کے غزلوں کے مصرعے، آنکھوں میں افسانے تھے
وحشت کا عنوان ہماری، ان میں سے جو نار تھہری
دیکھیں گے لوگ تو کہیں گے، انشاء جی دیوانے تھے

❋ عبدالجبار رومی انصاری......چوہنگ، لاہور
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

❋ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال
بہت مشکل سے ہوتی ہے تجارت تیری یادوں کی
منافع کم سہی لیکن گزارہ ہو ہی جاتا ہے

❋ ڈاکٹر ظفر اسلام......مظفر گڑھ
تیری الفت کی راہوں میں لٹا دی زندگی میں نے
دل وجاں سے لوٹنے والے تو کتنا بے وفا نکلا

❋ ایم یوسف......نور پور
میرے ہاتھ کی لکیروں میں یہ عیب چھپا ہے محسن
میں جس شخص کو چھو لوں وہ میرا نہیں ہوتا

❋ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
پھر جھیل سی آنکھوں کی پلکوں کو اٹھاتا ہے
ٹھہرے ہوئے پانی میں اک آگ لگاتا ہے
اس پار بھی چاہو تو رہ رہ کے مہک لینا
اب صحن میں پھولوں کی دیوار اٹھاتا ہے

❋ عذرا ہاشمی......گڑھ موڑ
خود سے فرصت ہی میسر نہیں آئی ورنہ
ہم کسی اور کے ہوتے تو تمہارے ہوتے

❋ ظفر اقبال ظفر......کامرہ شرقی
ڈھانچوں کے اک ڈھیر کی گنتی سے کیا فائدہ
کیوں ہو رہی ہیں شہر میں مردم شماریاں

❋ اطہر حسین......کراچی
یہ تو بات الگ ہے پھول اور خوشبو سے بھر جاؤ گے
لیکن اب کے عشق کیا تو جیتے جی مر جاؤ گے
لوگ تو چھپ چھپ کر بیٹھے ہیں روزن و در سب بند کیے
دھڑکن کی آواز کے پیچھے اب کس کے گھر جاؤ گے

❋ احمد جہانزیب......میانوالی
وہ جو ملزم تھا ہر اک عشق میں سچا نکلا
اس پہ الزام لگا حسن سے غداری کا
منصب دار پہ فائز ہو تو کچھ بات بنے
تاج ہم بھی اسے پہنائیں گے سرداری کا

❋ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
یہ کائنات سمٹ جائے تو وفا کی قسم
تمہارے نقشِ کفِ پا سے کچھ زیادہ نہیں
یہ آسماں و زمیں اوڑھ کر بھی دیکھوں اگر
تو ماں کی گود سے بڑھ کر کوئی لبادہ نہیں

❋ شیخ خرم ریاض......دہلی چوک، لاہور کینٹ
ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

❋ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
ان کی فطرت ہے کہ مجھ کو بھول جاتے ہیں مگر
میری عادت ہے کہ ان کو یاد کر لیتا ہوں میں

❋ ریاض بٹ......حسن ابدال
تم رنگ ہو خوشبو ہو، دھیان سے رہنا
صحرائے محبت کی ہوا تیز بہت ہے

❋ محمود علی......اسلام آباد
جو کاغذی ہے وہ ہر ناؤ ڈوب جائے گی
تو سطحِ آب پہ کھل جائے گا بھرم اس کا
جو سر نہیں ہے تو دستار کی ضرورت کیا
سروں کے ساتھ عبارت ہے پیچ و خم اس کا

❋ سید عبادت کاظمی......ڈیرہ اسماعیل خان
کیا دشمنی تھی چاند کو گھر کے چراغ سے
چراغ بجھ گیا تو چاند ندی میں اتر گیا

❋ رضیہ عمیر......کراچی
شعور و فکر کے ہے میکدوں میں سناٹا
خرد کے نام پہ ذہنوں کا جام خالی ہے

❁ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ
آئی نہ رات بھر کوئی پنگھٹ پہ سانولی
پانی میں چھپ کے بیٹھا رہا بے قرار چاند

❁ یوسف رضا کاظمی..... لیہ
کھیتوں میں پھر سے سرسوں کی رت آگئی
دیکھے ہوئے تمہیں آج اک سال ہوگیا

❁ مدحت..... کراچی
دل کو غمِ حیات سے ابھی نجات نہیں
نگاہِ یار سے کہہ دو کہ انتظار کرے

❁ اظہر حسین پچار..... ہزاری، جتوئی
پھر یوں ہوا کہ جب بھی ضرورت پڑی مجھے
ہر شخص اتفاق سے مجبور ہوگیا

❁ سید عرفان شاہ، عمران عارف..... فیصل آباد
تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ میخانے کا پتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

❁ بلقیس خان..... واہ کینٹ
یہ سال بھی پچھلے کئی برسوں کی طرح ہے
اس سال بھی ہر سانس گراں بار بہت ہے

❁ انجینئر محمد سعید اقبال بھٹی..... گلبرگ، لاہور
قید میں گزری ہے جو عمر بڑے کام کی تھی
کیا میں کرتا کہ زنجیر میرے نام کی تھی

❁ مرحا گل، رمنا گل..... ڈیرہ اسماعیل خان
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

❁ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

❁ مشال اینڈ نوال..... جہلم
اس شہر کے انداز عجب دیکھے ہیں یارو
گونگوں سے کہا جاتا ہے بہروں کو پکارو

❁ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
ستم گری کی ابھی تو تمہاری باری ہے
کبھی تو آئے گا تم دیکھنا ہمارا دن

❁ علی مراد..... لاہور
تتلی بن کر اڑنے والا لوٹ کے شاید آئے
گلدانوں میں پھول سجائے خواب اسی کے دیکھوں

❁ ادریس احمد..... حیدر آباد
ہم نے دیکھا تو افق پر تھا سمندر کا سکوت
ہاں ترے ساتھ جو گزرے تھے نظارے چمکے

❁ عظیم الیاس..... فیصل آباد
پہلے تو وہ کھو جائے گا رسموں کے نگر میں
پھر گود میں رکھا ہرا سر یاد کرے گا

❁ زرمین نیازی..... مظفر آباد
مل جانے کی خواہش بھی بچھڑ جانے کی ضد بھی
ہاں اس کی محبت بھی، عداوت بھی عجب تھی

❁ محمد جہانگیر..... پشاور
میں اس کا درد کسی کو بھی دوں تو کیسے دوں
وہ زخم میں نے بڑی چاہتوں سے پالا ہے

❁ منصور اختر..... سیالکوٹ
تنہا چھوڑ کے جانے والا آنچل لوٹ کے آیا تو
ہم نے اس کی یاد میں کیسے وقت گزارا جانے کا

❁ شازیہ کمال..... کراچی
اِک میں ہی خاموش رہوں کیا سارے شہر کے بیچ
جیسے بلبلہ جھاگ کا کوئی اونچی لہر کے بیچ

❁ محمد رشید..... بہاولپور
اک روز میں بھی کہہ گیا بچوں سے دل کی بات
اب کیا ملے گا ٹوٹے کھلونوں کو جوڑ کر

❁ محمد آریز ملک..... کراچی
یا تو دریا بھی کسی طور نہ آتے تھے قریب
اور دن آئے تو قدموں میں سمندر آیا

کوپن برائے شمارہ مئی 2016

مُحفلِ شعر و سُخن

نام: --

پتا: --



استحقاق

ڈاکٹر شیر شاہ سید

بعض اوقات انسان کتنی عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتا ہے۔ تمام عمر مخالف سمت چلتا ہے اور درست سمت میں منزل چاہتا ہے مگر... اس شخص کو سمتوں کا ادراک تھا اور سفر کرنے کا ہنر بھی آتا تھا جب ہی تو راستوں کی کٹھنائیوں میں ثابت قدم رہنے کے تمام تر تقاضوں سے واقف تھا... بس یہی ایک احساس اسے زندگی و موت کی کشمکش میں بھی رعنائیوں کی جانب نہ دھکیل سکا اور بالآخر پُرخار سفر اس کا مقدر ٹھہرا۔

پل صراط لمحات کو عبور کرنے کی تکالیف کا ادراک

کینسر ہوگیا تھا ان کو۔ پھیپھڑوں کا کینسر۔ بائیوپسی کے بعد پیتھالوجسٹ نے یہی رپورٹ دی تھی۔ رپورٹ دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اہلِ خانہ کو اب بتانا ہوگا اور بہتر ہے کہ میں ہی بتاؤں۔ گزشتہ تین چار دنوں میں ان سے اور ان کی بیوی، بیٹی سے باتیں ہوتی رہی تھیں پھر پتا چلا کہ وہ عامر کے والد ہیں۔ عامر میرے ساتھ ہی تھا کالج

میں۔ ہم دونوں نے ساتھ ایم بی بی ایس کیا۔ میں ڈاکٹر بن کر لندن چلا گیا جبکہ عامر امریکا کا امتحان پاس کر کے وہاں چلا گیا تھا۔ پھر کچھ پتا نہیں چلا۔ تین سو کی کلاس میں کون کہاں جاتا ہے، کسے پتا لگتا ہے۔

وہ اپنی بیٹی کے ساتھ میرے کلینک میں آئے تھے۔ کئی دنوں سے انہیں کھانسی تھی اور اب تو بلغم کے ساتھ خون بھی آجاتا تھا کبھی کبھی۔ پہلے تو انہوں نے کسی کو بتایا بھی نہیں مگر جب ایک دن کھانس کھانس کر بے حال ہو گئے تو ان کی بیوی نے بیٹی کو فون کر کے بتایا جو دوسرے دن انہیں لے کر میرے پاس آگئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ انہیں ٹی بی ہو گئی ہے۔ ان کے بڑے بھائی کا انتقال بھی ٹی بی کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ دبلے پتلے، سادے سے آدمی تھے۔ گہرا سانولا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، سر پر گھنے سفید بال۔ ان کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں ان کی آنکھیں اور ہونٹ تھے۔ دور سے ہی نظر بس جیسے چمٹ جاتی تھیں۔ وہ خاکی رنگ کی پینٹ اور سفید قمیص پہنے ہوئے تھے۔ پینٹ اور قمیص دونوں گھر کی دھلی ہوئی تھیں اور کسی نے گھر میں ہی استری کی تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے اچھے لگے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں اچھے لگتے ہیں یا پھر ان سے نفرت ہی ہو جاتی ہے۔ ان میں کوئی خاص کشش تھی کہ وہ مجھے متاثر کر گئے تھے۔

تفصیل سے ہسٹری لینے اور معائنے کے بعد میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی کہ شاید انہیں کچھ خطرناک بیماری ہے۔ شاید کینسر۔ میں نے ان کی گھبرائی ہوئی بیٹی کی طرف دیکھا، پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ داخلہ، بلغم، خون کا ٹیسٹ، برونکواسکوپی، ایکسرے، سی ٹی اسکین، ایم آر آئی، آپریشن، کیموتھراپی۔ یہ تو بڑا خرچ ہو جائے گا۔ کیسے کریں گے یہ لوگ۔ ٹیچر کی آمدنی ہی کتنی ہے۔

وہ لانڈھی میں رہتے تھے اور ایک گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں پڑھاتے تھے۔ تین سال ہوئے وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد گھر پر ایک ٹیوشن سینٹر کھول لیا تھا انہوں نے۔

میں نے انہیں کاؤچ پر لیٹے رہنے کو کہا اور ان کی بیٹی صائمہ کو لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ ”انہیں داخل کرنا پڑے گا۔ کچھ ٹیسٹ کرنے ہوں گے پھر فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! خیر تو ہے نا۔ ابو ٹھیک ہیں نا؟“ اس نے بہت پریشانی سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”نہیں، ٹھیک نہیں ہیں۔“ میں کبھی بھی مریضوں سے ان کی تشخیص اور ان کی حالت چھپاتا نہیں ہوں۔ خاص طور پر مریضوں کے رشتے داروں سے۔ یہ بہتر ہے کہ مریض کے رشتے داروں کو پتا ہو کہ مریض کو کیا مرض ہے اور اس سے بھی زیادہ بہتر ہے کہ مریض کو بھی اندازہ ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور اگر مریض کو کینسر وغیرہ ہو تو مریض کو یہ بتانا چاہیے کہ زندگی کتنی باقی ہے۔ مریض پریشان ضرور ہوتے ہیں، ڈپریس ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ڈاکٹر پر ناراض ہونا شروع ہو جاتے ہیں لیکن یہ سب کچھ بہت کم وقت کے لیے ہوتا ہے۔ جلد ہی وہ اپنے آپ میں واپس آجاتے ہیں۔ سوچتے ہیں، سمجھتے ہیں اور اپنی باقی ماندہ زندگی کو پلان کر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

”کیا ہوا ڈاکٹر صاحب انہیں...... خدانخواستہ، علاج تو ہو سکے گا نا؟“ اس نے روہانسی آواز میں پوچھا تھا۔ ”ٹھیک ہو جائیں گے نا...؟“ اس کی آواز میں پریشانی بھری ہوئی تھی۔

”دیکھیں ایسا ہے کہ ابھی داخلہ ہوگا پھر کچھ ٹیسٹ کرائیں گے ہم لوگ۔ ہو سکتا ہے کہ سب کچھ صحیح نکل آئے مگر شاید کوئی خطرناک بات بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ ٹیسٹ وغیرہ کے بعد ہی ہو سکے گا۔“

اسی وقت صائمہ نے مجھے بتایا کہ اس کا بھائی بھی ڈاکٹر ہے اور سندھ میڈیکل کالج سے پڑھ کر ڈاکٹر بنا ہے۔ نام سنتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ عامر کی بات ہو رہی ہے۔ ”ارے، وہ تو میری کلاس میں تھا بلکہ میرا دوست تھا، اچھا دوست لیکن ایسے بچھڑے ہم لوگ کہ پھر کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کہاں ہے وہ؟“ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”وہ تو امریکا میں ہیں۔“ اس کی آواز کی اداسی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے امریکا میں ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی اور سلسلہ بھی ہے۔

پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ”ابو کو مت بتایئے گا ڈاکٹر

صاحب کہ میں نے آپ کو عامر بھائی کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ نام نہیں سننا چاہتے اب بھائی کا۔ انہوں نے عاق کر دیا ہے ان کو۔ بس آپ جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ میں جا کر بتاتی ہوں انہیں کہ داخل کرنا ہوگا۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور میں سوچتا رہا کہ نہ جانے کیا ہوا ہوگا باپ، بیٹے کے درمیان۔ عاق وغیرہ تو بڑے انتہائی اقدامات ہوتے ہیں۔

میں نے انہیں وارڈ کے سائڈ والے کمرے میں داخل کر لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا باتھ روم کے ساتھ تھا۔ عام طور پر ہم لوگ ڈاکٹروں کے جاننے والے مریضوں کو اسی کمرے میں داخل کرتے تھے۔ جنرل وارڈ اور جنرل وارڈ کے ٹوائلٹ کا تو برا حال تھا۔ سرکاری اسپتالوں کا جو حشر ہے ویسا ہی حشر ہمارے وارڈ کا بھی تھا۔ میں نے خود ان کے داخلے کا فارم بھرا اور ڈاکٹر شازیہ سے کہا کہ انہیں داخل کر کے جو ٹیسٹ لکھے ہیں ان کے کرانے کا انتظام کرے۔

عام طور پر شام کو میں اسپتال نہیں جاتا ہوں۔ ویسے بھی سرکاری اسپتالوں میں سینئر ڈاکٹر کہاں جاتے ہیں۔ بارہ ایک بجے کے بعد، صرف جونیئر ڈاکٹر ہوتے ہیں اور ان کی مرضی سے اسپتال چلتا ہے۔ اس دن میں اپنے کمرے میں نہ جانے کیسے ایک ضروری خط بھول کر آ گیا تھا۔ اپنے پرائیویٹ کلینک جانے سے پہلے شام تقریباً پانچ بجے میں نے سوچا کہ اپنے وارڈ سے وہ خط لیتا چلوں۔ وارڈ کے باہر میں بے شمار لوگوں کو کھڑا دیکھ کر حیران ہو گیا۔ عام طور پر مریضوں سے ملنے کے وقت پر مجمع تو ہوتا ہے لیکن اتنے زیادہ لوگ میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اپنے کمرے سے خط لے کر میں نرسوں کے کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر شازیہ مل گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ سارے لوگ میرے مریض سے ملنے آئے ہیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے آج ایک مریض داخل کیا ہے۔ میں بھی انہیں دیکھنے چلا گیا۔

ان کا کمرا لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ صائمہ اور اس کی ماں وہاں موجود تھے اور مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ میں نے خیریت پوچھی تو ماسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! خیریت کہاں ہے، سارے اسٹوڈنٹ مجھے دیکھنے آئے ہیں جیسے میں مرنے والا ہوں۔ آپ بتا دیں

سنہری باتیں

☆ جب عقل پختہ ہو جاتی ہے تو گفتگو کم ہو جاتی ہے۔

☆ انسان سمندر میں ڈوب کر بچ سکتا ہے لیکن آنسوؤں میں ڈوب کر نہیں۔

☆ جسے ہارنے کا خوف ہوتا ہے، وہ ضرور ہارتا ہے۔

☆ خود کو بدل دو، قسمت خود بخود بدل جائے گی۔

☆ شیریں کلام اور خوش خلق کے ساتھ محبت واجب ہو جاتی ہے۔

☆ اسلام کے نقشِ قدم پر چلو کیونکہ اسلام کا دامن حکمت و دانائی کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔

☆ ماں باپ کی خوشنودی دنیا میں باعثِ دولت اور آخرت میں باعثِ نجات ہے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

مشعل راہ

اے ابن آدم جب تو دیکھے تیرا پروردگار تجھے پے در پے نعمتیں عطا کیے جا رہا ہے حالانکہ تو اس کی نافرمانی کر رہا ہے تو ہوشیار ہو جا کیونکہ درگزر کرنے میں اسی کا درجہ بلند ہے جو سزا دینے میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے۔ خیر یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد زیادہ ہو جائے بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو اور تمہاری بردباری کی صفت بڑی ہو جائے اور اپنے رب کی عبادت میں تم لوگوں سے آگے نکل جاؤ۔

اے ابنِ آدم تو آج کے دن کی فکر کر اور آئندہ کی فکر طاری نہ کر...... جلدی کرنے کی ضرورت نہیں اگر کل تجھے موت نہیں آئی تو کل کی روزی تیرے پاس خود ہی آ جائے گی اور اچھی طرح سمجھ لے کہ تو اپنی ضرورت سے زیادہ جتنا کما رہا ہے وہ دوسروں کے لیے جمع کر رہا ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

ڈاکٹر صاحب کہ سب خیر ہے تاکہ مزید نہ آئیں اور دو دن میں تو میں ویسے ہی گھر چلا جاؤں گا۔''

میں نے سوچا کہ ماسٹر صاحب بھی غضب کے ماسٹر ہوں گے۔ داخلے کے چھ سات گھنٹوں کے اندر اتنے لوگ ملنے چلے آئیں، ایسا تو میں نے کم ہی ہوتے دیکھا ہے۔ میں مسکرا دیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔ شازیہ کو میں نے ہدایت دی کہ ماسٹر صاحب کو کھانسی کے لیے دوا دے کر رات کو سلا دے۔ کل میں برونکواسکوپی کا انتظام کروں گا پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔

میرے خدشات صحیح نکلے، ابتدائی رپورٹ سے ہی پتا لگ گیا کہ انہیں برونکوجے نک کارسی نوما ہے۔ یہ پھیپھڑے کا کینسر ہوتا ہے جو عام طور پر سگریٹ پینے والوں کو ہوتا ہے۔ مستقل دھواں جو سانسوں سے پھیپھڑوں میں جاتا ہے پھر پھیپھڑوں میں آہستہ آہستہ کینسر کو جنم دیتا ہے۔ کراچی میں تو کینسر کے لیے سگریٹ ضروری نہیں ہے کیونکہ شہر میں ٹریفک کا دھواں اتنا کثیر ہے کہ سگریٹ پیے بغیر بھی پھیپھڑوں کا کینسر ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کراچی کے اسپتالوں میں پھیپھڑے کے کینسر کے مریضوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ماسٹر صاحب نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ پان کھاتے تھے۔ صرف چائے پیتے تھے اور خوب پیتے تھے۔ سادہ سی زندگی تھی ان کی۔ تمام عمر صبح سے شام تک اسکول میں پڑھایا تھا انہوں نے۔ جب تک اسکول میں پڑھاتے رہے نہ کوئی ٹیوشن سینٹر کھولا اور نہ ہی پیسے لے کر ٹیوشن پڑھائی۔ اسکول میں گھر میں جب بھی کوئی طالب علم کچھ پوچھنے آ گیا پڑھا دیا۔ یہی زندگی تھی ان کی۔ آج کل ایسے ٹیچر کہاں ملتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہوئے ایک بیٹے کو ڈاکٹر بنایا تھا انہوں نے اور تین بیٹیوں کی شادیاں عزت سے کر دی تھیں۔ اب سلیقہ مند بیوی کے ساتھ سلیقے سے اپنے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی غصہ تھا نہ ملال۔ ایک قسم کا سکون تھا ان کی شخصیت میں۔ میں سوچتا رہا، کھوجتا رہا، بوجھتا رہا کہ غربت کے باوجود بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ کیا بغیر جھکے بھی کھڑا رہ سکتا ہے۔

ماسٹر صاحب کی تینوں بیٹیوں اور داماد سے بات کرنے کے بعد میں نے انہیں تفصیل سے بتا دیا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ ان کا سینہ کھولا جائے گا۔ پھیپھڑوں کے کینسر زدہ حصوں کو نکالا جائے گا، پھر بجلی بھی لگے گی اور دوائیں بھی دی جائیں گی۔ کیموتھراپی ہوگی ان کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کینسر کے خلاف دوائیں دی جائیں گی جن کا اپنا بھی ری ایکشن ہوتا ہے اور یہ دوائیں تھوڑی مہنگی بھی ہیں۔ ''دیکھتے ہیں کچھ کریں گے آپریشن کے بعد۔'' میں نے انہیں تسلی دی تھی۔

ان کے چہرے پر ایک رنگ آیا، پریشانی کی ایک لہر پھر وہ رک کر بولے تھے۔ ''ڈاکٹر صاحب! جو بھی علاج ہے وہ تو کرانا ہی ہوگا مگر یہ بتائیں کہ زندگی کی کتنی امید ہے۔ ایک خواہش تھی کہ بیوی کے ساتھ حج کرلوں۔ اس نیک بخت نے زندگی میں کوئی بھی خواہش نہیں کی مجھ سے۔ غربت میں، مجبوری میں، جیسی زندگی گزرتی رہی وہ بھی گزارتی رہی۔ ہر بات مانی ہے اس نے، ہر فیصلہ قبول کیا ہے میرا...... کیا صحیح ہو جاؤں گا؟ حج کرلوں گا؟ بچیوں سے فارغ ہو کر ہوائی جہاز کا کرایہ جمع کرلیا ہے میں نے۔ بس اس سال نیت تھی میری حج پہ جانے کی کہ اب بیمار پڑ گیا، وہ بھی کینسر۔''

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' میں نے جواب دیا۔

دل میں آیا کہ میں عامر کے بارے میں پوچھ لوں، امریکا میں رہنے والے ڈاکٹر کے ماں باپ کے لیے حج وعمرہ کوئی مسئلہ تھوڑی ہے۔ ایک ہفتے سے بھی کم تنخواہ میں یہ سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ایسی کون سی بڑی بات تھی مگر میں خاموش رہا، صائمہ نے منع کیا تھا۔ صائمہ نے بتایا تھا کہ بھائی کو عاق کیے اب گیارہ سال ہو گئے ہیں، کسی سے بھی تعلق نہیں ان کا۔ امریکا سے پانچ سال کے بعد آئے تھے تو جیسے گھر میں بہار آ گئی تھی۔ ابو نے ان کے سامنے ہی آپی کی شادی کی تھی اور بھائی سے کہا تھا کہ اگلے دو سال کے بعد ....

جب باجی کی شادی ہو گی تو اس کی بھی شادی کریں گے پھر دو سال کے بعد بھائی پھر آئے۔ باجی کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد بھائی نے کہہ دیا کہ وہ کسی امریکن لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ابو کے لیے یہ قابلِ قبول نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عامر کو واپس آ جانا چاہیے، کراچی میں رہنا چاہیے، اس ملک میں جہاں اس کے باپ نے ماں نے زندگی گزاری ہے۔ اس کی مٹی سے تنکے چن کر گھر بنایا ہے۔ بچوں کو پڑھایا ہے۔ اس ملک نے اس قابل کیا

کہ امریکا جا کر امتحان پاس کرے، قابل بنے، پیسے کمائے اور اب اس قابل ہو گئے کہ کچھ کر سکو تو کہتے ہو کہ امریکی لڑکی سے شادی کرو گے یعنی اب امریکا میں ہی رہو گے۔ یہ مجھے قبول نہیں ہے۔ مجھے ایسی زندگی گزارنے کا کوئی شوق نہیں ہے جس میں اپنے پوتوں کے لیے بے قرار رہوں، جو تمہارے بیٹے مگر میرے پوتے بھی ہوں گے۔ میری نسل، میرے باپ دادا اور پرکھوں کی نسل۔ میرا تشخص اسلام ہے، میں پاکستانی ہوں۔ تمہاری بیوی کرسچین ہوگی، امریکن ہوگی۔ اس بے چاری کا کیا قصور۔ وہ تو وہی کرے گی جو کرنا چاہیے اسے۔

انہوں نے عامر کو سمجھایا۔ مجھے امریکی لڑکی سے کوئی بیر نہیں ہے، نہ اس پر میرا زور ہے، میرا تو تم پر بھی زور نہیں ہے، میرا تو کسی پر بھی زور نہیں ہے، میرا تو صرف اپنے پر زور ہے بیٹے۔ میں سمجھوں گا تمہاری موت ہوگئی، کسی ایکسیڈنٹ میں، کسی حادثے کا شکار ہو گئے تم۔ لوگ تو مرتے ہی ہیں، یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہوگی۔ میں سمجھوں گا تم مر گئے۔ ایک دفعہ ہی مرو گے نا..... میں روز روز نہیں مرنا چاہتا۔ واپس چلے جاؤ پھر نہ ملنا مجھ سے۔ جہاں رہو خوش رہو۔ مردے کے لیے تو دعا ہی کرتا ہے آدمی، وہ دعا ہی کریں گے ہم۔ بھائی پھر نہیں آیا۔ ابو نے ایسا ہی کیا جیسا کہا تھا انہوں نے۔ شروع شروع میں بھائی خط بھی لکھتا رہا فون پر بھی بات کرنے کی کوشش کی مگر ابو نے اسے بھلا دیا، جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ہم بھی ان کے سامنے کچھ نہیں بولتے ہیں بھائی کے بارے میں اور سچی بات تو یہ ہے کہ کسی سے تعلق بھی نہیں ہے ان کا۔

میں نے صائمہ کو بتایا کہ ابھی حج میں آٹھ مہینے باقی ہیں مجھے پتا نہیں ہے کہ کیا ہوگا۔ ٹیومر کتنا بڑا ہے، علاج کے قابل بھی ہے کہ نہیں۔ کوشش تو یہی ہوگی کہ ماسٹر صاحب اچھے ہو جائیں اور اگر حج کر سکیں تو بہت ہی اچھا ہے مگر مجھے لگتا ہے شاید یہ ممکن نہ ہو سکے۔

صائمہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں سوچتا رہا کہ انسان کیا سوچتا ہے اور کیا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ عامر بڑا اچھا دوست تھا میرا۔ بہت اچھی طرح زندگی گزاری تھی اس نے کالج میں، سلجھا ہوا بندہ تھا وہ۔ پھر کیوں کیا اس نے ایسا؟ بہت کچھ چھوڑ دیا۔ گھر، ماں باپ، بہنیں، لانڈھی، کراچی، پاکستان۔ زندگی میں انسان کو انتخاب کرنا پڑتا ہے، فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ پیار، محبت، وفا، وعدے، زندگی گزارنا کسی ایسے کے ساتھ جس سے ذہن بھی ملا ہو، یہ ضروری ہے لیکن ہمارے سماج کے اپنے بھی تو کچھ اصول ہیں۔ صدیوں کے بنے ہوئے رشتے ہیں اور ان کے اپنے مطالبے ہیں۔ میں شاید وہ نہیں کرتا جو عامر نے کیا تھا لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں کوئی فیصلہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور میں فیصلہ کرنے والا تھا بھی کون مگر سوچنے پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ذہن جلتا رہا، سوچتا رہا اور خود ہی سمجھتا رہا۔

ماسٹر صاحب سے ملنے کے لیے آنے والے بہت سے لوگ مجھ سے بھی ملتے۔ بہت سے لوگوں کا فون آتا، ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ انہوں نے بڑی محنت، ایمانداری سے بچوں کو اسکول میں پڑھایا تھا۔ ایک تعلق، رشتہ تھا ان کا اپنے طالب علموں کے ساتھ جس کی بنیاد سادگی اور ایمانداری پر تھی۔ بہت محبت کرنے والے استاد رہے ہوں گے وہ، تبھی تو لوگوں کا تانتا ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں ہے۔

جس دن ان کا آپریشن تھا اس دن مجھے پتا چلا کہ لانڈھی کے اس اسکول میں صبح اسمبلی کے بعد ان کے لیے دعا کی گئی ہے اور آپریشن تھیٹر کے باہر اسکول کے ہیڈ ماسٹر، ٹیچروں اور اسکول کے بچوں کی ایک فوج بھی کھڑی تھی۔

صائمہ نے مجھے بتایا کہ آپریشن کی رات کو انہوں نے اپنے بڑے داماد کو بلا کر کہا کہ وہ اب بچ نہیں سکیں گے کیونکہ آپریشن ٹیومر کو پھیپھڑوں سے نکالے گا مگر جسم کے دوسرے حصوں سے نہیں نکال سکے گا، زندگی شاید تھوڑی بڑھ جائے مگر بچ نہیں سکے گی۔ انہوں نے جمع کیے ہوئے ایک لاکھ انہتر ہزار دو سو ترانوے روپے کا ایک چیک بھی انہیں دیا اور کہا کہ بیٹے میں مروں کہ جیوں، مگر تمہیں اس رقم سے اپنی ساس کو حج ضرور کرانا ہے۔ میرا اب کچھ نہیں ہو سکے گا، وہ حج کر لے گی تو میں سمجھوں گا میرا بھی حج ہو گیا۔ جتنی محبت اس نے ساری زندگی مجھ سے، میرے بچوں سے کی ہے اس کا بدل تو کوئی نہیں ہے لیکن اس کے دل کی یہ آرزو کہ وہ حج کر لے، اگر پوری ہو گئی تو میں سکون سے مر سکوں گا اور اگر میں مر گیا تو اس کے حج کی خبر ہی میرے لیے جنت ہوگی۔

میرے دل میں نہ جانے کیا کیا خیال آئے۔ میں نے سوچا کہ شاید زندگی میں کبھی انہوں نے گلدستہ بھی نہیں بھیجا ہوگا اپنی بیوی کو، کوئی کارڈ نہیں لکھا ہوگا اور شاید منہ سے ایک بار اپنی محبت کا اقرار بھی نہیں کیا ہو۔ شاید انہیں پتا بھی نہ ہو کہ ان کی سالگرہ کا کون سا دن ہے؟ کس رنگ کا جوڑا دینا چاہیے؟ کیسا کیک ہونا چاہیے؟ اور شاید ان کی بیوی کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہوگی لیکن آج کا کوئی پیمانہ اس محبت، الفت کی اتھاہ گہرائیوں کو ناپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ محبت جو بڑی خاموش ہوتی ہے، چھپی ہوئی، سادہ، صرف گرم احساس لیے ہوئے۔

آپریشن تو ہوگیا اور پھیپھڑوں سے ٹیومر جتنا ممکن تھا، نکال بھی دیا گیا اور ساتھ ہی فیصلہ کیا گیا کہ انہیں اب کیموتھراپی کی ضرورت ہے۔ تین مختلف دواؤں کو مشترکہ طور پر دینا تھا۔ کم از کم سات دفعہ اور ہر دفعہ کی ڈوز کی قیمت تقریباً پینتیس ہزار روپے تھی۔ سرکاری اسپتال میں آپریشن تو تقریباً مفت میں ہوگیا مگر کیموتھراپی کے لیے حکومت کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ مریض کو خود ہی دینا پڑتے ہیں یا پھر خیرات زکوٰۃ کے پیسوں سے ممکن تھا۔ میں نے شازیہ سے کہا کہ زکوٰۃ کے فارم وغیرہ بھر لیں کیونکہ ان کے مالی حالات تو ایسے نہیں تھے کہ وہ خود اتنا مہنگا علاج کراسکتے۔ بیٹیاں شاید مل کر پیسے جمع کرلیں مگر یہ بھی ایک طرح سے بوجھ ہوگا اور پھر زکوٰۃ کے فنڈ میں رقم موجود تھی۔ فارم کے بعد میں خود پیروی کروں گا اور دواؤں کا انتظام ہوجائے گا۔

دوسرے دن شازیہ نے بتایا کہ انہوں نے زکوٰۃ کے استحقاق کے فارم پر دستخط کرنے سے انکار کردیا ہے اور ساتھ ہی بیٹیوں کو بھی منع کردیا ہے کہ کیموتھراپی کے لیے پیسے نہ جمع کریں۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر صاحب نے معاملے کو خوامخواہ پیچیدہ بنادیا ہے۔ ان کے دستخط کے بعد بہت آسانی کے ساتھ ان کا علاج شروع ہوسکتا تھا مگر نہ جانے کیوں انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا۔ میں نے سوچا کہ میں خود ہی ان سے بات کرلیتا ہوں۔

اس دن وہ مجھے ذرا کمزور سے لگے تھے۔ آپریشن کے بعد ایسا لگتا ہے۔ صائمہ نے کمرا بہت صاف ستھرا کیا ہوا تھا۔ وہ صاف ستھرے دو تین تکیوں سے ٹیک لگا کر لیٹے ہوئے تھے۔ چہرا کمزور اور نڈھال سا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی محسوس کی تھی میں نے۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر آہستہ سے انہوں نے شکریہ ادا کیا تھا میرا۔

''شکریہ، ڈاکٹر صاحب! بہت خیال رکھا ہے آپ نے۔ خدا خوش اور زندہ رکھے آپ کو کہ آپ علاج کرتے رہیں ہم جیسے لوگوں کا۔ زندگیاں بانٹتے رہیں اسی طرح، خوش رہو ہمیشہ خوش رہو بیٹے۔''

''لیکن آپ علاج کرنے کہاں دے رہے ہیں۔'' میں نے فوراً ہی جواب اس طرح سے دیا کہ گفتگو جلدی آگے بڑھ سکے۔ ''میرا مطلب ہے کہ آپ استحقاق کے فارم پہ دستخط کردیں کیونکہ استحقاق تو بنتا ہے آپ کا۔ اس کے بعد ہم لوگ دوا منگوا کر فوراً ہی علاج شروع کردیں گے۔ آج کل بہت اچھی دوائیں آئی ہوئی ہیں اور سارے کینسر کے مریضوں کا علاج ہورہا ہے۔ تھوڑا ری ایکشن ضرور ہوتا ہے۔ بال گرجاتے ہیں الٹی ہوتی ہے مگر زندگی مل جاتی ہے تھوڑی سی اور۔ بس اب آپ دستخط کردیں تاکہ میں دوائیں منگوا سکوں۔''

وہ تھوڑی دیر مجھے دیکھتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔ ''استحقاق تو بنتا ہے بیٹے، تم صحیح کہہ رہے ہو۔ غریب آدمی ہوں میں...... اتنا مہنگا علاج نہیں کراسکتا۔ علاج تو زکوٰۃ سے ہی ہوسکے گا۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ خاموش سے ہوگئے پھر آہستہ سے گلا کھنکھار کے انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''مگر بیٹے یہ جن لوگوں نے زکوٰۃ نکالی ہے اپنی آمدنی، اپنے منافع سے انہوں نے کوئی فارم بھرا ہے کہ جس آمدنی اور نفع پر یہ زکوٰۃ نکالی گئی، وہ آمدنی، وہ نفع کسی لوٹ مار، اسمگلنگ، بے ایمانی، بلیک مارکیٹنگ، رشوت دھاندلی سے حاصل نہیں کی گئی ہے۔ کوئی فارم بھرا ہے انہوں نے زکوٰۃ دینے سے پہلے کہ کسی اور کے استحقاق کو پامال نہیں کیا ہے ان لوگوں نے؟''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے اور پھر انہوں نے آہستہ آہستہ رک رک کے کہا۔ ''بغیر اس فارم کے یہ فارم تو بے معنی ہے نا۔''

اور اتنی گہری سوچ پر میں صرف انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔





بچے برائے فروخت

منظر امام

کبھی کبھی مجبوری میں انسان کوئی ایسا انتہائی قدم اٹھاتا ہے جس کا مقصد ناقابل برداشت دکھ سے چھٹکارا پانا یا لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہوتا ہے مگر بدنیت انسان ان ہمدردیوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ جیسا کہ یہاں... وہ بیوپاری بھی اپنے جگر گوشوں کو غیروں کی آغوش میں دے کر مطمئن تھا کہ لوٹ کر تو اسی کے آنگن میں یہ کبوتر اتریں گے۔

رشتوں کی تجارت اور..... نرم فطرت لوگوں کے مابین عجب تماشا

وہ ایک درد بھرا دل رکھنے والا انسان تھا۔ دفتر جاتے ہوئے اس نے پریس کلب کے سامنے ایک معقول صورت شخص کو دیکھا جو دو عدد بچوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بچے تو دس برس سے زیادہ عمر کے نہیں تھے۔

دفتر جا کر وہ مصروفیات میں انہیں بھول گیا تھا مگر جب واپسی میں اس نے پھر اس شخص کو اسی جگہ ان ہی بچوں کے ساتھ دیکھا تو گاڑی روک کر ان کے پاس آ گیا۔ ''بھائی صاحب! کیا آپ صبح سے یہیں کھڑے

ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بھائی!'' اس آدمی نے ایک گہری سانس لی۔ ''کئی گھنٹے ہوگئے ہیں کھڑے ہوئے۔''

''لیکن کیوں؟''

''تو کیا کروں...... کوئی مناسب خریدار ہی نہیں ملا۔'' اس نے بتایا۔

''کس چیز کا خریدار؟'' انور نے حیرت سے پوچھا۔

''ان دونوں بچوں کا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں انہیں بیچنے نکلا ہوں۔'' پھر اس نے ایک بچے کی طرف دیکھا۔ ''بابی! انکل کو اپنے دانت دکھاؤ۔''

بابی نامی اس بچے نے انور کو اپنے صاف ستھرے دانت دکھا دیے۔ پھر اس نے دوسرے سے کہا۔ ''ٹونی! انکل کو اپنے ناخن... چیک کراؤ۔''

''جناب! آپ کے بچے بالکل صاف ستھرے ہیں۔'' انور جلدی سے بولا۔ ''لیکن آپ انہیں کیوں بیچ رہے ہیں؟''

''تو اور کیا کروں جناب...... کون اپنی مرضی سے اور اپنی خوشی سے اپنے بچے بیچتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ بچے کھانے تک کو ترس کر رہ گئے ہیں۔ اب میرے پاس دو ہی طریقے ہیں...... یا تو ان کو زہر دے کر مار دوں یا پھر ان کو بیچ دوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ، کیا دام لگایا ہے؟''

''یہ بڑا والا ہے بابی پچیس ہزار کا۔'' اس نے بتایا۔ ''بابی انکل کو وہ انگلش کی نظم سناؤ۔''

بابی نے ابھی پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ انور جلدی سے بولا۔ ''اوکے اوکے...... میں سمجھ گیا۔ پڑھے لکھے بچے ہیں اور یہ چھوٹا والا۔ یہ کتنے میں دے رہے ہیں؟''

''اس کا نام ٹونی ہے اور یہ بیس ہزار کا ہے۔''

''اگر کسی ایک کو لینا چاہوں تو؟''

''نہیں جناب! لینا ہے تو... جوڑی لینی ہوگی۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''ان دونوں میں بہت محبت ہے۔ یہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

انور کو خود بچوں کی ضرورت تھی۔ گھر میں دو ہی افراد تھے۔ انور اور اس کی بیوی اسما۔ شادی کو پانچ برس گزر چکے تھے لیکن اولاد کے آثار نہیں پیدا ہوسکے تھے۔ اسما نے بچوں کی بہت سی تصویریں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ ان کو دیکھ کر روتی رہتی تھی۔ محلے کے

بچوں کو پکڑ کر لے آتی اور دن بھر ان کے ساتھ لگی رہتی۔ انور اس سے کہا کرتا تھا۔ ''خدا کی بندی، بچوں سے اتنی محبت نہ کیا کر۔ ورنہ لوگ تجھے بچے اغوا کرنے والے گروہ کی ممبر سمجھنے لگیں گے۔''

''تو کیا کروں، بغیر بچوں کے رہ بھی تو نہیں سکتی۔''

ایک دن وہ انور کو ایک پیر صاحب کے پاس پکڑ کر لے گئی۔ پیر صاحب نے پانچ سو لینے کے بعد کہا۔ ''ایسا کرو، جوشاندہ پیا کرو۔''

''جوشاندہ...... لیکن وہ تو نزلہ بخار کے لیے ہوتا ہے۔''

''یہ بتاؤ دونوں میں سے پیر کون ہے...... میں یا تم؟''

''ظاہر ہے کہ آپ ہی ہیں۔''

''تو پھر میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔'' پیر صاحب نے کہا۔ ''کم از کم پندرہ گلاس روزانہ۔''

''پیر صاحب! میرے پھیپھڑے تباہ ہوجائیں گے۔''

''لیکن اولاد ہوجائے گی۔'' پیر صاحب نے کہا۔ ''میں نے اپنے ماموں زاد بھائی کو بھی یہی مشورہ دیا تھا۔''

''تو کیا ان کے یہاں اولاد ہوگئی تھی؟''

''اگر کچھ دن زندہ رہتا تو ہو ہی جاتی۔ وہ تو ساتویں دن چل بسا تھا۔'' پیر صاحب نے فرمایا۔

''سن لیا تم نے۔'' انور نے باہر آکر اسما سے کہا۔ ''تمہارے یہ پیر صاحب مجھے مارنے کے چکر میں ہیں۔''

''ان کے مشورے پر عمل تو کر کے دیکھو۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے عمل کرنے کی۔'' انور نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔ ''ہم بغیر بچوں کے صحیح ہیں۔ کیا کمی ہے ہماری زندگی میں؟''

''بچوں کی۔'' اسما نے کہا۔ ''پلیز! کسی طرح بندوبست کردو۔ محلے کے بچوں کے لیے تو تم نے منع ہی کردیا ہے۔''

اس کی حالت دیکھ کر انور نے فیصلہ کرلیا کہ وہ بچوں کا بندوبست کردے گا۔ اس نے کئی یتیم خانوں وغیرہ کے چکر لگائے لیکن بات نہیں بن سکی۔ بالآخر یہ آدمی اپنے دو بچوں کو فروخت کرتا ہوا دکھائی دے گیا تھا۔

''دیکھو بھائی! میں دونوں کے بیس بیس ہزار روپے دوں گا۔'' انور نے کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دونوں ہی بہت

پیارے دانے ہیں۔'' وہ آدمی ایک بچے کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔ ''بابی! ذرا فلائنگ کِک لگا کر دکھاؤ۔''

''نہیں... نہیں، میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہارے دونوں بچے بہت ہوشیار ہیں لیکن ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی قانونی چکر پڑ جائے۔''

''کوئی قانونی چکر نہیں پڑے گا۔'' وہ آدمی جلدی سے بولا۔ ''میں باقاعدہ حلف نامہ دینے کو تیار ہوں اور کورٹ میں معاملات طے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو کل یہیں آجانا۔ میں دونوں کو خرید لوں گا۔''

انور نے گھر آکر اسما کو بتایا۔ ''نیک بخت! اب تو خوش ہو جاؤ۔ تمہارے لیے بندوبست ہو گیا ہے۔''

''میرے لیے کس کا بندوبست کر دیا؟''

''دو بچوں کا۔ دونوں کو خرید کر لا رہا ہوں۔ صرف پینتالیس ہزار میں۔''

''یہ تو بہت ظلم کی بات ہے۔ آپ بچوں کو ماں باپ سے الگ کر رہے ہیں۔'' اسما نے کہا۔

''ارے وہ بچے خود ہی الگ ہونے کو تیار ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''اور ہیں کیسے؟''

''بہت پیارے۔ بہت کیوٹ۔'' انور نے بتایا۔ ''انہیں دیکھ کر تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔''

''تو جائیں، خدا کے لیے جلدی لے کر آجائیں۔''

''کل ملیں گے۔ قانونی کارروائی بھی تو مکمل کرنی ہوگی۔ ان کے لیے کمرا تیار رکھنا۔''

دوسری صبح انور نے بینک سے پینتالیس ہزار نکالے اور اس جگہ پہنچ گیا۔ وہ آدمی اپنے وعدے کے مطابق دونوں بچوں کو لیے کھڑا تھا۔

''آئیں جناب۔'' اس نے کہا۔ ''یہ دونوں تو کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

ایک گھنٹے کی کارروائی کے بعد دونوں بچے انور کے حوالے کر دیے گئے۔ اس آدمی نے دونوں بچوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، ابو کو زیادہ تنگ مت کرنا۔''

''یہ میرے ابو نہیں ہیں۔'' بابی نے احتجاج کیا۔

''نہیں بیٹا۔ آج سے ان ہی کو اپنا ابو سمجھو۔ یہ تمہیں کھلائیں گے، تمہاری پرورش کریں گے۔ تمہارا خیال رکھیں گے۔''

''اور گھمانے بھی لے جائیں گے؟'' ٹونی نے

کاش...

کاش کا لفظ بہت چھوٹا سا ہے۔ اس کو بول کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سمندر کی موجیں آپس میں ملنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہوں۔ جیسے مٹی ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام تک جانے کی آرزو کر رہی ہو۔ یہ لفظ بار بار کہنے کی وجہ سے انسان کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ ایسے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ کچھ لفظ انسان کو بکھیر دیتے ہیں اور اس کو مکمل طور پر بے صبرا بنا دیتے ہیں۔

'کاش' بھی انہی الفاظ میں سے ایک ہے۔ یہ بہت چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس لفظ میں اضطرابی کیفیت اور بے چینی بہت زیادہ ہے۔ کاش کا لفظ ہر دم استعمال کرنے والوں کے دلوں میں ہر آن بے چینی رہتی ہے اس لیے اس لفظ کا استعمال کم ہی کریں۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

شیخی خورے

تین دوست اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ وہ پیسے کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتے۔ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اسے ماچس کی تیلی جلا کر راکھ کر دیا۔ دوسرے نے جیب سے بیس روپے کا نوٹ نکالا اور اسے جلا کر راکھ کر دیا۔ تیسرے نے ہنس کر کہا۔ ''بس اتنی ہی ہمت تھی۔ یہ دیکھو۔'' اس نے جیب سے چیک بک نکالی، ایک چیک پھاڑ کر اس پر ایک ہزار روپے لکھے اور اسے لائٹر کے شعلے سے راکھ کر دیا۔''

لومڑی اور چھتری

ہالی ووڈ کی ایک اداکارہ ایک دکان پر لومڑی کی کھال کا کوٹ خریدنے گئی۔ دیر تک جھک جھک کرنے کے بعد کوٹ پسند کیا۔ دام چکانے کے بعد بولی۔ ''یہ کوٹ بارش میں بھیگ تو نہیں جائے گا۔''

دکاندار جو پہلے ہی اس کی بے تکی بحث سے تنگ آچکا تھا، جھلا کر بولا۔ ''محترمہ! آپ نے کسی لومڑی کو بارش میں چھتری لگائے دیکھا ہے؟''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

پوچھا۔

''کیوں نہیں بیٹا۔ خوب سیر کراؤں گا۔''

''اب جاؤ تم دونوں۔''

بچے بھی عجیب مزاج کے تھے۔ انہوں نے مڑ کر بھی باپ کی طرف نہیں دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ''ابو! یہ گاڑی آپ کی ہے؟'' بابی نے راستے میں پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔ یہ میری ہے۔''

''لیکن میرے امی ابو کے پاس تو بائیک بھی نہیں ہے۔''

''بھائی تمہیں نہیں معلوم۔'' ٹونی نے جیسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جو ابو اصلی ہوتے ہیں، ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا اور جو نقلی ہوتے ہیں، ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔''

انور بچوں کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ بچے کچھ بے پروا قسم کے تھے۔ ورنہ ماں باپ سے جدا ہو کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔

اسما نے والہانہ انداز میں دونوں بچوں کا استقبال کیا تھا۔

''بچو!'' انور نے اسما کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تمہاری امی ہیں۔''

''یہ کیسی امی ہیں بابی۔'' ٹونی نے بابی سے پوچھا۔

''بھائی! اب یہ جیسی بھی ہیں، ان ہی پر گزارہ کرو۔'' بابی نے کہا۔

انور اور اسما دونوں یہ جملہ سن کر حیران رہ گئے تھے۔ کم بخت نے اپنی عمر سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ انور کا تو جو بھی ردعمل ہو لیکن اسما بھنا کر رہ گئی تھی۔ ''خدا کی پناہ۔ یہ تم کیسے بچوں کو پکڑ کر لائے ہو۔''

''اسما! جلدی میں یہی ملے تھے لیکن ہیں بہت ذہین۔''

''ان کی ذہانت تو ابھی سے پتا چل رہی ہے۔''

''امی۔'' بابی نے اسما کی طرف دیکھا۔ ''بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانے میں کیا ہے؟''

''واہ۔ کیا بچے ہیں۔'' اسما بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''ابو! آپ بہت اچھے ہیں۔'' ٹونی نے کہا۔ ''لیکن یہ جو امی ہیں، یہ کچھ پاگل معلوم ہوتی ہیں۔''

''ارے تو خود پاگل ہوگا۔'' اسما کی آواز آئی۔ اس نے ٹونی کی بات سن لی تھی پھر اس نے انور کی طرف دیکھا۔ ''انور پلیز! واپس کرآؤ ان بچوں کو۔''

''کیا پاگل ہوگئی ہو۔ ان بچوں پر پینتالیس ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں۔''

''اب تو ہم بھی کہیں نہیں جائیں گے۔'' ٹونی نے کہا۔ ''واہ، ایک تو اتنی مشکل سے اپنے گھر سے جان چھوٹی ہے اور آپ لوگ ہمیں دوبارہ بھیج رہے ہیں۔''

''اچھا بابا! کوئی نہیں بھیج رہا۔'' انور زچ ہوگیا تھا۔ ''تم دونوں کو یہیں رہنا ہے۔''

اسما نے ان دونوں کے لیے ایک کمرا ٹھیک کر دیا تھا۔ اس میں ان کی ضرورت کی ہر چیز تھی۔ ان کی تفریح کے لیے کمرے میں ایک ویڈیو گیم بھی رکھ دیا گیا۔

انور اور اسما بچوں کو کمرے میں بھیجنے کے بعد بہت دیر تک ان ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کس اسکول میں ایڈمیشن دلانا ہے، ان کی ڈریسنگ کیسی ہونی چاہیے، ان کو ایڈاپٹ کرنے کی خوشی میں تقریب کب ہو۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے دونوں کو چونکا دیا۔ انور نے دروازہ کھولا۔ ٹونی کھڑا ہوا منہ بسور رہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' انور نے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ابو! مجھے اس کمرے میں نہیں سونا۔'' ٹونی نے کہا۔ ''میں تو آپ دونوں کے ساتھ سوؤں گا۔''

''ہم دونوں کے ساتھ؟ نہیں بیٹا، تمہارے لیے وہ الگ کمرا ہے نا۔ تم وہاں سو گے۔''

''نہیں۔ میں بابی کے ساتھ نہیں سوؤں گا اور اگر آپ نے نہیں سلایا تو پھر میں زور زور سے رونے لگوں گا۔''

''اچھا اچھا رونے کی ضرورت نہیں ہے، آجاؤ۔''

اسما نے اسے دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ ''یہ تم اس کو کیوں لے کر آرہے ہو؟''

''بچہ ہے۔ ہمارے ساتھ سونے کی ضد کر رہا ہے۔'' انور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہاں امی! صرف آج رات۔'' ٹونی نے کہا۔ ''صرف ایک رات آپ دونوں کے ساتھ سونا ہے اور کل سے اپنے کمرے میں سوؤں گا اور بھائی آپ دونوں کے ساتھ سوئے گا۔''

''کیا! پھر بابی سونے کے لیے آجائے گا؟''

''ہاں امی۔ باری باری...... ایک رات میں تو ایک

رات بابی۔ پھر ایک رات بابی تو ایک رات میں۔"

"انور! اب یہ بچے ناقابلِ برداشت ہوتے جارہے ہیں۔" اسما دھیرے سے بولی۔

"امی! آپ اور ابو باتیں کرتے رہیں۔ میں کچھ نہیں سن رہا۔" ٹونی نے دونوں کے درمیان لیٹ کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔

ٹھیک چار بجے کے قریب بابی بھی اپنے بھائی کو ڈھونڈتا ہوا اس کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ انور کو اسے بھی اسی بستر پر سلانا پڑا تھا۔

"انور! کیا تم مجھے پاگل کرنے کے لیے ایسے بچے اٹھا کر لے آئے ہو؟" اسما دانت پیستے ہوئے بولی۔

"ارے تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ دونوں ایسے نکلیں گے۔"

"میں تو کہتی ہوں کہ ان کے باپ نے انہیں بیچا نہیں ہے بلکہ ان سے جان چھڑائی ہے۔"

"اب کچھ بھی ہو۔ یہ بچے ہمارے گھر کے ہیں۔ ہمارے اپنے ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ ہی گزارہ کرنا ہے۔"

"آپ دونوں اتنی باتیں کیوں کرتے ہیں۔" ٹونی اچانک بول پڑا۔ "کیا آپ لوگوں کو نیند نہیں آتی؟... خوامخواہ ہماری نیند بھی برباد کررہے ہیں۔"

"میرے خدا! یہ بچے ہیں یا مصیبت ہیں۔" اسما بوکھلا کر بولی۔

"یہ تمہارا ہی شوق تھا۔ اب خود ہی بھگتو۔"

دوسرے دن وہ لوگ بہت دیر سے اٹھے۔ دونوں بچے کمرے میں نہیں تھے۔ "خدا کی پناہ...... کہاں چلے گئے دونوں؟" انور نے پریشان ہو کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ بھاگ گئے ہوں۔"

"بھاگ جائیں تو اچھا ہی ہے۔"

"کیسی بات کررہی ہو۔ ہم قانونی چکر میں پھنس جائیں گے۔ میں باقاعدہ عدالت سے لے کر آیا ہوں دونوں کو۔ عدالت ہماری جان کھا جائے گی۔"

کچھ دیر بعد باہر سے شوروغل کی آوازیں آنے لگیں۔ انور اور اسما دوڑتے ہوئے گیٹ پر پہنچے۔ محلے کے ایک شخص نے دونوں بچوں کے ہاتھ تھام رکھے تھے اور زور زور سے شور کیے جارہا تھا۔ "نالائق، بدتمیز...... نہ جانے کس کی اولاد ہیں۔"

"امی۔" بابی اسما کو دیکھ کر ٹھٹکا۔

"ابو۔" ٹونی نے انور کی طرف آنے کی کوشش کی۔

"انور صاحب! یہ کیا سلسلہ ہے۔ یہ بچے آپ کے کیسے ہوگئے؟"

"یہ ایک درد بھری داستان ہے اکرم بھائی۔ آپ یہ بتاؤ ہوا کیا ہے؟"

"اب کیا بتاؤں۔ یہ دونوں بچے میرے گھر میں گھس گئے تھے۔" اکرم نے بتایا۔ "پھر ایک عجیب حرکت کی کم بختوں نے...... سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے بچوں کو کیسی تربیت دی ہے۔ پھر اب سے پہلے تو ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ پھر یہ اچانک آپ کے بچے کہاں سے ہوگئے۔"

"میں نے بتایا نا کہ یہ ایک درد بھری داستان ہے لیکن آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"وہ بھی ایک درد بھری داستان ہے انور بھائی۔" اکرم نے کہا پھر اپنی آواز نیچی کی۔ "یہ کم بخت مجھ سے کہہ رہا تھا انکل، انگلش فلموں میں جس طرح پیار کرتے ہیں، آپ بھی آنٹی کو اسی طرح پیار کریں۔"

"لاحول ولا۔" انور اچھل پڑا۔ "معاف کرنا اکرم بھائی۔ میں ابھی ان کے دماغ درست کرتا ہوں۔"

وہ دونوں بچوں کو پکڑ کر گھر لے آیا۔ "چلو بچو...... اب تم دونوں اپنے گھر جانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"ہاں ہاں، واپس کریں کم بختوں کو۔ یہ اگر رہ گئے تو پھر ہم محلے میں نہیں رہ سکیں گے۔"

ایک گھنٹے کے بعد انور دونوں بچوں کو لے کر ان کے باپ کے پاس کھڑا تھا۔ "خدا کے لیے بھائی۔ اپنے بچے واپس لے لو۔" اس نے کہا۔

"اب تو یہ نہیں ہوسکتا جناب۔ آپ سودے سے انکار نہیں کرسکتے۔ اب میں آپ کو پیسے کہاں سے واپس کروں گا۔ وہ تو سب ادھار میں چلے گئے۔"

"ارے بابا! تم سے پیسے کون واپس مانگ رہا ہے۔ بس تم اپنی امانت کو سنبھالو۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے۔"

"مرضی ہے آپ کی۔ چھوڑ جائیں دونوں کو۔"

دوسری شام کو دفتر سے واپسی پر انور کو وہی آدمی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے بیٹھا ہوا دکھائی دے گیا۔ اس کے ساتھ وہی دونوں بچے تھے اور اس کے ہاتھ میں ایک پلے کارڈ تھا جس پر لکھا تھا...... "بچے برائے فروخت۔"

ماروی

محی الدین نواب

انتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر و اور چاچی نتی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کروی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی بر باد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو گیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو یو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹیمی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آ گیا۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ٹیمی سن کے بیٹے ایمان سے ہو گئی۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کر لیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ رہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ

جہاز کرلندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرلیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا مگر وہ اس کا دیوانہ تھا اور اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے غباروں کے ذریعے ماروی تک اپنا پیغام پہنچانا چاہا اور کئی غباروں میں دو لفافے باندھ کر انہیں اڑا دیا۔ انڈین آرمی نے غباروں کو چیک کرکے انہیں آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اس کے ذریعے مراد اور ماروی تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اب وہ غبارے مغرب کی سمت جارہے تھے۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہوگئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کرلیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوالیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِاقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد، دونوں جب چاہتے نادیدہ ہوجاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے ادھر دشمن مراد پکڑنے کے لیے محبوب اور ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنادی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگنی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک حیات بنالیا۔ مراد شریک حیات کے ساتھ اپنی ریاست جارہا تھا کہ اسے دشمنوں نے گھیرلیا۔ اس کے جہاز کو بیچ راستے میں ہی روک لیا گیا۔ دشمن اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے تاہم مراد نے انہیں دھمکی دی اور چھ گھنٹے انتظار کرنے کو کہا اس نے جہاز سے باہر آنے سے انکار کردیا تھا۔ دشمن ناچار انتظار کرنے لگے کہ چھ گھنٹے بعد کیا ہوگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مراد اور ہم زاد کے لیے بازی پلٹنا بہت ہی آسان تھا۔ وہ دونوں نادیدہ ہوکر ان کے ہوش اڑا سکتے تھے لیکن ایسا کرنے سے یہ بھید کھل جاتا کہ وہ نادیدہ ہوجایا کرتے ہیں اور اس بھید کو اس لیے قائم رکھنا تھا کہ ان کے نادیدہ ہونے کی صلاحیت دائمی نہیں تھی۔ کسی دن کسی وقت بھی یہ صلاحیت ختم ہونے والی تھی۔ اس لیے مراد دوسری تدابیر سے اپنے بچاؤ کی کوششیں کررہا تھا۔ اس نے ہم زاد کو کچھ اہم ہدایات دی تھیں۔ وہ مراد کی ہدایت کے مطابق اپنی ریاست میں ایک جوان حسینہ کو تلاش کرتا ہوا ایک ایسے گھر میں پہنچا جہاں ایک حسین لڑکی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

اس کا نام زیب النساء عرف زیبی تھا۔ اس کے دن پھرنے والے تھے۔ خوش نصیبی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ماں بیٹی ریاست کے حکمران کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

اس نے مکان کے اندر آکر کہا۔ ”حیران اور پریشان نہ ہوں ماں جی! میں نے آپ کی بیٹی کو پسند کیا ہے۔ اسے ریاست کی ملکہ بنانا چاہتا ہوں۔ کیا زیب النساء مجھے قبول کرے گی؟ کیا آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا چاہیں گی؟“

زیبی نے سر پر آنچل رکھ کر اسے گھونگھٹ بنالیا۔ مراد نے ہم زاد کو سختی سے کہا تھا۔ ”جسے بھی پسند کرو، اس سے فوراً نکاح پڑھاؤ۔ فی الحال کسی قاضی، وکیل اور گواہوں کو نہیں بلاسکو گے۔ ابھی رازداری ضروری ہے۔ اس لیے لڑکی کے والدین کے سامنے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اسے شریکِ حیات بناؤ۔ بعد میں اس سے باقاعدہ نکاح پڑھواؤ گے اور خبردار! جب تک باقاعدہ نکاح نہیں پڑھایا جائے گا تب تک تم اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔“

ہم زاد نے ایک بار مراد کو ناراض کیا تھا۔ اب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زیبی کی والدہ کے سامنے کلام پاک کی ایک آیت پڑھی اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر پوچھا۔ ”کیا تم مجھے اپنے خاوند اپنے مجازی خدا کی حیثیت سے قبول کرتی ہو؟“

اس نے تین بار قبول کیا۔ ہم زاد نے بھی اسے تین بار قبول کرنے کے بعد کہا۔ ”میں تمہاری حیا کا محافظ ہوں۔ موجودہ الجھنوں سے نکلنے کے بعد باقاعدہ تم سے نکاح پڑھوانے کے بعد تمہیں ہاتھ لگاؤں گا۔ اس وقت تک ہمارے درمیان فاصلہ رہا کرے گا۔ چلو اٹھو۔ ابھی تمہیں ملکۂ عالیہ کا اہم رول ادا کرنا ہے۔ میں راستے میں سمجھاؤں گا کہ معاملات کیا ہیں؟“

زیبی دوسرے کمرے میں گئی۔ اس کے پاس جو بہترین لباس تھا، اسے پہن کر باہر آکر ایک کار میں بیٹھ گئی۔ ہم زاد رات کی تاریکی میں اسے ڈرائیو کرتا ہوا سرحد کے پار چلا آیا۔ وہاں سے اس نے ریاست کے منتظم اعلیٰ بشریٰ اور بلے کو فون پر کہا۔ ”میں فضائی راستے سے نہیں خشکی کے راستے سے آرہا ہوں۔ اپنی سرحد کے قریب پہنچ گیا ہوں۔“

ریاست کے حکمران اور ملکہ کے استقبال کے لیے عوام کثیر تعداد میں ائرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔ پریس میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے رپورٹرز، کیمرا مین اور مووی کیمرے سب ہی وہاں موجود تھے۔

جب یہ اطلاع ملی کہ ان کا حاکم اعلیٰ اپنی دلہن کے ساتھ خشکی کے راستے سے آرہا ہے تو سب ہی ادھر دوڑ پڑے پھر ایک گولی چلائے بغیر ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ مراد نے فون پر سپر پاور کے اعلیٰ حاکم سے کہا۔ ”ٹی وی آن کرو اور ہماری ریاست کا چینل دیکھو۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم جہاز میں نہیں ہو؟ یہ تمہارا فون نمبر ہے...... تم کہاں ہو؟“

”میں نے کہا نا کہ ٹی وی آن کرو پھر کسی وقت باتیں کروں گا۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے ٹی وی آن کرتے ہوئے دوسرے تمام اتحادی ممالک کو اطلاع دی۔ وہ سب اپنے اپنے ٹی وی اسکرین کے سامنے آ بیٹھے پھر انہوں نے حیرانی سے دیکھا۔ ریاست کی سرحدی چوکی پر عورتوں اور مردوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ نغمے اور موسیقی کا شور تھا۔ پٹاخے پھوٹ رہے تھے اور آسمان پر آتش بازی کے رنگا رنگ پھول کھل رہے تھے۔

مراد علی منگی ایک کھلی کار میں اپنی نئی دلہن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ریاست کے عوام والہانہ جوش و جذبے سے ان کا استقبال کر رہے تھے اور انہیں محل کی طرف لے جارہے تھے۔

وہ سب حیرانی اور بے یقینی سے دیکھ رہے تھے اور دوسری اسکرین پر اسکائپ کے ذریعے ایک دوسرے سے بول رہے تھے۔ ”وہ جو طیارے میں ہے اور ہماری حراست میں ہے، وہ مراد علی منگی کی ڈمی ہے۔ ہم دھوکا کھا چکے ہیں۔“

سپر پاور کی آرمی کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”میں شروع سے کہتا آرہا ہوں کہ ابھی اس سے دشمنی نہ کرو۔ اسے بخیریت ریاست پہنچا کر اس کا اعتماد حاصل کرو۔ اب دیکھو کہ ہم کیسی نادانی سے اس کا اعتماد کھو چکے ہیں۔“

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ ”مائی گاڈ...! اب وہ ہمارا بدترین دشمن بن جائے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اس کی دشمنی کو کم سے کم کرنے کے لیے دانشمندی یہ ہوگی کہ فوراً ہی اس کی ڈمی کو اور اس کے ذاتی طیارے کو رہا کیا جائے۔“

”ہاں، اب تو اس ڈمی کی رہائی کی شرط پر ہی کسی حد تک سمجھوتا ہو سکے گا۔“

انہوں نے اسی لمحے میں کنٹرول ٹاور کے فوجی کو حکم دیا۔ ”مراد علی منگی سے فوراً معذرت چاہو۔ اسے عزت و احترام سے اپنی ریاست میں جانے دو۔“

سپر پاور کے اعلیٰ حکام نے فون پر مراد سے رابطہ کر کے کہا۔ ”مسٹر ڈمی مراد! تم نے درست کہا تھا۔ ہمیں چھ گھنٹے کے اندر ہی حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ تم طیارے کو یہاں سے لے جاسکتے ہو۔“

رہائی ملتے ہی طیارے کا انجن جاگ گیا۔ ماہ نور خوش ہو کر مراد کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کمال کیا تھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھے ہی بیٹھے دشمنوں کو شکست دے کر اپنی منزل کی طرف اسے لے جارہا تھا۔

ہم زاد نے محل میں پہنچ کر بشریٰ اور بلّے سے تنہائی میں کہا۔ ”میں مراد نہیں ہوں اور یہ ماہ نور نہیں ہے۔ وہ دونوں طیارے میں ہیں اور دو گھنٹے کے اندر یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

اس نے تفصیل بتائی کہ دشمن ممالک نے کس طرح مکاری سے مراد کو طیارے کے ساتھ ٹریپ کیا تھا اور کس طرح مراد اور ہم زاد نے انہیں الو بنایا ہے۔

بشریٰ نے زیبی کو گلے لگا کر کہا۔ ”میری ایک بھابی آرہی ہیں۔ ایک اور ہوگئیں۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”ابھی پوری طرح تمہاری بھابی نہیں ہوئی ہیں۔ ہمارا باقاعدہ نکاح پڑھایا جائے گا۔“

بلّے نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تمہاری آدھی وائف ہے؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نے صرف زیبی کی والدہ کے سامنے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اسے اپنی شریک حیات بنایا ہے۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے قبول کیا ہے، تاکہ یہ میرے لیے نامحرم نہ رہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ جب تک باقاعدہ نکاح خوانی نہیں ہوگی، تب تک ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔“

بلّے نے کہا۔ ”یہ تم نے بالکل مراد کی طرح شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ تم دونوں کا پورا نکاح آج صبح سے پہلے ہی ہوگا۔ میں ابھی قاضی صاحب کو کال کرتا ہوں۔ مراد کے آتے ہی تم دونوں کا نکاح پڑھایا جائے گا۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”پہلے مراد کو آجانے دو۔ ابھی بہت ہی اہم معاملات سے گزرنا ہے۔ اس کا ذہن الجھا ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ ابھی میری شادی خانہ آبادی کو مناسب نہ سمجھے۔ وہ میرے معاملے کو ایک آدھ روز کے لیے ٹال سکتا ہے۔“

دو گھنٹے بعد ماہ نور اور مراد اپنی ریاست میں پہنچ گئے۔ وہ سب ان کے استقبال کے لیے ائرپورٹ آئے تھے۔ بشریٰ نے ماہ نور کو گلے لگا کر پیار کیا پھر مراد سے کہا۔ ''بھائی! میری بھائی کو بتائیں کہ میں آپ کی کون ہوں اور آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں؟''

ماہ نور نے کہا۔ ''آپ کے بھائی نے بتایا تھا کہ یہاں پہنچتے ہی ایک پاگل لڑکی آکر گلے سے لگ جائے گی اور مجھے پیار کرے گی۔ ایسے وقت مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ ماہ نور اس کے دونوں رخساروں کو چومنے لگی۔ مراد نے محل میں آکر زیبی کو دیکھا۔ ہم زاد نے کہا۔ ''میں تمہاری ہدایت کے مطابق زیب النساء کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ اس نے ہماری پلاننگ کے مطابق ہم سے بھرپور تعاون کیا ہے۔''

مراد نے بلّے سے کہا۔ ''قاضی صاحب کو کال کرو۔ کل صبح آٹھ بجے ان کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ زیب النساء کی والدہ کو یہاں عزت واحترام سے لایا جائے۔ آئندہ وہ اسی محل میں رہیں گی۔''

ہم زاد نے دور بیٹھی ہوئی زیبی کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ اسے چھونے کے لیے دوسرے دن تک انتظار کرنا تھا۔

اس نے دل میں کہا۔ ''تو نہ سہی اور سہی اور نہ سہی اور سہی۔ جینی بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ آج کی رات اس کے ساتھ گزرے گی۔''

مراد اسے اور بلّے کو اور شہر کے میئر کو ہدایات دے رہا تھا کہ ریاست میں کل بھی عام تعطیل ہوگی اور جشن منایا جائے۔ اپنے چینل سے نشر ہونے والی خبروں میں اور بریکنگ نیوز میں کہا جائے کہ ریاست کا حکمران مراد علی منگی کل صبح اپنی قوم سے اور دنیا والوں سے مخاطب ہوگا۔

وہ سب ہی تھکے ہوئے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ آج رات بے خوف وخطر گہری نیند سویا جائے۔ دوسرے دن سے پھر دشمنوں کے خلاف جہاد شروع ہوگا۔ وہ سب اپنے اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ ہم زاد نے اپنے کمرے میں آکر لباس تبدیل کیا۔ آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھتے ہوئے ایک خوشبو لباس پر اسپرے کی۔ پھر وہ آئینہ اچانک اس کے وجود سے خالی ہوگیا۔

وہ جا چکا تھا۔

☆☆☆

جینی کو اچانک ہی پراسرار طاقت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ حیوانوں میں شیر اور انسانوں میں مرد خونخوار ہوتے ہیں۔ مردوں کی اس دنیا میں کوئی بھی حسین عورت تنہا رہ کر سلامتی سے نہیں رہ سکتی۔

وہ مست ہو کر بل کھا کر سوچتی تھی۔ ''کسی کی مجال نہیں ہے کہ اب کوئی میرے خوب صورت بدن کو چھو سکے۔ گاڈ مجھے میری خواہش کے مطابق سلامتی دے رہا ہے۔ میں آدھی رات کو اکیلی عیاشوں اور بدمعاشوں کے درمیان سے گزرتی رہوں گی تو میرے قریب آنے والوں کی شامت آجائے گی اور میں کتنی دولت مند ہوگئی ہوں۔ وہ مجھے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے دے کر گیا ہے۔ آئندہ میں دریائے سین کے کنارے سب سے مہنگا اور شاندار بنگلا خرید سکوں گی۔''

ماڈلنگ کی دنیا میں سب حیران تھے۔ اشتہاری فلم کے پروڈیوسروں نے اور کئی لوگوں نے اس سے پوچھا تھا کہ جو لوگ فائرنگ کرتے ہوئے اسے کہیں لے گئے تھے، ان خطرناک لوگوں سے بچ کر وہ کیسے صحیح سلامت آگئی تھی؟

وہ بڑے فخر سے کہتی پھر رہی تھی کہ ایک جن اس پر عاشق ہوگیا ہے۔ کسی کو میرے قریب آنے نہیں دیتا۔ اب کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی مجھے کمزور عورت سمجھ کر چھونے آئے۔ جو آئے گا اسے میرا جن عاشق الٹا لٹکا دے گا۔

اس کی اس بات پر کسی کسی نے یقین کیا۔ باقی سب نے کہا۔ ''وہ خطرناک لوگوں سے بچ کر آ ہی نہیں سکتی تھی۔ کسی نے اسے اچھی طرح استعمال کرنے کے بعد واپس بھیج دیا ہے۔''

یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنی پارسائی جتانے کے لیے جھوٹ بول رہی تھی۔ اس سائنسی دور میں ایک جن کا قصہ سنا رہی تھی۔ یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات تھی کہ کوئی یار عاشق ہے اور وہ نظر نہیں آتا ہے۔

جینی کو پروا نہیں تھی کہ دنیا اس کے بارے میں کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے سوچا۔ ''جو آزمانے آئے گا۔ وہ مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی ہاتھ پاؤں سے اپاہج ہو جائے گا۔''

راجر ڈی سوزا کی انگلی کسی ہتھیار کے بغیر کیسے کٹ گئی تھی؟ یہ منظر جینی نے دیکھا تھا۔ وہ ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے چھونے والے کو اس نے خود سزا دی ہو۔ اب اس کے دل میں رہ رہ کر تجسس پیدا ہو رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے؟

''مائی گاڈ! کتنا پراسرار ہے۔ مجھے چھو لیتا ہے۔ میرے چہرے سے سفر کرتا ہوا کہاں کہاں پہنچتا رہتا ہے۔ تیز روشنی میں بھی نظر نہیں آتا۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے اور اچھا لگتا ہے۔

"اپنے بدن کے مسافر کو سب ہی دیکھتے ہیں۔ میں نہیں دیکھ پاتی۔ ایسا تجسس ایسی سنسنی سی جاری رہتی ہے کہ میں اسے چھوتی پکڑتی رہتی ہوں اور اس کی آنکھ مچولی ختم نہیں ہوتی۔ وہ نادیدہ مسافر مجھے تھکا مارتا ہے۔"

اچانک اس کی سانسیں خوشبو خوشبو سی ہوگئیں۔ اس نے ہم زاد سے کہا تھا کہ تم اچانک آکر پکڑو گے تو ڈر جاؤں گی۔ میری سانسیں رک جائیں گی۔ پلیز آنے سے پہلے کوئی ہلکا سا اشارہ دیا کرو۔

ہم زاد نے کہا تھا۔ "میں اچانک آکر نہیں پکڑوں گا اور نہ ہی آواز دوں گا۔ جب بھی خوشبو محسوس کرو تو سمجھ لیا کرو کہ خوشبو خوشبو ہونے آگیا ہوں۔"

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "مائی گڈنس۔ تم آگئے ہو؟"

دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔ "ہاں...!"

اس نے آواز کی سمت دیکھ کر پوچھا۔ "یہاں ہو؟"

اس کا ہاتھ بیڈ کے سرے پر رکھا ہوا تھا۔ خوشبو وہاں پہنچ گئی۔ اسے اپنی ہتھیلی کی پشت پر سفاک ہونٹوں کا بوسہ محسوس ہوا۔ آواز آئی۔ "یہاں ہوں..."

جینی نے وہاں دوسرا ہاتھ رکھا۔ اچانک اس کی گردن سے زلفیں ایک طرف سمٹ گئیں... گردن پر سلگتے ہوئے ہونٹ آگئے۔ "میں یہاں ہوں..."

"پلیز! اپنی جینی کو ایک بار دکھائی دو۔"

"مجھے افسوس ہے۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"تم پیدائشی ایسے نہیں ہوگے، تمہارے ماں باپ نے تمہیں دیکھا ہوگا۔ تمہارے قریبی رشتے داروں نے بھی تمہیں دیکھا ہوگا؟"

"کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے بھی اپنے ماں باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بھی پیدائشی نادیدہ تھے۔"

"او گاڈ! ایسا تو کبھی دیکھنے میں سننے میں نہیں آیا۔ قصے کہانیوں میں غائب ہوجانے والوں کی باتیں پڑھی ہیں لیکن یہ کبھی نہیں پڑھا کہ پورا خاندان نادیدہ ہوتا ہے۔"

"تم نے نہیں پڑھا...؟" گردن پر سانسوں کا بھبکا پہنچا۔ "دنیا والوں نے بھی نہیں دیکھا..." اک بوسہ لہرایا۔

"اس کے باوجود حقیقت سامنے ہے میری جان...! تم ایک نادیدہ کی آغوش میں ہو۔"

وہ آغوش میں تھی اور ایسی انوکھی مسرتیں حاصل کررہی تھی جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوسکتی تھیں۔

شاور کے بعد جینی نے کہا۔ "ابھی ہم آؤٹنگ کے لیے جائیں گے۔"

وہ بولا۔ "رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔"

وہ بولی۔ "قحبہ خانے، شراب خانے اور نائٹ کلبس ساری رات مستی میں رہتے ہیں۔ یہاں کے ایک مہنگے نائٹ کلب میں دنیا کے امیر ترین عیاش آتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں چاہتی ہوں، وہ مجھے تنہا دیکھ کر للچائیں اور مجھے حاصل کرنے کے لیے کمینگی پر اتر آئیں۔"

وہ سینہ تان کر بولی۔ "میں ساری دنیا کو دکھانا چاہتی ہوں کہ مجھ اکیلی کو بڑے سے بڑا شہ زور بھی حاصل نہیں کرسکے گا۔ یہاں سب کو حیران کرنا چاہتی ہوں۔ دنیا والوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ ایک جن مجھ پر عاشق ہے۔ وہ کسی عیاش دولت مند کو کسی تیس مار خاں کو میرے قریب پہنچنے نہیں دے گا۔"

وہ ایک مختصر سا پرکشش لباس پہن کر باہر آئی۔ باہر سرخ رنگ کی اسپورٹس کار چھت کے بغیر کھلی تھی۔ دور سے نظر آسکتا تھا کہ ایک اکیلی حسینہ تنہا کار ڈرائیو کرتی ہوئی جارہی ہے پھر یہ کہ کار کی طرح مختصر سا لباس بھی کھلا کھلا سا تھا۔ اس کے بدن کا نظارہ جگہ جگہ سے دعوت دے رہا تھا۔

"مرد کے بچو! آؤ مجھے ہاتھ تو لگاؤ۔"

وہ ڈرائیو کرتی ہوئی ایک شاہراہ پر آگئی۔ اس نے اونچی آواز میں آڈیو کیسٹ کو آن کررکھا تھا۔ پاپ میوزک اور گیت کی آواز دور تک گونجتی جارہی تھی اور یہ بتاتی جارہی تھی کہ جینی جوزف ہوا میں اڑتی جارہی ہے۔ اسے پکڑو۔

ہم زاد برابر والی سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس حسینہ کی مسرتوں سے اور جوش و جذبوں سے محظوظ ہورہا تھا۔ پھر منچلے جوانوں کی ایک ٹولی اس کے پیچھے پڑگئی۔ وہ تعداد میں دس تھے اور پانچ موٹر سائیکلوں پر تھے۔ سیٹیاں بجاتے اور ہلا گلا کرتے مستیاں کرتے آرہے تھے۔

اس ٹولی کی دو موٹر سائیکلیں اس کے دائیں بائیں آگئیں۔ ایک نے اس کے بالکل قریب ہوکر موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے کہا۔

"ہے...... تم جینی جوزف ہو نا؟"

وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ "ہاں۔ میں بہتی ہوئی ہوا ہوں۔ کوئی ہوا کو مٹھی میں پکڑ نہیں سکتا۔"

اس نے بھی زوردار قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "چیلنج نہ کرو۔ ہم ابھی اٹھا کرلے جائیں گے۔"

"میں پھول کی طرح ہلکی اور پہاڑ کی طرح بھاری ہوں۔ تمہارا باپ بھی مجھے اٹھا کر نہیں لے جاسکے گا۔"

"اچھا تو دیکھو۔ ہم کس طرح تمہیں کار روکنے پر

مجبور کرتے ہیں۔"

وہ دو موٹر سائیکلوں والے اس کا راستہ روکنے کے لیے رفتار بڑھا کر آگے جانے لگے۔ پیچھے ان کے ساتھی بھی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ وہ آگے جا کر تمام موٹر سائیکلوں کو بریک لگا کر اسے آگے جانے سے روک سکتے تھے۔

ایسے ہی وقت ایک کے سینے پر لات پڑی۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ موٹر سائیکل ان کے نیچے سے نکل کر آگے کی طرف دوڑتی ہوئی سڑک کے کنارے گر پڑی۔ دونوں سوار سڑک پر پڑے کراہ رہے تھے۔

دوسرے دو ساتھیوں کو بھی لاتیں پڑیں۔ وہ موٹر سائیکل بھی ان کے نیچے سے نکل گئی۔ دوسری تین موٹر سائیکلیں رک گئی تھیں وہ اپنے زخمی ساتھیوں کو سنبھال رہے تھے۔

جینی کار روک کر باہر آگئی۔ پاپ میوزک شور مچا رہا تھا۔ وہ اس کی دھن پر بیچ سڑک پر ناچنے لگی۔ کہنے لگی۔ "کم آن۔ تمہیں لاتیں مار کر ناچ رہی ہوں۔ آؤ مجھے اٹھا کر لے جاؤ۔"

ان میں سے ایک جوان طیش میں آکر اسے دبوچ لینے کے لیے دوڑا لیکن اس کے قریب پہنچنے سے پہلے اچھل کر اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کے یار نے آنے والے کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تھی۔ جینی قہقہے لگانے لگی۔

باقی پانچ جوانوں میں سے ایک نے کہا۔ "یہ ہماری مردانگی کو للکار رہی ہے۔"

دوسرے نے پوچھا۔ "لیکن ہمارے چار ساتھی گاڑیوں پر سے کیسے گر پڑے؟ اور وہ راجر' جینی کے سامنے اوندھے منہ کیسے گر پڑا ہے؟ کیا یہ بلیک میجک جانتی ہے؟"

تیسرے نے کہا۔ "اگر ہم بیک وقت اس پر حملہ کریں گے تو اس کا بلیک میجک دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔"

بات ختم ہوتے ہی کہنے والے کے منہ سے ایک کراہ نکلی وہ پیٹ پکڑ کر جھکنے لگا۔ دوسرے کے منہ پر کراٹے کا ہاتھ پڑا۔ تیسرے کے سینے پر فلائنگ کک لگی۔ باقی دو جوان گھونسے اور کراٹے کے ہاتھ ادھر ادھر چلاتے ہوئے چیخنے لگے۔ "کون ہے؟ یہاں کون حملے کر رہا ہے؟ ہمارے سامنے آؤ۔"

ایک کی کمر پر لات پڑی۔ وہ دوسرے سے ٹکرا گیا پھر وہ سب اٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگے۔ اس شاہراہ پر کئی گاڑیاں رک گئی تھیں۔ گشتی پولیس کی دو گاڑیاں آگئی تھیں۔

وہ تمام نوجوان پولیس والوں سے اور دوسرے لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ "آپ سب جانتے ہیں۔ یہ مشہور ماڈل جینی جوزف ہے۔ یہ بلیک میجک جانتی ہے۔ اس نے ہمارے چار ساتھیوں کو زخمی کیا ہے اور ہم سب کی پٹائی کی ہے۔"

جینی نے کہا۔ "میں پاگل نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ دس نوجوانوں سے چھیڑ چھاڑ کروں گی۔ یہ سب مجھے لوٹ کا مال سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔"

پولیس افسر نے پوچھا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ' تم نے ان سے تنہا کیسے مقابلہ کیا ہے؟"

وہ بڑے فخر سے بولی۔ "ایک جن میرا پیار دلدار ہے۔ یہ مجھ پر عاشق ہے۔ یہ ابھی یہاں موجود ہے۔ کسی کو نظر نہیں آتا ہے۔ مجھے اپنی ملکیت بنا چکا ہے۔ جو بھی مجھے چھونے آتا ہے' اس کی اچھی طرح پٹائی شروع کر دیتا ہے۔"

افسر نے ناگواری سے کہا۔ "کیا بکواس کر رہی ہو؟ بلیک میجک قانوناً جرم ہے۔ تم اپنا جرم چھپانے کے لیے کسی جن کی بات کر رہی ہو۔ تم ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو اور کسی جن کا وجود ثابت کرو۔"

"کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی سب کے سامنے یہیں ثابت کر دوں گی۔"

وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر بولی۔ "میں جا رہی ہوں۔ میرا جن کسی کو میرا راستہ روکنے نہیں دے گا۔"

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ افسر نے کہا۔ "سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلو۔ ورنہ..."

بات ادھوری رہ گئی۔ افسر کے ہولسٹر سے آپ ہی آپ ریوالور نکل گیا۔ اس نے بوکھلا کر دیکھا۔ وہ خود اپنے ریوالور کے نشانے پر آگیا تھا۔ پھر ایک گولی اس کے قدموں کے پاس چلی۔ وہ اچھل کر پیچھے چلا گیا۔

تمام سپاہیوں نے اپنی اپنی گنیں سنبھال لیں لیکن وہ کس پر گولیاں چلاتے؟ ان کے افسر کا ریوالور بھی غائب ہو گیا تھا۔

ہم زاد نے کہا۔ "آفیسر! ہم قانون کا احترام کرتے ہیں۔ جینی کوئی جادوگرنی نہیں ہے۔ میں اس کا عاشق جن ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اسے پریشان نہ کریں' جانے دیں۔"

پھر اس افسر نے حیرانی سے دیکھا۔ اس کا ریوالور اس کے ہولسٹر میں واپس آگیا تھا۔ اس نے حیرانی اور پریشانی سے جینی کو دیکھا پھر کہا۔ "تم جا سکتی ہو۔"

اس نے خوشی سے مٹھی باندھ کر اسے فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "ہپ ہپ ہرے..."

پھر وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گئی۔ سب پیچھے رہ گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ "گھر واپس چلو۔"

وہ بولی۔ ''ابھی نہیں۔ بڑا مزہ آرہا ہے۔ ہم یہاں کے سب سے مہنگے نائٹ کلب میں جائیں گے۔ وہاں امیر ترین لوگوں سے جوا کھیلنے کا مزہ آئے گا۔''

''نائٹ کلب کل جائیں گے۔ ابھی میرا واپس جانا بہت ضروری ہے۔''

وہ ناراض ہوگئی۔ واپسی پر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ ذرا نخرے دکھا کر اسے راضی کرنا چاہتی تھی۔ ہم زاد مجبور تھا۔ اسے محل میں جاکر نیند پوری کرنی تھی۔ دوسری صبح ایک نئی نویلی دلہن اس کی زندگی میں آنے والی تھی۔

وہ گھر پہنچ کر بولا۔ ''تمہاری یہ ناراضگی یہ نخرے اچھے لگ رہے ہیں۔ بڑا پیار آرہا ہے تم پر...... لیکن تمہیں منانے کا وقت نہیں ہے۔ میں بہت مصروف رہوں گا۔ اس لیے تیس گھنٹے کے بعد آکر تمہیں مناؤں گا۔''

وہ چیخ کر بولی۔ ''تیس گھنٹوں تک انتظار نہیں کرسکوں گی۔ اس دوران میں کوئی دشمن آکر مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''جیسے ہی خطرہ محسوس کرو فوراً مس کال دو۔ میں آجاؤں گا لیکن یہ اچھی طرح یاد رکھو۔ جب زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہوجائے اور تم بہت مجبور ہوجاؤ، تب ہی مجھے کال کرنا۔ محض ملاقات کرنے اور ہوس مٹانے کے لیے بلاؤ گی تو پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ ساری عمر مجھے ڈھونڈتی رہ جاؤ گی۔''

جینی نے آواز کی سمت ہاتھ بڑھا کر اسے ٹٹولا پھر اسے پاکر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ وہ پیار سے اس کے آنسو پونچھ کر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

پچھلی رات سے ریاستی چینل کے ذریعے یہ خبر سنائی جارہی تھی کہ ہز ہائی نس مراد علی منگی اپنی قوم سے خطاب کریں گے۔ اس اطلاع نے تمام دشمنی کرنے والے ممالک میں ہلچل پیدا کردی تھی۔ وہ یہ سننے کے لیے بے چین ہوگئے تھے کہ مراد ان سے کیا کہنے والا ہے؟ انہوں نے اپنی دانست میں مراد کی ڈمی کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ اس سے بدسلوکی نہیں کی تھی۔ صرف اس کا راستہ روکنے کی غلطی کی تھی پھر معذرت چاہتے ہوئے اسے اپنے طیارے میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

وہ امید کررہے تھے کہ مراد ان سے راضی رہے گا کیونکہ انہوں نے غلطی کرنے کے بعد فوراً ہی تلافی کی تھی۔

وہ دس بجے سے پہلے ہی مراد کے فون نمبر پنچ کررہے تھے اور مایوس ہورہے تھے۔ اس نے سم بدل دی تھی۔

آٹھ بجے زیب النساء کا نکاح ہم زاد سے پڑھایا گیا۔ وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ ویسے دُلہا دُلہن کو فی الحال تنہائی میں ملنے کا اور ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ پہلے اہم سیاسی معاملات سے نمٹنا ضروری تھا۔ محل کے ایک کمرے میں.. ٹی وی کیمرے اور ساؤنڈ ریکارڈنگ کے آلات سیٹ کیے جارہے تھے۔

ٹھیک دس بجے ریاست کے عوام نے اور دشمن ممالک کے حکمران اور تمام عہدیداران نے ہم زاد اور زیب النساء کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا۔ ہم زاد نے کہا۔ ''میں اپنے عوام کا شکر گزار ہوں۔ انہوں نے کل رات میرا اور میری دلہن کا والہانہ استقبال کیا اور ہمیں بھرپور محبتیں دیں لیکن میں اپنے عوام سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔ سچ یہ ہے کہ میں اس ریاست کا حاکم اعلیٰ مراد علی منگی نہیں ہوں۔''

یہ سن کر تمام مخالفین بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔ وہ ذرا چپ رہ کر بولا۔ ''ہز ہائی نس نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے مجھے اپنا ہم شکل بنایا ہے۔''

سپر پاور اور اتحادی ممالک اسے اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ یہ معلوم ہورہا تھا کہ جسے وہ اصلی مراد سمجھ رہے تھے وہ نقلی تھا۔ مراد کی ڈمی تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''میرے عوام توجہ سے سنیں۔ ہمارے ہز ہائی نس اپنی دلہن کے ساتھ کراچی سے یہاں آنا چاہتے تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ ہمارے دشمن ہمیں یہاں تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ ان کا اندیشہ درست نکلا۔ ہز ہائی نس کو یہاں آنے سے پہلے ہی ٹریپ کیا گیا۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا جہاز ایک ویرانے میں اتاریں اور ان کے قیدی بن جائیں۔ انہوں نے جہاز اتار دیا۔ ایک پوری فوج انہیں گرفتار کرنے آئی تھی لیکن ہز ہائی نس نے جہاز سے باہر آکر قیدی بننا گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے چھ گھنٹے کی مہلت حاصل کی۔ ان چھ گھنٹوں کے اندر دشمنوں نے ٹی وی چینل کے ذریعے دیکھا کہ ریاست کے عوام ہائی وے پر اپنے حاکم اعلیٰ کا کیسا شاندار استقبال کررہے ہیں۔ ان دشمنوں سے کہا گیا کہ انہوں نے ہز ہائی نس کے ڈپلیکیٹ کو ٹریپ کیا ہے۔ اصل تو اپنی ریاست میں پہنچ گئے ہیں۔ تب انہوں نے اپنی غلطی کی تلافی کے لیے ہز ہائی نس کو ڈپلیکیٹ سمجھ کر رہا کردیا۔''

یہ الّو بنا دینے والی ایسی بات تھی کہ تمام ممالک کے حکمران اور اکابرین اسکائپ پر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

ہم زاد کہہ رہا تھا۔ ''میرے ہم وطنو...! آپ کے

حاکم اعلیٰ عزت مآب محترم مراد علی منگی کل رات آپ کی نئی ملکہ کے ساتھ یہاں بخیریت پہنچ گئے ہیں اور اب آپ کے سامنے تشریف لا رہے ہیں۔ ہز ہائی نس کو مجھ پر اور آپ سب پر فخر ہے کہ کل رات ایک نقلی ہز ہائی نس کا استقبال کرکے انہیں دشمنوں کی قید سے رہائی دلائی ہے۔ میرے بزرگو! میری ماؤ! میری بہنو! اور میرے بھائیو...! ہز ہائی نس آپ کا شکریہ ادا کرنے تشریف لا رہے ہیں۔ تھینکس گاڈ۔ لیو لانگ آور ہز ہائی نس مراد علی منگی...''

یہ کہہ کر ہم زاد زیب النساء کے ساتھ اسکرین سے آؤٹ ہوگیا۔ مراد اپنی دلہن ماہ نور کے ساتھ آ کر بولا...

''السلام علیکم۔ اللہ تعالیٰ ہی عزت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ذلت دیتا ہے۔ ہم عبادت کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں اور اپنی خیر مناتے ہیں۔ بہترین اعمال کے صلے میں ہی عزت ملتی ہے اور بعض اوقات سیاسی حکمت عملی سے ہی سلامتی ملتی ہے۔ یہ میری شریک حیات ماہ نور منگی ہیں۔ میرے ہی منگی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ میرے دل میں رہنے والی آج سے اس ریاست کی ملکہ معظمہ ہیں۔''

معزول ہونے والی ملکہ نگار خانم ٹی وی کے سامنے بیٹھی مراد کو اور نئی ملکہ کو دیکھ رہی تھی۔ سینے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ وہ بہت اونچے مقام سے گر کر پستی میں چلی آئی تھی۔ اگر مراد کی منکوحہ بن کر رہتی تو جلاوطنی کے یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ یہ مان رہی تھی کہ عورتوں کی حکمرانی بھی قائم نہیں کرسکے گی۔ اب وہ ملکہ نہیں رہی تھی۔ آئندہ کسی سے شادی کرتی تو اس شوہر کو تابعدار بنا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔

ماہ نور اسکرین سے آؤٹ ہوگئی تھی۔ مراد کہہ رہا تھا۔

''میرا اعتماد حاصل کرنے والو! میرے دوست بن کر رہنے والے دشمنو! کف افسوس ملتے رہو۔ اصلی مراد علی منگی تمہاری گرفت میں آ کر مکھن کے بال کی طرح نکل گیا ہے۔ تم ایک بھی گولی نہ چلا سکے۔ میرے بدن پر ہلکی سی خراش بھی نہ ڈال سکے۔ خود پر لعنت بھیجو کہ مجھے چھو بھی نہ سکے۔ اسے کہتے ہیں، سیاست۔ اب میں ایک ریاست کا حکمران بن چکا ہوں تو آئندہ تمہیں سیاست سکھاؤں گا۔ پہلے یہ سیکھ لو کہ مجھ جیسے ایک چھوٹی سی ریاست کے حکمران کو کسی بھی ہتھکنڈے سے اپنا ماتحت نہیں بنا سکو گے۔ نہ اپنی طاقت سے دبا سکو گے۔ نہ ہوائی حملوں سے ڈرا سکو گے۔ تمہاری آرمی کے سیکڑوں سپاہی مارے گئے ہیں۔ کئی طیارے اور ہیلی کاپٹرز تباہ ہو چکے ہیں۔ اسلحے کا گودام دھماکوں سے اڑایا گیا ہے۔ آئندہ اس سے بھی زیادہ تباہی و بربادی کے مناظر دیکھو گے۔ اگر میں اپنی حکمت عملی نہ آزماتا تو ابھی اس وقت تمہاری قید میں ہوتا۔ پھر تم کیا کرتے؟ یہ اندازہ ہے کہ مجھے ٹارچر سیل میں لے جا کر مجھ پر مظالم ڈھانے کی انتہا کر دیتے اور آخر میں مجھے گولی مار دیتے۔ میرے اللہ نے مجھے سلامتی دی ہے۔ میں تمہاری کم ظرفی اور کمینگی کو بھی نہیں بھولوں گا۔ شیطان کو پتھر ضرور مارنا چاہیے اس لیے میں انتقامی کارروائی کروں گا اور کیا کروں گا یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ ابھی میرے عوام میری سلامتی کا جشن منا رہے ہیں۔ میں دو روز تک ان کی مسرتوں میں شریک رہوں گا۔

''دو روز تک کوئی مجھ سے فون پر بات نہ کرے۔ کوئی ہمارے ملکی اور سیاسی معاملات کو نہ چھیڑے۔ دو دنوں کے بعد میں سیاسی معاملات پر اسکائپ کے ذریعے باتیں کروں گا۔''

اس کی تقریر سیاسی محاذ پر تمام ممالک کو اپ سیٹ کر رہی تھی۔ کئی حکمران اسے مغرور اور بددماغ کہہ رہے تھے۔ اکثر ملکوں کے عوام کہہ رہے تھے کہ سپر پاور کا طلسم توڑنے والا ایک جانباز آگیا ہے۔

پوری دنیا میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ دنیا کے نقشے میں وہ ریاست واقعی ایک نقطے کے برابر تھی اور پہاڑوں کی برتری تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ بڑی طاقتیں مجبور بھی تھیں اور مشتعل بھی ہو رہی تھیں۔ مراد علی منگی ایک تنہا شخص تھا۔ اس کے چیلنج کے باعث بڑی انسلٹ ہو رہی تھی اور وہ انسلٹ کرکے دو روز تک اپنے عوام کے ساتھ جشن منانے اور ناچنے گانے والا تھا۔

اب تک تو یہی ہوتا آیا تھا جو بھی ملک ان کی برتری تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا اور ان کا تابعدار نہیں بنتا تھا وہ بری بحری اور فضائی فوج لے کر اس پر چڑھ دوڑتے تھے لیکن اس ننھی سی ریاست پر حملہ کرنے کی بھی جرأت کرنے والے نہیں تھے۔ سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک بیان دے رہے تھے کہ ہم خون خرابا نہیں چاہتے۔ اس لیے... ہز ہائی نس مراد علی منگی سے امن و امان اور صلح جوئی کی توقع کرتے ہیں۔ ہم دو روز بعد ہز ہائی نس سے مذاکرات کریں گے اور وہ آپس میں یکجا ہو کر مذاکرات کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک ہی بنیادی سوال چیخ رہا تھا کہ مراد کے پاس کیسی نہ سمجھ میں آنے والی غیر معمولی قوت ہے جس کے ذریعے وہ تنہا پوری آرمی کو شکست دے دیتا ہے؟

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ''وہ آئندہ بھی ہمارے طیاروں کو اور ہیلی کاپٹروں کو تباہ کرے گا اور ہم پہلے کی طرح منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ ہم کبھی معلوم نہیں کر سکیں

گے کہ اسے کیسی پراسرار قوتیں حاصل ہوگئی ہیں؟"

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "سب سے پہلے ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ وہ کسی طرح کی پراسرار قوت کا حامل ہے۔ اس کے پاس آبدوز کشتی نہیں ہے اور اس نے گہرے سمندر میں پہنچ کر ہیلی کوپٹرز کو تباہ کیا تھا۔"

ایک نے تائید کی۔ "ہاں۔ یہ ثابت ہوتا آرہا ہے کہ وہ کسی پراسرار قوت کے ذریعے ہی ہماری آرمی کو شکست دے چکا ہے۔ آئندہ بھی وہی قوت ہمیں شکست سے دوچار کرے گی۔"

"اب سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہم اس قوت کے مقابلے میں پھر اپنی فوج کو استعمال کرنے کی غلطی کریں گے؟"

سپر پاور کے فوجی افسر نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ سب سے زیادہ ہم نے نقصان اٹھایا ہے۔ ہمارے سیکڑوں سپاہی مارے گئے ہیں۔ ہمارے طیارے اور ہیلی کاپٹرز تباہ ہوئے ہیں۔ ہم فی الحال اپنی فوجی قوت ضائع نہیں کریں گے۔"

ایک نے پوچھا۔ "کیا اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیں گے؟ اسے سپر پاور تسلیم کرلیں گے؟"

سپر پاور کے ماہر سیاستداں نے کہا۔ "ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم کسی جیسی ریاست کو سپر پاور مان لیں۔"

وہ مٹھی باندھ کر بولا۔ "ہم عسکری جنگ نہیں لڑیں گے۔ سیاسی حربے آزمائیں گے۔"

ایک نے پوچھا۔ "وہ سیاسی حربے کیا ہوں گے؟"

"یہی کہ فی الحال ہم اس کے ہر فیصلے کو تسلیم کریں گے۔ اسے یہ تاثر دیں گے کہ ہم شکست خوردہ ہیں۔ اس کی انتقامی کارروائی کو برداشت کرلیں گے۔ جوابی کارروائی نہیں کریں گے اور چپ چاپ کئی طرح کے ہتھکنڈے سے اس کی پراسرار قوت کا سراغ لگائیں گے۔ پھر اس قوت کا توڑ معلوم کریں گے۔ اس سے نمٹنے کے لیے اچھا خاصا وقت لگے گا۔ مہینوں گزر جائیں گے لیکن ہم اس کا بھید معلوم کرکے اس کا توڑ ضرور کریں گے۔ ہمیں بہت صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔"

ایک ماہر پلان میکر نے کہا۔ "ہم مراد کی ایک اور بڑی کمزوری سے کھیل سکتے ہیں۔"

سب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "ماروی اور محبوب کو وہ دل و جان سے چاہتا ہے۔ ان دونوں سے کتنا گہرا لگاؤ ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کریں کہ وہ لندن میں ماروی کو تحفظ فراہم کرتا رہا پھر اسے کراچی لے آیا۔ محبوب کو بیچ سمندر میں قیدی بنا کر رکھا گیا

تھا، اسے وہاں سے بھی نکال لایا۔ اب وہ دونوں کراچی کی ایک کوٹھی میں ہیں۔ اگر ہم اس کوٹھی کو ان کا قید خانہ بنادیں، جگہ جگہ ان کے قدموں تلے بارود بچھا دیں اور انہیں یہ بتادیں کہ جب بھی وہ کوٹھی سے باہر قدم رکھیں گے، ایک دھماکے سے ان کے چیتھڑے اڑ جائیں گے، تب مراد ضرور مجبور ہوجائے گا۔"

ایک نے کہا۔ "بہت کمزور پلان ہے۔ جو شخص بیچ سمندر سے محبوب کو نکال کرلا سکتا ہے، کیا وہ اس کی کوٹھی سے اسے نکال کر نہیں لاسکے گا؟ سوچو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یقیناً پھر ہماری شامت آجائے گی۔"

پلان میکر نے کہا۔ "پہلے میری پوری بات سنیں۔ ہم ماروی اور محبوب کا محاصرہ نہیں کریں گے۔ ہماری آرمی یا پاکستان کے زرخرید سپاہی وہاں نہیں جائیں گے۔ ہم بیان دیتے رہیں گے کہ مجرموں کی وہ خطرناک تنظیمیں جو نائن الیون ----- سے خدا واسطے کا بیر رکھتی ہیں، وہ ایسی دشمنی کررہی ہیں۔ ہمارا ایک بھی سپاہی ایک بھی ہتھیار وہاں نہیں پایا جائے گا۔ مراد کو ہمارے خلاف نہ کوئی ثبوت ملے گا، نہ وہ ہمارے خلاف انتقامی کارروائی کرے گا۔"

کئی حکمران اور فوجی افسران نے تائید میں سر ہلایا۔ ایک نے کہا۔ "ہاں۔ اس منصوبے پر غور کیا جاسکتا ہے۔ ہم اسے قابلِ عمل بنا سکتے ہیں۔"

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ "آپ حضرات کتنے ہی منصوبے بنالیں۔ میں تو ایک ہی بات جانتا ہوں۔ وہ نمازی ہے۔ پکا عبادت گزار ہے۔ اسے کوئی روحانی قوت حاصل ہوگئی ہے۔ ہم اسے کبھی زیر نہیں کرسکیں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "اور میں کہتا ہوں، انسان سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔ اگر روحانی قوتوں سے ڈرتے ہو تو یہ تمہاری کمزوری ہے۔ یہ جو آندھی طوفان آتے ہیں اور زلزلوں سے تباہی ہوتی ہے تو یہ کیا ہیں؟ یہ قدرتی آفات ہیں۔ انہیں روحانی غضب ناک قوتیں کہہ لو۔ ہم انسان آندھیوں کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ زلزلے آتے ہیں۔ تباہ کرتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ہم پھر سے نیا شہر آباد کرلیتے ہیں اگر مراد نے کوئی روحانی قوت حاصل کی ہے تو ہم اپنی ذہانت سے اور حکمتِ عملی سے اس طاقت کو کمزور بناسکیں گے۔ ایک بار معلوم تو ہوجائے کہ اسے کیسی قوت حاصل ہوگئی ہے اور وہ کیسے طریقہ کار سے ہمیں ڈراتا آرہا ہے۔ جب راستہ دکھائی دے گا تو ہم ہزار راستے بنا کر اسے دبوچ لیں گے۔"

مراد وہاں موجود تھا۔ ان کی تمام باتیں سن رہا تھا۔ وہ اجلاس کے اختتام پر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

کاتبِ تقدیر نے دو دنوں تک عیش و آرام لکھ دیا تھا۔ ماہ نور، مراد، زیب النساء، ہم زاد، بشریٰ اور بلّے نے تمام مسائل کو اور تمام دشمنوں کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ یہ طے کرلیا تھا کہ ہر غم سے بے نیاز ہوکر ہنستے بولتے، ناچتے گاتے اور خوب گھومتے پھرتے رہیں گے۔ ریاست کے عوام بھی دل کھول کر جشن منارہے تھے۔

ہم زاد کو نئی دلہن مل گئی تھی۔ وہ تیس گھنٹے کے لیے جینی کو بھول گیا تھا۔ وہ نئی کے سامنے ذرا پرانی ہوگئی تھی۔ زہی اس پر سحر طاری کررہی تھی۔ وہ اچھی لگ رہی تھی اور پتا نہیں وہ کب تک اچھی لگتی رہتی۔ وہ پارہ صفت تھا۔ ریل گاڑی کی طرح پٹڑیاں بدلتے ہوئے زندگی کا سفر طے کرنا چاہتا تھا۔

مراد ماہ نور کو پاکر بہت خوش تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ ایک اچھی لائف پارٹنر ثابت ہوگی۔ وہ اس کے ساتھ ایک کار میں بیٹھ کر پوری ریاست میں گھومتا پھرتا رہا۔ بشریٰ اور بلّے بھی ان کے ساتھ رہے۔ ایسے وقت وہ اپنے ساتھ ایک بھی سیکیورٹی گارڈ نہیں رکھتے تھے۔ مراد اور ہم زاد وقتاً فوقتاً تمام دشمنوں کے اجلاس میں جاتے تھے۔ ان کی تنہائی میں ہونے والی رازدارانہ گفتگو بھی سنتے تھے پھر خاموشی سے واپس آجاتے تھے۔ انہیں اطمینان ہوگیا تھا کہ دو روز تک کوئی دشمنی کرنے نہیں آئے گا۔

حالات رہ رہ کر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ اب اس طرح کروٹ بدل رہے تھے کہ ہیروں کی کان کے مالک راجر ڈی سوزا نے اخبارات میں بیان دیا تھا۔ جینی اس کے قلعے سے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے لے گئی ہے لیکن میں اسے نہ روک سکا نہ اور کوئی روک سکے گا۔ اس نے مزید کہا تھا کہ جینی کے پیچھے کوئی پراسرار قوت ہے کوئی شخص چھپا رہتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا۔ وہ راجر ڈی سوزا کے کئی سیکیورٹی گارڈز کو ہلاک کرچکا ہے۔

راجر ڈی سوزا نے کہا تھا کہ وہ جینی کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کرائے گا۔ اس کے نادیدہ مددگار سے دشمنی مول لینے کی غلطی نہیں کرے گا۔

اس سے سوال کیا گیا۔ ''کیا جینی کو کسی طرح کی پراسرار قوت حاصل ہوگئی ہے یا واقعی اس کے ساتھ کوئی نادیدہ ہستی ہے جو اس کی محافظ ہے اور اسے فائدہ پہنچاتی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں جن بھوت کو مانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کوئی جن اس پر عاشق ہوگیا ہے۔''

جلد ہی اس کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ دوسری رات شہر کے ایک پولیس افسر نے اور دس نوجوانوں نے بیان دیا کہ جینی کو پراسرار قوت حاصل ہوگئی ہے۔ وہ اپنی زبان سے کہہ رہی تھی کہ اس پر ایک جن عاشق ہوگیا ہے۔ کوئی مائی کا لال اسے ہاتھ نہیں لگاسکے گا۔

پولیس افسر نے بیان دیا تھا۔ ''میں نے زندگی میں پہلی بار ایسا جادوئی تماشا دیکھا ہے۔ میرا ریوالور میرے ہولسٹر سے خودبخود نکل کر میرے سامنے آگیا تھا۔ اس جن نے مجھے گولی نہیں ماری۔ میرے قدموں کے پاس فائر کرنے کے بعد ریوالور کو واپس میرے ہولسٹر میں رکھ دیا۔ وہ کوئی بہت ہی نیک جن ہے۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا ہے بلکہ دل پھینک بدمعاش جوانوں کو سزائیں دیتا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں ایسے دو چار جن اور پیدا ہوجائیں تو یہاں سے بے شرمی، گناہ اور جرائم ختم ہوجائیں گے۔''

یہ بیانات یورپ کے تمام اخبارات میں جینی کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ کئی ملکوں کے حکام اور فوجی افسران نے ان بیانات کو پڑھا۔ ان سب کے دماغوں میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ یہ خیال آیا کہ وہ سچ مچ کوئی جن ہے تو اس سے بہت بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔

ایک بار پھر تمام اعلیٰ حکام اور فوجی افسران اسکائپ کے ذریعے ایک دوسرے سے بولنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''وہ جن نادیدہ رہ کر مراد کی پراسرار قوتوں کا راز معلوم کرسکے گا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''اور وہی جن اس کی پراسرار قوتوں کا توڑ کرسکے گا۔ مراد اس نظر نہ آنے والے جن کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ یعنی ہمارے قدموں میں آجائے گا۔''

تیسرے نے شبہ ظاہر کیا۔ ''مجھے تو یقین نہیں آتا۔ کہیں یہ قصے کہانیوں والی بات نہ ہو؟''

دوسرے نے کہا۔ ''سانچ کو کیا آنچ؟ جینی کو گورنر ہاؤس میں طلب کریں۔ اگر کوئی جن ہوگا تو اس کے ساتھ آئے گا۔''

فوراً ہی سرکاری طور پر جینی کو گورنر ہاؤس میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ پہلے تو وہ پریشان ہوئی۔ سوچنے لگی کہ ایک ملک کے حکمران اسے کیوں بلا رہے ہیں؟ سپاہی چاہتے تو اسے گرفتار کرکے لے جاسکتے تھے لیکن انہوں نے بڑی عزت سے اسے حاضر ہونے کو کہا تھا۔

پھر اس نے سوچا۔ ''مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

کوئی گڑبڑ ہوگی تو فوراً ہی اپنے جن کو مس کال دوں گی۔ وہ پلک جھپکتے ہی میرے پاس آجائے گا۔''

وہ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر اور سپاہیوں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر گورنر ہاؤس میں پہنچی۔ وہاں حکومت کے چند اعلیٰ عہدیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے عزت دی، اسے خوش آمدید کہا۔ وہ ان کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ''مس جینی! ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں جن اور بھوتوں کی باتوں کو محض بچکانا پن سمجھتے ہیں لیکن تم کہتی ہو، کوئی جن تم پر عاشق ہوگیا ہے اور وہ کسی کو نظر نہیں آتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''جی ہاں۔ مجھے بھی نظر نہیں آتا ہے۔''

''پھر تم اس سے کس طرح ملتی ہو؟''

''جس طرح خوشبو نظر نہیں آتی اور ہم اسے پالیتے ہیں۔ اسی طرح میں اسے پالیتی ہوں۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتی۔ وہ میرے قریب آتا ہے تو میں اسے چھو لیتی ہوں۔ پکڑ لیتی ہوں۔ پیار کی یہ آنکھ مچولی مجھ پر جادو کرتی رہتی ہے۔''

''کیا تم ابھی اس سے مل سکتی ہو؟''

''نہیں۔ اس نے کل رات کہا تھا کہ تیس گھنٹے بعد آئے گا۔ بائیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ میں بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔''

''تم بے چین ہوتی ہو، اس سے ملنا چاہتی ہو تو کیا اسے پکارنے سے وہ آجاتا ہے؟''

''پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ جدید ٹیکنالوجی ہے۔ میں فون کے ذریعے مس کال دیتی ہوں۔ وہ آجاتا ہے۔''

''ابھی مس کال دو۔ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں۔ اس نے سختی سے تاکید کی ہے کہ صرف اہم ضرورت کے وقت اسے کال کروں۔''

''عقل سے سمجھو، کیا یہ اہم نہیں ہے کہ اس ملک کا حکمران تمہیں حکم دے رہا ہے؟''

''آپ کا حکم میرے لیے اہم ہے۔ اس کے لیے نہیں ہے۔ آپ مائنڈ نہ کریں' وہ صرف میرے پاس آتا ہے اور کسی سے ملنے نہیں آئے گا۔''

''ابھی تم نے کہا ہے وہ تمہاری اہم ضرورت کے وقت آتا ہے۔ وہ اہم ضرورت کیا ہوتی ہے؟''

''مجھ پر کوئی مصیبت آئے، میں خطرات میں گھر جاؤں، تب اسے کال کرسکتی ہوں۔''

ان تمام عہدیداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے کچھ بولنے لگے۔ پھر ایک نے جینی سے کہا۔ ''سمجھ لو کہ تم ابھی مصیبت میں ہو۔ ہم نے تمہیں حراست میں رکھا ہے۔ جب تک اسے نہیں بلاؤ گی تمہیں رہائی نہیں ملے گی۔''

''مجھے حراست میں لینے کی بات کرو گے تو وہ آپ حضرات کا دشمن بن جائے گا۔ اس کی دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔''

''ہم اسے دشمن نہیں بننے دیں گے۔ اسے سمجھائیں گے کہ صرف اس سے ملاقات کرنے کے لیے دشمنی کا بہانہ کیا ہے۔''

''وہ اسے دھوکا سمجھے گا۔ وہ بہت غصے والا ہے۔ جھوٹ بول کر اسے بلاؤ گے تو وہ کسی کی نہیں سنے گا۔ میں اسے سمجھاؤں گی تب بھی نہیں سمجھے گا۔''

ایک نے کہا۔ ''آٹھ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ ہم اسے دوست بنائیں گے۔ دشمن نہیں۔''

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ''جینی! تم اگلے آٹھ گھنٹے تک یہاں آرام سے رہو۔ یہیں اس کا انتظار کرو۔''

وہ بولی۔ ''سوری۔ یہاں جتنا بھی آرام ملے گا، وہ میرے اپنے گھر جیسا نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں اسے سمجھا بجھا کر آپ سے ملاقات کرنے کو کہوں گی۔''

''ہمیں اطمینان نہیں ہوگا۔ وہ ہمارے پاس آنے سے انکار کرسکتا ہے۔ پلیز یہاں رہ جاؤ۔ صرف آٹھ گھنٹے کی تو بات ہے۔ ہم اسے دوست بنانا چاہتے ہیں۔''

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ''ایک ملک کا حکمران تم سے گزارش کر رہا ہے۔ پلیز مان جاؤ۔''

وہ مان گئی۔ اگلے آٹھ گھنٹے اس محل میں گزارنے لگی۔

وہ نمبر ون ماڈل گرل اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ اسے دیکھ کر سب ہی للچاتے تھے۔ بے اختیار اسے چھونے کو جی چاہتا تھا۔ اسے قریب سے دیکھ کر کتنے ہی عہدیداروں کے دل مچلنے لگے تھے۔ وہ اسے تصور کی چور تنہائی میں حاصل کر رہے تھے۔

وہ سب بے حد طاقتور تھے۔ وسیع اختیارات کے مالک تھے۔ اسے جبراً حاصل کرسکتے تھے لیکن اس انمول بدن کے جملہ حقوق صرف ایک نادیدہ جن کے لیے تھے اور ان میں سے کوئی ایک جن سے پنگا نہیں لے سکتا تھا۔

آخر آٹھ گھنٹے گزر گئے۔ وہ خوشبو محسوس کرتے ہی خوشی سے کھل گئی۔ ''تھینکس گاڈ! تم آگئے۔''

''ہاں مگر یہ تم کہاں ہو؟''

''میں گورنر ہاؤس میں ہوں۔ میں کیا بتاؤں۔ میری عزت اور شان وشوکت میں اضافہ ہورہا ہے۔ حکومت کے

تمام اعلیٰ عہدیدار اور حاکم اعلیٰ ڈرائنگ روم میں ہیں۔ وہ تم سے دوستی کرنے کے لیے مجھے سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔''

''وہ مجھ سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہیں؟''

''تم ایسے عجیب و غریب ہو کہ سب ہی تم سے ملنا اور دوستی کرنا چاہیں گے۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ پورا حکمران طبقہ مجھے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دے رہا ہے۔''

''تم بہت چھوٹی ہو کر سوچ رہی ہو۔ اعزاز انہیں حاصل ہو رہا ہے کہ تمہارے ذریعے وہ مجھ سے باتیں کریں گے۔ میں انکار کردوں تمہیں یہاں سے لے جاؤں تو وہ ہماری خوشامدیں کرنے لگیں گے۔''

''تم درست کہتے ہو۔ پلیز ڈرائنگ روم میں چلو۔ وہ انتظار کررہے ہیں۔ ان سے دوستی کرو۔''

''میں تمہارے کہنے سے آنکھیں بند کرکے دوستی نہیں کروں گا، مگر تمہارے ساتھ چلوں گا۔ یہ معلوم کروں گا کہ وہ مجھے دوست کیوں بنانا چاہتے ہیں؟''

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آگئے۔ حاکم اعلیٰ اور دوسرے تمام عہدیدار اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ جینی کو تنہا دیکھ رہے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں سوال تھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''کیا آپ حضرات کچھ تبدیلی محسوس کررہے ہیں؟ خوشبو محسوس کررہے ہیں؟''

ایک عہدیدار نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں، تمہارے آتے ہی خوشبو آئی ہے۔''

''یہ میرے عاشق کی خوشبو ہے۔''

انہیں آواز سنائی دی۔ ''ہاں......''

وہ سب چونک کر جینی کے آس پاس آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم زاد نے کہا۔ ''میں یہاں موجود ہوں۔ جینی میری جان ہے۔ اس کی خاطر اپنی آواز سنا رہا ہوں۔ آپ حضرات کھڑے نہ رہیں۔''

وہ سب بیٹھ گئے۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ''ہم کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''ضرور پوچھیں۔ جواب دوں گا۔''

اس نے سوال کیا۔ ''کیا آپ کی صرف آواز ہے یا وجود بھی ہے؟''

وہ بولا۔ ''وجود ہے۔ تب ہی جینی میری آغوش میں کھیلتی ہے۔ یہ میرے وجود کی گواہ ہے۔''

اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ''کیا ہم سے مصافحہ کریں گے؟''

''کسی ایک سے کروں گا۔''

اعلیٰ حاکم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہم زاد نے اسے تھام لیا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ''او مائی گاڈ! آپ کا وجود ہے۔ آپ مجھ سے مصافحہ کررہے ہیں۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے ہم زاد کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہا تھا۔ ''کتنا عجیب لگ رہا ہے۔''

ہم زاد اپنا ہاتھ چھڑا کر جینی کے پاس آگیا۔ اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ''مسٹر! ہم آپ کو کس نام سے پکاریں؟''

وہ بولا۔ ''جو دیکھا نہ جائے اسے ان سین کہنا چاہیے۔ مجھے ان سین کہا جائے۔''

''مسٹر ان سین! ہم بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ ہم سے ہمدردی کرو۔ ہم سے دوستی کرو۔''

وہ بولا۔ ''مجھے آپ حضرات سے ہمدردی بھی ہے اور میں آپ کا دشمن بھی نہیں ہوں۔ مصیبتیں کیا ہیں؟''

فوج کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''ہمارے ایک دشمن کو نہ جانے کیسی پراسرار قوتیں حاصل ہوگئی ہیں۔ اس نے تنہا ہو کر ہمارے سیکڑوں سپاہیوں کو مار ڈالا ہے۔ ہمارے طیاروں کو اور ہیلی کاپٹروں کو پرواز کے دوران تباہ کردیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ایسی جادوئی قوت کہاں سے حاصل ہوگئی ہے۔''

ہم زاد نے پوچھا۔ ''یا اللہ خیر۔ کیا آپ مراد علی منگی کی بات کررہے ہیں؟''

وہ سب ہی ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ ''آپ اسے جانتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''وہ میرا بدترین دشمن ہے۔ میں اپنے دشمن کو صرف جانتا ہی نہیں، پہچانتا بھی ہوں۔''

وہ سب خوشی سے کھل گئے۔ اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''ہمارا دشمن آپ کا بھی دشمن ہے۔ پھر تو آپ ہماری مدد ضرور کریں گے۔''

''میں مدد نہ کروں، تب بھی مدد ہوتی رہے گی۔ وہ اس طرح کہ میں اس دشمن سے لڑتا رہوں گا تو گویا تمہارے لیے بھی لڑائی جاری رہے گی۔''

''آپ درست کہتے ہیں۔ پلیز ہمیں بتائیں۔ اس کی پراسرار قوتیں کیا ہیں؟ اور اسے کہاں سے حاصل ہوگئی ہیں؟''

''وہ بہت بڑا عامل ہے۔ جنات کو تسخیر کرنے کا پراسرار علم پڑھتا رہتا ہے۔ اس وقت بیس جنات اس کے معمول مطیع اور فرمانبردار ہیں۔''

''بیس جنات......'' ان سب نے حیرانی اور پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے مایوسی سے پوچھا۔ ''وہ معمول اور مطیع بن کر رہنے والے جنات بھی آپ کی طرح نادیدہ رہتے ہوں گے۔''

"بے شک! ہم جنات ہیں کسی کو نظر نہیں آتے لیکن کسی کی صورت بنا کر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک جن مراد علی منگی کی صورت بنا کر اس کے ساتھ محل میں رہتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے ڈمی مراد بن گیا ہے۔ سب اسے مراد کا ہم زاد کہتے ہیں۔"

ایک فوجی افسر نے کہا۔ "ہاں۔ ہم نے اسے ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہے۔ کیا باقی جن بھی مراد کے ساتھ محل میں رہتے ہیں؟"

"نہیں۔ صرف وہ ہم زاد اس کے ساتھ دن رات رہتا ہے۔ باقی جن پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس وقت آتے ہیں، جب مراد کسی کام سے انہیں کال کرتا ہے۔ وہ چشم زدن میں اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔"

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ "اب معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی پراسرار قوت کیا ہے؟ بیس جنات نے اس کے حکم سے ہمارے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے حکم سے چشم زدن میں جا کر ہمارے ہیلی کاپٹروں کو تباہ کر کے محبوب علی چانڈیو کو بحری جہاز سے نکال لائے تھے۔"

دوسرے عہدیدار نے تائید کی۔ "یہ انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ جنات نے اس کے سارے کام کیے ہیں۔"

ایک نے کہا۔ "اور آئندہ بھی کریں گے۔"

"مسٹر ان سین! ہم برباد ہو رہے ہیں۔ کیا آپ اس کے حملوں کو روک سکیں گے؟"

ہم زاد نے کہا۔ "اس نے پراسرار عمل کے ذریعے بیس جنات کو تسخیر کیا ہے۔ مجھے بھی جکڑنا چاہتا ہے لیکن میں اس کے علم کا توڑ کرنا جانتا ہوں۔ اس کے حملوں سے بچتا آ رہا ہوں۔ ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس پر کس طرح کامیاب حملے کر سکتا ہوں۔ ابھی تدبیر سوچ رہا ہوں۔"

"ہم تمہارے لیے آسانی کریں گے۔ ہم پلاننگ کریں گے۔ تم اس پر عمل کرو گے تو تمہارے ساتھ ہمیں بھی ہمیشہ کے لیے اس سے نجات مل جائے گی۔"

"آپ کوئی بھی تدبیر سوچیں، اس پر عمل کرنے کے لیے مراد سے ٹکرانا ہوگا۔ اس سے ٹکرانے کا مطلب ہے، بیس جنات سے مقابلہ کرنا اور میں تنہا ان سے مقابلہ نہیں کر سکوں گا۔"

فوجی افسر نے کہا۔ "کسی سے لڑنا ضروری نہیں ہوگا۔ ہم ایسی پلاننگ کریں گے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوگی اور تم نادیدہ رہ کر اپنا کام کر جاؤ گے۔ ایک بار ہماری پلاننگ پر عمل کرو گے تو مراد ہمارے قابو میں آ جائے گا یا مارا جائے

متفرق معلومات

☺ دنیا میں سب سے پہلے نوبل انعام مادام کیوری نامی عورت نے حاصل کیا۔

☺ دنیا کا سب سے بڑا موجد سائنس دان امریکا کا ایڈیسن ہے۔

☺ دنیا کا سب سے تیز رفتار جانور چیتا ہے۔

☺ دنیا میں سب سے زیادہ آتش فشاں پہاڑ فلپائن میں پھٹتے ہیں۔

☺ دنیا کی سب سے قیمتی دھات پلاٹینم ہے۔

☺ دنیا میں سب سے پہلے ایٹم بم اوپن ہیمر نامی سائنس دان نے بنایا۔

انتخاب۔ رانا حبیب الرحمٰن، سینٹرل جیل، لاہور

گا۔ پھر وہ نہیں رہے گا تو وہ بیس جنات ہم سے دشمنی نہیں کریں گے۔"

"ایسی کوئی زبردست پلاننگ ہوگی تو میں ضرور اس کے مطابق عمل کروں گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں کہ آپ کسی بھی اجلاس میں یا بند کمرے میں جو بھی پلاننگ کرتے ہیں یا رازداری سے کوئی بھی بات کرتے ہیں تو مراد کا کوئی جن آ کر سنتا رہتا ہے۔ وہ آپ کو نظر نہیں آتا اور مراد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ آپ کیا کرنے والے ہیں۔"

وہ سب پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "واقعی ماضی میں ایسا ہو چکا ہے۔ ہم کہیں بھی چھپ کر باتیں کرتے رہے ہیں، وہ راز میں نہیں رہی ہیں۔ مراد ان سے آگاہ ہوتا رہا ہے۔"

ان کی تنہائی کی اور رازداری کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اس وقت بھی مراد کا کوئی جن وہاں موجود ہے اور ان کی تمام باتیں سن رہا ہے۔ ایک نے پوچھا۔ "کیا اس کا کوئی جاسوس جن ابھی یہاں موجود ہوگا؟"

ہم زاد نے کہا۔ "نہیں۔ پریشان نہ ہوں۔ ہم جنات ایک دوسرے کی بو پا لیتے ہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ کوئی یہاں ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا۔"

ان سب نے اطمینان کی سانس لی۔ ایک عہدیدار نے کہا۔ "ہم کیا کریں؟ رازداری کی باتیں کہاں کریں؟ یہ تو بہت ہی پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ ''آئندہ ہم جب بھی رازداری سے کوئی پلاننگ کرنا چاہیں گے تو ان سین کو بلا لیا کریں گے۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''میں وہاں جنات کی بو محسوس کروں گا تو وہ بھی میری بو محسوس کرلیں گے۔''

ایک نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوگا؟''

''یہ ہوگا کہ میں انہیں دیکھتے ہی بھاگ جاؤں گا ورنہ وہ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

وہ مایوس ہوگئے۔ ہم زاد نے کہا۔ ''ویسے میں وہاں سے فرار ہوکر کہیں جاکر فون کے ذریعے تم سب کو ان کی موجودگی کی خبر کردوں گا۔''

وہ خوش ہوگئے۔ ہم زاد نے کہا۔ ''اب میں جارہا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔''

''یہ تو بتادو، ہم تم سے رابطہ کیسے کریں؟''

''جینی کے ذریعے......''

پھر خاموشی چھاگئی۔ جینی نے کہا۔ ''وہ جاچکا ہے۔ میرے گھر میں انتظار کرے گا۔ مجھے فوراً جانا چاہیے۔''

وہ اسے سرکاری گاڑی میں گھر پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ بولی۔ ''میں یہاں سے پیدل جاؤں گی۔ وہ میری اسپورٹس کار لے کر آرہا ہے۔''

وہ پیدل جانے لگی تو یورپ کی سب سے حسین ٹاپ ماڈل گرل کو دیکھ کر لوگوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ درجنوں سپاہی اس کے چاروں طرف آگئے اور لوگوں کو اس کے قریب آنے سے روکنے لگے۔ ادھر ہم زاد اس کے بنگلے سے اسپورٹس کار ڈرائیو کرتا آرہا تھا۔ وہ کار جہاں سے گزر رہی تھی لوگ حیران ہوکر دیکھ رہے تھے۔ اس کا ڈرائیور نظر نہیں آرہا تھا۔ لوگ اس کار کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ کسی ڈرائیور کے بغیر جارہی تھی۔

بے شمار کاریں اور موٹر سائیکلیں اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں دوڑنے لگیں۔ لڑکیوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہائے یہ تو وہی جینی کا عاشق ہے۔ وہ کتنی خوش نصیب ہے، اسے ایسی شہرت مل رہی ہے۔''

پورا مجمع شور مچاتا ہوا اسپورٹس کار کے ساتھ اپنی گاڑیاں دوڑا رہا تھا۔ کتنے ہی اسٹل اور مووی کیمرے والے اس کے قریب ہونے کی کوششیں کررہے تھے اور خالی دوڑتی ہوئی کار کی تصویریں اتار رہے تھے۔

وہ کار جینی کے قریب آکر رکی تو وہاں بھی تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ کئی ٹی وی چینلز کے کیمرے آگئے تھے۔ موبائل پولیس کی درجنوں گاڑیاں لوگوں کو دور بھگانے کے لیے پہنچ گئی تھیں۔ پھر ٹی وی چینلز کے ذریعے ساری دنیا نے دیکھا کہ ایک خالی کار دوڑتی جارہی تھی۔ کوئی ڈرائیور نہیں تھا اور ٹریفک کے ہجوم میں نوجوانوں کی موٹر سائیکلیں اسپورٹس کار کے ساتھ دوڑتی جارہی تھیں پھر یہ عجیب جذباتی تماشا دکھائی دیا کہ جینی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھی تو وہ سیٹ سے کچھ اوپر دکھائی دے رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے نادیدہ عاشق کی گود میں بیٹھی ہے۔ اس کی پشت اسٹیئرنگ کی طرف تھی۔ وہ کار نہیں چلا رہی تھی۔ کسی سے ہم آغوش ہوگئی تھی اور کار خود بخود اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ رہی تھی۔

ٹی وی کے ناظرین گم صم سے ہوکر وہ منظر دیکھ رہے تھے اور کمنٹری کرنے والے کہہ رہے تھے۔ ''یہ کمپیوٹرائز کی ہوئی کوئی گرافک فلم نہیں ہے۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں سچ مچ ایسا ہورہا ہے۔ یہ لائیو مناظر پیش کیے جارہے ہیں۔''

تبصرہ کرنے والے کہہ رہے تھے۔ ''جینی اور مسٹر ان سین کو سرعام ایسا تماشا نہیں کرنا چاہیے۔''

اور جینی نے ٹی وی چینلز کے ذریعے کہا تھا کہ وہ آئندہ لوگوں سے کترائے گی اور چھپ کر رہا کرے گی۔

☆☆☆

مراد اپنے بہت سے معاملات میں مصروف تھا۔ اس نے ایک بار ہم زاد کو جینی کے ساتھ دیکھا تھا لیکن اس کا محاسبہ کرنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس نے ٹی وی پر جینی کے ساتھ ہونے والے تماشے کو دیکھا تو اسے بلا کر پوچھا۔ ''یہ تم کیا کررہے ہو؟ کیا تم نے جینی کو باقاعدہ اپنی شریک حیات بنایا ہے یا گناہ کے مرتکب ہورہے ہو؟''

ہم زاد نے کہا۔ ''گناہ اور ثواب کی باتیں رہنے دو۔ میں تمہارا ہم زاد ہوں۔ تمہارے وجود کا ایک نیگیٹیو پہلو ہوں۔ نیگیٹیو ہی رہوں گا۔''

مراد نے سختی سے کہا۔ ''میں اپنے وجود کا کوئی پہلو بھی داغ دار نہیں رکھنا چاہتا۔''

''نہ چاہنے کے باوجود انسان ہو۔ بے داغ فرشتہ نہیں بن سکو گے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ کسی نہ کسی پہلو سے خطا کا مرتکب ہوتا ہی رہتا ہے۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ خطا کرنے والوں کے دلوں میں بھی خوف خدا ہوتا ہے۔ میرے دل میں اس حد تک خوف ہے کہ میں شرپسندوں سے نمٹنے کے لیے ہمیشہ تمہارے ہی ساتھ رہوں گا۔ عبادت کرتا رہوں گا۔ انصاف کے تقاضے پورے کرتا رہوں گا۔ پلیز میرے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کرو۔''

مراد خاموش ہو گیا۔ اس نے بحث نہیں کی۔ یہ سوچ کر چپ رہا کہ اس کے اعمال اس کے ساتھ ہیں۔ خدا کو منظور ہوگا تو وہ راہِ راست پر آجائے گا۔

ہم زاد نے اسے بتایا کہ دشمن ممالک کے ایک حاکم اعلیٰ اور اس کے اہم عہدیداروں سے کس طرح ملاقات ہوئی اور کیا باتیں ہوئیں۔ وہ سب اس بات سے پریشان ہیں کہ مراد کے بیس عدد جن چپ چاپ آکر ان کی خفیہ باتیں سنتے رہتے ہیں۔

جشن منانے کے دو دن گزر گئے۔ مراد نے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے اعلان کیا کہ اب وہ سیاسی امور پر باتیں کرے گا۔ کسی بھی ملک کے اکابرین اسکائپ کے ذریعے گفتگو کرسکتے ہیں۔ سب سے پہلے سپر پاور کے اکابرین نے ہی رابطہ کیا اور کہا۔ ”ہم ہز ہائی نس سے گفتگو کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے اکابرین بھی اسکائپ کے ذریعے ہم سے رابطہ کرتے رہیں گے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”سب سے پہلے ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کے طیارے کو اور آپ کو گھیرنے اور حراست میں لینے کی بہت بڑی بھول کی تھی۔“

مراد نے کہا۔ ”آپ نے بھول نہیں کی تھی۔ سچ مچ مجھے حراست میں لیا تھا۔ البتہ مجھے رہا کرنے کی سب سے بڑی احمقانہ غلطی کی ہے۔“

”یہ اچھا ہی ہوا کہ ہم نے احمقانہ غلطی کی اور آپ کو رہا کردیا۔ آپ ہماری اس غلطی کو نظر انداز کردیں۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم لوگوں نے مراد علی منگی کو حراست میں لے کر مار ڈالا ہے۔ وہ مرچکا ہے۔ یہ جو یہاں بیٹھا ہے، یہ نیا مراد ہے۔ میرے اللہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ سیدھی سی بات ہے، میں اس نئی زندگی میں سانپوں کو دودھ نہیں پلاؤں گا۔

”تم سے اور تمہارے تمام اتحادی ممالک سے سفارتی تعلقات نہیں رکھوں گا اور نہ ہی تمہارے ملکوں کے انجینئروں و ڈاکٹروں کو اور مختلف شعبوں کے ماہرین کو اپنی ریاست میں آنے کی اجازت دوں گا۔ تمہارے ملکوں کے جو باشندے یہاں ملازمت کررہے ہیں انہیں اس وقت تک عزت اور سلامتی دی جائے گی، جب تک وہ ہماری ریاست کے وفادار رہیں گے۔ ورنہ ان کی بھی چھٹی کردی جائے گی۔“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”سفارتی تعلقات نہیں رکھیں گے تو آپ کے عوام بیرونی ممالک جانے کے لیے ویزا کہاں سے حاصل کریں گے؟“

دوسرے ملک کے حاکم نے کہا۔ ”آپ اور آپ کے عوام تقریباً آدھی دنیا سے کٹ جائیں گے۔ ہمارے زیر اثر جو چھوٹے ممالک ہیں، وہ بھی اپنی سرحدیں بند کردیں گے۔ آپ کی ریاست کے طیاروں کو کسی بھی ملک کی سرحد سے گزرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

”ہم تمہاری یا کسی بھی ملک کی اجازت حاصل نہیں کریں گے۔ ہمارے عوام ویزا حاصل کیے بغیر جس ملک میں جانا چاہیں گے آزادی سے جائیں گے۔ الرٹ ہو جاؤ۔ کل ایک طیارہ ہماری ریاست کے سیاحوں کو لے کر جرمنی، فرانس اور یوکے ..... جائے گا۔ ان کے پاس صرف اس ریاست کا پاسپورٹ ہوگا۔ یہ میرا چیلنج ہے کوئی میری ریاست کے کسی ایک فرد کو بھی وہاں آزادی سے گھومنے پھرنے سے نہیں روک سکے گا۔ ہمارا طیارہ ان تین ممالک کی سرحدیں عبور کرے گا۔ اس طیارے کے اترنے کے لیے تمام ملکوں کے رن وے کو خالی رکھنا ہوگا۔ ہمارا شیڈول نوٹ کرو۔ ہمارا طیارہ کل صبح دس بجے یہاں سے روانہ ہوگا اور پہلے جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں پہنچے گا۔ چالیس گھنٹے کے بعد وہ طیارہ فرانس کے شہر پیرس جائے گا۔ پھر چالیس گھنٹوں کے بعد یوکے کے شہر لندن پہنچے گا۔ یوں سمجھو کہ مجھے حراست میں لینے کی جو دشمنی کی تھی، اس کا انتقام لینے کے لیے میں جبراً سرحدی قوانین کی خلاف ورزی کروں گا۔ دنیا والوں کے سامنے تمام سپر طاقتوں کو جھاگ کی طرح بٹھا دوں گا۔ آئندہ کسی بھی معاملے میں گفتگو کرنے کے لیے میری وزارت داخلہ سے رابطہ کیا جائے۔ میں کسی سے براہِ راست گفتگو نہیں کروں گا۔“

اس کے بعد اس نے کسی کی بات نہیں سنی۔ رابطہ ختم کردیا۔ ہم زاد سے کہا۔ ”ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ میرے اس فیصلے کا ردِعمل کیا ہو رہا ہے۔ میں جرمنی جارہا ہوں۔ تم فرانس جاؤ۔“

دوسرے ہی لمحے میں وہ دونوں ہوا ہو گئے۔

☆☆☆

مراد نے فیصلہ سنانے کے بعد ان کی ایک نہیں سنی تھی۔ رابطہ ختم کرکے یہ اچھی طرح جتایا تھا کہ اس کے سامنے سپر طاقتیں کچھ نہیں ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ وہ جب چاہے گا، اپنے فیصلے کے آگے انہیں جھکاتا رہے گا اور وہ بے بسی سے جھکتے رہیں گے۔ وہ سب غصے سے تلملا رہے تھے۔

لندن کے اکابرین نے تمام اتحادی ممالک کو یہ چشم دید واقعہ سنایا تھا کہ انہوں نے ایک نادیدہ جن سے ملاقات کی

ہے۔ اس سے مصافحہ کیا ہے۔ اس سے باتیں بھی کی ہیں۔ وہ نادیدہ جن مراد کا دشمن ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ بیس عدد جن مراد کے معمول اور تابعدار ہیں۔ ان ہی جنات نے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک کیا تھا۔ طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو تباہ کیا تھا اور بیچ سمندر میں کھڑے ہوئے بحری جہاز سے محبوب علی چانڈیو کو نکال لائے تھے۔

پہلے تو وہ جن نامی مخلوق کو مانتے نہیں تھے پھر ایک ملک کے اکابرین نے گواہی دی کہ وہ ایک جن سے ملاقات کر چکے ہیں۔ پھر انہوں نے ٹی وی کی خبروں کے دوران میں ڈرائیور کے بغیر چلنے والی کار کو دیکھا تھا اور سرعام جینی سے اس کا رومانس دیکھا تھا۔ اس طرح وہ قائل ہو گئے تھے۔ یہ مان لیا تھا کہ مراد نے بیس عدد جنات کو تسخیر کیا ہے اور وہ دوسرے دن ریاست کے طیارے کو اپنی سرحد میں داخل ہونے اور فرینکفرٹ کے ائرپورٹ پر اترنے سے نہیں روک سکیں گے۔

ایک اکیلے مراد کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ آرمی کے ایک اعلیٰ افسر نے ناگواری سے کہا۔ ''میں کسی جن بھوت کو نہیں مانتا۔ یہ جاہلانہ باتیں ہیں۔ میں حکم دیتا ہوں۔ جیسے ہی وہ طیارہ ہماری سرحد میں داخل ہو، اسے مار گراؤ۔''

وہ حکم دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھنے جا رہا تھا۔ وہ کرسی اچانک پیچھے ہٹ گئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ جہاز کو گرانے سے پہلے خود ہی گرا پھر فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پیچھے گھوم کر سپاہیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کس مردود نے یہ حرکت کی ہے؟''

ایک سپاہی نے کہا۔ ''سر! ہم سب دور کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ کرسی خود بخود پیچھے ہٹ گئی تھی۔''

وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''وہاٹ نان سنس۔ یہ آپ ہی آپ پیچھے کیسے جا سکتی ہے؟''

وہ کرسی آہستہ آہستہ اچھل کر ناچتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔ وہ بے یقینی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے چھو کر یقین کرنے لگا کہ جو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، وہ درست ہے اور کرسی اس کے قریب آ گئی ہے۔

اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ''ادھر آؤ۔ کرسی پر بیٹھو۔''

وہ قریب آ کر کرسی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر بہت سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کرسی پہلے جہاں تھی، اب وہیں آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو ہوا، وہ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔

اس نے سپاہی کو حکم دیا۔ ''اٹھو۔''

وہ اٹھ گیا۔ اس نے دو سپاہیوں سے کہا۔ ''اسے اچھی طرح مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اسے نہ چھوڑنا۔''

انہوں نے کرسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کچھ نہیں ہوا۔ کوئی جن بھوت نہیں تھا۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ''کیا بکواس ہے۔ ابھی جو ہوا اس پر غور کرنا ہوگا۔ چلو ہٹو یہاں سے۔''

وہ سپاہی کرسی کو چھوڑ کر دور ہو گئے۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ ''ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ...''

وہ بات پوری نہ کر سکا۔ مراد اور ہم زاد نے کرسی کو اٹھا کر فضا میں ذرا بلند کیا۔ پھر اسے دور پھینک دیا۔ وہ چیختا ہوا کرسی کے ساتھ فضا میں اڑتا ہوا سامنے دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کی چیخیں سن کر دوسرے افسران بھی دوڑے چلے آئے۔ وہ اسے فرش سے اٹھا کر کرسی کو سیدھا کر کے پھر اسے بٹھانا چاہتے تھے۔ وہ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل کر دور بھاگتے ہوئے بولا۔ ''نہیں بیٹھوں گا۔ اس کرسی پر وہ......وہ بیٹھا ہے۔''

ایک افسر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کون بیٹھا ہے؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

''وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ جن ہے۔ میں مانتا ہوں۔ جنات کا وجود ہے اور وہ جنات مراد علی منگی کے سپاہی ہیں۔''

ایک افسر نے کہا۔ ''آپ اتنی جلدی ہار مان گئے۔ اگر اس نے آپ کو اٹھا کر پھینکا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہماری پوری آرمی سے بھی ٹکرا جائے گا۔ ہم سپاہی ہیں' میدان نہیں چھوڑیں گے۔ اسے کچل کر رکھ دیں گے۔''

یہ کہتے ہی اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ منہ پر گھونسا پڑا تھا۔ پھر دوسرا گھونسا پڑا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

تب انہوں نے آواز سنی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''سپر پاور کی آرمی میرے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ تمہاری کیا حیثیت ہے؟ باہر بالکونی میں جاؤ اور اپنے طیاروں کو دیکھو۔''

وہ حیرانی سے سن رہے تھے۔ بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب بالکونی میں آئے۔ سامنے وسیع و عریض گراؤنڈ میں کئی جنگی طیارے کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں آواز سنائی دی۔ ''تم کہتے ہو' میں تمہاری پوری آرمی سے مقابلہ نہیں کر سکوں گا اور ابھی میں چاہوں تو ان تمام طیاروں کو تباہ کر سکتا ہوں لیکن پہلے کسی ایک کو تباہ کر رہا ہوں۔''

ہم زاد ایک طیارے کے اندر ٹائم بم رکھ کر چلا آیا۔ مراد کہہ رہا تھا۔ ''اس ائربیس کے اندر اور باہر سخت سیکیورٹی ہے۔ یہاں ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ یہ لو

پرندہ وہاں پہنچ گیا۔"

اسی لمحے میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ایک جنگی طیارے کے پرخچے اڑنے لگے۔ وہ شدید حیرانی اور پریشانی سے اپنے ایک طیارے کی تباہی دیکھ رہے تھے۔

جب دھماکے کا شور کم ہوا تو مراد نے کہا۔"یہ ہماری طاقت کا ایک نمونہ ہے۔ اب بولو تمام طیاروں کی تباہی کا منظر دیکھنا چاہو گے؟ ہمیں روک سکو گے؟"

سب ہی جلدی جلدی انکار میں سر ہلانے لگے۔ مراد نے کہا۔"کل ہمارا طیارہ اس ملک کی سرحد میں داخل ہوگا اور تم اسے نشانہ بنانا چاہو گے تو اس سے پہلے ہی تمہارے تمام طیاروں کو نابود کردیا جائے گا۔ اب کل ملاقات ہوگی۔"

اس نے ایک افسر کے سر پر چپت مار کر کہا۔"وش یو بیڈ لک۔"

وہ دونوں وہاں سے آرمی ہیڈ کوارٹر میں آگئے۔ وہاں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ ان کے ائربیس کے ایک طیارے کو تباہ کردیا گیا ہے اور کسی جن نے ایک اعلیٰ افسر کی پٹائی کی ہے۔

وہ سب پریشان تھے۔ انہوں نے بڑے حوصلے سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ریاست کا طیارہ ان کی سرحد میں داخل ہوگا تو اسے زمینی حملوں سے مار گرائیں گے لیکن وہ فوجی عزم سے کیا ہوا فیصلہ اب کمزور پڑ گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹر میں آرمی کے کمانڈر اور کئی افسران نے کسی نادیدہ کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔"کل جو ہونے والا ہے، وہ آج ہوجائے۔ اس ہیڈ کوارٹر میں کل جو تباہی ہونے والی ہے، اس کا ایک نمونہ پیش کرنے آیا ہوں۔"

کمانڈر نے کہا۔"پلیز مسٹر ان سین! ہم آپ کو چیلنج نہیں کر رہے ہیں۔ کل آپ کے طیارے کی طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھائے گا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔"

"اپنے وعدے پر قائم رہو گے تو تمہاری سلامتی ہے۔ ورنہ ایک ناقابلِ برداشت نقصان اٹھانے کے لیے تیار رہنا۔ کل تمہاری ایک غلطی کے باعث ہزاروں فوجیوں کے گھروں سے ماتم کرنے کی آوازیں گونجتی رہیں گی۔"

مراد اور ہم زاد وقت سے پہلے انہیں تباہی کا منظر دکھا کر وارننگ دے چکے تھے۔ یہ یقین ہوگیا تھا کہ وہ ریاست سے آنے والے سیاحوں کو نقصان پہنچانے کی غلطی نہیں کریں گے۔ دیکھا جائے تو دشمن مرعوب ہوچکے تھے۔ ان پر اچھی خاصی دہشت طاری ہوگئی تھی۔ وہ آرمی کے حوالے سے بڑے نقصانات اٹھا چکے تھے یہ یقین ہو رہا تھا کہ وہ آئندہ مراد کے خلاف محاذ آرائی کی جرأت کرنے کی نادانی نہیں کریں گے۔ اب سے پہلے بھی مراد نے یقین سے یہی سوچا تھا اور ان کی دوستی پر بھروسا کیا تھا لیکن انہوں نے اچانک ہی اسے طیارے سمیت ٹریپ کرلیا تھا۔ ان کی دوغلی دوستی سے سبق حاصل ہوا تھا کہ آئندہ کبھی ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔

سانپ کی فطرت ہے ڈسنا۔ انہیں لاکھ دودھ پلاؤ۔ وہ ڈسنے سے باز نہیں آئیں گے۔ مراد نے اسکائپ کے ذریعے پھر ان سے رابطہ کیا اور کہا۔"میں نے اپنے پروگرام میں ایک تبدیلی کی ہے۔ یہاں کے سیاح ریاست کے طیارے میں نہیں جائیں گے۔ آپ حضرات ایک خصوصی طیارہ یہاں بھیجیں گے۔"

ایک نے پوچھا۔"آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟"

اس نے کہا۔"میری ریاست میں دو ہی مسافر بردار طیارے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو سیاحوں کے لیے استعمال کروں گا تو دوسرے مسافروں کو پریشانی ہوگی۔ میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کروں گا۔ آپ ایک طیارہ ان کے لیے بھیج دیں۔"

وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ اسکائپ کو آف کرکے ایک دوسرے سے بولتے رہے۔ ایک نے کہا۔"وہ بہت گہرا ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر ہم سے ہمارے طیارے کا مطالبہ کیا ہے۔"

دوسرے نے ناگواری سے اور بے بسی سے کہا۔"مطالبہ تو پورا کرنا ہوگا۔ ورنہ رنجشیں اور بڑھیں گی۔ ہم اس کی باتیں مان کر ہی اختلافات کو کم کرسکتے ہیں۔"

انہوں نے پھر اسکائپ کے ذریعے کہا۔"ویل ہز ہائی نس! ہم آپ کو خوش کرنا اور اختلافات کو کم سے کم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اور چوبیس گھنٹے کا وقت دیں۔ ہم کل نہیں، پرسوں صبح آپ کے پاس ایک طیارہ پہنچادیں گے۔"

مراد نے کہا۔"شکریہ۔ آپ مجھ سے تعاون کر رہے ہیں۔ واقعی آپ حضرات کے ایسے ہی طرزِ عمل سے اختلافات ختم ہوتے رہیں گے۔"

ان سے رابطہ ختم ہوگیا۔ وہاں مراد کے ساتھ اس کا ہم زاد بشریٰ اور بلا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔"تم تینوں توجہ سے سنو۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ دشمن پھر چالبازیوں سے باز نہیں آئیں گے۔ اس بار وہ ہمارے طیارے کو صرف ٹریپ نہیں کریں گے، اسے اپنی سرحدی حدود میں مار گرائیں گے۔ اب یہ اندیشہ ختم ہوگیا ہے۔ طیارہ ان کا ہوگا۔ مسافر ہمارے ہوں گے۔

ہم زاد نے سر ہلا کر کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ اس طرح وہ اپنے طیارے کو تباہ نہیں کریں گے۔ یہاں سے جانے والے ہمارے سیاح محفوظ رہیں گے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''بھائی! ان امیر کبیر ممالک کے لیے ایک چھوٹا طیارہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے ان کے کئی طیارے مار گرائے ہیں۔ ایک طیارہ اور سہی۔ وہ اسے مار گرائیں گے تو ہمارے تمام سیاح مارے جائیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''درست کہتی ہو۔ کتوں کی دم ٹیڑھی رہتی ہے۔ وہ ٹیڑھے ہی رہیں گے۔ پھر نقصان اٹھائیں گے۔ ہم انہیں پھر سبق سکھائیں گے۔ وہ اپنا طیارہ تباہ کریں گے اور اپنا سر پکڑ لیں گے۔ ہمارا ایک بھی سیاح مارا نہیں جائے گا۔''

تینوں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''ہمارا کوئی سیاح کوئی معصوم شہری اس طیارے میں نہیں جائے گا۔ صرف بہروپیے سیاح جائیں گے۔''

بلے نے پوچھا۔ ''وہ بہروپیے سیاح کون ہوں گے؟''

مراد نے کہا۔ ''وہ ہوں گے جن کے مقدر میں موت لکھی جا چکی ہے۔ جنہیں ہر حال میں مرنا ہی مرنا ہے۔''

وہ سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں نے جیلر سے معلوم کیا ہے۔ ہماری ریاست کی جیل میں چھ قیدی ایسے ہیں جو بہت ہی بے رحم اور سنگدل مجرم ہیں۔ جن کے جرائم ناقابلِ معافی ہیں۔ عدالت انہیں سزائے موت کا حکم سنا چکی ہے۔ اب انہیں یہاں پھانسی نہیں دی جائے گی۔ وہ طیارے میں جا کر دشمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''واہ بھائی! کیا زبردست آئیڈیا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''اور چار مجرم ایسے ہیں جو عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ انہیں بھی طیارے میں بھیج دیا جائے گا۔ اب سوچو کہ وہاں کیا ہوگا؟ اگر دشمنوں نے اپنے جہاز کو تباہ نہ کیا اور وہ دس مجرم زندہ رہ جائیں گے تو وہاں پہنچتے ہی ہماری ریاست کے عدالتی فیصلے سے آزاد ہو جائیں گے۔ یہاں واپس نہیں آئیں گے۔ وہ سب ان ممالک سے پناہ کی درخواست کریں گے۔ انہیں پناہ نہیں دی جائے گی تو وہ وہاں کے شہروں اور مختلف علاقوں میں بھاگتے اور چھپتے پھریں گے۔ ہماری ریاست میں واپس نہیں آئیں گے۔ یہاں انہیں موت ملے گی۔ وہاں روپوش رہ کر زندگی ملتی رہے گی۔ وہ دس مجرم بہت خطرناک ہیں۔ جہاں جائیں گے وہاں قانون کے محافظوں کی نیندیں حرام کر دیں گے۔''

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''یہی میری انتقامی کارروائی ہوگی۔''

بشریٰ نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ''واہ بھائی! کیا کمال کا آئیڈیا ہے۔ آپ یہاں بیٹھے رہیں گے۔ کچھ نہیں کریں گے اور وہاں بڑے مزے سے انتقامی کارروائی ہوتی رہے گی۔''

اس نے بشریٰ سے کہا۔ ''تم بلے کے ساتھ ان قیدیوں سے ملنے کے لیے جیل میں جاؤ گی۔ ان میں سے دو قیدی عورتیں ہیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ ان سب کو ایک طیارے میں فرینکفرٹ بھیجا جا رہا ہے۔ وہ سیاحوں کی حیثیت سے جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنی اصلیت بیان کریں گے اور ان سے پناہ مانگیں گے۔ اگر انہیں پناہ نہیں ملے گی اور وہ واپس آئیں گے تو ان کے لیے سزائے موت اور عمر قید لازمی ہوگی۔ لہٰذا وہ واپس آنے کی نادانی نہ کریں۔ وہیں کسی طرح زندہ رہیں۔''

پھر اس نے ہم زاد سے کہا۔ ''تم ان دس مجرموں کی نگرانی کرو گے اور دشمنوں کا ردِعمل دیکھتے ہوئے اپنے طور پر کارروائی کرتے رہو گے۔ میں ماروی اور محبوب صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ وہاں دشمن ایک نئی چال چل رہے ہیں۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں ماہ نور کے پاس آیا۔ وہاں ایک دیوار پر ایک بڑی سی اسکرین تھی۔ اس اسکرین پر انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے کئی اہم عہدیدار نظر آ رہے تھے۔ ریاست کے تمام حساس شعبوں میں خفیہ کیمرے اور مائک نصب کیے گئے تھے۔ ماہ نور وہاں بیٹھی چینل بدل بدل کر ہر شعبے کے عہدیداروں کو اور دیگر اہم افراد کو دیکھتی رہتی تھی۔ ان کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ ہم زاد کی شریک حیات زیب النساء بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ اپنی خواب گاہ میں اسی طرح مصروف رہتی تھی۔ چالاک جاسوس اور آرمی کے افسران ان خفیہ کیمروں اور مائکروفون سے اس لیے بے خبر تھے کہ مراد اور ہم زاد نے نادیدہ ہو کر بڑی رازداری سے انہیں وہاں نصب کیا تھا۔

ان میں سے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کی خفیہ باتیں محل کی خواب گاہوں تک پہنچ رہی ہیں۔ ماہ نور اور زیبی اہم اور قابلِ اعتراض باتوں کی ریکارڈنگ کو محفوظ کرتی رہتی تھیں۔ جو لوگ حکومت کے اور ریاست کے خلاف باتیں کرتے تھے، ان کے نام بلیک لسٹ میں آ جاتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف باتیں کرتے ہیں لیکن مراد کے

خلاف عملی طور پر کچھ کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور دس بار اپنے کان پکڑتے تھے اور جو عملی طور پر کچھ کرگزرنا چاہتے تھے ان کی لاشیں شہر کے چوراہوں پر الٹی لٹکی ہوئی دکھائی دیتی تھیں اور بڑے سے بلیک بورڈ پر ان کے جرائم کی تفصیل لکھی ہوئی دیکھی جاتی تھی۔ اس کے بہترین نتائج سامنے آرہے تھے۔ عوام کے ذہنوں میں یہ حقائق نقش ہوگئے تھے کہ موجودہ حکمران کی سیکرٹ فورس بہت فعال ہے۔ وہ تاریکی میں بھی ان کی حرکتوں کو دیکھ لیتے ہیں۔

☆☆☆

مراد نے پہلے ہی محبوب کو یہ بتادیا تھا کہ دشمن اب اس کے اور ماروی کے لیے پرابلم بننے والے ہیں۔ اس بار وہ بڑی پلاننگ سے دشمنی کرنے والے ہیں۔ جرائم کی دنیا کی جو مجرمانہ تنظیمیں ہیں ان کے ہی ناموں سے مجرموں کا لشکر کراچی بھیجنے والے ہیں۔ لہٰذا اس سے پہلے ہی بچاؤ کی تدابیر پر عمل کرنا لازمی ہوگیا تھا اور وہ عمل کررہے تھے۔

ماروی جس کوٹھی میں رہتی تھی، وہاں تین کنیزیں خدمت گزاری کے لیے آگئی تھیں۔ ان میں سے ایک کنیز پردے کی سخت پابند تھی۔ کوٹھی کے باہر نہیں آتی تھی۔ چھپ کر نگرانی کرنے والے دشمنوں نے اس کو اور ماروی کو بھی کھڑکی اور دروازے پر بھی نہیں دیکھا تھا۔

محبوب کے آفس کے پیچھے ایک بہت ہی آرام دہ کمرا تھا۔ وہ لنچ کے بعد وہاں ایک آدھ گھنٹے کے لیے لیٹنے جاتا تھا۔ اس نے اس کمرے کو عارضی طور پر اپنی رہائش گاہ بنالیا۔ ایک رات ماروی کو بڑی رازداری سے وہاں لے آیا۔ تمام سیکورٹی گارڈز کو تاکید کی۔ یہ کہا کہ کسی سے یہ ذکر نہ کیا جائے کہ اس کے ساتھ ایک خاتون وہاں آکر رہنے لگی ہے۔

وہ تمام گارڈز وفادار تھے۔ کسی سے ذکر کرنے والے نہیں تھے۔ یوں ماروی کو کوٹھی سے چپ چاپ وہاں ٹرانسفر کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد محبوب کو مراد کا انتظار تھا۔ جب وہ آیا تو اس روز محبوب شام تک دفتر میں مصروف رہا۔ پھر مراد نے کہا۔ ”دروازہ بند کرو۔“

اس نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ اسی لمحے میں مراد بالکل اسی سوٹ میں حاضر ہوگیا جیسا کہ محبوب نے پہنا ہوا تھا۔ محبوب اس سے مصافحہ کرکے پیچھے رہائشی کمرے میں ماروی کے پاس چلا گیا۔ مراد دروازہ کھول کر آفس سے باہر آیا تو سب اسے محبوب سمجھ کر کھڑے ہوگئے۔ وہ باہر آکر محبوب کی کار میں بیٹھ کر کوٹھی میں پہنچ گیا۔ نگرانی کرنے والے دیکھ رہے تھے کہ محبوب جو سوٹ پہن کر جس کار میں آفس گیا تھا، اسی کار میں اسی سوٹ میں واپس آیا ہے۔

وہ سب اچھی طرح نگرانی کررہے تھے۔ جلد بازی میں دھوکا کھانا نہیں چاہتے تھے۔ دن رات یہی دیکھ رہے تھے، محبوب معمول کے مطابق کوٹھی سے آفس جاتا تھا۔ اندر کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔ شام کو محبوب آفس کا دروازہ اندر سے بند کرتا تو مراد حاضر ہوجاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے لباس تبدیل کرتے تھے۔ پھر مراد بھی دن کو برقع پوش کنیز کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے بھی جاتا تھا۔ اسے شاپنگ بھی کراتا تھا۔

دشمنوں کو یقین ہوتا جارہا تھا کہ ماروی اور محبوب اسی کوٹھی میں ہیں۔ ایسے وقت مراد اس نامحرم کنیز کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہتا تھا۔ اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کرکے ماہ نور کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ رات گزارتا تھا۔ شاور لے کر فجر کی نماز پڑھنے محبوب کی کوٹھی میں آجاتا تھا۔

تین دن اور تین راتوں تک اچھی طرح نگرانی کے بعد دشمنوں کو یقین ہوگیا کہ وہ دھوکا نہیں کھارہے ہیں۔ انہوں نے چینی کے ذریعے اس کے نادیدہ یار مسٹران سین کو بلایا۔ اس سے کہا۔ ”محبوب کی کوٹھی میں جاکر دیکھو۔ وہاں وہ ماروی کے ساتھ موجود ہے یا نہیں؟“

ہم زاد نے تھوڑی دیر بعد آکر کہا۔ ”وہاں محبوب ہے لیکن میں ماروی کو صورت سے پہچانتا نہیں ہوں۔“

انہوں نے اسے ثمرہ کی تصویر دکھائی۔ وہ آخری بار لندن سے ثمرہ کی صورت لے کر آئی تھی۔ محبوب نے رازداری سے پھر اس کی پلاسٹک سرجری کرائی تھی۔ ماروی کو اس کا اصلی چہرہ واپس مل گیا تھا۔ یہ دشمن... نہیں جانتے تھے۔

ہم زاد نے ثمرہ کی تصویر دیکھ کر کہا۔ ”ایسی صورت والی اس کوٹھی میں نہیں ہے۔ محبوب نے کسی ماہر سے اس کا چہرہ بدل دیا ہوگا۔ تمہارے وہ تمام نگرانی کرنے والے کیا کہتے ہیں؟“

”انہوں نے ماروی کو ہمیشہ عبا اور نقاب میں دیکھا ہے۔ اسے صورت سے نہیں پہچانتے ہیں۔ اب یہ کیسے معلوم ہو کہ ماروی کسی دوسرے روپ میں وہاں ہے یا نہیں؟“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مسٹر ان سین! پلیز وہاں تھوڑی دیر رہ کر دیکھیں۔ ماروی ہوگی تو محبوب اس کے ساتھ بیڈروم میں جائے گا یا کسی وقت اسے ماروی کے نام سے پکارے گا۔“

”اچھی بات ہے، میں وہاں جاکر تھوڑی دیر تک

رہوں گا۔‘‘

وہ چلا گیا۔ سب ہی بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔۔۔۔

ہمزاد نے پندرہ منٹ بعد آ کر کہا۔ ’’وہ اس حسینہ کے ساتھ بیڈروم میں گیا ہے، اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا ہے۔‘‘

پھر کسی طرح کے شبہے کی گنجائش نہیں رہی۔ انہوں نے اسی وقت فون کے ذریعے کہا۔ ’’تصدیق ہو گئی ہے۔ ماروی اور محبوب ابھی کوٹھی کے اندر ہیں۔ اس کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ پھر ہمیں رپورٹ دو۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

تھوڑی دیر بعد ہی مراد نے اسکائپ کے ذریعے ان سے رابطہ کیا۔ پھر غصے سے کہا۔ ’’یہ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی محبوب صاحب نے مجھے فون پر کہا ہے کہ ان کی کوٹھی کو درجنوں مسلح افراد نے گھیر لیا ہے اور حکم دے رہے ہیں کہ کوٹھی کے اندر جتنے ہتھیار ہیں، انہیں باہر پھینک دیا جائے۔ سامنے کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ وہ مسلح افراد اندر آ کر انہیں قیدی بنانے والے ہیں۔‘‘

یہ سن کر وہ سب ہی اندر سے خوش ہو رہے تھے۔ بظاہر پریشانی ظاہر کر رہے تھے۔ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ’’ہز ہائی نس! ہم سے قسم لے لو۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ باتیں ہم آپ کے منہ سے سن رہے ہیں۔ ہم ابھی اپنے ذرائع سے معلوم کرتے ہیں کہ وہاں کون لوگ ہیں اور ایسی حرکتیں کیوں کر رہے ہیں؟‘‘

مراد محل میں بیٹھا اسکائپ کے ذریعے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک فوجی افسر کئی اعلیٰ عہدیدار فون پر کسی نہ کسی سے بول رہے تھے۔ پھر ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ’’ہز ہائی نس! یہ معلوم ہو رہا ہے کہ مجرموں کی ایک خطرناک تنظیم ریڈ الرٹ اور اس کی اتحادی تنظیمیں آپ کے خلاف ایسا کر رہی ہیں۔ میں نے انہیں آپ کا فون نمبر دیا ہے۔ وہ آپ سے باتیں کرنے والے ہیں۔‘‘

دس منٹ کے بعد ہی کسی نے مراد سے کہا۔ ’’ہیلو! کیا تم مراد علی منگی ہو؟‘‘

’’ہاں۔ میں ریاست ارضِ اسلام کا حاکم اعلیٰ مراد علی منگی ہوں۔ تم کون ہو؟‘‘

وہ حقارت سے بولا۔ ’’اونہہ...... ایک بدترین مجرم، ایک سفاک قاتل سر پر تاج پہن کر بادشاہ نہیں بن جاتا۔ تم دو کوڑی کے مجرم ہو، مجرم ہی رہو گے۔‘‘

مراد اسکائپ کو آف کر کے پلک جھپکتے ہی بولنے والے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں فون کو کان سے لگائے بیٹھا تھا۔

مراد نے پوچھا۔ ’’یہ تو بتاؤ تم کون ہو؟‘‘

’’میں ریڈ الرٹ کا موجودہ سربراہ جیکی براؤن ہوں۔ تم نے میرے باپ کو، چچا کو اور میرے بزرگ برنارڈ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ آج تم میری مٹھی میں آ رہے ہو۔ میرے چار درجن شوٹرز نے تمہاری چہیتی ماروی کو اور محبوب علی چانڈیو کو ان کی کوٹھی میں قید کر دیا ہے۔ میرے ایک اشارے پر ان دونوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔‘‘

’’پہلے تو یہ کہہ دوں کہ میں جیکی براؤن کے لب و لہجے کو خوب پہچانتا ہوں۔ تم جیکی براؤن نہیں ہو۔ اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سچ بولو، تم کون ہو؟ اور کس کے اشارے پر ناچنے کے لیے ماروی اور محبوب کی طرف گئے ہو؟‘‘

’’تم نہ مانو کہ میں جیکی براؤن ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ دیکھو کہ وہ دونوں میری قید میں ہیں اور اپنی زندگی کی چند آخری سانسیں لے رہے ہیں۔‘‘

’’اچھا تو چلو اپنے اوپر والوں سے پوچھ لو کہ تمہارے آدمیوں کو کب اس کوٹھی کے اندر جا کر ان دو قیدیوں کو ہلاک کرنا ہے۔ میں انہیں بچانے کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔‘‘

مراد نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس شخص نے فوراً ہی اپنے فون پر نمبر پنچ کیے۔ مراد اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ’’سر! میں نے مراد سے باتیں کی ہیں۔ وہ دھونس میں نہیں آ رہا ہے۔ اسے مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں جیکی براؤن نہیں ہوں۔ آپ بتائیں، اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘

اسی وقت مراد نے اس سے فون چھین کر اپنے کان سے لگایا۔ وہ شخص حیرانی سے اور خوف سے منہ کھول کر دیکھنے لگا۔ اس کا فون فضا میں معلق تھا۔ اس نے ڈرتے ہوئے اپنے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو منہ پر کراٹے کا ہاتھ پڑا۔ وہ صوفے پر سے نیچے فرش پر گر پڑا۔ پھر وہاں سے اٹھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

دوسری طرف سے ایک حاکم اعلیٰ کہہ رہا تھا۔ ’’اپنے شوٹرز سے بولو، وہ کوٹھی میں گھس کر ماروی اور محبوب کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ یہ یقین کر لو کہ وہ واقعی شکنجے میں آ گئے ہیں۔‘‘

مراد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’اچھا تو مسٹر سپر پاور! یہ تم ہو۔ کرائے کے شوٹرز کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر چلا رہے ہو۔‘‘

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ’’کون ہو تم؟‘‘

مراد نے پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’میں ہز ہائی نس

...کا ایک تابعدار جن ہوں۔ ابھی تمہاری اصلیت بتانے اپنے آقا کے پاس جا رہا ہوں۔"

ادھر اس نے فون بند کیا، ادھر سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کے ہوش اڑ گئے۔ اگر مراد اتنی لمبی چال نہ چلتا تو دشمن کبھی اعتراف نہ کرتے کہ وہ پھر کمینگی دکھا رہے ہیں۔ اعلیٰ حاکم نے دوسرے ماتحت سے کہا۔ "ہمارا بھید کھل رہا ہے۔ فوراً کوٹھی میں گھس کر ماروی اور محبوب کو اپنے شکنجے میں لو۔ مراد کی یہ بہت بڑی کمزوری ہمارے ہاتھ میں رہے گی۔"

پھر اس نے جینی کے ذریعے مسٹر ان سین کو بلایا اور کہا۔ "مراد کے سامنے پھر ہماری دشمنی کھل رہی ہے۔ پلیز اس کوٹھی میں جاؤ۔ مراد کے کسی جن کو رکاوٹ نہ بننے دو۔"

ہم زاد نے کہا۔ "میں ابھی جاتا ہوں۔ مراد سے انتقام لینے کا یہ بہترین موقع ہے۔"

ادھر کئی شوٹر ہاتھوں میں گن لیے محتاط انداز میں کوٹھی کے اندر آئے۔ وہ بار بار للکار رہے تھے۔ "خبردار! کوئی گولی چلائے گا تو ہم یہاں کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ محبوب علی چانڈیو! زندہ رہنا چاہتے ہو تو ماروی کے ساتھ ہمارے سامنے آجاؤ۔"

وہ للکار رہے تھے اور کوٹھی کے ایک ایک حصے میں جا رہے تھے۔ تین کنیزوں کو گرفتار کیا گیا اور کوئی نظر نہیں آیا۔ ایک نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "وہ دونوں کہاں ہیں؟"

ایک کنیز نے کہا۔ "ہماری مالکن کوئی چار دن پہلے کہیں چلی گئی ہیں۔ پھر واپس نہیں آئیں۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ ہم نے کل ہی دیکھا ہے۔ وہ محبوب کے ساتھ کار میں بیٹھ کر شاپنگ کے لیے گئی تھی۔"

کنیز نے کہا۔ "وہ میں تھی۔ عبا اور نقاب میں باہر جاتی ہوں۔ گھر کی ضرورت کا سامان لانے کے لیے مالک کے ساتھ گئی تھی۔"

"تمہارا مالک محبوب کہاں ہے؟"

"وہ ایک گھنٹا پہلے یہاں اپنی خواب گاہ میں تھے۔"

"ہم خواب گاہ میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ نہیں ہے۔ وہ اس کوٹھی سے باہر کیسے جا سکتا ہے؟"

دوسری کنیز نے کہا۔ "ہم خود حیران ہیں کہ وہ کہاں گم ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہاں سے جانے دو۔"

ایک شوٹر نے کنیز کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "سیدھی طرح نہیں بتاؤ گی تو......"

بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ اس نے جس ہاتھ سے اس کے بالوں کو پکڑا تھا، اس

ہاتھ پر کوئی نکیلی چیز چبھی تھی وہاں سے لہو بہہ رہا تھا۔

پھر دوسرے ہاتھ میں وہی تکلیف دہ چبھن ہوئی تو گن چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اس ہاتھ سے بھی لہو بہہ رہا تھا۔ پھر دوسرے تیسرے شوٹر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے خون آلود ہاتھوں سے ہتھیار نکل کر فرش پر گر پڑے۔ وہ سب سہم گئے۔ ان کنیزوں سے دور ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں کوئی ہے۔ ہم پر حملے کر رہا ہے اور نظر نہیں آ رہا ہے۔“

وہاں مراد کے علاوہ ہم زاد بھی تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں چاقو تھے۔ وہ ایک ایک شوٹر پر چاقو چلانے لگے۔ انہیں ہلاک نہیں کر رہے تھے، صرف زخمی کر رہے تھے۔ وہ سب چیختے چلاتے ہوئے کوٹھی سے باہر بھاگنے لگے۔ باہر جن شوٹرز نے کوٹھی کا محاصرہ کیا تھا، ان پر بھی یہ عذاب نازل ہونے لگا۔ وہ سب زخمی ہو رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زخمی کرنے والے کہاں ہیں اور انہیں کس سمت گولی چلانا چاہیے؟ وہ اپنی سلامتی کے لیے بھاگتے چلے گئے۔

ذرا سی دیر میں کوٹھی کے اندر اور باہر ویرانی چھا گئی۔ وہاں ایک بھی ہتھیار والا نہ رہا۔ کوٹھی کے اندر صرف تین کنیزیں رہ گئیں۔ محبوب نے فون کے ذریعے انہیں تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ آرام سے کوٹھی میں رہیں۔ وہ سب محفوظ ہیں۔ اب کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔

سپر پاور اور اس کے اتحادی اسکائپ کے ذریعے رابطے میں تھے۔ ہم زاد نے آ کر کہا۔ ”ہم سب دھوکا کھا گئے۔ اس کوٹھی میں ایک جن محبوب کی صورت بنا کر رہتا تھا۔ تمہارے شوٹرز اور نگرانی کرنے والے جاسوس اسے محبوب علی چانڈیو سمجھتے رہے۔“

ایک نے سوال کیا۔ ”تم اسے کیوں نہ پہچان سکے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ایک جن دوسرے جن کے اندر گھس نہیں سکتا، اس کی اصلیت معلوم نہیں کر سکتا۔ جب محبوب اچانک اس کوٹھی سے غائب ہوا، تب پتا چلا کہ وہ ایک جن تھا۔ اس کے بعد کئی جن وہاں آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں چاقو تھے اور وہ تمہارے درجنوں شوٹرز کو زخمی کرتے جا رہے تھے۔ میں چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ میں بزدل نہیں ہوں لیکن اکیلا ان تمام جنات سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ نہ مراد نے نہ محبوب نے کسی سے مقابلہ کیا ہے، وہ اپنے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور آپ حضرات مات کھا رہے ہیں۔ وہاں میدان صاف ہو چکا ہے۔ اب آپ کیا کریں گے؟“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”تم ہمارے لیے کچھ نہ کر سکے۔ تمہاری جناتی قوتیں ہمارے کسی کام نہیں آئیں۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ تنہا ہوں اور وہ کئی تھے۔ ان کی جناتی قوتیں مجھ سے زیادہ ہیں۔ میں آئندہ بھی تمہارے کام نہیں آسکوں گا۔ آئندہ جینی کی طرف رخ نہ کرنا۔ میں اس کے ساتھ عیش و آرام سے رہوں گا۔ کسی نے جینی کو نقصان پہنچانا چاہا تو اس کی شامت آ جائے گی۔ میرے خلاف نیا محاذ کھولنے کی حماقت نہ کرنا۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مسٹر ان سین! پلیز ناراض ہو کر نہ جاؤ۔ ہم تم سے دوستی رکھنا چاہتے ہیں۔“

انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ جا چکا ہے۔ ایک پلان میکر نے کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟ آپ حضرات اپنی ہتھیلیوں پر دہکتے ہوئے انگارے رکھ کر مراد سے دوستی کی قسمیں کھائیں گے، تب بھی وہ ہم پر یقین نہیں کرے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہاں، اب تو وہ کبھی ہم پر اعتماد نہیں کرے گا۔ پتا نہیں وہ کیسی انتقامی کارروائیاں کرنے والا ہے۔ اب ہمیں صرف اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ کر ان پر عمل کرنا ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم نظر نہ آنے والے جنات کی دشمنی سے خود کو بچا نہیں پائیں گے۔“

ایک مشیر نے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے۔ ہم مراد کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا اعلان کریں۔ بین الاقوامی عدالت کی طرف سے مراد کو کہا جائے گا کہ ہتھیار ڈالنے والے سپاہیوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ انتقامی کارروائی نہ کرے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”اس طرح ہم اس کی انتقامی کارروائیوں سے محفوظ رہیں گے لیکن ہم پوری دنیا میں سپر پاور کہلاتے ہیں۔ ہماری بڑی توہین ہوگی۔ ہمارا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ وہ ناخن برابر ریاست سپر پاور کہلائے گی۔ ہم کئی معاملات میں اس کے تابعدار بن کر رہ جائیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”نہیں۔ ہمیں اس قدر خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے؟“

دوسرے نے کہا۔ ”ہاں، اسے انتقامی کارروائیاں کرنے دو۔ دیکھتے ہیں کیا ہوگا؟ ہم کچھ نقصان اٹھاتے رہیں گے اور بچاؤ کی تدابیر پر عمل کرتے رہیں گے۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“

وہ ٹوٹ جانا چاہتے تھے لیکن جھکنا نہیں چاہتے تھے۔

☆☆☆

وہ جہاز ریاست کے دس نام نہاد سیاحوں کو لے کر فرینکفرٹ پہنچ گیا۔ وہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والے یہ شبہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ریاست کے دس مجرم ہیں۔ سیاح بن کر آئے ہیں۔ اوپر سے یہ احکامات جاری ہوئے تھے کہ ان سب کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جائے۔ کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہ دیا جائے لیکن انہوں نے اخبارات اور ٹی وی والوں کے سامنے یہ بیان دیا کہ وہ خطرناک مجرم ہیں، قاتل ہیں۔ ریاست کی عدالت نے انہیں سزائے موت کا اور عمر قید کا حکم سنایا ہے۔

یہ حیرانی کی بات تھی کہ موت کی سزا پانے والوں کو اور آہنی سلاخوں سے کبھی باہر نہ آنے والوں کو مراد نے ان کے ملک میں بھیج دیا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا۔ ”وہاں تمہیں دی ہوئی سزاؤں پر عمل کیوں نہیں کیا گیا؟ تم سب کو رہا کیوں کر دیا گیا ہے؟“

ایک نے کہا۔ ”ہمیں بظاہر رہائی ملی ہے۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ریاست میں واپس جائیں گے تو سزائے موت کے احکامات کے مطابق ہمیں پھانسی کے پھندوں سے لٹکا دیا جائے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہم اسی طرح زندہ رہ سکتے ہیں کہ یہاں سے واپس نہ جائیں۔ آپ کی حکومت سے التجا کر رہے ہیں کہ ہمیں یہاں کی شہریت دے کر ہم پر احسان کریں۔ ہم یہاں شرافت سے اور امن و امان سے رہیں گے۔“

حکومت کے اکابرین نے ان کے بیانات سن کر کہا۔ ”ہز ہائی نس مراد علی منگی نے ہم سے کہا ہے کہ ان کے دس سیاحوں کو یہاں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ وہ تیس گھنٹے جرمنی میں، تیس گھنٹے فرانس میں اور تیس گھنٹے یو کے میں گزاریں گے۔ نوے گھنٹوں کے بعد انہیں خیر خیریت سے ریاست واپس بھیجا جائے۔ ہمیں افسوس ہے۔ ہم تمہیں یہاں کی شہریت نہیں دیں گے۔ ہز ہائی نس سے جو معاملات طے ہو چکے ہیں اس کے مطابق ٹھیک تیس گھنٹے کے بعد ہمارا طیارہ تمہیں اس ملک کی سرحد سے باہر کر کے فرانس کے شہر پیرس پہنچا دے گا۔“

وہ دس مجرم گرداب میں پھنس گئے۔ نہ اس کنارے اتر سکتے تھے نہ اس کنارے جا سکتے تھے۔ وہ ریاست واپس جا کر موت کو گلے نہیں لگا سکتے تھے اور وہ تینوں ملکوں میں نوے گھنٹوں سے زیادہ نہیں گزار سکتے تھے۔ وہاں کی پولیس انہیں زبردستی طیارے میں بٹھا کر ریاست میں پہنچا دیتی۔

مجرموں کو کسی مجرم کے ہی گھر میں پناہ مل سکتی تھی۔ وہ دس مجرم کئی کرمنل تنظیموں کے لیے کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے ایسی تنظیموں سے رابطے کیے اور کہا کہ وہ ان کے لیے واردات کرتے رہیں گے۔ فی الحال ان کی مدد کی جائے۔ ان سب نے التجا کی کہ انہیں فی الحال ایسی جگہ چھپا دیا جائے، جہاں قانون کے محافظ انہیں گرفتار نہ کریں اور انہیں ریاست میں واپس جانے پر مجبور نہ کر سکیں۔

ریڈ الرٹ کے سربراہ جیکی براؤن نے کہا۔ ”ہم تمہیں پناہ دیں گے۔ شرط یہ ہے کہ مراد کو گولی مارو گے۔“

ایک نے کہا۔ ”ہم مراد سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں اور آپ ہمیں اس کے پیچھے لگانے کی بات کر رہے ہیں۔“

جیکی براؤن نے کہا۔ ”وہ روزِ اول سے ہمارا ایک ایسا دشمن ہے جو ہمارے نشانے پر نہیں آ رہا ہے۔ اسے مار کر ہی تم سب ہماری پناہ میں رہ سکو گے۔“

”ہم ریاست میں نہیں جائیں گے۔ وہ ریاست سے باہر کسی بھی ملک میں آئے گا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”چلو یہی سہی۔ اسے ہلاک کرنے تک تم ہمارے لیے دوسرے کام کرتے رہو گے۔ ہم نوے گھنٹے پورے ہونے سے پہلے تم سب کو کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دیں گے۔“

بہرحال وہ چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ انہوں نے اپنے لیے پناہ حاصل کرنے کی جگہ ڈھونڈ ہی لی۔ سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک سہمے ہوئے سے انتظار کر رہے تھے مراد کی طرف سے کسی وقت بھی انتقامی کارروائی ہونے کی توقع تھی لیکن ایک دن اور ایک رات گزرنے کے بعد بھی اس کی طرف سے بڑی پراسرار خاموشی تھی۔ وہ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اور یہ اس لیے کہ مراد علی منگی کے غبارے سے ہوا نکل رہی تھی۔ بابا اجمیری نے کہا تھا کہ نادیدہ ہونے اور چشم زدن میں کہیں بھی پہنچ جانے کی صلاحیتیں عارضی ہیں کسی وقت بھی یہ صلاحیتیں نابود ہو جائیں گی اور وہ وقت آ ہی گیا۔

انسان ہمیشہ بچہ نہیں رہتا۔ ہمیشہ جوانی کی چھلانگیں نہیں مار سکتا۔ جوانی کو زوال ہے اور بڑھاپے میں جینا محال ہے اور آدمی نہ ہی سدا با کمال رہتا ہے۔ اس دنیا میں اس سے سب کچھ چھن جاتا ہے۔

نادیدہ ہو جانے کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ اس نے

خواب میں حضرت صلاح الدین اجمیری کو دیکھا۔ وہ فرما رہے تھے۔ ''انسان اپنی دنیا میں انسانی صلاحیتوں سے کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ روحانی صلاحیتیں صرف ان مومنین کو حاصل ہوتی ہیں' جو دنیاوی مصروفیات کم سے کم کرکے دین و ایمان کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردیتے ہیں۔ تم اپنی ذات تک عبادت گزار ہو۔ نیک اعمال کے حامل ہو لیکن دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کبھی جھوٹ بولتے اور فریبی چالیں چلنے پر مجبور ہوجاتے ہو۔ دنیاوی معاملات میں الجھنے والے ہمیشہ سچ نہیں بول سکتے۔ ہیرا پھیری سے باز نہیں آسکتے۔ بے شک تم نیک مقاصد کے لیے ایسا کرتے ہو لیکن مومن وہ ہے، جو جان دے دیتا ہے لیکن جھوٹ نہیں بولتا۔ چالبازیاں ہمارے دین میں ممنوع ہیں اور تم حالات سے مجبور ہوکر کبھی کبھی دینی احکامات کے خلاف زندگی گزارتے رہو گے۔ اس لیے اس لمحے سے تمہاری روحانی صلاحیتیں ختم ہورہی ہیں۔ یہ تمہارے لیے بدنصیبی کی بات ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری عبادت گزاری اور نیک اعمال کے باعث اللہ تم سے راضی ہے۔ لہٰذا میں کبھی کبھی تمہاری راہ نمائی کے لیے آتا رہوں گا۔''

خواب تمام ہوا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب تک کی شہ زوریوں کے بعد کمزوری نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا اندر سے روح نکل گئی ہے۔ وہ فقط جسمانی ڈھانچا رہ گیا ہے۔ وہ حوصلہ ہارنا نہیں چاہتا تھا لیکن اچانک ملنے والی توانائی اچانک ہی چلی گئی تھی۔ اس لیے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ سنبھلنے میں وقت لگ رہا تھا۔

ماہ نور شاور لے کر آگئی تھی۔ وہ بھی شاور لینے کے بعد بالکونی میں آکر اس کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ وہ دونوں خاموشی سے عبادت میں مصروف رہے۔ پھر مراد نے دعا مانگنے کے بعد ماہ نور سے کہا۔ ''تم میری رازدار ہو۔ ایک اور راز کی بات سنو۔ میری نادیدہ ہوجانے کی صلاحیتیں ختم ہوچکی ہیں۔''

اس نے چونک کر مراد کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا آئندہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوسکیں گے؟''

''نہیں۔ وہ ایک عارضی صلاحیت حاصل ہوئی تھی۔''

وہ بہت پریشان ہوگئی تھی۔ اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ ''یا اللہ...! آپ کی پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔ دشمن بے حساب ہیں اور وہ بے حساب عسکری قوتیں رکھتے ہیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ تنہا کس طرح ان سے نمٹ سکیں گے؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں آپ کے لیے کیا کروں؟''

''دل سے عبادت کرتی رہو۔ اللہ تعالیٰ کارساز ہے۔ بابا اجمیری نے بشارت دی ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ رب راضی تو جگ راضی۔''

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ ہمزاد کھڑا تھا۔ چہرے سے پریشانی ظاہر تھی۔ اس نے سر جھکا کر بڑے کرب سے کہا۔ ''میں ابھی غائب ہوکر کہیں جانا چاہتا تھا مگر نہ جاسکا۔''

مراد نے جبراً مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''پریشان کیوں ہو؟ ہم جیسے تھے ویسے ہی رہیں گے۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''بابا صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں عارضی صلاحیتیں مل رہی ہیں۔ یہ کسی وقت بھی ہوا ہوجائیں گی لیکن ہم بھول گئے تھے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں نہیں بھولا تھا۔ ہر نماز میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا تھا اور کسی دن محرومیت کا جھٹکا کھانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ یہ جھٹکا تم سے برداشت نہیں ہورہا ہے۔''

''ہاں، محرومیت نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔''

''صاف بولو کہ اب جینی کے پاس نہیں جاسکو گے۔ اب راستے میں سمندر ہے، پہاڑ ہیں، دشمن ہی دشمن ہیں۔ کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اب دنیا والوں کو اندھا کرکے چشم زدن میں وہاں پہنچ نہیں پاؤ گے۔''

وہ بڑی پریشانی سے خلا میں تک رہا تھا۔ مراد نے کہا۔ ''تمہیں معلوم تھا کہ ہمیں یہ عارضی صلاحیتیں حاصل ہوئی ہیں لیکن عشق و محبت کی رنگینیوں میں بھول گئے تھے۔''

''نہیں۔ مجھے یاد تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اچانک ہی یہ صلاحیت ختم ہوجائے گی۔ اب کیا ہوگا۔ میں جینی کے پاس کیسے پہنچوں گا؟ وہ ہزاروں میل دور ہے۔''

''تعجب ہے۔ تمہیں صرف جینی کی فکر ہے۔ بے شمار دشمنوں کی طرف سے تشویش نہیں ہے۔''

''میں ابھی یہی کہنے والا تھا۔ آئندہ ہم ان سے کیسے نمٹ سکیں گے؟ انہیں معلوم ہوجائے گا کہ کوئی جن ہمارا تابعدار نہیں ہے۔''

''انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی ایک عرصے تک ان کے دلوں پر دہشت طاری رہے گی۔ وہ نادیدہ جنات

سے ڈرتے رہیں گے۔ یہ بھید کھلنے تک ہم آزاد خارجہ پالیسی کے ذریعے امریکا، روس اور چین سے مضبوط تعلقات قائم کریں گے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بڑا ملک ہم پر ناجائز دباؤ ڈالے گا تو ہم باقی دو بڑے ملکوں سے فوجی امداد حاصل کریں گے۔ جب ہم ایک کے مقابلے میں دوسروں کو اہمیت دیں گے تو وہ ایک خود بخود درست ہو جائے گا۔ آئندہ ہمیں سیاسی حکمتِ عملی سے کام لینا ہوگا۔"

پھر وہ دونوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ آنے والے دن ان کے لیے چیلنج بن گئے تھے۔ اگر دشمنوں کو معلوم ہو جاتا کہ ان کی پراسرار قوتیں ختم ہو چکی ہیں تو وہ اپنی تمام فوجی قوتوں کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑتے۔ پھر اسی طرح روپوش رہ کر زندگی گزارنے کے دن آ جاتے۔ تمام بادشاہت خاک میں مل جاتی۔

ماروی اور محبوب کی سلامتی کا بھی مسئلہ تھا۔ اب وہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر انہیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ بڑی پریشانیاں تھیں۔ بڑے پیچیدہ مسائل تھے۔ بے حساب مسائل سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔

اس نے فون کے ذریعے محبوب سے پوچھا۔ "وہاں کے کیا حالات ہیں۔ آپ دونوں خیریت سے ہیں؟"

اس نے پوچھا۔ "فون پر کیوں بول رہے ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے آجاؤ۔ یہاں باتیں ہوں گی۔"

وہ بہت ہی اداس لہجے میں بولا۔ "محبوب صاحب! بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے نادیدہ ہو جانے کی عارضی صلاحیت حاصل ہوئی تھی۔ وہ عارضی وقت گزر چکا ہے۔ میں اس روحانی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یا خدا! ہم سب پر رحم فرما۔ یہ کیا ہو گیا مراد؟ اب تو بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔ تمہاری ریاست پر ہر طرف سے حملے ہوں گے۔"

"آپ ریاست کی بات چھوڑیں۔ یہ پہلے بھی نہیں تھی، اب بھی نہیں رہے گی۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے اپنی بھی فکر نہیں ہے۔ میں روپوش رہ کر گوریلا جنگ لڑنا جانتا ہوں۔ فکر آپ کی اور ماروی کی ہے۔ میں یہاں سے آپ دونوں کی سیکیورٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"میں فی الحال ماروی کے ساتھ آفس کے پچھلے حصے میں چھپ کر رہوں گا۔"

"آپ ابھی روپوشی اختیار نہ کریں۔ ابھی تمام دشمن دہشت زدہ ہیں۔ وہ آپ کی طرف رخ نہیں کریں گے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ دشمنوں کو یہ راز معلوم نہ ہو۔ وہ اسی فریب میں مبتلا رہیں کہ میں اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے انہیں سزائیں دے سکتا ہوں۔ جب تک ان پر دہشت طاری رہے گی تب تک ہم اپنی سلامتی کی تدابیر پر عمل کرتے رہیں گے۔"

وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ محبوب اپنے طور پر مشورے دیتا رہا پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے بشریٰ اور بلے کو بھی موجودہ مشکلات سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں مراد کے بہت قریب رہتے آئے تھے۔ اس کے احسان مند بھی تھے اور اس کے لیے جان کی بازیاں لگانے والے ساتھی بھی تھے۔

بشریٰ پریشان ہو گئی تھی۔ بلے نے کہا۔ "ہم پہلے بھی کسی غیر معمولی صلاحیت کے بغیر بدترین حالات سے نمٹتے آئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ بھی حالات کے زلزلے ہمیں توڑ پھوڑ نہیں سکیں گے۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا..."

مراد نے اسکائپ کے ذریعے سپر پاور کے اکابرین سے رابطہ کیا۔ ان اکابرین نے دوسرے ٹی وی پر اپنے اتحادیوں سے رابطہ کر لیا۔ یوں مراد کی باتیں ان تمام حکمرانوں تک پہنچنے لگیں۔

اس نے کہا۔ "میں نے ایک طویل خاموشی اختیار کی تھی۔ اپنے حالات اور آپ حضرات کے موجودہ حالات پر غور کرتا رہا۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس دنیا میں ڈنڈے کے زور پر اپنے آپ کو منوایا جاتا ہے اگر میں غلط بول رہا ہوں تو آپ بولیں۔ میرے ڈنڈے کو مان رہے ہیں؟ کیا مجھے اپنے برابر ایک طاقتور حکمران تسلیم کر رہے ہیں؟ اگر تسلیم کر رہے ہیں تو میں برابری کی سطح پر دوستی کروں گا۔ ہمارے درمیان پھر سے سفارتی تعلقات قائم ہوں گے۔"

سپر پاور کے حاکم اعلیٰ نے کہا۔ "ہم تسلیم کرتے ہیں۔ بے شک ہز ہائی نس ایک طاقتور حکمران ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ مل جائیں تو ہم پوری دنیا پر حکومت کر سکیں گے۔"

مراد نے کہا۔ "میں پوری دنیا پر حکومت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر کرنا چاہوں تو مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میرے بیس جنات ہی مجھے پوری دنیا کا ناقابلِ شکست حکمران بنا دیں گے۔"

"ہز ہائی نس کیا چاہتے ہیں؟"

"میں بین الاقوامی قوانین کا پابند رہوں گا۔ آئندہ سیاسی اور عسکری معاملات میں اپنے جنات کو استعمال نہیں کروں گا۔ وہ جنات میرے بہت سے پرسنل معاملات میں

کام آتے رہیں گے۔ میں ایک طرح سے آپ سب کو خوف و دہشت سے نکال رہا ہوں۔ یہ اطمینان کر لیں کہ اپنی پراسرار قوتیں کسی بھی بڑے یا چھوٹے ملک کے خلاف استعمال نہیں کروں گا لیکن یاد رہے۔ کوئی مجھے مجبور نہ کرے۔ کوئی ماروی اور محبوب علی چانڈیو کی طرف رخ نہ کرے۔ آئندہ کسی نے سازش کی اور چھپ کر دشمنی کرنی چاہی تو میں منٹوں میں اس کی فوجی قوت کو نیست و نابود کر دوں گا۔''

پھر وہ ٹھہرے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ''اور تباہی کیسے آتی ہے۔ اس کے کئی نمونے آپ حضرات دیکھ چکے ہیں۔''

''بے شک ہم نے دیکھا ہے اور تسلیم کر رہے ہیں کہ آپ طاقت میں اور حاکمیت میں ہم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔''

''میں چاہوں گا کہ آپ حضرات مجھے پھر بھی دشمنی اور انتقامی کارروائیوں پر مجبور نہ کریں۔ آئیں دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اپنے نمائندوں کو یہاں بھیجیں اور بھرپور اعتماد کے ساتھ سفارتی تعلقات کا پھر سے آغاز کریں۔''

انہوں نے خوش ہو کر دلی مسرتوں سے مراد کو ویلکم کہا اور کہا کہ ان تمام ممالک کے نمائندے دوسرے ہی دن ریاست میں پہنچیں گے اور باہمی تعاون سے دوستی کو مضبوط کریں گے۔ وہ مراد سے رابطہ ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ آئندہ اس سے بے تکی دشمنی نہیں کی جائے گی۔ گویا وہ اپنے اپنے کان پکڑ رہے تھے۔

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''مراد کو اپنی سطح کا طاقت ور حکمران مان لینے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح نقصانات پہنچا کر اپنی طاقت کا لوہا منوا چکا ہے۔ اب ہم نقصانات اٹھانے والی کوئی غلطی نہیں کریں گے۔''

ایک حاکم نے کہا۔ ''ہماری دنیا میں کئی طاقتور اور خودمختار ممالک ہیں۔ ان کے بعد ریاست ارض اسلام کا اضافہ ہو جائے گا تو ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''فرق اس وقت پڑے گا جب ہم دوستی اور باہمی مفادات کو پیش نظر نہیں رکھیں گے۔''

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ''ہماری غلطی یہ ہے کہ ملکہ نگارا کے بعد ہم نے مراد کو وہاں کا حکمران تسلیم نہیں کیا۔ اسے ایک عالمی سطح کا مجرم سمجھ کر اس خوش فہمی میں رہے کہ جلد ہی اسے کچل ڈالیں گے۔ بہرحال سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو منوا چکا ہے اور اسے مان کر ہی ہم باہمی بہتری کی راہوں پر چلتے رہیں گے۔''

مراد نے ٹیڑھا ہو کر سب کو سیدھا کر دیا تھا۔ فی الحال آثار یہ تھے کہ آئندہ اسے جنات کا ڈراما پلے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آنے والے دنوں میں سیاسی سطح پر تعلقات قائم رہیں گے۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ نادیدہ ہونے والی غیر معمولی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

اس نے فون پر محبوب سے کہا۔ ''میں سیاسی حکمتِ عملی سے کام لے رہا ہوں۔ دشمن دوست بن رہے ہیں۔ آئندہ بھی سیاسی چالیں چلتا رہوں گا۔ کسی کو جانی دشمن نہیں بننے دوں گا۔ آپ وہاں آزادی سے رہیں۔ کوئی آپ کو نقصان پہنچانے نہیں آئے گا۔''

محبوب نے کہا۔ ''شاباش مراد! تم بڑی ذہانت سے دشمنوں کو دوست اور سیاہ کو سفید بنا رہے ہو۔''

اس نے کہا۔ ''میں جلد ہی پاکستان سے سفارتی تعلق قائم کروں گا۔ اس طرح ہمارے آنے جانے اور ایک دوسرے سے ملنے کے سلسلے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''واہ کیا بات ہے مراد! واقعی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ہم کسی روک ٹوک کے بغیر جب چاہیں گے، ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''فی الحال دور تک آپ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں ابھی زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گا۔ بہت مصروف ہوں۔ پھر کسی وقت کال کروں گا۔''

واقعی مصروفیات حد سے زیادہ تھیں۔ اس کا ہمزاد بلا اور بشریٰ کے علاوہ ریاست میں کئی ماہر سیاستداں اور مختلف شعبوں کے ماہرین مراد کے ساتھ دن رات مصروف ہو گئے تھے۔ دوسرے دن سے کئی ممالک کے نمائندے آنے لگے۔ ان سے مذاکرات ہونے لگے اور معاملات طے ہونے پر تحریری معاہدے ہونے لگے۔ پھر کئی ملکوں کے سفارت خانے قائم ہو گئے۔ ان کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ پاکستان سے بھی سفارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔

ان تمام معاملات سے نمٹنے میں کئی ماہ گزرتے جا رہے تھے اور ریاست ارض اسلام کی سیاسی حیثیت مسلم ہوتی جا رہی تھی۔ مراد کی حکمت عملی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ریاستی چینل کے ذریعے ہمزاد کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے آتا تھا اور کہتا تھا۔ ''ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک ملک کے دو حکمران کبھی نہیں ہوتے لیکن دنیا والوں کو یہ نئی اور انوکھی بات معلوم ہو جائے کہ ہم دونوں ہی مراد علی منگی ہیں۔ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور ہم

دونوں ہی اس ریاست کے حکمران ہیں۔"

ہم زاد کہتا تھا۔ "حکمران ایک ہی ہے اور وہ میں ہوں۔ مراد علی منگی۔ والیِ ریاست ارضِ اسلام۔"

اس کے ساتھ کھڑا ہوا مراد کہتا تھا۔ "حکمران میں ہوں مراد علی منگی۔ والیِ ریاست ارضِ اسلام...... اور یہ بھید کبھی نہیں کھلے گا کہ ہم میں سے کون پیدائشی مراد علی منگی ہے۔"

مختلف ملکوں کے نمائندوں سے علیحدہ میٹنگ ہال میں گفتگو ہوتی تھی اور وہ نمائندے یہ دیکھتے تھے کہ ایک ہی وقت میں دو مراد ان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ سوچتے رہ جاتے تھے کہ اصلی مراد اور اصلی حکمران ان میں سے کون ہے؟

مراد کی اس حکمتِ عملی کے دور رس نتائج سامنے آئے۔ سپر پاور نے اسے اپنے ملک کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اس نے فوراً ہی دعوت قبول کر لی۔ اب سپر پاور اور دوسرے تمام ممالک کے اکابرین کے ذہنوں میں ایک سوال چیخ رہا تھا۔ ان دو مراد میں سے کون دعوت نامہ قبول کر کے آنے والا ہے؟ کیا روپوش رہنے والا اور کبھی منظرِ عام پر کھلم کھلا نہ آنے والا مراد آزادانہ سپر پاور کے ملک میں آئے گا؟

کسی نے کہا۔ "نہیں۔ وہ اتنا نادان نہیں ہے۔ ہم نے پچھلی بار اسے طیارے سمیت اپنے شکنجے میں لے لیا تھا اور وہ بڑی چالاکی سے بچ نکلا تھا۔ وہ پھر یہی غلطی نہیں کرے گا۔"

کسی نے کہا۔ "جو مراد دوستی اور خیرسگالی کے نام پر دورہ کرنے آرہا ہے، وہ اصلی نہیں ہوگا۔ اس کی ڈمی ہوگا۔"

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ "اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اصلی مراد آئے گا، تب بھی ہم دشمنی کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ اس کے ساتھ سیاسی سطح پر مضبوط تعلقات نہیں رکھیں گے تو روس اور چین اس سے دوستی بڑھانے کی کوششیں کریں گے۔"

دوسرے حاکم نے کہا۔ "بے شک وہ ریاست جغرافیائی اور عسکری حوالے سے ہم تمام بڑے ممالک کے لیے اہم ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اسے دوستی کے شکنجے میں رکھنا ہے۔"

اب ہر پہلو سے حالات مراد کے موافق ہو گئے تھے۔ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے خاص مشیروں کے ساتھ سپر پاور کے ملک میں پہنچا تو جہاز سے اترتے ہی اسے اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ تمام اکابرین اس کے استقبال کے لیے ائرپورٹ کے رن وے پر آئے تھے۔ وہاں کھڑی ہوئی آرمی کے سپاہی اسے گارڈ آف آنر پیش کر رہے تھے۔ کس کی مجال تھی کہ کوئی اسے ایک مجرم کہہ دیتا؟ ایک گدھا گاڑی والے کو دنیا سلام کر رہی تھی۔ اس معمولی شخص نے آگ اور لہو کے دریاؤں سے گزرتے ہوئے ایسے کارنامے انجام دیے تھے، ایسی ذہانت کا ثبوت دیا تھا کہ ایک معمولی انسان سے غیر معمولی اور ناقابلِ شکست حکمران بن گیا تھا۔

دنیا کے بے شمار ٹی وی چینلز اسے بھرپور کوریج دے رہے تھے۔ اس کے تمام اپنے پرائے، تمام دوست اور دشمن اسے سپر پاور کے حاکم اعلیٰ کے ساتھ اخبارات کے پہلے صفحات پر دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی اسکرین پر ان دونوں کی تقریریں سن رہے تھے۔

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ "ہم والیِ ریاست ہزہائی نس مراد علی منگی کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔ ہزہائی نس نے ہماری دعوت قبول کی ہے اور یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ہمارے درمیان دوستی مستحکم ہوتی رہے گی۔ ہزہائی نس نے ہمیں بھی ریاست کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ جسے ہم شکریہ کے ساتھ قبول کر رہے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، ذلت دیتا ہے۔ یا اللہ! مجھے اپنے قہر و غضب سے بچا لے آمین۔ میں نے ایک تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد یہ موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔ آنریبل حاکم اعلیٰ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ آنے والے دنوں میں ہماری دوستی مزید مستحکم ہوتی رہے گی۔"

اس نے ریاست کی بہتری کے لیے ان سے کئی معاہدے کیے۔ ان میں یہ معاہدہ اہم تھا کہ ریاست کے طلبا و طالبات کو یورپ اور امریکا کے کسی بھی شہر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیمات حاصل کرنے کی سہولتیں حاصل ہوں گی اور ریاست کے ضرورت مند افراد کو ان ممالک میں ملازمتیں دی جائیں گی۔ وہ اپنی ریاست کو مضبوط اور خوش حال بنانے کے کئی معاہدے کر رہا تھا۔

روحانی صلاحیت کے ختم ہونے کے بعد بڑی انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس سلسلے میں ہم زاد کو ایک نقصان پہنچا تھا۔ وہ حسینۂ عالم جینی سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے محروم ہوتے کے چند گھنٹوں کے بعد ہی اسے فون پر مخاطب کیا وہ چیخ کر بولی۔ "میرے یار! میرے دلدار! کہاں ہو تم؟ کیا تمہیں میری تنہائی اور بے چینی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''آہ میری جان! میری جینی! میں مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے۔ تم بہت شکست خوردہ سے لگ رہے ہو؟''

''ہاں۔ میں شکست کھا چکا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے دشمن مراد نے پراسرار عمل کے ذریعے بیس جنات کو تسخیر کیا ہے، انہیں اپنا معمول اور تابعدار بنا لیا ہے۔''

''ہاں تم نے بتایا تھا پھر۔۔۔؟''

''پھر یہ کہ اس نے پراسرار عمل کے ذریعے مجھے بھی اپنے شکنجے میں لے لیا ہے۔ میں چونکہ باغی ہوں، اس کی غلامی قبول نہیں کر رہا ہوں اس لیے اس نے مجھے زنجیریں پہنا دی ہیں اور مجھے پاتال کی تاریکیوں میں قیدی بنا لیا ہے۔''

یہ سنتے ہی وہ رونے لگی۔ کہنے لگی۔ ''اب کیا ہوگا؟ کیا تم میرے پاس نہیں آسکو گے؟''

''نہیں۔ وہ مجھے پاتال سے باہر نہیں آنے دے گا۔''

''او گاڈ! میں کیا کروں؟ تم نہیں ملو گے تو میں مرجاؤں گی۔''

''آہ جینی۔۔۔ اس کس دل سے کہوں کہ مجھے بھول جاؤ۔''

''تمہارے کہنے سے بھی تمہیں بھول نہیں پاؤں گی۔ میں اپنے طور پر ہزار کوششیں کروں گی۔ تب بھی مجھے نظر آنے والا کوئی محبوب یا شوہر بھی متاثر نہیں کرے گا۔ میرے نادیدہ یار سے ہی میری تسلی ہوگی۔ میں تمہاری عادی ہو گئی ہوں۔ کوئی تدبیر کرو۔ کسی طرح ایک بار میرے پاس آجاؤ۔''

''میں مجبور ہوں جینی! شاید اس کی قید سے نکلنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں آئے گی تو پھر یہاں سے نکل سکوں گا۔''

''تم مجھے بتاؤ کہاں ہو؟ میں وہاں آؤں گی۔''

''میں گھپ اندھیرے میں ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ کہاں ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے اپنی ریاست میں ہی کہیں کسی تہ خانے میں قید کیا ہے۔''

''میں تمہیں تلاش کرنے آؤں گی۔ مراد تک پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ اس سے تمہاری رہائی کی بھیک مانگوں گی۔''

''ابھی نہ آؤ۔ وہ بہت غصے میں ہے۔ اپنے دشمنوں سے نمٹ رہا ہے۔ تمہاری فریاد اور تمہارے آنسو اس پر اثر نہیں کریں گے۔ ذرا صبر کرو۔ مجھے اپنے طور پر رہائی کی کوشش کرنے دو۔''

''میں صبر سے انتظار کروں گی۔ تم سے فون پر تو باتیں ہوتی رہیں گی نا؟''

''ہاں۔ میں فون پر تم سے پیار کرتا رہوں گا۔ آئی لو یو جینی!''

''آہ! میں تڑپ رہی ہوں۔ میرے نادیدہ یار۔۔۔! میں مرجاؤں گی۔''

ہم زاد نے اپنے فون کو چوما تو وہ رونے لگی۔ اس نے تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دینے کے بعد رابطہ ختم کر دیا۔ بڑی محبت سے سوچنے لگا کہ اس کے پاس کیسے جائے؟ اس کا پھول جیسا نرم و نازک بدن تصور میں کھل رہا تھا۔

جینی کے پیار کی ایک ایک ادا اسے تڑپا رہی تھی۔ اگر وہ خود اس کے پاس جانا چاہتا تو کیا ہوتا؟ وہ پہلے کی طرح نادیدہ ہو کر نہیں جا سکتا تھا۔ اوّل تو وہ نظر آنے والے کو قبول نہ کرتی۔ اگر قبول کرتی تو ایک ریاست کے حکمران کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ صرف جینی ہی نہیں، تمام دشمن بھی اسے ریاست سے پیرس تک سفر کرتے ہوئے دیکھتے تو کہیں نہ کہیں اس پر جال پھینکتے۔ وہ مراد کو نئی الجھنوں میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ کسی وقت مراد سے جینی کے بارے میں باتیں کرے گا لیکن وہ بے حد مصروف تھا۔ ریاست کے سیاسی حالات بدل رہے تھے۔ کئی ملکوں کے نمائندے مذاکرات کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ ان سے کئی معاملات پر فیصلے کرنے اور ان پر عمل کرنے میں کئی مہینے گزر رہے تھے۔

ادھر دو ماہ کے اندر ہی جینی نے فون پر خوشی سے چیختے ہوئے کہا۔ ''میرے یار! میرے دلدار! ایک بہت بڑی خوش خبری سنا رہی ہوں۔''

اس نے پوچھا۔ ''تم بہت زیادہ ایکسائٹڈ ہو رہی ہو۔ تمہیں ایسی کیا خوشی مل گئی ہے؟''

''ہائے تم سامنے ہوتے تو مجھے سینے سے لگا کر خوب چومتے۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

ہم زاد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی باپ بن جائے گا۔ وہ ایک طویل عرصے تک رنگینوں میں دن رات گزارنا چاہتا تھا لیکن اس خواہش کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔

ویسے باپ بننے کا اعزاز حاصل کرنا بھی ایک بڑی بات تھی۔ جینی نے پوچھا۔ ''تم چپ کیوں ہو؟ کیا خوش نہیں ہو؟ پلیز جلدی بولو۔''

وہ فون کو چومتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بڑی خوش خبری سنائی ہے لیکن مجھ پر یہ صدمہ حاوی ہو رہا ہے کہ میں زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی ہوں۔ اگر آزاد ہوتا تو ابھی

تمہارے پاس ہوتا۔ ہم دونوں اتنی بڑی خوشی کو ایک ساتھ انجوائے کرتے۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں بدنصیب ہوں۔ تمہاری قربت سے محروم ہوں اور خوش نصیب بھی ہوں۔ تمہارا بچہ تمہارے پیار کی نشانی میرے وجود کے اندر پرورش پائے گا۔ نو ماہ بعد اسے گود میں لے کر خوب پیار کروں گی۔ میرا دل کہتا ہے، تم اس وقت تک آزاد ہو کر یہاں آجاؤ گے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔ ہمیں کم سے کم باتیں کرنا چاہئیں کیونکہ فون کی بیٹری ڈاؤن ہوجائے گی تو اسے ری چارج نہیں کرا سکوں گا۔ یہاں تہ خانے میں بجلی نہیں ہے۔"

اس نے فون کے ذریعے اسے چوم کر رابطہ ختم کردیا۔ وہ پلے بوائے تھا۔ جوانی کی رنگینیوں میں مست رہنا چاہتا تھا لیکن جینی نے اچانک اس کے مزاج کو بدل دیا تھا۔ باپ بننے والی بات خوش خبری بھی تھی اور پریشانی کا سبب بھی تھی۔ باپ بننا اچانک ہی اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے ہونے والے بچے کی ماں کو آغوش میں بھرنے کے لیے نہیں جاسکتا تھا۔ کئی مشکلات درپیش تھیں۔

بنیادی مشکل یہی تھی کہ وہ نادیدہ ہو کر نہیں جاسکتا تھا۔ بھیس بدل کر جاتا تھا اور جینی کو قائل کرتا تھا کہ وہی اس کا نادیدہ یار دلدار ہے۔ وہ کسی طرح اسے [illegible] کرلیتا۔ لیکن ہمیشہ اپنے بچے اور اس کی ماں کے ساتھ بہروپیا بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک باپ کو اپنی اصلی شکل سے [illegible] بچے کے ساتھ رہنا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ بچے کی یہودی ماں پہ بھروسا کرنے اور خود کو مراد کی حیثیت سے ظاہر کرنے کے معاملے میں اسے ہزار بار سوچنا تھا۔ ایسے سنگین معاملے میں وہ مراد سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ادھر اس ملک کے دو اکابرین نے فون پر جینی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہم مسٹر ان سین سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اسے کہو ہمارے پاس آئے۔"

جینی نے کہا۔ "وہ نامعلوم مدت تک نہیں آسکیں گے۔ میں بہت بڑا صدمہ جھیل رہی ہوں۔ مراد علی منگی نے دوسرے جنات کی طرح میرے یار کو بھی اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔"

یہ خبر سن کر سب ہی پریشان ہو گئے۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ "اس نے ہم سے کہا تھا کہ مراد پراسرار علوم کے ذریعے اسے بھی تسخیر کرنا چاہتا ہے اور وہ اس سے بچتا پھر رہا ہے۔ آخر اس کے شکنجے میں چلا ہی گیا۔"

دوسرے عہدیدار نے کہا۔ "مراد کا ستارہ بلندی پر چمک رہا ہے۔ یہاں ہم نے بھی اس سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ دوست بن کر رہنے میں ہی بہتری ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تمہارے نادیدہ یار کو رہائی پانے کی امید ہے؟"

"ہاں۔ وہ کوششیں کررہا ہے اور میں دعائیں مانگ رہی ہوں۔ امید ہے کہ وہ رہائی حاصل کرلے گا۔"

"جب بھی وہ تمہارے پاس آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دو۔ ہم بے چینی سے انتظار کرتے رہیں گے۔"

نہ وہ آنے والا تھا، نہ انتظار ختم ہونے والا تھا۔ دن اور مہینے گزرتے جارہے تھے۔ سپرپاور اور دیگر ممالک سے جو معاہدے کیے گئے تھے، ان کے مطابق ریاست کے سیکڑوں افراد بیرونی ملکوں میں جاکر ملازمتیں حاصل کررہے تھے۔ ان بیرونی ممالک سے بھی مختلف شعبوں کے ماہرین ریاست کے کئی پروجیکٹس میں کام کرنے آگئے تھے۔ وہاں آنے والوں کو پولیس اور انٹیلی جنس والے سختی سے چیک کرتے تھے۔ جن پر ذرا بھی شبہ ہوتا تھا، انہیں فوراً واپس جانے کا حکم دیتے تھے۔

بشریٰ بلا اور سیکرٹ فورس کے جاں نثار ان تمام آنے والوں کی اور تمام سفارت خانوں کی نگرانی کررہے تھے۔ ایسے وقت ایک انوکھی بات ہوئی۔ بشریٰ اور بلا فرانسیسی سفارت خانے کی ایک دوشیزہ کو دیکھ کر چونک گئے۔

ان کے سامنے جیسے ماروی آگئی تھی۔ وہ دوشیزہ ہوبہو ویسی ہی تھی۔ فرانسیسی سفیر کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ آئی تھی۔ بشریٰ نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہیلو تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ بڑے معصوم سے لہجے میں بولی۔ "میرا نام...؟ میرا نام...؟ پلیز ویٹ اے منٹ، ابھی بتاتی ہوں۔"

وہ سوچنے لگی۔ بلے نے اس کے سفیر باپ سے پوچھا۔ "مسٹر ہارورڈ! کیا آپ کی صاحبزادی اپنا نام بھول جاتی ہے؟"

ہارورڈ نے کہا۔ "یہ بچپن سے کند ذہن ہے۔ یادداشت اتنی کمزور ہے کہ کبھی کبھی ہمیں بھی بھول جاتی ہے۔ ہم اسے کہیں تنہا جانے نہیں دیتے۔ یہ گھر کا راستہ بھی بھول جاتی ہے۔"

پھر اس نے بیٹی سے کہا۔ "جیسی! کم آن اپنا نام بولو۔"

وہ تالی بجانے کے انداز میں اپنی ہتھیلیوں کو ایک دوسری سے ٹکراتے ہوئے بولی۔ "یاد آگیا جیسیکا۔ میرا نام جیسیکا ہے۔ میری مام اور ڈیڈ مجھے جیسی کہتے ہیں۔ یہ جو بیٹی

ہوئی ہیں، یہ میری ماما ہیں۔ مجھے سب یاد ہے۔ میری یادداشت کمزور نہیں ہے۔"

ماں نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "میری بیٹی بہت ذہین ہے۔ تمام باتیں یاد رکھتی ہے۔"

بلّے نے اس کے والدین سے کہا۔ "ماروی کا نام دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشہور ہو گیا ہے۔ آپ نے اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ مراد کے حوالے سے کئی ٹی وی چینلز پر اس کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ کیا آپ نے ماروی کی تصویریں دیکھی ہیں؟"

مام نے کہا۔ "دیکھی ہیں اور اس کی تصویریں ایک فائل میں حفاظت سے رکھی ہیں۔ ہم ماروی اور ہز ہائی نس کے بارے میں بہت کچھ سنتے رہے ہیں۔"

اس کے ڈیڈی ہارورڈ نے کہا۔ "ایک بار یہ گھر سے باہر ایک تتلی کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دور تک چلی گئی۔ ایک اسٹریٹ سے دوسری اسٹریٹ میں پہنچ گئی۔ گھر کا راستہ بھول گئی۔ ہم یہ سوچ کر پریشان ہو گئے کہ اسے ماروی سمجھ کر کسی نے اغوا کیا ہے۔ بہرحال گشتی پولیس نے اسے گھر پہنچا دیا۔"

مام نے کہا۔ "ہمیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہز ہائی نس کے دشمن اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تھینکس گاڈ! اب حالات بدل گئے ہیں۔ ہمارے ملک اور آپ کی ریاست کے درمیان دوستی اور گہری محبت قائم ہو گئی ہے۔"

ہارورڈ نے کہا۔ "جب مجھے یہاں کا سفیر بنا کر بھیجا گیا تو جیسے میرے دل کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ ہماری بیٹی ہز ہائی نس کی ریاست میں ان کے سائے میں رہے۔ ہم آج تک یہ دیکھتے آ رہے ہیں کہ ہز ہائی نس باکمال ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی دشمن کو ماروی کے سائے تک بھی پہنچنے نہیں دیا۔ ہماری جیسی بھی یہاں محفوظ رہے گی۔"

بشریٰ نے معنی خیز نظروں سے بلّے کو دیکھا پھر ہارورڈ سے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسی کے ساتھ ہز ہائی نس سے ملاقات کریں۔ وہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کے لیے سیکیورٹی کے خاص انتظامات کریں گے۔"

مسز ہارورڈ خوش ہو کر بولیں۔ "یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔ اگر ہز ہائی نس جیسی پر خصوصی توجہ دیں گے تو اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ سنا ہے وہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے علوم سے اس کا علاج کر سکیں گے۔"

بشریٰ نے جیسی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "آپ کو یہ اعتماد ہے تو پھر ابھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

ہارورڈ نے کہا۔ "ابھی اچانک کیسے جا سکتے ہیں۔ پہلے ہز ہائی نس کے پی اے سے ملاقات کے لیے اپائنٹمنٹ لینا ہو گا۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ابھی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔"

وہ سب سفارت خانے سے باہر آ کر اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر محل کی طرف جانے لگے۔ بشریٰ اور بلّے کو محل کے اندر جانے سے کوئی گارڈ نہیں روکتا تھا لیکن اندر جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اگر وہ مصروف ہوتا تو انہیں بھی وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا اور اس وقت وہ بہت مصروف تھا۔ ایک ہال میں تمام مشیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ اہم معاملات پر باتیں کر رہا تھا۔

اس کے پی اے نے اسے فون پر کہا۔ "میڈم بشریٰ ابھی آپ سے ملنے کی ضد کر رہی ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن..."

مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ "بشریٰ سے بات کراؤ۔"

دوسرے ہی لمحے میں اس کی آواز سنائی دی۔ "بھائی! تمام مصروفیات کو چھوڑ کر ابھی ہال سے باہر آئیں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟ کیوں مجھے فوراً آنے کو کہہ رہی ہو؟"

"آپ کے لیے ایک بہت بڑا سرپرائز ہے۔ آپ اسے دیکھیں گے تو ساری دنیا کو بھول جائیں گے۔"

"تم کیا دکھانا چاہتی ہو؟ کیوں میرا وقت ضائع کر رہی ہو؟"

"بھائی! میں کہتی ہوں سیدھی طرح آ جائیں۔ ورنہ میں اس کا نام لوں گی تو یکلخت دوڑتے ہوئے آئیں گے۔"

"اگر یہ تمہارا چیلنج ہے تو میں نہیں آؤں گا۔"

"تو پھر کان کھول کر سنیں۔ ماروی آپ سے ملنے آئی ہے۔"

"کیا...؟" وہ حیرت سے چیخ پڑا۔ "یہ ناممکن ہے۔ دیکھو بشریٰ ایسا مذاق نہ کرو۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔"

وہ تو ماروی کا نام سنتے ہی تڑپ گیا تھا۔ تمام مصروفیات کو بھول گیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا پھر ماروی کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔

بلّا، سفیر اور اس کی وائف احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جیسی بھی اپنے والدین کے ساتھ کھڑی ہوئی تو مراد نے اس کا سراپا دیکھا پھر فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ ماروی کی ہم شکل ہے

لیکن ماروی نہیں ہے۔

اس نے جینز اور سلیولیس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ماروی ایسا لباس نہیں پہنتی تھی۔ اس کی گوری اور گلابی رنگت اور شانوں تک تراشیدہ زلفیں کہہ رہی تھیں کہ وہ یورپ کے کسی ملک سے تعلق رکھتی ہے۔

بلّے نے کہا۔ ”یہ فرانس کے سفیر مسٹر جیمس ہارورڈ ہیں۔ یہ ان کی وائف مسز مارتھا ہارورڈ ہیں اور یہ ان کی صاحبزادی مس جیسیکا عرف جیسی ہیں۔“

مراد نے مسٹر اور مسز ہارورڈ سے مصافحہ کیا۔ جیسی نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈ! یہ وہی ہیں۔ میں نے ان کو ٹی وی کے ایک ڈرامے میں دیکھا تھا۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹی! یہ ڈرامے کے ایکٹر نہیں ہیں۔ اس ریاست کے بادشاہ ہیں۔ تم نے انہیں ٹی وی کے نیوز چینلز میں دیکھا ہے۔ تم تو اچھی بیٹی ہو۔ بھولتی نہیں ہو۔“

اس نے پوچھا۔ ”مام! یہ بادشاہ ہیں مگر ان کے سر پر تاج نہیں ہے۔ انہوں نے زرق برق لباس نہیں پہنا ہے۔ ان کی کمر سے تلوار نہیں لٹک رہی ہے۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”بیٹی! چپ ہوجاؤ۔ ہم تمہیں بعد میں سمجھائیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”پلیز! اسے چپ نہ کرائیں۔ یہ چہکتی ہوئی چڑیا کتنی معصوم لگ رہی ہے۔ کیا یہ ابنارمل ہے؟“

”جی ہاں۔ ابنارمل کہہ سکتے ہیں۔ حقیقتاً یادداشت کمزور ہے۔ اسے بھولنے کی بیماری ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں جیسی کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔“

”آپ اجازت حاصل کرنے کے پابند نہ رہیں۔ جو بات دل میں ہے۔ اسے آزادی سے بیان کریں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے آپ کے بارے میں سنا ہے کہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو ایسے علوم سے میری معصوم بیٹی کا علاج ہوسکے گا؟“

مراد نے کہا۔ ”آپ نے غلط سنا ہے۔ جو شخص زیادہ شہرت حاصل کرتا ہے، اس کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں پھیلتی ہی رہتی ہیں۔ آپ مشہور و معروف اور تجربہ کار دماغی امراض کے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ علاج کتنا ہی مہنگا ہو، میں اس کے اخراجات پورے کروں گا۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”ہم پیرس میں تھے۔ وہاں سرکاری طور پر بہت مہنگا علاج کرایا گیا۔ یہ ماروی کی ہم شکل ہے۔ ہمارے ملک کے اکابرین اس میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ آخر انہوں نے ناکام ہو کر کہا کہ یہ دماغی طور پر پوری طرح نارمل ہوجاتی تو ہمارے بہت کام آسکتی تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آئندہ مجھے اپنی بیٹی کو گھر میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔ ورنہ مراد کے دشمن اسے ماروی سمجھ کر نقصان پہنچائیں گے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ کے اکابرین کیوں اس سے دلچسپی لے رہے تھے؟ کیوں اس کا مہنگا علاج کرا رہے تھے؟ اور اس کے نارمل ہونے کے بعد اس سے کیا کام لینا چاہتے تھے۔ مجھے آپ کی بیٹی سے ہمدردی ہے۔“

جب سے جیسی محل میں آئی تھی، تب سے ہم زاد اسے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ ادھر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ادھر اس کا دل کھنچا جا رہا تھا۔ ایسی معصوم سی تھی کہ اسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ وہاں آیا تو دوسرے مراد کو ریاست کے دوسرے حکمران کو دیکھ کر سب ہی احتراماً کھڑے ہوگئے۔ جیسی خوشی سے چیخ پڑی۔ تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ”ایک سے دو ہوگئے۔“

وہ دوڑتی ہوئی ہم زاد کے پاس آ کر بولی۔ ”کیا تم بھی بادشاہ ہو؟ میں تمہیں چھو کر دیکھوں؟“

وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”مجھ سے شیک ہینڈ کرو گے؟“

ہم زاد نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ یوں لگا، مکھن کی ٹکیہ ہاتھ میں آگئی ہے۔ اگر وہ اسی طرح ہاتھ میں رہے گی تو پگھلتی ہوئی اس کے اندر سما جائے گی۔

پھر اس نے سوچا۔ ’ماروی کا یہ چہرہ مراد کی جاگیر ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی پاگل ہو رہا ہوگا۔ یہ اس کی امانت ہے۔ مجھے اس کی طرف نہیں پھسلنا چاہیے۔‘

جیسی نے کہا۔ ”تم دونوں میں کون اصلی بادشاہ ہے؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”ہم دونوں ہی اصلی بادشاہ ہیں۔“

وہ بولی۔ ”کیا دو ملک کا ایک بادشاہ بھی ہوتا ہے؟“

”ہم دو ملک کے ایک بادشاہ نہیں، ایک ملک کے دو بادشاہ ہیں۔ تم غلط بول رہی ہو۔“

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔ ”سوری۔ میں یہی بولنا چاہتی تھی۔ کیا کروں بھول ہوجاتی ہے۔“

اس کا ہاتھ ابھی تک ہم زاد کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا میں تمہارا ہاتھ چھوڑوں؟“

وہ چونک کر اپنا ہاتھ کھینچ کر بولی۔ ”اوہ سوری۔ میں بھول گئی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوگیا تھا؟“

وہ بولی۔ ''مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ پھر کبھی آؤں گی تو پھر میرا ہاتھ پکڑو گے نا؟''

اس بات پر اس کے ماں باپ جھینپ رہے تھے۔ ہارورڈ نے کہا۔ ''جیسی! پلیز اتنا تو سمجھو یہ حاکم اعلیٰ ہیں۔ ان سے اس طرح بے تکلفی سے نہیں بولنا چاہیے۔''

مراد نے کہا۔ ''مسٹر ہارورڈ! میں نے کہا تھا' یہ چہکتی ہوئی چڑیا ہے۔ اسے بولنے دیں۔ یہ جو چاہتی ہے، وہ کرنے دیں۔''

پھر وہ ہم زاد سے بولا۔ ''یور ہائی نس! میں میٹنگ میں بہت مصروف ہوں۔ یہ ہمارے مہمانِ خصوصی ہیں۔ انہیں کمپنی دیں۔ یہ ڈنر کے بعد یہاں سے جائیں گے۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''یور ہائی نس! آپ جائیں۔ میں مہمانوں کا خاص خیال رکھوں گا۔''

مراد چلا گیا۔ جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ''میں حیران ہوں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو یور ہائی نس کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔ جبکہ یہ کہاوت درست ہے کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک ملک کے دو بادشاہ بھی نہیں ہوتے۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''یہاں ہوگئے ہیں۔ یہ ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ یہ کہاوت پرانے زمانے کی ہے۔ جب تلواریں چلا کرتی تھیں، اب بندوقیں چلتی ہیں اور ایک بندوق میں کئی بلٹس سما جاتے ہیں۔''

ادھر مراد میٹنگ ہال میں آیا۔ وہاں اس کے تمام مشیر اور آرمی کے اعلیٰ افسران کئی معاملات پر بحث کر رہے تھے اور ان معاملات پر مراد کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسی کو دیکھنے کے بعد ماروی اس کے اندر چیخ رہی تھی اور بول رہی تھی۔ ''میں آگئی ہوں۔ وہ جیسی نہیں ہے۔ وہ میں ہوں۔ میں نے شادی شدہ ماروی کو محبوب کے پاس چھوڑ دیا ہے۔ اسے وہیں رہنے دو۔ جس طرح تم ایک سے دو مراد ہوگئے ہو، اسی طرح میں ایک سے دو ماروی ہوگئی ہوں۔ یہ دوسری تمہارے پاس آگئی ہے۔''

مراد نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ایک مشیر اعلیٰ نے پوچھا۔ ''یور ہائی نس! آپ کچھ پریشان ہیں؟''

وہ سر اٹھا کر بولا۔ ''سوری جنٹلمین! میں واقعی اپ سیٹ ہوں۔ معذرت چاہتا ہوں۔ میٹنگ برخاست کریں۔ ہم کل صبح نو بجے یہیں ملیں گے۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔''

وہ سب وہاں سے اٹھ کر جانے لگے۔ ہال خالی ہوگیا۔ وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ یہ جو دوسری ماروی آئی ہے، یہ ہوس ہے۔ میری آزمائش ہے کہ ماہ نور جیسی بہترین عبادت گزار شریک حیات کے ہوتے ہوئے کیا مجھے دوسری عورت کی ہوس کرنی چاہیے؟ خواہ وہ ماروی ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، صابر و شاکر رہو۔ ضرورت سے زیادہ نہ چاہو۔ جو مل رہا ہے اس پر قناعت کرو۔ میں نے مصلے پر بیٹھ کر اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ ماروی محبوب کے نکاح میں آ کر میرے لیے نامحرم ہوگئی ہے۔ مجھے اس کا نام بھی زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ زبان سے اس کے نام کو اور ذہن سے اس کے تصور کو ہمیشہ کے لیے مٹا دینا چاہیے اور میں یہی کرتا آرہا ہوں۔ اب اگر جیسی کی ہوس دل میں ہوگی۔ اگر میں اسے طلب کروں گا تو گویا اس کے روپ میں ماروی پھر میری زندگی میں آجائے گی۔ میں جیسی کو منکوحہ بنا کر اسے آغوش میں لوں گا تو لاشعوری طور پر ماروی کو دھڑکنوں سے لگاتا رہوں گا۔ حقیقتاً ماروی کی طرف بھٹکنے کے لیے جیسی کا وجود ایک بہانہ بن جائے گا۔ شیطان اسی طرح بہکاتا ہے۔ ہوس اسی طرح ذہن کو سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہنے دیتی۔ نہیں، ماروی میرے لیے فنا ہو چکی ہے۔ اب ایک کے بعد دوسری تیسری آجائے تو میں کسی کو اپنی زندگی میں آنے نہیں دوں گا۔ جو میرے لیے فنا ہو چکی ہے اسے کسی بھی بہانے زندہ نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ اس ہال سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا اپنی خواب گاہ میں آیا۔ ماہ نور نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے' آپ نے وقت سے پہلے اجلاس کو برخاست کر دیا ہے؟''

مراد نے اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر اس کی گردن کو اور چہرے کو چومتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں ڈوب رہا تھا اس لیے تمام مصروفیات کو ملتوی کر کے تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے کنارے لگا دو۔''

وہ کیا کنارے لگاتی؟ وہ تو اس کے والہانہ پیار میں غرق ہو رہی تھی۔ دونوں کی سانسیں ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ''میں نے سنا ہے، کوئی ماروی کی ہم شکل آئی ہے؟''

''میرا امتحان لینے آئی ہے لیکن میری ماہ نور کے حقوق مجھ سے نہیں لے سکے گی۔''

''میں آپ کی محبت پر اور دیانت داری پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ خدا آپ کو میرے بعد بھی سلامت رکھے۔''

دوسری طرف جیسی کی گفتگو اور لہجے میں ایسی معصومیت اور ایسا بچوں جیسا انداز تھا کہ ہم زاد دل ہی دل میں قربان ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ''یا خدا...! یہ میرے سامنے کیوں آگئی ہے؟ میرا دل بے ایمان ہو رہا ہے۔ اب

سے پہلے میں ماہ نور کے سلسلے میں بے ایمان ہو گیا تھا۔ میں نے مراد کو دھوکا دیا تھا لیکن مراد اسے مکھن کے بال کی طرح نکال کر لے گیا تھا۔ مجھے ماہ نور سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اس بار بھی وہ جیسی کو میرے ہاتھ لگنے نہیں دے گا۔ بہتر ہے کہ میں اس معصوم حسینہ سے دور ہو جاؤں۔ یہ سامنے رہے گی تو مجھے پاگل بناتی رہے گی۔"

وہ اس وقت جیسی اور اس کے والدین کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر تھا۔ بشریٰ اور بلّا بھی تھے۔ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے جانا ہوگا۔ سپر پاور کے حاکم اعلیٰ سے ایک اہم معاملے میں گفتگو کرنے کا وقت مقرر ہے۔ مجھے ابھی اسکائپ کے ذریعے ان سے رابطہ کرنا ہے۔"

اس نے بشریٰ اور بلّے سے کہا۔ "تم دونوں میزبانی کے فرائض ادا کرو۔ ہز ہائی نس تھوڑی دیر بعد یہاں آئیں گے۔"

جیسی نے کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ میں بھی اسکائپ کے ذریعے بولوں گی۔"

وہ بولا۔ "سوری جیسی! کچھ سیاسی رازدارانہ باتیں ہیں۔ ایسی باتیں تنہائی میں کی جاتی ہیں۔"

"تم جاؤ گے تو میں تنہا رہ جاؤں گی۔ تم بہت اچھے ہو۔ میری تعریفیں کرتے رہتے ہو۔"

"تم تنہا نہیں رہو گی۔ ابھی وہ میرے ہم شکل ہز ہائی نس .... آئیں گے۔ وہ بھی تمہاری خوب تعریفیں کریں گے۔"

وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر بولی۔ "پھر تو تم جاؤ۔"

ہم زاد وہاں سے چلتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا مراد سے ملنے کے لیے اس کی خواب گاہ کے دروازے پر آیا۔ وہ عشا کی نماز پڑھ کر اٹھ رہا تھا۔ دستک کی آواز سن کر دروازہ کھول کر باہر آیا پھر پوچھا۔ "کیا مہمان چلے گئے؟"

ہم زاد نے کہا۔ "مہمان تمہارے ہیں۔ تم نے مجھے مہمان نوازی میں الجھایا ہوا ہے۔ پلیز جاؤ اور انہیں سنبھالو۔ میں انہیں کمپنی نہیں دوں گا۔"

"کیا ان مہمانوں سے تکلیف پہنچ رہی ہے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "تکلیف صرف اس حسینہ سے ہو رہی ہے جو ماروی کی ہم شکل ہے۔"

"کیا اس کے ابنارمل ہونے سے پریشان ہو گئے ہو؟"

"اس کے ابنارمل ہونے کی اور ایک ننھی سی بچی کی طرح بولنے کی ادائیں ایسی ہیں کہ دل بے ایمان ہونے لگا ہے۔ پھر تم سے بے ایمانی کرنے کو جی چاہنے لگا ہے۔"

"مجھ سے بے ایمانی کیسے ہو گی؟ میں نہیں سمجھا۔ مجھے سمجھاؤ۔"

"وہ تمہاری ماروی ہے۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ اس پر میرا دل آ گیا ہے۔"

"ماروی کی ہم شکل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا ہوں۔ مجھے اس حسینہ جیسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہاری طرح جگہ جگہ دل پھینکنے والا عاشق نہیں ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "کیا سچ کہہ رہے ہو؟ تمہیں سچ مچ اس سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"کہہ تو رہا ہوں نہیں ہے لیکن یہ بہت ہی غلط بات ہو گی اگر تم اس کے چکر میں پڑو گے۔ یہاں تمہاری محبت کرنے والی نیک سیرت شریک حیات ہے۔ اس کے علاوہ تم کسی جینی نام کی حسینہ سے..."

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "ارے ہاں۔ اس حسینہ کے پاس تو تم جا نہیں سکتے ہو۔ کیا اسے دودھ کی مکھی کی طرح دل سے نکال کر پھینک دیا ہے؟"

"میں نے اسے دل سے نہیں نکالا ہے اور اب تو اس سے اور بھی گہرا رشتہ ہو گیا ہے۔"

وہ چند قدموں کے فاصلے پر آرام دہ کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ "جینی میرے لیے بہت اہم ہو گئی ہے کیونکہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

مراد نے چونک کر اسے بے یقینی سے دیکھا پھر پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں جینی سے فون پر باتیں کرتا رہتا ہوں۔ تم اتنے مصروف رہتے ہو کہ تم سے اتنی اہم بات نہ کہہ سکا۔ آٹھ ماہ گزر چکے ہیں اور ایک ماہ بعد وہ بچے کو جنم دے گی۔ اسے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ بیٹا پیدا ہوگا۔ مراد...! جینی سے میرا رشتہ جائز ہے یا نہیں ہے؟ لیکن وہ بیٹا میرا ہے۔ اسے میرے سائے میں میرے دینی ماحول میں پرورش پانا چاہیے۔ اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہے گا تو اس بچے کی ماں اسے یہودی بنا دے گی۔"

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ "یا اللہ......! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم کیسی غلطی کر بیٹھے ہو؟"

وہ بولا۔ "میں نے جینی سے کہا ہے کہ مراد نے دوسرے جنات کی طرح مجھے بھی اپنے شکنجے میں لے لیا ہے۔ میں مراد کی تابعداری سے انکار کر رہا ہوں اس لیے اس نے مجھے زنجیریں پہنا کر ایک تہ خانے میں قید کر دیا ہے۔ اس نے میرے جھوٹ کو سچ مان لیا ہے کہ میں شکنجے میں ہوں،

اس کے پاس نادیدہ ہو کر نہیں جاسکوں گا۔ وہ میری رہائی کا انتظار کر رہی ہے۔"

"یہ بولو کہ بیٹے کو کیسے حاصل کرو گے؟ اسے ہمارے دینی ماحول میں پرورش پانا چاہیے۔"

"میں نے اس مسئلے پر غور کیا ہے۔ یہ تدبیر سمجھ میں آرہی ہے کہ تم فرانس کے اکابرین سے یہ بولو کہ تم نے جینی کے عاشق ان سین کو اپنے شکنجے میں لے لیا ہے لیکن وہ تمہارا تابعدار بن کر رہنے کی ایک شرط پیش کر رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اگر تم جینی کو ریاست میں بلا کر اسے اس کے عاشق کے ساتھ رہنے دو گے تو وہ دوسرے جنات کی طرح تمہارا غلام بن جائے گا۔ اس طرح جینی یہاں آکر رہنے لگے گی۔"

"ہوں۔ تدبیر اچھی ہے لیکن جب وہ یہاں آئے گی تو اپنے نادیدہ عاشق کے ساتھ رہنا چاہے گی اور تم نادیدہ نہیں ہو سکو گے۔ پھر کیا ہوگا؟"

"ہاں یہ ایک مسئلہ ہے۔ اسے بھی کسی طرح حل کیا جائے گا۔ پہلے وہ آتو جائے۔ میں بیٹے کو اپنی تحویل میں رکھوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم مراد بن کر فرانس کے اکابرین سے باتیں کرو۔ جینی کو جلد ہی یہاں آنا چاہیے۔"

"میں کل کسی وقت ان سے اسکائپ کے ذریعے باتیں کروں گا۔ ابھی جیسی اور اس کے والدین ہمارے مہمان ہیں۔ میں مراد بن کر ان کے پاس جا رہا ہوں۔"

مراد نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا ارادہ کیا ہے؟ کیا جیسی سے بھی فلرٹ کرو گے؟"

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ گناہ گار نہیں بنوں گا۔ وہ راضی ہوگی تو اسے اپنی منکوحہ بنالوں گا۔"

"لعنت ہے تمہاری ہوس پرستی پر۔ تم زیب النساء جیسی نیک سیرت شریکِ حیات پر سوکن لانا چاہتے ہو۔"

"میں زیب النساء کو راضی کرلوں گا۔ وہ میری دوسری شادی پر اعتراض نہیں کرے گی۔"

"دوسری نہیں، تیسری کہو۔ جینی یہاں آئے گی تو کیا اپنے بچے کی ماں کو منکوحہ نہیں بناؤ گے؟ کیا دنیا والوں کے سامنے اپنے بچے کو جائز نہیں بناؤ گے؟"

"ہاں، اس سے بھی نکاح پڑھوانا ہوگا۔ کوئی بات نہیں دین میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔"

"عیاشی کے لیے چار شادیوں کی اجازت نہیں ہے۔ اگر پہلی بیوی ازدواجی وظیفہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو، تب دوسری شادی لازمی ہے۔ دوسری کے ساتھ بھی ناقابلِ حل مسائل پیدا ہو جائیں، تب تیسری شادی کی اجازت ہے۔"

ہم زاد نے کہا۔ "میرے ساتھ بھی مسائل ہیں۔ اپنی اولاد کو مسلمان بنائے رکھنے کے لیے اس کی یہودی ماں سے شادی کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہاں تک تو میں راہِ راست پر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تیسری کے خواب نہ دیکھو۔ جیسی کو دل سے نکال دو۔ ابھی جاؤ اور انہیں یہاں سے رخصت کر دو۔ فضول بحث میں میرا وقت ضائع نہ کرو۔"

مراد جانے کے لیے اٹھ گیا۔ ہم زاد نے کہا۔ "جیسی میری آخری آرزو ہے۔ اس کے بعد میں کسی کی تمنا نہیں کروں گا۔"

"وہ آرزو نہیں ہے۔ گناہ کی طرف لے جانے والی ہوس ہے۔ باز آجاؤ۔"

"پلیز! مولوی بن کر نصیحتیں نہ کرو۔ یہ زندگی صرف ایک ہی بار جینے کے لیے ملتی ہے۔ موت کے بعد پھر نہیں ملے گی۔ مجھے اپنے مزاج کے مطابق لائف کو انجوائے کرنے دو۔"

وہ فوراً ہی پلٹ کر مراد کی مزید کوئی بات سنے بغیر اپنی خواب گاہ میں آگیا۔ وہاں زیب النساء عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر کے پھر جیسی اور اس کے والدین کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سب احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ لباس تبدیل ہونے کی وجہ سے یہی سمجھ میں آیا کہ دوسرا مراد آگیا ہے۔ ہم زاد نے بھی یہی ظاہر کیا۔ جیسی نے پوچھا۔ "کہاں چلے گئے تھے؟ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ جاؤ میں تم سے نہیں بولوں گی۔"

اس کی مام نے کہا۔ "بیٹی! یہ وہ نہیں ہیں۔ وہ تم سے بول کر گئے تھے کہ یہ آنے والے ہیں۔ کیا تم بھول گئیں؟"

وہ بولی۔ "مسٹر تم دونوں مجھے کنفیوز کر رہے ہو۔ تم وہ نہیں ہو۔"

ہم زاد نے مسکرا کر کہا۔ "وہ جو تھوڑی دیر پہلے گیا تھا وہ ایک اہم معاملے میں مصروف ہو گیا ہے۔ میں تمہیں کمپنی دینے آیا ہوں۔"

جیمس ہارورڈ نے کہا۔ "ہم آپ کے ممنون ہیں۔ آپ بہت زیادہ مصروف رہنے کے باوجود ہمیں اپنا وقت دے رہے ہیں۔"

ہم زاد نے کہا۔ "مسٹر ہارورڈ! آپ خوب سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کی صاحبزادی میں دلچسپی لے رہا ہوں کیونکہ یہ ہو بہو ماروی دکھائی دے رہی ہے۔"

"یور ہائی نس! میں سمجھ رہا ہوں۔ میں آپ سے اپنے

اندر کی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ جب سے مجھے اور میری مسز کو معلوم ہوا ہے کہ ہماری بیٹی ماروی کی ہم شکل ہے اور آپ ماروی کی حفاظت اور سلامتی کے لیے زمین و آسمان ایک کردیتے ہیں، تب سے ہمارے دل میں یہ بات ہے کہ ہماری بیٹی ماروی بن کر آپ کی پناہ میں رہے۔ تب ہماری تمام فکر اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔''

ماں نے کہا۔ ''ایک تو ہماری بچی ایبنارمل ہے۔ اس کا دماغ بہت کمزور ہے۔ تھوڑی دیر پہلے کی باتیں بھول جاتی ہے۔ پھر یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ آپ کے دشمن اسے ماروی سمجھ کر کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یور ہائی نس! ایک ماں آپ سے التجا کرتی ہے کہ اسے اپنی پناہ میں رکھ لیں۔ یہ آپ کے پاس محفوظ رہے گی۔''

وہ ماں باپ ہم زاد کے دل کی باتیں کر رہے تھے۔ جیسی کے قریب رہنے کا راستہ خود ہی ہموار ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ دونوں یہ چاہتے ہیں کہ جیسی میرے اس محل میں رہے؟''

جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ''بائی گاڈ ہم یہی چاہتے ہیں۔''

''کیا یہ اپنے مام اور ڈیڈ کے بغیر یہاں رہنا چاہے گی؟''

''ہم یہاں سے جائیں گے تو یہ چند گھنٹوں کے بعد ہمیں بھول جائے گی۔ جب ہم سامنے آئیں گے تو پھر ہمیں پہچاننے لگے گی۔''

ہم زاد نے دو کنیزوں کو بلا کر کہا۔ ''مس جیسیکا کے لیے ایک خواب گاہ مخصوص کرو۔ وہاں ان کی ہر ضرورت کا سامان پہنچاؤ۔ تم دونوں ان کا خاص خیال رکھو گی۔''

جیسی کی ماں نے کہا۔ ''بیٹی! یہ تمہاری کنیزیں ہیں۔ تمہیں اس محل کی سیر کرائیں گی۔ ان کے ساتھ جاؤ۔''

وہ محل کی سیر کرنے کے لیے راضی خوشی چلی گئی۔ جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ''اچھا ہوا یہ چلی گئی۔ ہم اس کی غیر موجودگی میں یہاں سے جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ بھول جائے گی کہ کس کے ساتھ محل میں آئی تھی۔ ہمیں جانا چاہیے۔''

ہم زاد ان کے ساتھ چلتا ہوا صدر دروازے سے باہر ان کی کار کے پاس آیا پھر اس نے سیکیورٹی افسر کو بلا کر کہا۔ ''یہ مسٹر جیمس ہارورڈ فرانس کے سفیر ہیں اور یہ ان کی مسز ہیں۔ ان کی صاحبزادی مس جیسیکا شاہی خاندان کی ایک فرد بن چکی ہیں۔ ان ماں باپ کو ہمیشہ وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جائے۔ یہ جب بھی اپنی صاحبزادی سے ملنے آئیں انہیں کسی روک ٹوک کے بغیر آنے جانے دیا جائے۔''

سیکیورٹی افسر نے ہارورڈ اور مسز ہارورڈ کو سیلیوٹ کیا۔ ایک گارڈ نے ان کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ وہ دونوں ہم زاد کے ممنون و مشکور ہو کر وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد بلّے نے کہا۔ ''مراد! یہ تو میں جانتا تھا کہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھتے ہی پاگل ہو جاؤ گے لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ..... منکوحہ بنائے بغیر اس نامحرم کو اپنے محل میں رکھو گے۔''

وہ بولا۔ ''میں مراد نہیں ہوں۔''

بشریٰ اور بلّے نے اطمینان کی سانس لی۔ بشریٰ نے کہا۔ ''میرے بھائی جان سلامت رہیں۔ میں جانتی تھی۔ وہ دین کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔''

بلّے نے ہم زاد سے کہا۔ ''تم بعض اوقات مراد کے مزاج کے خلاف کام کرتے ہو اور وہ برداشت کر لیتا ہے۔ اس نے یقیناً تمہیں نیک ہدایات کی ہوں گی۔''

اس نے کہا۔ ''سوری۔ میں اپنے پرسنل معاملات میں تم سے اور بشریٰ سے کبھی نہیں بولوں گا۔ تم دونوں مراد کے ہی رہو گے میرے کبھی نہیں ہو سکو گے۔''

وہ کوئی جواب سنے بغیر منہ پھیر کر چلا گیا۔ بلّے نے کہا۔ ''میں حیران ہوں۔ مراد ماروی کا دیوانہ ہے لیکن اس سے دور رہا اور یہ ہم زاد اس پر ڈورے ڈال رہا ہے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''بھائی خوب سمجھتے ہیں کہ اس کی صورت ماروی کی ہے۔ جیسی بار بار پیدا ہو کر بھی ماروی جیسی نہیں بن سکے گی۔ میرے بھائی جان بہت اچھے ہیں۔ ہمیشہ ایک بیوی کے ساتھ گزارہ کرتے رہیں گے۔ وہ تیرے اور ہم زاد کے جیسے نہیں ہیں۔''

''اے! میں نے کیا کیا ہے؟ کیا تجھ پر سوکن لا رہا ہوں؟''

''نہیں لا رہا ہے لیکن دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی دن لے آئے گا۔ تم مردوں پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ اچھا ہے۔ جس بیوی کے دل میں سوکن کا دھڑکا لگا رہتا ہے، وہ تیری طرح دن رات شوہر کی خدمت گزار بن کر رہتی ہے تاکہ دوسری کا خیال ہی نہ آئے۔ اب چل یہاں سے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔''

وہ دونوں محل سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ جیمس ہارورڈ اور اس کی بیوی دونوں ہی خوش تھے۔ ان کی ایبنارمل بیٹی شاہی محل میں عیش و آرام سے محفوظ رہنے والی تھی۔ جیمس نے گھر آ کر بیوی کو آغوش میں لے کر چوم لیا پھر اس نے فون پر اپنے ملک کے حاکم اعلیٰ سے رابطہ کیا۔

اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''سر! بہت بڑی خوش

خبری سنا رہا ہوں۔ جیسی شاہی محل میں پہنچ گئی ہے۔''

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ''صرف پہنچی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نو سر! مراد تو ماروی کا دیوانہ ہے۔ اس کی ہم شکل جیسی کو دیکھتے ہی اس پر لٹو ہو گیا ہے۔ اب جیسی اس کے ساتھ محل میں رہے گی۔ ہم اسے وہاں چھوڑ کر ابھی گھر آئے ہیں۔''

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ''ویل ڈن مسٹر ہارورڈ! یہ کامیابی ہماری توقع سے زیادہ ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا' اتنی جلدی وہ ایک چھلانگ میں محل کے اندر رہنے چلی جائے گی۔''

''اور اب وہ دونوں مراد معما نہیں رہے۔ صاف سمجھ میں آ گیا ہے کہ جیسی کی طرف مائل ہونے والا اور اسے محل میں اپنے قریب رکھنے والا ہی اصلی مراد ہے۔''

''ہاں۔ یہ سمجھ میں آ رہا ہے لیکن یقین نہیں کرنا چاہیے۔ ہم پہلے دھوکا کھا چکے ہیں۔ جیسی اس کے قریب رہے گی تو وہ اسے اپنی بیوی بنالے گا پھر بیرونی ممالک کے دوروں میں اپنے ساتھ لے جایا کرے گا تو ہمیں یقین ہوتا رہے گا۔''

''سر! وہ مراد کے اتنے قریب پہنچ گئی ہے کہ ہم اس کے بہت سے اندرونی رازوں تک پہنچتے رہیں گے۔''

''بے شک۔ بڑی سہولت سے بڑے اعتماد سے اپنے مشن پر ڈٹے رہو۔ کسی بھی معاملے میں جلد بازی کرو گے تو ہم پہلے کی طرح نقصان اٹھائیں گے۔ ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا۔''

''آل رائٹ سر! ہم بہت محتاط رہیں گے۔''

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ دوستی آسانی سے ختم ہو جاتی ہے۔ دشمنی مشکلات سے گزر کر بھی ختم نہیں ہوتی۔ سپر پاور اور دوسرے تمام بڑے ممالک نے پہلے ہی پلاننگ کی تھی کہ مراد علی منگی جب دشمنی سے زیر نہیں ہو گا تو اسے محبت سے زیر کیا جائے گا۔ اسی پلاننگ کے مطابق ایک ابنارمل لڑکی کو پیار کے پھول کھلانے کے لیے وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

ہمزاد نے دوسری صبح جینی سے فون پر کہا۔ ''میری کوئی تدبیر کام نہیں آئے گی۔ میں مراد کے شکنجے سے نہیں بچ سکوں گا۔''

وہ بولی۔ ''میرا کیا ہو گا؟ کیا میں تمام عمر اکیلی رہوں گی؟ کسی دن بھی ڈیلیوری ہو سکتی ہے۔ تمہارا بیٹا میری گود میں آنے والا ہے۔ ایسے وقت تمہیں میرے پاس ہونا چاہیے۔''

''میں نے سوچا ہے کہ مجھے تمہارے پاس رہنا چاہیے۔ اپنے بچے کو ہاتھوں میں لے کر چومنا چاہیے۔''

''ہائے میرے دلدار! کسی طرح آ جاؤ۔''

''اس طرح آ سکتا ہوں کہ مراد کی غلامی منظور کر لوں۔ پھر وہ مجھے اس حد تک آزاد کرے گا کہ تم یہاں آؤ تو میں تم سے مل سکوں۔ میں تمہاری خاطر اس کا غلام بن جاؤں گا۔''

''کیا وہ ہمیں ہمیشہ ملتے رہنے کی اجازت دے گا؟''

''وہ کبھی کبھی تم سے ملنے کی چھٹی دے دیا کرے گا۔''

''چلو یہی سہی۔ نہ ملنے سے بہتر ہے کبھی کبھی ملتے رہیں گے لیکن ایک پرابلم ہے۔ ڈاکٹر حاملہ عورت کو لمبے سفر کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر یہ کہ میری میڈیکل رپورٹ تشویش ناک ہے۔''

''کیا رپورٹ ہے...... کیا ہمارا بچہ صحت مند نہیں ہے؟''

''بہت زیادہ صحت مند ہے۔ رپورٹ کے مطابق بچہ غیر معمولی جسامت رکھتا ہے۔ عام بچوں کی طرح نہیں ہے۔ اپنے حجم میں طویل قامت ہے۔ میجر آپریشن کے ذریعے ڈیلیوری ہو گی۔ یہ سن کر پریشان ہوں کہ زچگی معمول کے مطابق نہیں ہو گی۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''یا خدا یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ یہ بچہ تو بڑے مسائل پیدا کر رہا ہے۔''

وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ''نہیں جینی! ایسے وقت میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے قریب رہوں گا لیکن...''

''لیکن کیا؟ کسی طرح آ جاؤ۔ اس کے غلام بن جاؤ۔''

''غلام بننے کے بعد اس کی شرط یہ ہو گی کہ وہ میرے نادیدہ بننے کی قوت چھین لے گا۔ میں تمہارے پاس کسی انسان کی شکل میں آؤں گا۔''

''کیا پھر میں تمہیں دیکھ سکوں گی؟''

''ہاں۔ پوری دنیا مجھے دیکھے گی۔ جب مراد کو مجھ سے کوئی کام لینا ہو گا تو وہ مجھے نادیدہ بنا دے گا۔ وہ بڑے خطرناک پراسرار علوم جانتا ہے۔ میں اس کے آگے بے بس ہوں۔''

''اس کی بات نہ کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے۔ کیا تم کسی انسان کے روپ میں میرے پاس آؤ گے؟''

''ہاں انسان کے ہی روپ میں آؤں گا لیکن تمہارے پاس نہیں آ سکوں گا۔ اس کی شرط ہو گی کہ میں ریاست سے باہر کہیں نہ جاؤں۔ اس لیے تمہیں یہاں آنا ہو گا۔''

''او گاڈ...! ایسا ہو کہ مجھے پر لگ جائیں اور میں تمہارے پاس آ جاؤں۔ میں ابھی ڈاکٹروں سے التجا کروں گی کہ مجھے ریاست تک سفر کرنے کی اجازت دیں۔''

''میں ابھی مراد کا تابعدار بن جاؤں گا تو وہ تمہارے ملک

کے اکابرین سے کہے گا کہ تمہیں یہاں فوراً بھیج دیا جائے۔"

"پلیز! میری خاطر اس کے تابعدار بن جاؤ۔ میرے اندر یہ بات سما گئی ہے کہ زندگی کا بھروسا نہیں ہے۔ میں ایسے وقت تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

اس نے وعدہ کیا کہ ابھی مراد سے معاملات طے کرے گا، اس کے آگے جھک جائے گا پھر جینی کو ریاست آنے کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔

اس نے رابطہ ختم کر کے اس ملک کے اعلیٰ حاکم کو فون پر مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ "آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے شکریہ... میرے لائق کوئی خدمت؟"

ہم زاد نے کہا۔ "پیرس میں ایک مشہور ماڈل جینی جوزف ہے، جس پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے۔"

"یس یور ہائی نس! ہمیں معلوم ہے۔ وہ ماڈل جینی ہم سے رابطے میں رہتی ہے۔"

"میں نے اس کے عاشق کو تسخیر کیا ہے۔ وہ میری قید میں ہے۔ وہ کمبخت بہت ضدی ہے۔ میری اطاعت قبول نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے زنجیریں پہنا دی ہیں۔ اپنے پراسرار علوم سے اس کے نادیدہ ہونے کی صلاحیت چھین لی ہے۔"

وہ بولا۔ "بے شک آپ پراسرار علوم کے زبردست عامل بن گئے ہیں۔ میں جینی کو اطلاع دوں گا کہ وہ آپ کی قید میں ہے۔"

"میں چاہتا ہوں، آپ جینی کو میری ریاست میں بھیج دیں۔ اس کا عاشق میرے آگے اس شرط پر گھٹنے ٹیکنا چاہتا ہے کہ میں اس کی محبوبہ کو اس کے پاس پہنچا دوں۔ میں چاہتا ہوں' جینی کو جلد از جلد اس کے حوالے کر دوں تاکہ وہ میرا غلام بن جائے۔"

"یہ کوئی پرابلم نہیں ہے، میں جینی سے بات کرتا ہوں۔ کل ہی اسے یہاں سے روانہ کر دوں گا۔ ابھی اس سے باتیں کرنے کے بعد آپ کو کال کروں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا پھر اس نے ایک گھنٹے کے بعد کہا۔ "یور ہائی نس! ڈاکٹر کہتے ہیں بچہ دس بارہ دنوں میں جنم لے گا۔ ایسے وقت اسے طویل سفر نہیں کرنا چاہیے لیکن جینی اپنے محبوب کے پاس جانے کی ضد کر رہی ہے۔"

ہم زاد نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ بچہ اور زچہ کو کوئی نقصان پہنچے لیکن اس کا محبوب بھی میری قید میں مچل رہا ہے۔ اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔ میرا فائدہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد میرا غلام بن جائے گا۔ کیا جینی کو لیڈی ڈاکٹر اور سرجن وغیرہ کی ٹیم کے ساتھ خصوصی طیارے میں بھیج سکتے ہیں؟"

"ہم ایک خاص طیارے میں اس کے لیے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کر دیں گے۔ لیڈی ڈاکٹر بھی ہوگی۔ ہنگامی سچویشن میں آپریشن کرنے والے سرجن بھی ہوں گے۔"

"جب ایسے زبردست انتظامات ہو سکتے ہیں تو اسے کل ہی کسی وقت وہاں سے روانہ کر دیں۔"

معاملات طے ہو گئے۔ جینی دوسرے دن کسی وقت بھی ہم زاد کے پاس آنے والی تھی۔

مراد کی توجہ ماروی اور محبوب پر تھی۔ وہ ان سے ملنا اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ سیکیورٹی کو مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے صدر پاکستان سے گزارش کی تھی کہ وہ پیدائشی پاکستانی ہے اور دو چار دنوں کے لیے اپنے وطن میں آنا چاہتا ہے۔

صدر پاکستان نے کہا تھا۔ "آپ کی آمد باعث مسرت ہوگی۔ آپ بصد شوق تشریف لائیں۔ ہمیں آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوگا۔ پاکستان کے عوام بڑے جوش و خروش سے اپنے ہم وطن بادشاہ سلامت کا استقبال کریں گے۔"

یہ طے پا گیا کہ وہ چار دنوں کے بعد اپنے طیارے میں وہاں آئے گا۔ ماہ نور نے خوش ہو کر پوچھا۔ "آپ مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے؟ وہ میرا بھی وطن ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ تم نہ جاؤ تو؟"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ضد نہیں کروں گی لیکن میں افسوس کرتی رہوں گی۔"

مراد مسکرانے لگا۔ وہ بولی۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں نا؟ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے نا؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "میں جاؤں گا تو تمہیں لے جاؤں گا اور میں نہیں جا رہا ہوں۔"

"ابھی آپ صدر پاکستان سے کہہ رہے تھے کہ..."

"سیاست میں کہا کچھ جاتا ہے، کیا کچھ جاتا ہے۔ میں پھر سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کو فریب دینے والا ہوں۔ ہم زاد ... وہاں جائے گا۔ میں دشمنوں کو پھر الجھاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "یہ سب جانتے ہیں کہ ریاست کی ملکہ... ماہ نور بھی پیدائشی پاکستانی ہے۔ سوال پیدا ہوگا کہ ریاست کے بادشاہ کے ساتھ ملکہ اپنے وطن کیوں نہیں آئی ہے؟"

"تم دو روز بعد بیمار بن جاؤ گی۔ یہاں کے ڈاکٹر بیان دیں گے کہ تم سفر کرنے کے قابل نہیں ہو۔ ہم زاد کے ساتھ اس کی وائف زیب النساء نہیں جائے گی۔ اس طرح سب ہی اسے مراد سمجھتے رہیں گے۔"

وہ چند لمحوں تک سر جھکا کر سوچتا رہا پھر بولا۔ "ہم زاد کے ساتھ جینی جائے گی۔"

ماہ نور نے کہا۔ ''ہم زاد سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کیا اس کا ساتھ جانا مناسب ہوگا؟''

وہ بولا۔ ''یہ سیاسی چالبازی ہے۔ کل رات سے اب تک تمام مخالفین کو یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ مراد علی منگی' ماروی کی ہم شکل جیسیکا عرف جیسی پر عاشق ہو گیا ہے۔ اس نے جیسی کو اپنے محل میں رکھا ہے۔ وہ اس کے ساتھ پاکستان جائے گی تو سب ہی کو پورا یقین ہو جائے گا کہ دیوانہ مراد اپنی دوسری ماروی سے دور نہیں رہتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''واقعی اس طرح سب ہی کو یقین ہو جائے گا کہ آپ دوسری ماروی کے بھی دیوانے ہو گئے ہیں۔ اسے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔''

وہ مراد کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں بہت خوش نصیب ہوں۔ آپ نے میری خاطر ماروی بن کر آنے والی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اللہ آپ کو میری زندگی بھی عطا کرے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اپنی دعا واپس لو۔ تمہاری زندگی ملے گی تو میں عورت بن جاؤں گا۔ ماہ نور کہلانے لگوں گا۔''

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر مراد نے فون پر محبوب سے پوچھا۔ ''آپ خیریت سے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''اوپر خدا ہے اور نیچے تم ہو۔ پھر خیریت کیسے نہیں ہوگی۔ یہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والے مجھ پر مہربان ہو گئے ہیں۔ آئی جی آف پولیس اور انفارمیشن منسٹر نے مجھے فون پر کہا ہے کہ ان کا پورا ڈیپارٹمنٹ میری سیکیورٹی کے لیے شب و روز الرٹ رہے گا۔ میں ان سے جیسی بھی سہولتیں حاصل کرنا چاہتا ہوں' وہ مجھے فوراً ہی حاصل ہوتی رہیں گی۔''

مراد ہنستے ہوئے بولا۔ ''مراد علی منگی کا ڈنڈا سروں پر بج رہا ہے۔ میں آج سے چار دنوں کے بعد وہاں آنے والا ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ جسے قاتل اور مفرور مجرم کہا جاتا تھا اور جس کے لیے میرے وطن کی زمین تنگ کر دی گئی تھی، اسی مجرم کا وہاں شاہانہ انداز میں استقبال کیا جائے گا۔''

''واقعی مراد! تم نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ ایک عام سا پاکستانی ایک ریاست کا حکمران بن کر آ رہا ہے۔ پورا پاکستان تم پر فخر کرے گا اور میں تم پر کتنا فخر کرتا ہوں' یہ میرا خدا جانتا ہے۔''

''ایک راز کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ صرف آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نہیں آ رہا ہوں۔ ہم زاد آنے والا ہے۔''

''یا خدا...! کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ دشمن پھر تمہیں ٹریپ کرنے کی حماقت کریں گے؟''

''آپ دیکھتے آ رہے ہیں۔ دشمن بھاری نقصانات اٹھانے کے باوجود دشمنی سے باز نہیں آتے ہیں۔ اس لیے میں احتیاطاً ایسی چال چل رہا ہوں۔''

''بے شک تم دانشمندی کا ثبوت دے رہے ہو۔''

مراد نے اسے ماروی کی ہم شکل جیسی کے متعلق بتایا کہ وہ ایک ابنارمل دوشیزہ ہے۔ ہم زاد اس سے فلرٹ کر رہا ہے۔ دشمن دھوکا کھائیں گے کہ مراد پھر کسی ماروی کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ اسے بیرونی ممالک کے دورے پر بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''دشمن اپنی چالیں چلیں گے۔ میں اپنی چل رہا ہوں۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ انجام کیا ہوگا؟''

محبوب نے کہا۔ ''مراد! یہ اچانک دوسری ماروی کہاں سے پیدا ہو گئی ہے؟ ایک تو ہم دونوں ہم شکل ہیں۔ اب ماروی کی بھی ہم شکل آ گئی ہے۔ اتفاقاً یہ کیا ہو گیا کہ وہ سیدھی تمہاری ریاست پہنچی اور اس نے پہنچتے ہی تمہارے محل میں جگہ بنا لی۔ مجھے تو یہ کھلم کھلا تو شکی لگ رہی ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں فریب میں آنے والا نہیں ہوں۔ اسی لیے میں نے اس کا دیوانہ عاشق بننے سے گریز کیا ہے۔ جیسی اور اس کے ماں باپ ہم زاد کو مراد سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ پاکستان کا دورہ کرے گا تو تمام مخالفین بھی اسے شک و شبے کے بغیر مراد سمجھ لیں گے۔ جیسی کو محل میں آئے ہوئے ابھی بیس گھنٹے گزرے ہیں۔ محل کی تین کنیزیں اور ایک خادم میرے جاسوس ہیں۔ اب تک ان کا بیان یہی ہے کہ وہ سچ مچ ابنارمل ہے۔ سفیر جیمس ہارورڈ اور اس کے ملک کے اکابرین اس ابنارمل لڑکی کے ذریعے اپنا گیم پلے کر رہے ہوں گے۔ پھر یہ کہ ہم زاد رنگین مزاج ضرور ہے لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی میں محتاط اور حاضر دماغ رہتا ہے۔ ان کی سازشیں جلد ہی کھل کر سامنے آئیں گی۔''

''خدا کرے، سازشیں کرنے والے بے نقاب ہو جائیں۔ تم یہاں نہیں آؤ گے۔ میں فون کے ذریعے تمہیں یہاں کے حالات بتاتا رہوں گا۔ جیسی کو بھی دیکھوں گا اور اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کروں گا۔''

ماہ نور نے آ کر کہا۔ ''اپنی مصروفیت ختم کریں۔ عصر کی اذان ہو رہی ہے۔''

مراد نے فون پر کہا۔ ''اچھا محبوب صاحب! ہم پھر کسی وقت باتیں کریں گے۔ اللہ حافظ۔''

وہ فون بند کر کے نماز کے لیے اٹھ گیا۔

☆☆☆

ہم زاد پورے محل میں جیسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے جیسی کی خاص کنیزوں کو بلا کر پوچھا۔ ''جیسیکا کہاں ہے؟''

ایک کنیز نے کہا۔ ''وہ آنکھ مچولی کھیلنے کی ضد کر رہی تھیں۔ ہم نے کہا کہ وہ کہیں جا کر چھپ جائیں۔ ہم انہیں تلاش کریں گے۔''

دوسری کنیز نے کہا۔ ''پتا نہیں، وہ کہاں جا کر چھپ گئی ہیں۔ ہم محل کے کئی حصوں میں دیکھ چکے ہیں۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''اسے ڈھونڈو۔ گارڈز اسے محل سے باہر نہیں جانے دیں گے۔ وہ اندر ہی کہیں ہو گی۔''

وہ خود اسے ڈھونڈنے لگا۔ اس محل میں تقریباً سو چھوٹے بڑے کمرے، ڈرائنگ روم، اسٹڈی روم، میٹنگ ہال اور اتنے ہی اسٹور روم تھے۔ کئی پیچ در پیچ راہداریاں تھیں۔ وہاں رہنے والوں کو ہی یاد رہتا تھا کہ وہ محل کے کس حصے میں ہیں اور انہیں کہاں سے گزر کر اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچنا ہے اور جیسی کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس کی یادداشت کمزور تھی۔ وہ ایک کمرے میں جا کر چھپ گئی تھی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑا کمرا تھا۔ دراصل وہ مراد کا وہ پرائیویٹ روم تھا، جہاں وہ بیٹھ کر اسکائپ کے ذریعے سپر پاور اور ان کے اتحادیوں سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس کی انتہائی خفیہ فائلیں اور ریاست کے تمام حساس اداروں کے اہم ریکارڈز وہاں رکھے ہوئے تھے۔

وہ اس کمرے میں بند ہو کر کمپیوٹر کے پاس آ کر چاروں طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہاں کی ہر چیز اس کے لیے نئی ہو اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ سب کیا ہے؟ چند لمحوں کے بعد ہی بھول گئی کہ وہ پہلے کہاں تھی اب کہاں ہے؟

ہم زاد اور کنیزوں کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ وہ مراد کے کانفیڈنشل روم کی طرف نہیں جائے گی۔ ایک ملازم نے دوڑتے ہوئے آ کر ہم زاد کے سامنے تعظیم سے جھک کر کہا۔ ''عالی جاہ! وہ حضور کے اسٹڈی روم میں بند ہو گئی ہیں۔ اندر سے دروازہ پیٹ رہی ہیں۔ میں نے وہاں جا کر دروازے کو باہر سے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ مقفل ہو گیا ہے۔''

مراد کے اس کمرے کی ایک چابی ہم زاد کے پاس تھی۔ اس کا لاک ایسا تھا کہ کوئی چوری چھپے وہاں جاتا تو دروازہ از خود مقفل ہو جاتا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں قیدی بنی رہی۔ ہم زاد دوڑتا ہوا آیا تو اندر سے اس کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے فوراً ہی چابی سے دروازے کو کھولا۔ وہ فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھی تھی اور رو رو کر کہہ رہی تھی۔ ''دروازہ نہیں کھلتا ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دروازہ کھولو۔''

دروازہ کھلا تو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ مراد کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کون ہے؟ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ گلاب کا پھول شبنم میں نہا رہا تھا۔ رونے والی کا حسن دوآتشہ ہو گیا تھا۔ ہم زاد نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''یاد کرو۔ میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔ تم میرے محل میں رہنے آئی ہو۔ تم نے کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا تھا۔''

وہ یاد کرنے کے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر سر ہلانے لگی۔ اسے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں اس کمرے میں کیسے آئی تھی؟''

وہ کنیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ یہاں چھپنے کے لیے آئی تھیں۔ تم تو بہت سمجھدار ہو، یاد کرو۔''

وہ پھر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ہم زاد نے کنیزوں اور ملازموں کو وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ پھر ان کے جاتے ہی دل بے ایمان ہونے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیسی کے شانوں پر تھے۔ بدن سے آنچ آ رہی تھی۔ وہ اس کے آنسو پونچھنے کے بہانے، ملائم چہرے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''کچھ یاد آ رہا ہے؟''

وہ اسے بڑے اعتماد سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ تم بادشاہ سلامت ہو۔ تم نے میرا یہ ہاتھ پکڑا تھا۔ پھر ایک بار پکڑو۔''

اس نے بڑی معصومیت سے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بہت ہی بھولے پن سے ہم زاد کو چھونے اور پکڑنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ تھام کر تعجب سے پوچھا۔ ''میں نے کب تمہارا ہاتھ پکڑا تھا؟''

''وہ جب میں یہاں آئی تھی تو تم نے مصافحہ کیا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ جب میں رات کو سونے لگی تو ایسا لگا کہ تم میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہو۔ ابھی تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی تو یاد آیا کہ تم نے ہی میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ اسی لیے جلدی پہچان گئی۔''

''ابھی میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا ہے۔ کیسا لگ رہا ہے؟''

''بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تم میرے آنسو پونچھ رہے تھے تو میں تمہاری انگلیوں اور ہتھیلیوں کے بیچ آ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ پلیز بولو نا۔ مجھے کیا ہونے لگتا ہے؟''

وہ نہ تو دل لبھانے والی ادائیں دکھا رہی تھی اور نہ ہی اپنے حسن و شباب کا چارا ڈال رہی تھی۔ وہ اپنی معصومیت سے اسے لوٹ رہی تھی۔

وہ اسے آغوش میں سمیٹ کر بولا۔ ”تم خود ہی سمجھو کہ تمہیں کیا ہونے لگتا ہے۔“

وہ ننھی سی چڑیا تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی صیاد کیسے جال پھینکتا ہے۔ اس کی ماں سمجھایا کرتی تھی۔ ”بیٹی! مردوں سے دور رہنا۔ کبھی کسی کو چھونے اور پکڑنے نہ دینا۔ تمہاری دماغی کمزوری اور معصومیت نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ میں جو سمجھاتی ہوں، وہ تمہیں یاد نہیں رہتا ہے۔“

اس کے باپ جیمس ہارورڈ نے کہا تھا۔ ”بس ایک ہی راستہ ہے۔ ہم دن رات اسے اپنی نظروں میں رکھیں۔ ہمارا ایک ہی مشن ہے، اسے مراد علی منگی تک پہنچانا۔ تب تک ہم اسے کسی کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔“

ان لمحات میں اس چڑیا کو یاد آیا۔ اس نے کہا۔ ”مام کہتی تھیں، کسی مرد کے قریب نہ جانا۔ یہ بات میں بھول گئی تھی، ابھی تم اپنے بدن سے لگا رہے ہو تو یاد آ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ، مام کیوں منع کرتی تھیں؟ کیا یہ اچھی بات نہیں ہے؟ لیکن مجھے تو اچھا لگ رہا ہے۔“

اس نے سمجھایا۔ ”ایک جوان لڑکی کو کسی ایک لائف پارٹنر کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ کیا تم یاد رکھو گی کہ میں تمہارا لائف پارٹنر ہوں اور تم اسی طرح میری آغوش میں آجایا کرو گی؟“

وہ عیسائی تھی۔ اس کے گلے میں سونے کی ایک چین کے ساتھ ایک صلیب تھا۔ اس نے ہم زاد سے الگ ہو کر اس صلیب کو تھام کر کہا۔ ”مجھے یاد آ گیا ہے۔ مام نے کہا تھا۔ گاڈ سے مدد مانگنا ہو تو اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پورے اعتماد سے چومو۔ پھر جو مانگنا چاہو، مانگو۔ گاڈ تمہاری ہر خواہش پوری کرے گا۔ تم مجھے چھوڑ رہے ہو۔ پکڑ رہے ہو تو بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ پلیز انتظار کرو۔ میں گاڈ سے تمہیں مانگ رہی ہوں۔“

وہ صلیب کو چوم کر اسے سینے سے لگا کر دھیمی آواز میں بولنے لگی۔ ”میرے خدا۔۔۔! مجھ پر رحم فرما۔ مجھے عقل دے۔ مجھے اتنا سا حافظہ دے کہ مجھے سینے سے لگانے والے بادشاہ سلامت کو ہمیشہ یاد رکھوں۔ یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں اس کے سینے سے لگنے والی بات یاد رکھوں گی تو پھر اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔ اے خدا۔۔۔! میری مدد فرما۔ آمین۔“

وہ دعا ختم کرتے ہی اس کے سینے سے آ کر لگ گئی پھر ایک ننھی سی بچی کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

ہم زاد نے پوچھا۔ ”کیوں رو رہی ہو؟“

وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ”معلوم نہیں۔ مجھے رونے دو۔“

ہم زاد نے پہلی بار اپنی ہوس پرستی پر ندامت محسوس کی۔ وہ جوان تھی لیکن اس کے اندر ایک ایسی معصوم بچی تھی جس کی معصومیت اور پاکیزگی کو ٹھیس پہنچانا مناسب نہیں تھا۔

دوسرے پہلو سے یہ حقیقت تھی کہ دنیا کی ہر بچی جوان ہو کر جوانی کے تقاضے پورے کرتی ہے۔ جینی کی عمر کا بھی یہی تقاضا تھا۔ اسی لیے ہم زاد کی قربت سے بھٹک رہی تھی۔ اس کا بچکانا ذہن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اپنے بادشاہ سلامت سے کیا چاہتی ہے؟

ہم زاد نے بڑی سنجیدگی سے فیصلہ کیا کہ اسے محض عیاشی کا کھلونا نہیں سمجھے گا۔ وہ کانچ سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اسے کبھی ٹوٹنے نہیں دے گا۔ اسے دل کی تجوری میں بڑی حفاظت سے رکھے گا۔ اسے بھٹکنے کے لیے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ہم زاد نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ مراد کی آواز سنائی دی۔ ”جہاں بھی ہو، ابھی یہاں آ جاؤ۔ میں محل کے اس حصے میں ہوں جہاں تمہاری جینی کے لیے ایک منی اسپتال قائم کیا جا رہا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”ابھی آ رہا ہوں۔“

جینی نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟ میں بھی چلوں گی۔“

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ہم شکل کے پاس تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔“

وہ دروازہ کھول کر اس کے ساتھ باہر آیا تو وہ اس سے لگی ہوئی تھی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ہم زاد نے کنیزوں کو حکم دیا۔ ”جینی کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ اس کا خیال رکھو۔ یہ اپنے کمرے سے باہر جائے گی تو پھر پورے محل میں بھٹکتی رہے گی۔“

وہ جینی کو تھپک کر بولا۔ ”ان کے ساتھ جاؤ۔ میں دیر نہیں کروں گا۔ جلدی آ جاؤں گا۔“

وہ چلی گئی۔ ہم زاد محل کے اس حصے میں آیا، جہاں تین کمروں کو اسپتال بنا دیا گیا تھا۔ ایک کمرے کو لیبر روم اور آپریشن تھیٹر بنا دیا گیا تھا۔ وہاں نرسیں اور وارڈ بوائز آ گئے تھے۔ دوسرے دن جینی کے وہاں پہنچنے سے پہلے ریاست

کے ماہر ڈاکٹر اور سرجن آنے والے تھے۔ ان کے علاوہ جیسی کے ساتھ بھی اس ملک کی معروف لیڈی ڈاکٹر اور سرجن آنے والے تھے۔

مراد اور ہم زاد وہاں کے انتظامات سے مطمئن ہو کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ مراد نے کہا۔ "میں نے سنا ہے جیسیکا میرے کانفیڈنشل روم میں گئی تھی اور وہاں ایک گھنٹے تک رہی تھی۔ دروازے کو اندر سے بند کرلیا تھا؟"

ہم زاد نے کہا۔ "تم تو جانتے ہو۔ اس کمرے کا دروازہ خودبخود لاک ہوجاتا ہے۔ وہ وہاں قید ہو کر رہ گئی تھی۔"

اس نے سختی سے کہا۔ "وہ کھیل تماشے کرنے نہیں گئی تھی۔ جان بوجھ کر لاکڈ ہو گئی تھی۔ کیا تم اندازہ کرسکتے ہو کہ اس نے ایک گھنٹے میں کمپیوٹر کے ذریعے ہمارے کتنے خفیہ معاملات کے کوڈز معلوم کیے ہوں گے اور کتنی اہم فائلیں پڑھ چکی ہوگی؟"

ہم زاد نے کہا۔ "وہ سچ مچ ذہنی مریضہ ہے۔ اس پر شبہ نہ کرو۔ اس کمپیوٹر کو اوپن کرنے کے پاس ورڈز صرف ہم دونوں جانتے ہیں۔ کوئی تیسرا نہ جانتا ہے' نہ جان سکے گا۔ پلیز اس پر شبہ نہ کرو۔ میں اسے اچھی طرح دیکھتا اور پرکھتا رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔ خدا کرے جیسیکا معصوم اور بےضرر ہو۔"

دوسری طرف سپر پاور اور اس کے اتحادی اسکائپ کے ذریعے بول رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "جیسیکا کے محل میں پہنچتے ہی ہمیں پہلی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جیسیکا دو مرادوں میں جس سے بھی بولتی ہے، اس کی ریکارڈنگ ہمارے پاس پہنچ جاتی ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ریکارڈنگ روم میں ہمارے جاسوس دن رات اس مشین کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ انہوں نے ابھی ایک آڈیو کیسٹ میرے پاس پہنچایا ہے۔ اسے آپ حضرات سنیں۔"

اس نے ایک ریکارڈر کو آن کیا۔ چند لمحوں کے بعد جیسیکا کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازہ پیٹ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "دروازہ کھولو۔ یہ بند ہوگیا ہے۔ مجھ سے نہیں کھل رہا ہے۔ پلیز ہیلپ می۔ کم اور ہیئر۔ فار گاڈ سیک اوپن اٹ..."

وقفے وقفے سے دروازہ پیٹنے کی اور اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ "او گاڈ! میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا یہاں کوئی دروازہ کھولنے والا نہیں ہے؟"

پھر ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "بی بی جی! کیا آپ کے پاس دروازے کی چابی نہیں ہے۔"

وہ روتے اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "نہیں ہے۔ چابی نہیں ہے۔ تم کون ہو؟ مجھے یہاں سے نکالو۔"

"آپ نہ روئیں بی بی جی! میں ابھی حضور اعلیٰ کو خبر دیتا ہوں۔ وہ ابھی آجائیں گے۔"

پھر دروازے کے دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف جیسی کے رونے اور سسکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک ملک کے حاکم نے پوچھا۔ "یہ کمبخت لڑکی کہاں جا کر پھنس گئی ہے؟ وہ آٹو میٹک لاکڈ ہوجانے والا دروازہ ہوگا۔ کسی خاص کمرے کے دروازے ہی ایسے ہوا کرتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے، وہ محل کے کسی کانفیڈنشل کمرے میں جا کر پھنس گئی ہے۔"

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ "جیسیکا نے کچھ راز کی باتیں معلوم کی ہوں گی۔"

سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "فار یور انفارمیشن وہ نہیں جانتی کہ راز کیا ہوتا ہے اور جاسوسی کیسے کی جاتی ہے۔ وہ دماغی طور پر بہت کمزور ہے۔ حافظہ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی ہے کہ اس کے گلے سے جو صلیب لٹک رہا ہے اس کے اندر موبائل فون کی ایک سم رکھی ہوئی ہے۔ وہ صلیب دراصل ایک فون ہے۔ اس کی بیٹری بہت پاورفل ہے۔ چوبیس گھنٹے آن رہنے کے باوجود کبھی ڈاؤن نہیں ہوگی۔ ہم وہاں ہونے والی تمام اہم اور غیر اہم باتیں سنتے رہیں گے۔"

ایک نے کہا۔ "صرف باتیں سننے سے کیا حاصل ہوگا؟"

"بہت کچھ حاصل ہوگا۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ ان دو میں سے کون اصلی مراد علی منگی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ آج سے چار دنوں کے بعد پاکستان کے دورے پر مراد جارہا ہے یا ڈمی مراد جانے والا ہے۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ ریکارڈر سے مراد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر جیسی کے پاس آگیا تھا۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مراد کہہ رہا تھا۔ "یاد کرو۔ میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔ تم میرے محل میں رہنے آئی ہو۔ تم نے کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا تھا۔"

مراد اور جیسی کی باتوں سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کنیزوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اس کمرے میں چھپنے کے لیے آئی تھی۔ اب مراد کے سامنے رفتہ رفتہ اسے پہچان رہی تھی۔ وہاں تمام سننے والے اکابرین کو معلوم ہو رہا

تھا کہ وہ نوخیز دوشیزہ اپنی عمر کے فطری تقاضوں کے مطابق مراد سے متاثر ہوگئی ہے اور اسے بڑی معصومیت سے طلب کررہی ہے۔ پھر وہ صلیب کو ہاتھوں میں لے کر اسے چوم کر دعائیں مانگ رہی تھی۔

ایک حاکم نے کہا۔ ''یہ لڑکی عقل سے محروم ہے لیکن مراد کی آغوش میں جاکر اپنی ماں کی گزری ہوئی باتیں یاد کررہی ہے۔ اسے معجزہ کہنا چاہیے۔ یہ کچھ عقل کی باتیں کررہی ہے۔ ایک نارمل لڑکی کی طرح گاڈ سے مراد کو طلب کررہی ہے۔''

وہ بولنے والا چپ ہوگیا۔ اس وقت مراد فون اٹینڈ کررہا تھا۔ پھر اس نے جواباً کہا۔ ''ابھی آرہا ہوں۔''

جیسی نے پوچھا۔ ''کہاں جارہے ہو؟ میں بھی چلوں گی۔''

مراد کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے دلاسا دینے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''میں اپنے ہم شکل کے پاس تھوڑی دیر کے لیے جارہا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ میں ابھی آجاؤں گا۔''

تمام ملکوں کے اکابرین یہ سن کر بے چین ہوگئے کہ وہ دوسرے مراد سے ملنے جارہا ہے۔ پھر جلد ہی انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ جیسی اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔ خبریں پہنچانے والی صلیب بھی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔

انہیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ دو مراد کہاں ملاقات کررہے ہیں اور کن معاملات پر باتیں کررہے ہیں۔

اکابرین میں سے ایک نے جھنجلا کر کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب اہم باتیں معلوم ہونے والی ہیں تو جیسی کو دور کردیا گیا ہے۔''

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''ہمیں صبر سے انتظار کرنا چاہیے۔ ابھی رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ آئندہ بھی کسی رکاوٹ کے بغیر معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔''

دوسرے حاکم نے کہا۔ ''اتنا تو معلوم ہوگیا ہے کہ جیسیکا سے جو پیار کررہا ہے، وہی ماروی کا دیوانہ مراد علی منگی ہے اور وہ مراد اپنی نئی ماروی کو اپنے ہم شکل کی آغوش میں جانے نہیں دے گا۔''

''ہاں۔ اصل مراد کی نشاندہی ہورہی ہے۔ پھر بھی ہماری طرف سے انتقامی کارروائی نہیں ہوگی۔ ہم ایک لمبی مدت تک یقین کرتے رہیں گے۔ دونوں مراد کو مختلف حالات میں مختلف واقعات میں پرکھتے رہیں گے۔ اس دوران دوستی اور محبت کی سیاست کرتے رہیں گے۔ اگر ہماری سیاسی دوستی سے باہمی تعلقات بہتر ہوتے جائیں تو ہم دوستی بحال رکھیں گے۔ دشمنی بھول جائیں گے۔''

پھر وہ جینی کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ''مراد مستران سین (ہم زاد) کی محبوبہ سے اچانک ہی دلچسپی لینے لگا ہے۔ اس ماں بننے والی ماڈل کو اپنی ریاست میں بلا رہا ہے۔ سوچنے کی بات ہے۔ میری سمجھ میں آرہا ہے کہ اس ماڈل جینی کے پیچھے گہری رازداری ہے۔ مراد کسی خاص مقصد کے لیے اسے اپنے قریب بلارہا ہے۔''

''مقصد یہ ہے کہ جینی کا عاشق جن اسی وقت مراد کی تابعداری قبول کرے گا، جب اس کی محبوبہ کو اس عاشق کے پاس ریاست میں پہنچایا جائے گا۔''

''کیا وہ عاشق جن مستران سین اس ریاست میں رہتا ہے؟''

''مراد نے اسے وہاں قیدی بنا کر رکھا ہے۔''

آرمی کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''ہمارا ذہن ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کررہا ہے۔ یہ قصے کہانیوں والی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔''

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ''پہلے ہم بھی تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن ہماری آرمی کے سیکڑوں سپاہی مارے گئے۔ ہمارے جہاز، ہیلی کاپٹر اور اسلحے کے گودام بم دھماکوں سے اڑ گئے۔ ہم نے دو ہی دنوں میں کروڑوں ڈالرز کا نقصان اٹھایا ہے۔ ایک تنہا مراد ہمیں اتنی بڑی تباہی سے دوچار نہیں کرسکتا تھا۔ پھر ہم نے مستران سین کو اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے درمیان موجود پایا تھا۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن ہم سے باتیں کررہا تھا۔ وہ اپنی حرکتوں سے یہ ثابت کرتا رہا ہے کہ ہماری دنیا میں جنات کا وجود ہے اور یہ قصے کہانیوں والی باتیں نہیں ہیں۔ میں سو بات کی ایک بات کہہ چکا ہوں۔ ہم ایک لمبی مدت تک مراد کے خلاف نہ سوچیں گے، نہ مخالفت میں کوئی قدم اٹھائیں گے۔ ایبنارمل جیسیکا کے اور دیگر سراغ رسانوں کے ذریعے جو جاسوسی کراسکتے ہیں اور اہم خفیہ معلومات حاصل کرسکتے ہیں، وہ چپ چاپ رازداری سے کرتے رہیں گے۔''

ان سب کے موجودہ فیصلے کے مطابق آئندہ مراد سے نہ جنگ ہونے والی تھی، نہ کسی طرح کی محاذ آرائی کی نوبت آنے والی تھی۔ دشمنوں کو عقل آگئی تھی۔ فی الحال جیسے کاتبِ تقدیر نے آرام وسکون اور امن وامان لکھ دیا تھا۔

لیکن دنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ تماشے نہ ہوں تو دنیا دلچسپیوں سے خالی ہوجائے گی۔ لہٰذا ایک سمت سے ہنگامے رکتے ہیں تو دوسری سمت سے شروع ہوجاتے ہیں۔ ریاست

میں سزائے موت اور عمر قید کی سزا پانے والے دس مجرموں نے مراد کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی۔ ان کی پشت پر مجرموں کی سب سے خطرناک اور طاقت ور تنظیم ریڈ الرٹ تھی۔ باقی دوسری کرمنل تنظیمیں بھی ریڈ الرٹ کے سربراہ جیکی براؤن کے ساتھ ہوگئی تھیں۔

ان دس مجرموں نے کئی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے مراد کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''ہمیں سزائے موت کا حکم سنانے والے اب تمہاری موت لازمی ہوگئی ہے۔ تم نے سوچا تھا کہ ہمیں ریاست سے باہر دوسرے ملکوں میں پہنچاؤ گے تو ہم بدنصیبوں کو کوئی ملک پناہ نہیں دے گا۔ ہم ان ملکوں میں مارے جائیں گے یا پھر سزائے موت پانے کے لیے ریاست واپس آئیں گے۔ تم یہ بھول گئے تھے کہ ہمیں کسی ملک میں پناہ ملے یا نہ ملے، جرائم کی دنیا میں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور یہی ہورہا ہے۔ ہمیں سلامتی مل گئی ہے۔ خفیہ پناہ گاہیں اور بے حساب اسلحہ مل گیا ہے۔ مختلف بینکوں میں ہمارے اکاؤنٹس کھل گئے ہیں۔ درجنوں تنظیموں نے بڑی فراخ دلی سے ہمارے اکاؤنٹس میں لاکھوں ڈالرز پہنچا دیے ہیں۔ اب ہم تمہاری طرف سے معتوب کیے ہوئے دس مجرم نہیں ہیں۔ ہم دس ہزار ہوگئے ہیں۔ تمہاری زندگی حرام کردیں گے۔ ابھی یہ لکھ لو کہ جب تک ریاست کے اندر ہو سلامت ہو۔ تم اور تمہارا وہ تو شکل... ہم شکل مراد جب بھی اپنی سرحد سے باہر آئے گا' مارا جائے گا۔ اگر کسی ملک کا دورہ کرنے والے ہو تو زندہ رہنے کے لیے اسے منسوخ کردو۔ اگر کبھی حالات سے مجبور ہوکر ریاست کو چھوڑنا پڑا تو ہم تمہیں کسی ملک میں سیاسی پناہ لینے نہیں دیں گے۔ تمہارا جینا مشکل کرکے موت کو آسان بنادیں گے۔ ابھی یہ ابتدا ہے۔ دو چار ماہ کے بعد ہمارے جاسوس اور سیکڑوں شوٹرز تمہاری ریاست میں گھس آئیں گے۔ تمہاری آرمی سے گوریلا جنگ لڑیں گے اور تم دیکھو گے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور کرنسی کی کمی نہیں ہوگی۔ جب تک تم زندہ رہو گے۔ جب تک ہم سانس لیتے رہیں گے۔ وہ گوریلا جنگ جاری رہے گی۔ سمجھ لو کہ تمہاری ریاست کے عوام کا بھی امن وسکون غارت ہونے والا ہے۔''

مراد اور ہم زاد سن رہے تھے۔ وہ دس مجرم بے یارومددگار نہیں تھے۔ ان کے پاس اسلحہ کرنسی اور خفیہ پناہ گاہیں تھیں۔ ان کی پشت پناہی کرنے والی کرمنل تنظیمیں بھی ان دونوں کو چیلنج کررہی تھیں۔ کسی بھی ملک کی پولیس، انٹیلی جنس اور آرمی انڈر گراؤنڈ تنظیموں کو لگام دینے میں ناکام رہتی ہیں اسی لیے وہ خوب پنپتی ہیں۔ وہ دس مجرم بھی بے لگام ہوگئے تھے۔

وہ اعلان کررہے تھے۔ ''مراد ایک ہی شرط پر زندہ سلامت رہ کر لمبی عمر گزار سکتا ہے۔ وہ ایک ناقابلِ شکست اور طاقتور مجرم تھا۔ وہ مجرم اب بھی اس کے اندر ہے۔ اسے ہم نیک مشورہ دیتے ہیں کہ وہ دنیا کے تمام مجرموں کا سرپرست بن جائے۔ اپنی ریاست کو ہم سب کی محفوظ پناہ گاہ بنادے۔ تمام مفرور اور روپوش رہنے والے مجرم اس کی ریاست میں آباد ہوں گے اور کسی اندیشے کے بغیر وہاں آزادی سے زندگی گزاریں گے۔ سیاست اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ مجرم ہے، مجرم ہی رہے گا۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ راضی خوشی تمام مجرموں کا سرپرست بن کر جرائم کی دنیا کا شہنشاہ کہلائے۔ اگر وہ ہماری یہ شرط تسلیم نہیں کرے گا۔ ہمارے نیک مشوروں پر عمل نہیں کرے گا تو ہم رفتہ رفتہ گوریلا جنگ لڑتے ہوئے اس کے محل میں گھس آئیں گے۔ اسے پھانسی پر لٹکا کر وہاں کے حکمران بن جائیں گے۔ مراد نے ایک ریاست کا حکمران بن کر ہمیں یہ سمجھا دیا ہے کہ ہم مجرم بھی اپنی ایک حکومت قائم کرسکتے ہیں اور اپنی مملکت میں اپنے مجرم بھائیوں کو پناہ دے سکتے ہیں اور ہم جلد ہی ایسا کرنے والے ہیں۔''

ہم زاد نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے کہا۔ ''مراد... ! ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے خلاف مجرموں کا یہ نیا محاذ کھل جائے گا۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ان کم بختوں نے ایک نئی اور چونکا دینے والی بات کی ہے کہ دنیا کے تمام مجرموں کا ایک الگ ملک اور الگ حکومت ہونی چاہیے۔ یہ ایسی بات ہے کہ دنیا کی تمام انڈر ورلڈ مافیا اور سنڈیکیٹ ان کا ساتھ دیں گی۔ تمام مجرموں کی یہ دلی خواہش ہوگی کہ وہ مفرور نہ کہلائیں۔ روپوش نہ رہیں۔ آزادی سے گھومنے پھرنے کے لیے ان کا ایک ملک اور ان کی اپنی حکومت ہو۔ وہ موت کی سزا پانے والے دس مجرم جو یہاں سے گئے تھے، بڑا زبردست گیم کھیل رہے ہیں۔ انہیں تمام انڈر ورلڈ کے چھٹے ہوئے مجرموں کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوگئے۔ ایسے وقت کہا جاسکتا ہے کہ دشمنوں نے بولتی بند کردی تھی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



دام

علی اختر

مفاد پرستی کی عادت نہ تو ذات پات دیکھتی ہے اور نہ ہی اونچ نیچ کا خیال کرتی ہے۔ نہ اپنا مقام دیکھتی ہے، نہ رشتوں کا احساس کرتی ہے۔ بس یہ ایک خوب صورت جال ہے جو اپنے مطلوب کے گرد گھیرا تنگ کرتا... اور مخالفین کی چھانٹی کرتا رہتا ہے... کچھ یہی انداز اس جوڑے کا تھا جو کچھ کی نظروں میں انتہائی بے جوڑ تھا لیکن وہ آپس میں اسی طرح جڑے رہے جیسے ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ہے... مگر... کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون کس کے دام میں الجھا اور کس نے جال پھیلایا۔

زینہ بننے والی ایک بے بس دوشیزہ کی تنہائیوں کا عکس

پولیس کو دیے گئے ابتدائی بیان میں اس کی موت کی وجہ خودکشی لکھوائی گئی تھی۔ سیڑھیوں اور کمرے کے درمیان کوریڈور میں ابھی تک باربرا گلاپی کی لاش اوندھے منہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی دونوں بانہیں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے ایک بازو کے ہاتھ کے قریب پسٹل پڑا ہوا تھا اور اس کی کنپٹی سے نکلی ہوئی خون کی پتلی سی دھار بہہ کر زمین تک آ گئی تھی۔ اس وقت اس چھوٹے سے گھر میں صرف دو افراد اس لاش کے نزدیک

بہ ظاہر پریشان کھڑے تھے۔ ایک اٹھارہ بیس سال کی عمر کا لڑکا جان اشکرافٹ اور دوسری انتہائی خوب صورت اور متناسب جسامت کی حامل پینتیس چالیس سال کی اپریل گلاپسی جو خودکشی کرنے والی باربرا کی ماں تھی۔ اس کے خوب صورتی سے کٹے بالوں کی پریشان لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ جان اشکرافٹ خود بڑا پریشان لیکن بہ ظاہر مطمئن نظر آرہا تھا۔ وہ ابھی ابھی کمرے میں پڑے ٹیلی فون سے مقامی پولیس اسٹیشن فون کر کے ہٹا تھا اور دوبارہ لاش کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

اپریل گلاپسی نے اپنی موٹی اور غلافی آنکھوں سے جان اشکرافٹ کی طرف دیکھا تو جان اشکرافٹ نے اس کی آنکھوں میں آئے سوال کو پڑھ کر آنکھوں ہی سے سب اچھا کی رپورٹ دی۔ چند لمحوں کے بعد ان کے فلیٹ میں پولیس پہنچ چکی تھی۔ انسپکٹر نے اندر آتے ہی زمین پر اوندھی پڑی لاش کی طرف دیکھا۔ لاش کے لانبے ہاتھوں کے خوب صورت اور بدور ناخنوں پر گہرے سرخ رنگ کی نیل پالش بہت سج رہی تھی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں ابھی تک حیرت جاگ رہی تھی۔ صحت کے لحاظ سے وہ خاصی کمزور اور بکھرے بالوں سے پریشان لگ رہی تھی۔ لاش کے اردگرد چلنے کے بعد اس نے اپنے ماتحتوں کو کچھ حکم دیا اور خود گھر والوں کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ کمرے میں رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کاغذ سنبھالا اور گھر میں موجود افراد کا بیان لینا شروع کر دیا۔ پہلا سوال اس نے اشکرافٹ سے کیا۔

''آپ مرنے والی کے کیا لگتے ہیں؟''

''جی، میں اس کا بوائے فرینڈ ہوں۔ میرا نام جان اشکرافٹ ہے۔''

''پولیس اسٹیشن فون آپ نے ہی کیا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی سر......!''

''اور آپ......'' انسپکٹر کا اگلا سوال اپریل گلاپسی سے تھا۔

''میں اس کی بدنصیب ماں ہوں......'' اپریل گلاپسی کی آنکھوں کی نمی چھلکنے کو تھی۔

''یہ واقعہ کب ہوا......؟'' انسپکٹر نے سوال کیا۔

''آج صبح...... میں رات ادھر ہی تھا۔ میں اور باربرا کمرے میں تھے۔ میں صبح اٹھ کر واش روم گیا تو باربرا جاگ رہی تھی لیکن بے حد پریشان اور الجھی الجھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید رات وہ پوری طرح اپنی نیند نہیں لے سکی ہے۔ رات اس کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ ہم تینوں قریبی ڈاکٹر کے پاس بھی گئے تھے جہاں سے باربرا کا علاج چل رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے کونسی بیماری لاحق ہے۔ بہ ظاہر وہ ٹھیک ٹھاک نظر آتی تھی لیکن اندر ہی اندر اسے کوئی ڈپریشن یا شدید نفسیاتی مرض لاحق تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بات بات پر اونچی آواز میں رونے لگتی تھی اور ہر وقت انتہائی غصے میں رہتی تھی۔ کھانا پینا بھی اس نے بہت کم کر رکھا تھا۔ آج صبح جب میں واش روم میں تھا تو میں نے گھر میں موجود سنگار میز کی دراز کھلنے کی آواز سنی اور پھر اس کے اٹھتے ہوئے تیز قدموں کی چاپ مجھے سنائی دی۔ اس کے بعد اچانک ہی مجھے فائر کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً واش روم سے نکلا تو یہ بھی باہر کھڑی تھیں۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے کوریڈور میں آئے۔ تو اس وقت تک باربرا دم توڑ چکی تھی۔ اس نے خود کو کنپٹی پر گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔''

انسپکٹر نے جان اشکرافٹ کا ابتدائی بیان لکھا۔ اتنی دیر تک اس کا ماتحت وقوعہ کا نقشہ بنا چکا تھا۔ تب انسپکٹر اپنی نشست سے اٹھا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور باربرا کے اس پھیلے ہوئے بازو کے قریب دوزانو بیٹھ کر پسٹل کے حلقے میں اس کی پھنسی انگلی کو آہستہ سے نکالا اور پسٹل کو رومال ہی میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے اٹھا لیا۔ اتنی دیر میں نیچے سڑک پر ایمبولینس پہنچ چکی تھی اور رضا کار...... اسٹریچر لے آئے تھے۔

''پوسٹ مارٹم کے لیے لاش کو اسپتال لے چلو......'' پولیس انسپکٹر نے انہیں کہا اور خود ایک بار پھر ان دونوں کے قریب آیا۔

''دیکھیں...... جب تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہیں آجاتی، اس وقت تک آپ دونوں شہر سے باہر نہیں جائیں گے۔ ہمیں کسی لمحے بھی آپ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیے تو انسپکٹر نے مزید ضروری کوائف لیے اور ان دونوں کو پریشان چھوڑ کر چلا گیا۔ ''وہ مجھے بہت عزیز تھی۔ اب اس کا خلا کس طرح پورا ہوگا......'' اپریل گلاپسی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو جان فوراً آگے بڑھا۔ اس نے اپریل کے گالوں پر اترنے والے آنسوؤں کو اپنی انگلی کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔

''اسے خداوند کی رضا جان کر صبر کرو......'' انسپکٹر نے جاتے جاتے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ناچار اسے بھی

صدمے سے نڈھال اپریل گلاسپی کا کندھا تھپتھپانا پڑا۔

☆☆☆

کیش اینڈ کیری سے باربرا اگلی صبح کا ناشتا سر شام ہی لے جایا کرتی تھی۔ اس روز بھی شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ باربرا ناشتا اور دیگر لوازمات لے کر کیش اینڈ کیری سے نکلی تھی۔ ابھی وہ تھوڑا دور ہی گئی تھی کہ ایک قریبی گلی سے وہ ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو لے کر اس پر پل پڑا۔ وہ قد کاٹھ میں خاصا لمبا اور ہاتھ پاؤں کا مضبوط سیاہ فام تھا۔ اس نے آتے ہی اسے اپنے مضبوط اور کھلے ہاتھوں سے قابو میں کرلیا اور اسٹریٹ لائٹس سے ہٹ کر اندھیرے میں گھسیٹ کر لے گیا۔

”مجھے امید ہے، ننھی گڑیا کہ تم چیخنے کی بے وقوفی نہیں کرو گی۔ ورنہ دیکھ رہی ہو میرے چاقو کا پھل بہت تیز ہے......“ وہ غرایا۔ باربرا نے خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”شاباش، جلدی سے جو کچھ تمہارے پاس ہے میرے حوالے کردو...... جلدی کرو...... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ اس نے چاقو کی نوک اس کی گردن میں چبھوئی تو باربرا نے خوفزدہ ہو کر خریدی ہوئی اشیا کے علاوہ اپنا پرس بھی اس کے حوالے کردیا۔ ابھی اس سیاہ فام نے وہ پرس پکڑا ہی تھا کہ مخالف سمت سے آنے والی کار کی بھرپور لائٹوں میں وہ دونوں نہا گئے۔ کار کے پہیے ان کے نزدیک آکر سختی سے چرچرائے اور دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا نوجوان نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ لگتا تھا کہ اسے دور ہی سے معاملے کی نوعیت کا پتا چل گیا تھا۔

”چھوڑ دو اسے ورنہ پستول کی ساری گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔“ آنے والے نے دھمکی دی تو وہ اسے وہیں چھوڑ کر اسی اندھیری گلی میں چلا گیا۔ باربرا کا خریدا ہوا سامان زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ پرس بھی اس کے پاؤں کے قریب پڑا تھا۔

”میرا خیال ہے، تم بچ گئی ہو۔“ وہ زمین سے سامان اٹھانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

”ہاں...... شکریہ تم وقت پر آگئے۔“ باربرا نے کہا۔

”میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ زبردستی کر رہا ہے۔ تبھی میں نے کار کو بڑی تیزی سے دوڑایا تھا۔“ باربرا نے تشکرانہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور اپنا سامان سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرنے لگی...... اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ باربرا اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی ماں ابھی تک اپنی جاب سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے سامان فریج میں رکھا۔ اس دوران میں وہ اسی واقعے کے بارے میں سوچتی رہی اگر وہ مزاحمت کرتی۔ تو کیا وہ اسے چاقو سے قتل کردیتا اور اگر وہ کار والا نوجوان وقت پر نہ پہنچتا تب بھی وہ اس کے ساتھ ہاتھا پائی ضرور کرتا۔ اس نے ان غنڈوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور زندگی میں شاید پہلی بار اسے اس واقعے کا حصہ بننا پڑا تھا، مگر وہ نوجوان کون تھا؟ اس کی نظروں میں دونوں کا حلیہ گھوم گیا۔ سیاہ فام غنڈا جس کی آنکھوں میں سفاکیت تھی اور وہ کسی بھی صورت میں اسے مار ڈالنے کی کوشش کرتا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی اس کی نسبت نیلی آنکھوں اور براؤن بالوں والے دراز قد نوجوان کی وجاہت اور مہذب رویہ اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔

اس نے سوچا کہ ماں کو بتا دینا چاہیے اگر اس نے بتایا بھی تو اس کی ماں اسے احتیاط برتنے کا کہہ کر خاموش ہوجائے گی مگر وہ نوجوان ابھی تک اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ کیا وہ روزانہ اسی راستے سے گزرتا ہے اگر ایسا ہے تو وہ کل شام کو اس کا وہیں انتظار کرے گی۔ اس کی ماں کب گھر آئی، اسے خبر نہیں ہوئی۔ ہاں البتہ اسے اس کے آنے کی خبر اس وقت ہوئی جب اس نے آواز دے کر پوچھا۔

”باربرا...... کچن کا سامان لے آئی ہو......؟“

”جی ماما...... کب کا...... آپ کس وقت آئیں؟“ باربرا نے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے پوچھا۔

”کچھ دیر پہلے...... میں نے سمجھا تم سو چکی ہو۔ کھانا کھالیا کہ نہیں......؟“ اس کی ماں نے دوبارہ استفسار کیا۔

”میں تو کھا چکی ہوں، آپ کے لیے رکھا ہے۔“ باربرا نے جواب دیا۔

”دیکھو باربی، میں صبح جلد کام پر چلی جاؤں گی۔ تمہارے اٹھنے سے پہلے ہی۔ تمہارا ناشتا بنا کر رکھ جاؤں گی۔ اٹھ کر کھا لینا اور کالج چلی جانا اوکے۔“ اس کی ماں نے بتایا۔

”ٹھیک ہے ماما......“ باربرا نے جواب دیا۔

☆☆☆

باربرا گلاسپی کو اپنے خوب صورت نقوش کی وجہ سے دیکھنے والے یہ کہتے تھے کہ وہ اپنی ماں...۔ اپریل گلاسپی کا دوسرا جنم ہے۔ بڑی بڑی ہرے کانچ کی سی آنکھیں ستواں ناک اور سرخ و سفید رنگت پر گلاب کی پنکھڑیوں کے سے ہونٹ جن کی رنگت قدرتی سرخ تھی۔ لمبی انگلیوں کے بیضوی ناخنوں پر اسے شروع سے ہی سرخ رنگ کی نیل پالش لگانے کا شوق تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی تو کئی بار اسے اس بات

پر اپنی ماں سے جھڑکیاں بھی سننے کو ملی تھیں مگر اس کا یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اب وہ کالج میں داخلہ لے چکی تھی۔ کالج میں مخلوط تعلیم تھی اور باربرا اپنی کلاس کی ذہین ترین لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کالج کی مقبول ترین لڑکی بن چکی تھی۔ کالج میں ہر دوسرا لڑکا اس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش میں تھا مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ اپنی پختہ طبیعت اور عادت کے مطابق وہ اپنے دل کا ایک دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتی تھی۔ اس دروازے سے وہ ہر اس لڑکے کو اتنی چھوٹ دے دیتی کہ وہ اس کی چاہت کی کچی ڈور پکڑ کر اس کے ذریعے اس کے من میں داخل ہو جاتا اور جب وہ دیکھتی کہ آنے والا اس کے دل پر دستک دینے لگا ہے تو وہ فوراً اس سے کنارہ کشی کر لیتی اور اگر کوئی پھر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تو اس کی شکایت پرنسپل سے کر دیتی۔

جارج واکر اس کی کلاس کا سب سے سنجیدہ لڑکا تھا۔ گھنگرالے سنہری بالوں اور براؤن آنکھوں والا۔ سب لڑکیاں اس کی قربت حاصل کرنے کی خواہاں تھیں مگر وہ کسی کو بھی سنجیدگی سے نہ لیتا تھا۔ تبھی وہ لڑکیوں میں مغرور سمجھا جانے لگا تھا۔ باربرا اگلا پی اور اس کی دوستوں نے باقاعدہ ایک پروگرام کے تحت اس کا غرور توڑنے اور اس کی انا کو شکست دینے کا پروگرام بنایا اور اس کے لیے باربرا کو آگے کر دیا گیا۔ باربرا نے بھی ہنس کر یہ ذمے داری قبول کر لی۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ باربرا کالج کی ٹک شاپ پر بیٹھی تھی کہ ایک پلیٹ میں سموسے اٹھائے لے کر آتا ہوا جارج اسے نظر آیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کافی تھی۔

باربرا کو شرارت سوجھی۔ وہ فوراً اپنی سیٹ سے اٹھی۔ اس کے قریب پہنچی اور تیزی سے ہاتھ بڑھا کر جارج کے ہاتھ سے کافی کا مگ پکڑ کر کہنے لگی۔

''ارے جارج! تم نے بھلا یہ تکلیف کیوں کی۔ تم بہت اچھے ہو۔''

جارج نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''لیکن یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''سب کے سامنے اب میری سبکی کراؤ گے۔ چلو آؤ۔''

یہ کہہ کر باربرا نے اس کا بازو پکڑا اور اپنے سامنے کی کرسی پر بٹھا لیا۔

جارج زندگی میں پہلی بار ایک عجیب و غریب صورت حال میں پھنسا اس کے سامنے بھیگی بلی کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے سموسوں کی پلیٹ سامنے رکھی تو وہ بھی باربرا نے اپنے سامنے سرکا لی اور ندیدوں کی طرح کھانے لگی۔

''مجھے بھی تو بھوک لگی ہے......'' جارج منمنایا۔

''اوہ تو جارج...... تم بھوک برداشت کر سکتے ہو مگر میں نہیں۔'' وہ بڑی تیزی سے کھاتے ہوئے بولی۔ اس سے آگے اس کی سہیلیاں بیٹھی سب دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ پلیٹ صاف کر کے اسے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے وہ کافی کا گھونٹ لینے لگی تو جارج غصے کے مارے اٹھ کر چلا گیا۔ جارج کے جاتے ہی سب لڑکیوں کا ایک بھرپور قہقہہ ابھرا۔

اس واقعے کے بعد جب بھی جارج اسے اکیلا ملتا تو وہ اسے تنگ کر کے مزہ لیتی۔ پھر آہستہ آہستہ خود ہی جارج اس کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ وہ باربرا کے بغیر خود کو ادھورا سمجھنے لگا۔ وہ ہر وقت باربرا کے ساتھ نظر آنے لگا۔ تب اس کی ایک دوست نے باربرا کے ساتھ ایک روز شرط لگائی۔

''باربی...... تم نے جس طرح جارج کو قابو کر کے اپنے ساتھ نتھی کیا ہے، کیا اسی طرح اسے اپنے سے جدا بھی کر سکتی ہو؟''

''یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے لیزا......'' باربرا نے ہنس کر جواب دیا۔

''کتنی دیر میں......'' لیزا نے پوچھا۔

''صرف ایک ہفتے کے اندر اندر......'' باربرا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''دیکھ لیتے ہیں......'' لیزا نے ہنس کر اسے اکسایا۔

اس روز سے باربرا نے جارج سے بے رخی اختیار کرنا شروع کر دی۔ جارج اس کے یکسر بدلتے رویے کو دیکھ کر ایک روز بولا۔ ''باربی...... میں کتنے دنوں سے تمہارا بدلتا ہوا رویہ دیکھ رہا ہوں۔ کہیں تم مجھ سے اکتا تو نہیں گئی ہو......؟''

''ہوں...... بس کچھ ایسا ہی سمجھو......'' باربرا نے آگے سے تنک کر جواب دیا۔

''وجہ جان سکتا ہوں......؟'' جارج نے دوبارہ پوچھا۔

''ضروری نہیں کہ ہر بات کی وجہ بتائی جائے...... میں بس چاہتی ہوں کہ تم میرا پیچھا چھوڑ دو......'' باربرا مصنوعی غصے سے بولی۔

''آخر کوئی میری غلطی بھی تو ہو...... یاد کرو اس محبت کی ابتدا بھی تم نے ہی کی تھی۔'' جارج آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

''یہ میری بے وقوفی تھی......'' باربرا نے ترت جواب دیا۔

"یہ تم نے درست کہا باربی...... ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں، وہاں محبت واقعی بے وقوفی ہے" پلٹنا اب میرے بس میں نہیں رہا۔" جارج سنجیدگی سے بولا۔

"کلاس میں اور بھی بہت سی لڑکیاں ہیں، پھر اس کے علاوہ پورا کالج مجھ ایسی بے وقوف لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں اور مقدر آزمائی کرلو اور پھر محبت کرنا ایسی کون سی مجبوری ہے۔ دیکھو جارج! اگر تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے تو میں دوسرا راستہ بھی اختیار کرسکتی ہوں۔" باربرا نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"میری بلا سے...... مگر سن لو، اگر تم میری نہ ہوئیں تو کسی دوسرے کی بھی نہ ہوسکو گی......" جارج نے سختی سے کہا۔

"یہ تمہاری طرف سے دھمکی ہے، تو یہ بھی جان لو...... ہمارے معاشرے میں عورت سے ایسا رویہ اختیار کرنے پر قانوناً تمہیں سزا بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن فی الحال میں تمہاری شکایت پرنسپل سے کررہی ہوں۔" باربرا نے درشت لہجے میں کہا تو جارج بھی خاموش ہوگیا۔ انہیں اونچی آواز سے باتیں کرتے دیکھ کر لیزا اور ان کی دوسری دوست وہاں آگئیں۔ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر جارج بڑبڑاتے ہوئے دوسری طرف نکل گیا۔

"تمہیں تمہارا یہ رویہ بہت مہنگا پڑے گا۔"

"ہوں، دھمکی دیتے ہو......" باربرا نے اسی لہجے میں کہا اور پھر اس کے جاتے ہی ساری سہیلیاں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

"باربی...... تم نے تو کمال کردیا......" وہ سب یک زبان ہوکر بولیں۔

"نہیں۔ کمال تو اب ہونے والا ہے۔" باربرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر اس نے پرنسپل کو درخواست دے دی کہ جارج اسے ہراساں کررہا ہے۔ پرنسپل نے دونوں کو اپنے آفس میں بلالیا جہاں جارج کو جرمانے کے ساتھ ساتھ تنبیہ بھی کی گئی۔ جارج منہ لٹکائے جب پرنسپل کے آفس سے نکلا تو پوری کلاس پرنسپل آفس کے باہر کھڑی تھی۔ جارج احساسِ شرمندگی کی وجہ سے ان سے آنکھ نہیں ملاپارہا تھا۔ اسی دوپہر جارج نے جرمانہ ادا کردیا۔ وہ ساری لڑکیاں لان میں کھڑی تھیں۔ جب لیزا ان سب کے سامنے شرط کی رقم باربرا کو پکڑا رہی تھی تو اس نے نہایت آہستگی سے کہا۔

"باربرا! میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر کٹھور بھی ہوسکتی ہو......" اس پر باربرا کھلکھلا کر ہنس دی۔ اسی دوران باربرا کی دوسری سہیلی مارتھی بازو سے پکڑ کر اسے ایک طرف کھینچ لے گئی۔

"تم نے بہت برا کیا باربرا...... اس بے چارے کو رسوا کرکے اچھا نہیں کیا۔ پتا نہیں تم کیوں نہیں سمجھتیں۔ لیزا نے تمہارے ساتھ ایک بڑی چال چلی تھی۔ وہ خود جارج کو چاہتی تھی مگر جارج اسے اتنا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ تو ہر وقت تمہارے ساتھ چپکا رہتا تھا۔ اس نے تمہاری اس بچکانا عادت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور تمہارے ہاتھوں جارج کو رسوا کروایا۔ اب دیکھ لینا۔ وہ جارج کی محبت کو جیت لے گی اور تم اپنے بھولپن سے اس کے دام کا شکار ہوکر رہ گئی ہو......"

"نہیں مارتھی...... ایسا نہیں ہوسکتا۔" باربرا کی ہنسی سنجیدگی میں بدل گئی تھی اور پھر وہی ہوا جو مارتھی نے بتایا تھا۔ اس واقعے کے کچھ ہی روز کے بعد لیزا اور جارج اکٹھے نظر آنے لگے۔ مارتھی نے ایک روز پھر باربرا کو بتایا کہ اس نے لیزا کو اس واقعے پر بڑی لعن طعن کی تھی تو لیزا نے بڑی ڈھٹائی سے بتایا کہ اس نے جارج کو حاصل کرنے کے لیے یہ دام بچھایا تھا۔ باربرا کی بے وقوفی کہ وہ اس دام میں پھنس گئی اور وہ جارج کو کھو بیٹھی لیکن لیزا جیت گئی۔

☆☆☆

اس روز اپریل گلاسپی اپنے آفس سے جلدی واپس آگئی تھی۔ اس نے سوچا کہ گھر جاتے جاتے وہ کیش اینڈ کیری سے خود ہی صبح کے ناشتے کے لیے سامان لے آئے۔ وہ کیش اینڈ کیری میں داخل ہوئی تو وہاں کافی رش تھا۔ وہ لائن میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگی تو معاً اس کی نظر ایک دراز قد، نیلی آنکھوں اور براؤن بالوں والے نوجوان پر پڑی جو کیش اینڈ کیری میں ابھی ابھی داخل ہوا تھا۔ اس کی نظریں ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ جتنی دیر تک اپریل گلاسپی کی باری آئی وہ ہال میں اسے مسلسل گھورے جارہا تھا۔ اپریل گلاسپی نے اپنے سامان کی ادائیگی کی اور سامان مختلف شاپر میں ڈال کر فارغ ہوئی۔ وہ نوجوان شاید اسی کا انتظار کررہا تھا۔ اپریل گلاسپی کیش اینڈ کیری سے باہر نکلنے والی تھی کہ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آیا اور آہستگی سے بولا۔

"معاف کرنا...... آپ وہی تو نہیں جسے کچھ روز پہلے میں نے ایک غنڈے سے بچایا تھا؟"

اپریل نے بڑی حیرانی سے اس کو دیکھا اور نفی میں جواب دے کر آگے بڑھنے والی تھی کہ وہ پھر اس کے سامنے

آ گیا۔

"مجھے یقین ہے، تم ہی ہو...... مجھے پہچانو......"

"تعارف کروانے کا یہ انتہائی بھونڈا انداز ہے......" اپریل نے اس پر آنکھیں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

"معاف کرنا، شاید مجھے اندازہ لگانے میں غلطی ہوگئی ہو۔ بہرحال وہ آپ ہی تھیں یا پھر شاید آپ کی چھوٹی بہن ہو۔" اس کے لہجے میں سنجیدگی برقرار تھی۔

اپریل نے یہ سنا تو اس کے لہجے میں بھی نرمی آگئی۔

"کہو......" اب وہ دونوں کیش اینڈ کیری سے باہر نکل آئے تھے۔

"میرا نام جان اشکرافٹ ہے اور میں یہاں سے کچھ دور ایک کاسمیٹک بنانے والی فیکٹری کا لیبارٹری انچارج ہوں۔ آپ مجھے صرف جان بھی کہہ سکتی ہیں۔ آج سے کچھ روز پہلے میں شام کے وقت فیکٹری سے واپس آرہا تھا۔ میں نے دور سے دیکھا۔ ایک لحیم شحیم حبشی ایک لڑکی کو گھیرے ہوئے تھا۔ میں گاڑی تیزی سے ان کے قریب لے آیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت میرے پاس پسٹل بھی تھا۔ میں نے کار روک کر پسٹل کو اس کی طرف کرتے ہوئے اسے للکارا تو وہ حبشی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا...... وہ لڑکی بالکل آپ کے خدوخال کی تھی۔ ایسا ہی رنگ روپ، آپ جتنا قد...... اور تو اور اس کے جسمانی خدوخال بھی آپ جیسے تھے۔ آج میں ادھر سے دوبارہ گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا اسی کیش اینڈ کیری سے وہ سامان لے کر نکلی ہوگی۔ ممکن ہے آج بھی وہ سودا سلف خریدنے کے لیے ادھر آئی ہو...... اس لیے میں کیش اینڈ کیری میں اس کی ایک جھلک دیکھنے آگیا۔ آپ کو دیکھ کر مجھے اسی کا شبہ ہوا۔" اس نے آہستہ آہستہ بتایا۔

"کیا تم اسے پہلے سے جانتے ہو؟" اپریل نے نرمی سے پوچھا۔

"نہیں...... بالکل نہیں...... میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا۔" جان نے جواب دیا۔

"وہ میری......" ابھی اپریل نے بات بھی پوری نہ کی تھی کہ وہ جلدی سے بول اٹھا۔

"یقیناً وہ آپ کی چھوٹی بہن ہوگی۔ شکل وصورت سے ہی لگتا ہے۔ دراصل گاڈ بعض انسانوں میں اس قدر مشابہت پیدا کردیتا ہے کہ پہلی نظر میں پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے۔" جان نے اپنی بات پوری کی۔

"یہیں نزدیک ہی ہمارا فلیٹ ہے، اگر تمہیں برا نہ لگے تو ایک کپ چائے یا کافی جو بھی پسند کرو ہمارے ساتھ پی کر چلے جانا......" اپریل نے اسے آفر کی۔

"جی...... جی یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔" جان بولا۔

"اگر پارکنگ کا مسئلہ نہ ہو تو گاڑی ساتھ لے لوں......؟" جان نے دریافت کیا۔

"یہیں نزدیک تو ہے، گاڑی ادھر ہی رہنے دو......" اپریل نے بتایا۔ "ہم پیدل ہی گھر چلے جاتے ہیں۔ میں نے اپنا تعارف تو تمہیں کرایا ہی نہیں۔ میرا نام اپریل گلاسپی ہے، میں مائیکروسافٹ کمپنی میں پروجیکٹ منیجر ہوں اور باربرا گلاسپی......" ابھی وہ بات پوری نہ کرپائی تھی کہ جان دوبارہ بول اٹھا۔

"اچھا...... اچھا وہ باربرا گلاسپی ہیں، یقین کریں اگر ہنستے ہوئے آپ کے رخساروں میں ڈمپل نہ پیدا ہوتے ہوں، تو آپ بالکل اپنی چھوٹی بہن باربرا ہی لگیں۔" جان کی یہ بات سن کر اپریل کھلکھلا کر ہنس دی۔

"باربرا میری بیٹی ہے...... میری چھوٹی بہن نہیں......" اپریل نے بتایا تو وہ حیران ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ مذاق تو نہیں......؟" جان نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں یہ سچ ہے......" اپریل نے بتایا۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا۔ یقیناً آپ اچھا مذاق کرلیتی ہیں۔" جان دوبارہ بولا۔

اتنے میں ان کا فلیٹ آگیا۔ اپریل نے دروازے کا لاک کھولا اور دونوں فلیٹ میں داخل ہوگئے۔ جان خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا ہوا فلیٹ میں داخل ہوا تو اپریل نے باربرا کو آواز دی۔

"ماما...... میں اپنے کمرے میں ہوں......" باربرا نے جواب دیا۔

تب اپریل نے دزدیدہ نظروں سے جان کی طرف دیکھا تو جان نے اثبات میں سرہلایا۔

"ویسے یقین مجھے اب بھی نہیں آرہا۔ مجھے یہ آپ دونوں کی سازش لگتی ہے۔" جان نے ہنستے ہوئے کہا باربرا کی آواز آئی۔

"ماما...... کس سے باتیں کررہی ہیں؟"

"یہ کوئی تمہارے واقف کار ہیں۔" اپریل نے جواب دیا۔ تو باربرا باہر آگئی۔

"ارے آپ......" باربرا نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ہوں...... کوئی شک ہے کیا......" جان نے جواب دیا۔

"ماما یہ آپ کو کہاں سے مل گئے......؟" باربرا نے

اگلا سوال کیا۔

''اسی جگہ سے جہاں کچھ روز پہلے سیاہ فام تمہیں لوٹنے کی کوشش کررہا تھا۔'' جان نے بتایا۔

''اوہ ماما...... میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ کچھ روز پہلے جب شام کو میں کیش اینڈ کیری سے سامان لے کر آرہی تھی تو ایک سیاہ فام نے مجھے لوٹنے کی کوشش کی اور انہوں نے میری جان بچائی تھی۔'' باربرا نے آہستہ آہستہ بتایا۔

''ڈارلنگ! ذرا دھیان رکھا کرو......'' اپریل نے کہا۔

''لو تم اپنے مہمان کو سنبھالو...... بے چارہ کیش اینڈ کیری میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چلا تھا۔'' اپریل نے ہنس کر کہا تو باربرا اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

''باربی...... ایک بات تو بتاؤ...... یہ واقعی تمہاری سگی ماں ہیں۔'' جان نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی، یہی سچ ہے۔ یہ میری بہت پیاری ماما ہیں۔'' باربرا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ویسے لگتا تو نہیں ہے۔ ان کی جسمانی ساخت سے تو لگتا ہے ابھی یہ خود غیر شادی شدہ ہیں۔'' جان نے دوبارہ کہا۔

''تمہیں ایک اور بات سن کر حیرانی ہوگی کہ میری ماما مس امریکا کا ٹائٹل جیت چکی ہیں۔'' باربرا نے کافی کا مگ جان کو پکڑاتے ہوئے انکشاف کیا۔

''اوہ، کیا یہ بھی سچ ہے اور تم......'' جان نے ورطۂ حیرت سے پوچھا۔

''میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ اپنی ماما کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرے نام سے تو واقف ہو ہی گئے ہو۔ میرا مکمل نام باربرا گلاسپی ہے لیکن مجھے سب میرے پہلے نام باربرا سے ہی پکارتے ہیں۔''

''میں بھی اپنا تعارف کروانا بھول گیا۔ میرا نام جان اشکرافٹ ہے۔ میں ایک کاسمیٹک بنانے والی فیکٹری میں لیبارٹری انچارج ہوں اور روز اسی راستے سے گزر کر اپنے گھر آتا جاتا ہوں۔ اس واقعے کے بعد تم مجھے نظر نہیں آئیں۔ آج بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں کیش اینڈ کیری میں تمہیں ڈھونڈنے نکلا تو تمہاری ماما سے ملاقات ہوگئی۔ یقین کرو باربی...... اگر تمہاری ماما کے ساتھ اس قدر مشابہت نہ ہوتی تو میں تم تک نہ پہنچ پاتا۔'' جان نے بتایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے نیل پالش مفت ملا کرے گی۔'' باربرا نے اپنے ناخن کو دانتوں سے کترتے ہوئے کہا۔

''نہ صرف نیل پالش بلکہ ہماری فیکٹری کی ہر مصنوعات......'' جان نے ہنس کر جواب دیا۔

''کاسمیٹک میں مجھے صرف نیل پالش ہی پسند ہے اور کچھ نہیں......'' باربرا نے کہا۔

''کیا تم مجھے اجازت دوگی کہ میں کبھی کبھار تم سے ملنے آجایا کروں؟ مجھے تم اچھی لگتی ہو۔'' جان نے بلا جھجک کہہ ڈالا۔

''جب چاہو...... مگر شام کو اگر آؤ تو زیادہ بہتر ہے کہ میں شام کو کالج سے گھر واپس آجاتی ہوں اور ماما تو شام کے بعد ہی گھر لوٹتی ہیں۔ کبھی کبھی تو رات بھی باہر رہ جاتی ہیں۔ ان کی ملازمت ہی کچھ ایسی ہے۔'' باربرا نے وضاحت کی۔

''ہاں...... ہاں تم مطمئن رہو۔ میں بھی شام ہی کو ادھر سے گزرتا ہوں۔''

☆☆☆

محبت اگر معاشرتی پابندیوں سے آزاد ہو تو بہت جلد انسانی احساسات کو فتح کرلیتی ہے۔ جان اشکرافٹ رفتہ رفتہ اس کے خاندان کا حصہ بن چکا تھا۔ اب اس کی اکثر راتیں ادھر ہی گزرتی تھیں۔ باربرا کو ابھی تک اس بات کا افسوس تھا کہ اس نے جارج کو بے جا تنگ کیا۔ حالانکہ جارج کو اب لیزا نے بڑے اچھے انداز سے سنبھال لیا تھا مگر پھر بھی کالج میں جب اس کا جارج سے سامنا ہوتا تو جارج کی آنکھوں میں ملتجیانہ پیاس بڑی واضح نظر آتی تھی جس کی وجہ سے باربرا کا احساسِ جرم اور بھی بڑھ جاتا۔ اس روز باربرا کا پیریڈ خالی تھا اور وہ ٹک شاپ جارہی تھی جب ہیری نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ہیری کو دیکھا تو وہ بڑے ڈھیٹ پن سے بولا۔

''ہیلو گڑیا...... ہمارے کالج کے سمندر میں ہمارا بھی ڈوبنے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی ہمیں بھی لفٹ کرادو۔''

''تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔'' باربرا نے درشتگی سے جواب دیا۔

''دیکھو گڑیا، یہ جارج تو ہے نہیں جسے تم ڈرا دھمکا لوگی۔ مجھے جو چیز پسند آجائے، میں اس کو زبردستی بھی اڑا لے جاتا ہوں۔'' ہیری نے ہنس کر کہا۔ ''کالج ٹائم کے بعد تم میرے ساتھ چلو گی۔ آرام سے یا زبردستی، فیصلہ اسی وقت ہوگا۔'' ہیری یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور باربرا وہیں کھڑی سوچنے لگی۔

ہیری کا شمار کالج کے ان طالب علموں میں ہوتا تھا جو پڑھنے کے لیے کالج میں داخلہ نہیں لیتے۔ آوارگی اور بدمعاشی کرنا ان کی عادت بن چکا ہوتا ہے۔ اس لیے باربرا

بھی اس سے خائف تھی۔ باربرا ابھی وہیں کھڑی تھی کہ جارج اس کے قریب سے گزرا۔

''مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں لیکن پوچھ رہا ہوں کیوں پریشان کھڑی ہو؟''

''ویسے ہی......'' باربرا نے شرمندگی سے کہا۔

''یہ ہیری تمہارے پاس کھڑا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

پہلے تو باربرا ہچکچاتی رہی پھر اس نے سب بتا دیا۔

''وہ بہت خطرناک غنڈا ہے...... اس سے بچ کر رہنا......'' جارج یہ کہہ کر چلا گیا۔ تب باربرا کے ذہن میں آیا کہ وہ یہ تمام بات جان کو موبائل پر بتا دے مگر وہ کیا کرے گا۔ ہوسکتا ہے اسے چھٹی نہ ملے اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ بھی جارج کی طرح خاموشی اور مصلحت سے کام لے۔ پرائی آگ میں کون کودتا ہے۔ گھبرا کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گویا کانچ کے ہرے سمندر میں سیلاب آگیا تھا۔

اس روز جب وہ کالج سے باہر نکلی تو بس اسٹاپ پر ہیری کھڑا نظر آیا۔ وہ واپس کالج جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس کی کرخت آواز آئی۔

''ہے گڑیا...... کہاں چلیں۔ تمہارے چاہنے والے تو ادھر کھڑے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک جست لگائی اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پستل تھا۔ کچھ لڑکوں اور مردوں نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہی تو اس نے پستول کو آسمان کی طرف کر کے چار پانچ فائر کر دیے۔ باربرا کچھ اور سہم گئی تھی۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھیل چکی تھیں۔ اسی اثنا میں نہ جانے جارج کدھر سے وحشیانہ طریقے سے بھاگتا ہوا آیا اور ہیری سے بھڑ گیا۔ ہیری اس اچانک حملے سے سنبھل نہ پایا اور پیچھے گر گیا۔ اس کی جرأت دیکھتے ہوئے کالج کے مزید طالب علم بھی اس پر پل پڑے اور اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ ان سب نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ باربرا پریشانی کے عالم میں وہیں کھڑی تھی۔ جب کسی نے جا کر کالج کے پرنسپل کو اطلاع دے دی۔ وہ بھی باہر نکل آیا۔ اسے آتے دیکھ کر طالب علموں نے ہیری کو چھوڑ دیا جو زخمی حالت میں زمین پر پڑا ڈکرا رہا تھا۔ ہیری کو اٹھا کر کالج کی ڈسپنسری لایا گیا جہاں سے مرہم پٹی کر کے اسے فارغ کر دیا گیا۔

باربرا جب گھر پہنچی تو وہ خاصی خوف زدہ تھی۔ اس نے آتے ہی موبائل پر جان کے نمبر ملائے مگر دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہ ملا۔ تب اسے یاد آیا کہ فیکٹری میں موبائل جام کر دیے جاتے ہیں۔ پھر اس نے آفس کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب جان تھا۔

''ہیلو باربی......'' آواز ابھری۔

''جان...... آج تمہاری باربی مر چکی تھی۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''مطلب......'' دوسری طرف جان گھبرا گیا۔

توقف کے بعد پھر جان نے پوچھا۔ ''کیا آج وہی واقعہ پیش آگیا؟ پھر کوئی غنڈا مل گیا تھا......'' جان نے جلدی سے پوچھا۔

''نہیں...... آج کالج کا ایک غنڈا مجھے اغوا کرنے لگا تھا۔ وہ اسلحے کے زور پر مجھے گھسیٹ رہا تھا۔ جب قدرت کو میرے حال پر رحم آگیا اور کوئی دوسرا اس سے بھڑ گیا۔'' اس نے بھیگی آواز میں بتایا۔

''میں آفس سے جلدی آجاؤں گا۔ پھر ہم آؤٹنگ پر چلیں گے تاکہ تمہارے ذہن پر چھایا ہوا خوف دور ہوسکے۔ کوئی بات نہیں۔ زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔'' جان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تو وہ بھی اوندھے منہ بستر پر گر پڑی۔ اس کی ماں ابھی تک آفس سے واپس نہیں آئی تھی۔ شام کو جب اپریل واپس آئی تو باربرا نے رو کر آج کا سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

''ماما...... آج کے بعد میں کالج نہیں جاؤں گی۔'' باربرا نے ہچکیوں کے درمیان کہا تو اپریل فوراً بول اٹھی۔

''ارے ارے یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میرے تو بڑے خواب تم سے وابستہ ہیں۔ میں جان سے کہوں گی۔ وہ تمہیں کالج ڈراپ کر دیا کرے گا۔ اس طرح کالج کے طالب علموں کو بھی پتا چل جائے گا کہ تمہیں تحفظ دینے والا موجود ہے...... مگر دیکھو ایجوکیشن نہ چھوڑنا...... زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ انسانی قوتِ مدافعت چھین رہا ہے۔'' اپریل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہوں......'' باربرا نے کہا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔

جان اپنے وقت سے پہلے ہی واپس آگیا تھا اور آتے ہوئے فیکٹری سے بہت سی نیل پالش اور کاسمیٹک کا دوسرا سامان لیتا آیا تھا۔

''ارے یہ کیا...... مجھے تو صرف نیل پالش پسند ہے۔ بقیہ اشیا کیوں اٹھا لائے؟'' باربرا نے اس سے پوچھا۔

''ویسے ہی...... باقی آنٹی لے لیں گی۔'' اس نے کہا۔

''آنٹی بھی میک اپ پسند نہیں کرتیں۔ انہیں لپ اسٹک اور نیل پالش ہی پسند ہے۔''

ان دونوں کی آوازیں سن کر اپریل بھی وہاں آگئی تھی۔ بستر پر رکھا ہوا کاسمیٹک کا سامان دیکھ کر اس نے جلدی سے لپ اسٹک اٹھالی۔

''چلو آؤ...... باہر چلتے ہیں۔ رات کا کھانا وہیں کھالیں گے۔'' جان نے کہا۔

''ہمیں تیاری تو کر لینے دو......'' باربرا نے کہا پھر دونوں جان کی گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

''تمہارے ڈیڈ کا کیا ہوا۔ میرا کافی دنوں سے تم سے تعلق ہے مگر میں نے انہیں آج تک نہیں دیکھا۔'' جان نے ایک روز باربرا سے سوال کیا۔

''میں نے تو خود انہیں نہیں دیکھا۔ میں نے اپنی ماما سے کئی بار پوچھا مگر وہ ہمیشہ ٹال مٹول کر گئیں۔ تم خود بھی پوچھ لو...... اگر انہوں نے بتادیا تو مجھے بھی بتانا۔'' باربرا نے روہانسے لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا دل دکھایا۔'' جان نے باربرا کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں پر سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ بس کبھی کبھی میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں۔'' باربرا نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ ایسی ہی کچھ کہانی میرے ساتھ بھی وابستہ ہے۔ تھوڑا سا انتظار کرلو۔ تمہاری پڑھائی مکمل ہوتے ہی میں تمہیں اپنالوں گا......'' جان نے دلار سے جواب دیا۔

''کیا ابھی نہیں ہوسکتی یہ شادی......؟'' باربرا نے جلدی سے پوچھا۔

''ابھی کچھ میری اپنی بھی مجبوریاں ہیں لیکن یقین کرو میں تمہیں بے حد چاہتا ہوں...... ارے ہاں یاد آیا تمہارے اس دشمن کا کیا ہوا جس نے تمہارے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی؟'' جان نے بات پلٹتے ہوئے پوچھا۔

''اسے کالج سے نکال دیا گیا ہے۔ باہر آتے ہی اس نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر بینک ڈکیتی میں حصہ لیا اور پکڑا گیا۔ آج کل جیل کی ہوا کھا رہا ہے...... اگر اس وقت ماما مجھے نہ سمجھاتیں اور تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو میں کب کی اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ چکی ہوتی۔'' باربرا نے جواب دیا۔

''چلو یار! میری چھٹی سے فائدہ اٹھاؤ، آج کا دن باتوں میں ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ہم ساحلِ سمندر پر اچھل کود کے دن گزاریں۔ آج سورج نے بھی اپنا چہرہ دکھایا ہے۔ دھوپ میں ساحلِ سمندر کی نیم گرم ریت پر سن باتھ بھی لے سکیں گے۔'' جان نے تجویز پیش کی۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔ میں ماما کو بھی یہ تجویز بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر باربرا بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئی۔

اپریل ابھی تک اپنے بستر پر ہی تھی۔

''ماما...... ہم ساحلِ سمندر پر جارہے ہیں۔ آپ بھی ساتھ چلیں۔'' باربرا نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے نہیں...... میرے سر میں شدید درد ہے۔ میں نہیں جاسکوں گی، تم کس کے ساتھ جارہی ہو؟'' اپریل نے پوچھا۔

''جان میرے ساتھ ہے......'' باربرا نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ...... میں گھر پر ہی آرام کروں گی۔'' اپریل نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے ماما۔ ہم شام کا کھانا لیتے آئیں گے۔ آپ نے انتظام نہیں کرنا اوکے......'' باربرا نے جواب دیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ساحلِ سمندر پر چلے گئے۔

☆☆☆

ساحلِ سمندر ان جیسے منچلوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں رنگ برنگے نرم فٹ بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں کرنے میں مصروف تھے اور بے شمار لوگ سورج کی نرم گرم دھوپ سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ باربرا اور جان بھی ان لوگوں میں شامل ہوچکے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی تو جان کے کچھ دوست انہیں مل گئے۔ وہ بھی اپنے بچوں کو لے کر ساحلِ سمندر پر آئے ہوئے تھے۔ جان کے دوست کی بیوی نے فرطِ انبساط سے باربرا کا ہاتھ تھام لیا۔

''جان! آپ کی پسند بڑی عمدہ ہے۔'' اس کی بیوی نے کہا۔

''میں ان کی نہیں بلکہ یہ میری پسند ہیں۔'' باربرا نے ہنس کر جواب دیا۔

''بہرحال کپل بہت اچھا ہے۔'' پھر اس نے باربرا کے پکڑے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا تو بے ساختہ بولی۔

''ارے یہ ریڈ نیل پالش تو نیلو پر اس طرح جچ رہی ہے جیسے

کسی نے پکے ہوئے انار کے دانے تمہارے ناخنوں پر گاڑ دیے ہوں۔"

دوست کی بیوی نے اس کی دوبارہ تعریف کی اور فٹ بال لے کر بچوں کے ساتھ ریت پر کھیلنے لگی۔ باربرا بھی شکریہ کہہ کر ان کے کھیل میں شامل ہوگئی۔

کچھ دیر کھیلنے کے بعد وہ دونوں تھک کر گیلی گرم ریت پر چت لیٹ گئیں۔

"جان سے تم کب ملی ہو......؟" اس نے دریافت کیا۔

"اب تو ایک مدت ہو چکی ہے۔" یہ کہہ کر باربرا نے ملاقات کی ساری کہانی اسے سنادی۔

"تم خوش قسمت ہو، جان طبیعت کا بہت اچھا اور دلیر انسان ہے۔ تم سے ملنے سے پہلے یہ اکثر ہمارے گھر میرے شوہر کے پاس آیا کرتا تھا۔" اس نے بتایا۔

وہ چٹائی پر اپنے مختصر لباس میں لیٹی باتیں کر رہی تھیں جب اس کا شوہر بچوں کو لے کر آ گیا۔ اس کے ساتھ جان بھی تھا۔ وہ بچوں کو لے کر اپنی بیوی کے قریب بیٹھ گیا تو جان نے لیٹی ہوئی باربرا کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ باربرا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے سہارے اٹھ بیٹھی تو جان ہاتھ باربرا کی کمر میں ڈال کر اسے الگ جگہ لے گیا۔

"کیا باتیں ہو رہی تھیں دونوں کے درمیان۔" جان نے سرگوشی میں پوچھا۔

"عورتوں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے۔" باربرا نے ہنس کر جواب دیا۔ "ویسے اتنے قریب آ گئے مگر شادی کا کچھ پتا نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو شادی بھی ہو ہی جائے گی۔ محبت ایک خوشگوار احساس کا نام ہے۔ ایک خوشبو ہے جو دھیرے سے بدن میں سرایت کر جاتی ہے......" جان نے اس کے تھامے ہوئے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"جان! تم نے ماما سے بات کی تھی؟" باربرا نے دوبارہ پوچھا۔

"ارے یار...... مجھے اس کا تو موقع ہی نہیں ملا اور سچ پوچھو تو میں ہر بات بھول جاتا ہوں تمہارے حسن کے آگے۔" جان نے جواب دیا۔

"یہ تم مجھے بنا رہے ہو۔ باتوں کا جال پھینک کر لڑکیوں کو پھانسنے کا ہنر تمہیں خوب آتا ہے۔" باربرا نے ہنس کر کہا۔

جان نے ہنستے ہوئے باربرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، تو باربرا اس کے چوڑے چکلے سینے سے آ لگی......

"سویٹ ہارٹ......" جان کے منہ سے جذباتی طور پر نکلا۔

"تم نام کے جان ہی نہیں۔ باربرا کی بھی جان ہو......" باربرا نے اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

موسموں کے تیور اور انسانی رویے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جان کی آنکھوں میں اترا ہوا بیگانہ پن باربرا کتنے دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا۔

"جان...... میں کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ اب تمہاری نظروں میں میرے لیے وہ پہلی سی چاہت نہیں رہی۔ کیا میں اس کا سبب جان سکتی ہوں؟"

"کچھ نہیں۔ بس ذرا میری فیکٹری میں مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے ادھر کم آتا ہوں۔" جان نے جواب دیا۔

"وجہ یہی ہے یا چاہت کے سلسلے بدل گئے ہیں؟" باربرا نے دوبارہ پوچھا۔

"مطلب......" جان نے وضاحت چاہی۔

"یہی کہ آج کل تم ماما کے ارد گرد زیادہ گھوم رہے ہو اور ماما کی نگاہیں بھی تمہیں ڈھونڈتی رہتی ہیں۔" باربرا نے برجستہ کہا۔

"باربی! تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ وہ تمہاری ماں ہیں۔" جان نے تیزی سے جواب دیا۔

"یہ حقیقت ہے اور سچائی بتانے میں کیا حرج ہے۔" باربرا نے اسی لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں نہ آیا کروں۔" جان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"پہلے جب تم میرے لیے آتے تھے، تو مجھے بہت اچھے لگتے تھے مگر اب مجھے یقین ہے کہ تم ماما کے لیے آتے ہو تو مجھے زہر لگتے ہو۔ میں جانتی ہوں، ماما کے جسمانی خدوخال مجھ سے بہتر ہی نہیں بہت بہتر ہیں۔ یہ تم ہی نہیں میرے اور بابا کے کئی ملنے والے کہتے ہیں کہ اپریل باربرا سے کہیں چھوٹی لگتی ہے۔

"آج مجھے پتا چلا کہ میری ماں ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی اولاد کی خوشیوں کو بھی چھیننے سے نہیں چوکتیں۔" باربرا نے سخت غصے میں جارحانہ انداز اپنا رکھا تھا۔

"تم بے وقوف ہو، تمہیں اپنی ماں پر یہ الزام لگاتے

ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔'' جان نے بھی غصے سے کہا۔

''مجھے یہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات تمہیں ماما سے کہنا چاہیے تھی۔'' باربرا کا پارہ تیز ہو رہا تھا۔

''میں ان کے ارد گرد رہتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے، تمہاری ماما نے تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیا تھا۔'' جان نے بتایا۔

''ہاں...... اس نے ایسا کرنا ہی تھا کیونکہ وہ اپنا رشتہ جو تم سے جوڑنا چاہتی تھی۔'' باربرا نے چیختے ہوئے کہا تو اتنی دیر میں اپریل بھی آ گئی۔

''بے وقوف لڑکی...... کیوں شور مچا رہی ہو۔'' اپریل نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ''پتا ہے، تمہاری آواز دوسرے فلیٹوں تک جا رہی ہے اگر کسی نے پولیس میں شکایت کر دی تو......'' اپریل نے غصے میں کہا تو باربرا نخوت سے بولی۔

''ہوں...... میرے جوتے کی نوک پر...... اچھا ہے پولیس کو اطلاع کر دیں تو میں پولیس کو بتاؤں کہ اس گھر میں کیا گل کھلائے جا رہے ہیں۔'' باربرا یہ کہہ کر زور سے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''دیکھا تم نے...... یہ کیسی بدتمیزی دکھا رہی ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ ایسے ملک کی رہائشی ہے جہاں بچوں کو بے جا دباؤ میں رکھنے پر بھی سزائیں مل جاتی ہیں اگر کسی مشرقی ملک میں ہوتی تو پتا چل جاتا۔''

''اکلوتی ہونے کا فائدہ اٹھا رہی ہے اور اسے اپنے باپ کی کمی بھی بے حد محسوس ہو رہی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کا باپ کہاں گیا......'' جان نے پوچھا۔

''تمہیں پتا ہے کہ میں نے مس امریکا کا ٹائٹل جیت رکھا ہے؟'' وہ بولی۔

''ہاں مجھے باربی نے بتایا تھا'' جان نے جواب دیا۔

''یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے۔ مقابلۂ حسن کے چناؤ کا آخری سیشن چل رہا تھا۔ اس مقابلے میں شرکت کرنے والی تمام لڑکیاں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں اور وہ منتظمین کی ہر جائز و ناجائز خواہشات کے سامنے بچھی جاتی تھیں۔ منتظمین اور جج صاحبان بھی موقع سے فائدہ اٹھانے میں ہر طرح کے حربے آزما رہے تھے۔ آخری سیشن میں شریک لڑکیوں کو بند کمروں میں لے جا کر ان کی جسمانی ساخت کی پیمائش اور ان کے ہر عضو کو پوری طرح ٹھونک بجا کر دیکھا جا رہا تھا۔ میں بھی برہنہ ایسے ہی مراحل سے گزر رہی تھی۔ پھر ایسے میں نہ صرف میں بلکہ میری طرح دیگر شرکا بھی ان منتظمین اور نتائج مرتب کرنے والوں کی ہوس کا شکار ہوئیں۔ وہ کون تھا اور اس کا تعلق کس ملک سے تھا میں نہیں جانتی۔ مجھے تو صرف یہ فکر تھی کہ کسی طور میں یہ مقابلہ جیت جاؤں...... پھر میں یہ مقابلہ جیت گئی۔ میں مس امریکا بن چکی تھی اور میں بے حد خوش تھی کہ میں نے اپنا ٹارگٹ حاصل کر لیا ہے۔ مگر نہیں جانتی تھی کہ نادانی یا انتہائی چالاکی سے میں اپنے جسم میں ایک وجود بھی چھپا لائی ہوں...... یہی باربرا ہے۔ جب میں مس امریکا منتخب ہوئی تو مائیکرو سافٹ کمپنی نے مجھے پروجیکٹ منیجر کی ملازمت آفر کی۔ جو میں نے قبول کر لی۔ مقابلۂ حسن سے ملنے والی خطیر رقم سے میں نے اپنی انشورنس کروالی......''

اپریل نے اپنی داستان سنائی تو جان فوراً بولا۔

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ آپ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین بھی ہیں۔ میں نے اپنی پہلی ملاقات میں ایسے ہی آپ کی تعریف نہیں کی تھی......'' جان نے پانسا پھینکا۔

''اب بتاؤ میں باربرا کو کیسے بتاؤں کہ اس کا باپ کون ہے جبکہ میں خود نہیں جانتی۔ میں نے تو اس وقت سے اپنی زندگی کا محور صرف اور صرف باربرا کو بنا لیا تھا۔ اس کے لیے تو میں نے اپنی جان تک کی پروا نہیں کی۔'' جان اس کی بات سن کر مسکرایا۔

''اگر آپ اپنی جان کی پروا کرتیں تو نہ جانے کس قدر خوب صورت رہتیں جو یہ پروا نہ کرتے ہوئے بھی اس قدر سڈول اور خوب صورت ہیں۔''

''ہوں...... مگر کہاں...... اب یہی دیکھ لو...... اسے یہ اعتراض ہے کہ میں تم پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔ تمہیں اس سے چھین رہی ہوں، وہ مجھ سے اس بات پر کتنی بار جھگڑ چکی ہے۔ اب مجھے بتاؤ اگر وہ جوان ہو گئی ہے تو کیا میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ میری خواہشات مر گئی ہیں کیا۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''ویسے ایک بات کہوں آنٹی......'' جان بولا۔ ابھی اس نے اپنی بات کی ابتدا ہی کی تھی کہ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بولی۔

''خبردار! آنٹی کہہ کر میری توہین نہ کرو...... میں تمہیں آنٹی دکھائی دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو پکڑا اور اسے چوم لیا۔

باربرا کا شک سچ ثابت ہو گیا۔ اس روز سے جان اپریل کے پورے قبضے میں آ گیا اور باربرا نے ایک دو بار اپنی ماں اور جان کو انتہائی قریب دیکھا۔ اس لیے وہ اپنی ماما کی مخالف ہو گئی تھی۔

اپریل کی محبت کا فسوں جان کی رگ رگ میں سما چکا تھا۔ باربرا بدلتے ہوئے حالات اور دم توڑتی محبت کو دیکھ دیکھ کر ذہنی الجھاؤ کا شکار ہونے لگی تھی اور عجیب و غریب حرکات کرنے لگی تھی۔ ایک روز تو اس نے باقاعدہ سبزی کاٹنے والی چھری سے اپریل پر حملہ کر دیا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسی لمحے جان فلیٹ پر پہنچ گیا اور اس نے اپریل کی جان چھڑائی۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' باربرا غراتے ہوئے بولی تو اپریل نے جان سے کہا۔

''تم دیکھ رہے ہو جان...... یہ عقل و شعور کی تمام حدیں عبور کر چکی ہے۔ اب ہمیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ ہر حال میں...... تاکہ ہم آسانی سے اپنا مستقبل سنوار سکیں۔''

''ہوں...... میں بھی یہ سوچ رکھنے لگا ہوں......'' جان نے کہا۔

جان نے باربرا کو گھسیٹ کر اس کے کمرے میں بند کر دیا تھا اور وہ پریشان اپریل کو نہ صرف تسلیاں دے رہا تھا بلکہ جان چھڑوانے کے منصوبے میں اس کا معاون بننے کا بھی فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں کمرے میں بیٹھے یہی بات سوچ رہے تھے کہ باربرا سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ دونوں اپنی محبت کے اس مقام تک جا پہنچے تھے جہاں انہیں اپنے سوا سب دشمن نظر آنے لگے تھے۔ باربرا کی ذہنی حالت دیکھ کر اسے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ کسی اچانک ذہنی صدمے کے باعث یہ دماغی تناؤ کا شکار ہوئی ہے اور اس نے جو ادویات اسے دینے کا کہا تھا اس میں نیند کی ادویات زیادہ تھیں کیونکہ ان کے استعمال سے اس کی ذہنی حالت کو سکون ملتا۔

''اگر وہ تندرست ہو جاتی ہے تو یہ احتمال تو رہے گا ہی کہ وہ ہماری محبت کو کسی طور قبول نہیں کر سکے گی۔'' اپریل نے مایوسی سے کہا۔

''بہر حال ہمیں اس کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔ پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے پہلے......'' جان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہوں...... لیکن جلد...... اس سے پہلے کہ وہ تندرست ہو کر دوبارہ ہماری جان کو آئے۔'' اپریل نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ کچھ دیر تک جان اور اپریل دونوں خاموش رہے پھر جیسے جان نے کوئی خزانہ پا لیا ہو، وہ چیخنے کے انداز میں بولا۔

''مل گیا...... اس کا حل بھی مل گیا۔ ہمیں اپنے کھیل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اصولوں کو توڑنا ہوگا۔'' جان نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کرنے سے لاٹھی بھی بچ جائے گی اور سانپ بھی مر جائے گا۔''

''وہ کیا......'' اپریل نے جلدی سے پوچھا۔

''لیکن اس کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔'' اب جان کے لہجے میں تھوڑی مایوسی تھی۔

''پھر بھی کتنا انتظار......؟'' اپریل نے دوبارہ پوچھا۔

''یہ مرنے والے کی قوتِ مدافعت پر ہے۔ دو ماہ، چھ ماہ یا پھر سال بھر کا انتظار...... مگر یہ طریقہ اس قدر شفاف ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی پکڑا نہیں جائے گا۔'' جان نے سمجھایا۔

''تم اگر ساتھ دو تو میں یہ بھی کرنے کو تیار ہوں لیکن اس کا کیا اعتبار ہے کہ تم بدل نہ جاؤ گے۔'' اپریل نے ملے جلے ردعمل میں جواب دیا۔

''ہم آج ہی کسی وقت چرچ میں جا کر شادی کر لیتے ہیں تاکہ تمہیں بھی خوف نہ رہے......'' جان نے پیشکش کی۔

''لیکن مجھے طریقۂ واردات تو بتاؤ۔'' اپریل نے پوچھا۔

''بہت آسان ہے۔ باربرا کو نیل پالش پسند ہے۔ ہم نیل پالش میں ایک عام سا کیمیکل ملاتے ہیں تاکہ نیل پالش جلدی سے سوکھ جائے۔ اس کیمیکل کو ٹرائی فینائل فاسفیٹ کہا جاتا ہے۔ یہ کیمیکل عام طور پر پلاسٹک کی مصنوعات اور فوم بنانے والے فرنیچر میں آگ سے تحفظ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کیمیکل جب نیل پالش میں ایک مخصوص مقدار میں شامل کیا جاتا ہے تو یہ خواتین خاص کر لڑکیوں کے جسم میں بڑی تیزی سے جذب ہو جاتا ہے۔ یہ جہاں نیل پالش کو دیرپا بناتا ہے، وہاں یہ جسمانی ہارمونز کا توازن بھی دھیرے دھیرے بگاڑ دیتا ہے پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ کیمیکل انسانی جسم میں ڈپریشن یا شدید قسم کے نفسیاتی امراض پیدا کر دیتا ہے۔ مریض کی عادت بن جاتی ہے کہ وہ غصے میں کوئی خطرناک کام بھی سرانجام دے سکتا ہے۔ میری سوچ کے مطابق ہم باربرا کے زیرِ استعمال نیل پالش میں اس کی مقدار زیادہ کر دیتے ہیں۔ اتنی زیادہ کہ یہ جلد جسم میں بگاڑ پیدا کر دے۔ جب یہ کیمیکل حاوی ہو جائے گا، اس کو خودکشی پر مجبور کر دیں گے۔'' جان نے واقعے کی تفصیل بتائی۔

''یہ بہت مشکل اور زیادہ وقت لینے والا عمل ہے۔ اس کے لیے کون اتنا انتظار کرے پھر اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ باربرا غصے میں ہمیں ہی قتل کر ڈالے۔ وہ تو اب بھی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ جان...... مجھے زندگی

بہت عزیز ہے، میں مرنا نہیں چاہتی......" اپریل کے لہجے میں اب خاصی تشویش پائی جانے لگی تھی۔

"دیکھو لو...... اس سے ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ ہم اس کی ٹرانسپیرنٹ نیل پالش اور نیل پالش ریمور میں اس کیمیکل کی مقدار کو جتنا چاہیں بڑھا سکتے ہیں تاکہ ہمیں اس کا جلد نتیجہ مل جائے۔ یہ طریقہ شفاف ہے......" جان نے دوبارہ زور دیا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد اپریل بھی اس بات پر رضامند ہوگئی۔

☆☆☆

منصوبے کے مطابق دونوں نے پہلا کام یہ کیا کہ کسی کو بتائے بغیر چرچ میں جا کر شادی کرلی۔ اس بات کی خبر باربرا کو بھی نہیں دی گئی۔ شادی گویا جان کا اس فلیٹ میں رہنے کا کھلا اجازت نامہ تھی۔ دوسرا کام جان کے ذمے تھا۔ اس نے باربرا کے کمرے سے اس کی پسندیدہ نیل پالش کی تمام بوتلیں (شیشیاں) اٹھالیں اور ان کی جگہ نئی انہی رنگوں کی شیشیاں رکھ دیں۔ وہ چونکہ کاسمیٹک بنانے والی فیکٹری میں لیبارٹری انچارج تھا۔ اس لیے اسے یہ کیمیکل ملنے میں کوئی پریشانی بھی نہ تھی۔ باربرا ان دنوں ویسے ہی ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ لہٰذا جان کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ باربرا کے ساتھ ساتھ رہے اور اس کو ذہنی طور پر اس بات کا یقین دلاتا رہے کہ وہ بے حد بیمار ہے اور اس کی یہ بیماری بے حد جان لیوا ہے۔ ٹرائی فینائل فاسفیٹ کی حد سے زیادہ مقدار اس کی نیل پالش اور ریمور میں ملادی گئی تھی۔ اب ہر روز صبح سویرے جان خود اپنے ہاتھوں سے باربرا کے ناخنوں پر پہلے نیل پالش ریمور سے پرانی نیل پالش اتارتا اور پھر نئی نیل پالش لگادیتا۔

"جان! تم کتنے اچھے ہو۔ میں ہی غلط تھی۔ تم بیماری میں میرا کتنا خیال رکھنے لگے ہو۔" ایک روز باربرا نے جان سے کہا تو جان نے فوراً اسے گلے لگالیا اور بولا۔

"میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں۔ کوئی بات نہیں زندگی میں ایسی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔"

اس پر باربرا کے ہرے کانچ کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ "اپریل میری ماں نہیں ہے۔ اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ بھی اپنی بیٹی کی محبت کو چھیننے کی کوشش نہ کرتی۔ کاش ایسے میں میرا باپ زندہ ہوتا تو میں اس کے پاس چلی جاتی۔ اب تو یہ بیماری ہی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں ہوں نا...... تمہارے ساتھ......" جان نے اس کی ڈبڈباتی آنکھوں کا پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تم کتنے اچھے ہو جان...... میری سوچوں سے بھی بڑھ کر اچھے......" باربرا نے ایک بار پھر جتایا۔ تھوڑی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ تم اپریل کے پاس اب تو نہیں جاؤ گے۔ وہ بہت بری عورت ہے، کسی کو پانے کے لیے وہ بدی کی آخری حد تک بھی جاسکتی ہے۔" باربرا نے سانس لیتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم میڈیسن لو اور آرام سے سو جاؤ۔ میں نے ابھی جاب پر جانے کی تیاری بھی کرنی

ہے۔'' جان نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اس کے کمرے سے نکل گیا۔

کمرے کے باہر اپریل آفس جانے کے لیے کھڑی تھی۔ اس نے جان کی آنکھوں میں جھانکا تو جان نے سب اچھا کی رپورٹ دی۔

''کل رات پڑوسی باربرا کی صحت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔'' اپریل نے کہا۔

''تو......'' جان نے پوچھا۔

''تو میں نے انہیں بتایا کہ اس کی طبیعت سدھرنے کے بجائے دن بہ دن بگڑتی جا رہی ہے۔ کئی ڈاکٹر بدل لیے، اب ہم اسے اسپتال میں داخل کروانے کا سوچ رہے ہیں۔'' اپریل نے بتایا۔

''گڈ..... تم بہت ذہین ہو......'' جان نے کہا۔

''ذہین نہ ہوتی تو مس امریکا کیسے بنتی......'' اپریل نے ہنستے ہوئے جان کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''ناشتا کرلیا ہے کیا......'' جان نے پوچھا۔

''میں نے کرلیا ہے اور تمہارا ناشتا پڑا ہے اگر مجھے میرے آفس پہنچانے کا وعدہ کرو تو میں کچھ دیر اور تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔'' اپریل نے کہا تو جان بولا۔

''ہوں...... اب یہ بوجھ بھی مجھے اٹھانا ہوگا۔''

''بیوی ہوں تمہاری...... ایک دوسرے کو بوجھ جانیں گے تو کیسے گزر ہوگی۔'' اپریل نے کہا تو جان ہنس پڑا۔

''باربرا دن بدن کمزور ہو رہی ہے۔'' اپریل نے کہا۔

''وہ پہلے ہی بیمار تھی۔ اوپر سے کیمیکل بدن میں متواتر جانے سے وہ تیزی کے ساتھ اپنی قوت مدافعت کھو رہی ہے، مجھے لگتا ہے ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔'' جان نے ناشتا کرتے کرتے بتایا۔

اسی شام اپریل آفس سے واپس آئی تو ابھی جان نہیں آیا تھا۔ وہ آتے ہی باربرا کے کمرے میں گئی۔ باربرا بستر پر لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ بہہ کر تکیہ بھگو رہا تھا۔ اپریل کو باربرا کی حالت پر کچھ ترس آیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے باربرا کے ماتھے کو چوم لیا اور بولی۔

''کس قدر کمزور ہوگئی ہے میری بیٹی...... اب تو میڈیسن بھی تم پر اثر نہیں کرتی۔ لگتا ہے، یہ موذی مرض میری بیٹی کی جان لے کر ہی رہے گا۔ چچ...... چچ......''

باربرا نے اپنی ویران اور بے بس آنکھوں سے اس کی

انگلیوں کے نام

دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع کریں

1۔آمین
2۔امانت
3۔جنت
4۔شہادت
5۔فرض۔

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

طرف دیکھا تو کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔

''ہاں...... ہاں...... بولو بیٹی...... میں سن رہی ہوں۔'' اپریل نے جھوٹ موٹ اپنی آنکھوں کے کونوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ماما...... میں جینا چاہتی ہوں...... مجھے بچالو......''

وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔

''ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں مگر صحت دینا ہمارے بس میں تھوڑی ہے۔'' اپریل نے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''میں سسک سسک کر جینے سے مرنے کو زیادہ ترجیح دوں گی۔'' وہ ہچکیوں میں بولی۔

''موت اور زندگی بڑے دھیرے دھیرے اپنا جال پھیلاتی ہیں، تم سو جاؤ...... میں تمہارے کھانے کا بندوبست کر کے تمہیں جگادوں گی۔ ہوسکتا ہے تمہیں کچھ افاقہ ہوجائے۔'' اپریل یہ کہہ کر اس کے پاس سے اٹھ آئی۔

جب جان واپس آیا تو اپریل نے ساری گفتگو اسے سنادی۔ وہ کہنے لگا۔

''کیمیکل کی زود اثری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مریض کو اس کی بیماری کی شدت کا اس قدر احساس دلا دیا جائے کہ وہ زندہ رہنے کے بجائے موت کو ترجیح دینے لگے اور یہ کام تم جاری رکھو......''

☆☆☆

ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مریضہ کے جسم میں موجود ہارمونز بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ اسے فوری طور پر اسپتال میں داخل کروا دیا جائے۔

اپریل گلاسپی بڑی محتاط اور ہوشیار عورت تھی۔ اس نے فوراً آفس سے چھٹی لی اور جان کو فیکٹری ٹیلی فون کر کے بتایا۔

''ڈارلنگ' باربی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانے کو کہا ہے۔ میں

اسے اسپتال لے کر جارہی ہوں، چھٹی پر تم بھی وہیں آجانا۔ میں اگر جلدی آگئی تو تمہیں دوبارہ اطلاع دے دوں گی۔''

وہ اسے اسپتال لے آئی۔ وہ شدید ڈپریشن کی وجہ سے بار بار بے ہوش ہورہی تھی۔ جب ہوش میں آتی تو رونا شروع کردیتی تھی۔ ڈاکٹروں نے فوری طور پر اسے چیک کیا اور مختلف انواع کے ٹیسٹ لکھ دیے۔ اسپتال ہی میں باربرا کے ٹیسٹ لیے گئے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ کسی میڈیسن کی وجہ سے اس کے جسم کے ہارمونز کا توازن بڑی تیزی سے بگڑ رہا ہے۔ اگر فوری طور پر اس عمل کو نہ روکا گیا تو مریضہ کسی وقت بھی نفسیاتی دباؤ کے تحت خودکشی کرسکتی ہے۔

رپورٹ پڑھ کر اپریل نے سکون سا محسوس کیا۔ گویا اب وہ اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے۔ باربرا کو اسپتال میں داخل کرلیا گیا تھا اور اس کا علاج شروع ہوچکا تھا۔ ایک روز باربرا نے سخت نقاہت میں جان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم اب فیکٹری نہیں جاتے؟ میرے پاس نیل پالش نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں ہو، میرے ناخن کس قدر اجڑے اجڑے لگ رہے ہیں۔''

''ہوں...... میں شام کو آتے ہوئے لے آؤں گا، گھر میں تو موجود ہے......'' جان نے تسلی دی۔

مروجہ اصولوں کے مطابق اسپتال میں کسی تیمار دار کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے جان باربرا کو مطلوبہ اشیا فراہم کرکے چلا گیا تھا۔ اسپتال میں بھی بہترین میڈیسن کی فراہمی کے باوجود باربرا کو افاقہ نہیں ہورہا تھا اور اس کی حالت تیزی سے بگڑتی جارہی تھی۔ ڈاکٹر خود اس کی حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ پھر ایک روز ڈاکٹروں نے اسے اسپتال سے چھٹی دے دی تو اپریل اور جان اسے واپس گھر لے آئے۔ باربرا کا کھانا پینا چھوٹ چکا تھا اور اس کے مزاج میں شدید غصہ شامل ہوچکا تھا۔ کوئی بھی بات اس کے مزاج کے خلاف ہوتی تو وہ شور مچا دیتی۔ اس روز تو حد ہی ہوگئی تھی۔

جان اور اپریل کی چھٹی تھی۔ وہ دونوں گھر پر تھے کہ جان نے دوست کے گھر جانے کو کہا۔ اپریل نے ضد کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے گی مگر جان نے منع کردیا۔ اسی بات پر دونوں کے درمیان ایک ہلکی سی جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ جان اکیلا ہی چلا گیا۔ اپریل اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ باربرا لڑکھڑاتی ہوئی اس کے کمرے میں آگئی۔ نقاہت کی وجہ سے وہ بار بار گر رہی تھی۔ پھر بھی ہمت کرکے وہ اٹھی اور اپریل پر جھپٹی۔

''ذلیل حرافہ...... تم کیا سمجھتی ہو...... میں مرگئی ہوں...... تم اس طرح میرے جان کو مجھ سے چھین لوگی؟ میں آج تمہاری وہ خوب صورتی ہی ختم کردوں گی جس پر تمہیں اس قدر ناز ہے۔''

ابھی اپریل سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ بھاگتے ہوئے کچن سے چھری اٹھا لائی اور اسے موقع دیے بغیر اس پر حملہ کردیا۔ اپریل نے اس کے ہاتھ سے چھری چھیننے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ زخمی بھی ہوگئی مگر اس نے چھری چھین لی اور اسے پیٹنے لگی۔

''تم مر کیوں نہیں جاتیں، میرے لیے مصیبت کھڑی کررکھی ہے۔'' اپریل اسے مارتے ہوئے چیخی۔

''تمہیں مار کر مروں گی چڑیل، تم نے میری خوشیاں چھینی ہیں۔ میں تمہیں بھی خوش نہیں رہنے دوں گی......'' یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر اس پر جھپٹی اور پھر اپنے جوش میں خود ہی زمین پر گر پڑی۔

''کاش میں ہی مرجاؤں......'' وہ کراہی۔

''خدا کرے، تم مرجاؤ۔'' اپریل نے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ زمین سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شام کو جب جان واپس آیا تو اس نے اپریل کو زخمی دیکھ کر پوچھا۔

اپریل نے ساری بات اس کے گوش گزار کردی۔ وہ بھی غصے میں آگیا اور جلدی سے باربرا کے کمرے میں گھس گیا۔ باربرا نے اسے دیکھتے ہی غرا کر کہا۔ ''آگئے ہو اس حرافہ کا بدلہ لینے...... اسے دیکھ کر بہت دکھ ہورہا ہوگا...... وہ تمہاری محبوبہ جو ہوئی۔ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے، اس کا جسم بھی مجھ سے زیادہ اچھا ہے۔ تمہیں پسند بھی بہت ہے نا...... جاؤ دفع ہوجاؤ......'' باربرا چیختی رہی۔

''یقیناً اب تمہیں مر ہی جانا چاہیے۔ ورنہ میں خود تمہیں موت کے منہ میں دھکیل دوں گا۔'' جان نے غصے سے کہا تو وہ بستر سے اٹھ کر اس کے مقابل آکر کھڑی ہوگئی اور چیخی۔

''لو مار ڈالو مجھے...... میں خود اس زندگی سے اکتا گئی ہوں۔'' ممکن تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیتی۔ جان نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو تم ایسے نہیں مروگی۔''

پھر اس نے قریبی الماری سے پسٹل نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا اور بولا۔

''لو کرلو خودکشی...... تاکہ ہم سب کی جان چھوٹ جائے۔''

کچھ ہی دیر بعد گولی کی آواز آئی...... اپریل اور جان بھاگ کر گئے تو سیڑھیوں اور کمرے کے درمیان کوریڈور

میں باربرا کی لاش پڑی تھی، گولی کنپٹی پر لگی تھی جہاں سے لہو کی پتلی سی لکیر اس کے چہرے سے ہو کر زمین پر پھیل گئی جان نے آگے بڑھ کر اس کو چیک کیا۔

''مرچکی ہے......'' وہ بولا۔

''تم فوراً پولیس کو اطلاع دو۔'' اپریل نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

جان نے پولیس اسٹیشن اطلاع دی تو وہاں سے پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی فوراً ہی ان کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ ضروری کارروائی کے بعد وہ لاش لے کر چلے گئے۔

☆☆☆

لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کیمیکل ایگزامن رپورٹس موصول ہوتے ہی پولیس اسٹیشن سے جان کو ٹیلی فون آیا کہ دونوں پولیس اسٹیشن رپورٹ کریں۔

''باربرا کی میڈیکل رپورٹس ساتھ ضرور لے لینا۔'' جان نے چلتے ہوئے اپریل سے کہا۔

''ہوں...... میں پہلے ہی سوچ رہی تھی۔ جان کچھ ہوگا تو نہیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' اپریل نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''ارے نہیں...... ہم ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ ڈاکٹرز اور اسپتال کی میڈیکل رپورٹس ہمارے لیے مضبوط گواہی ہیں۔'' جان نے کہا۔ پھر بولا۔ ''جلدی چلو...... ہمیں جلدی پولیس اسٹیشن پہنچنا ہوگا۔''

☆☆☆

''تم دونوں کا پھیلایا ہوا جال یقیناً بہت مضبوط تھا مگر نادانستگی میں اس کی کچھ گرہیں ذرا ڈھیلی رہ گئیں جس کی بنا پر میں تمہیں مجبوراً تفتیش میں شامل کر رہا ہوں۔'' پولیس انسپکٹر نے انہیں اپنے سامنے پا کر کہا۔

''دیکھو لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ، کیمیکل اور دوسری رپورٹوں کے مطابق وقوعہ کے دن جس پسٹل سے مقتولہ نے خودکشی کی ہے، اس پسٹل کے دستے پر مقتولہ کی انگلیوں کے نشانات کے ساتھ ساتھ کچھ اور نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ لگتا ہے، جیسے مقتولہ کو آلۂ قتل کسی نے خود پکڑایا ہے۔ ٹریگر پر بھی انہی انگلیوں کے نشانات ہیں جو پسٹل کے دستے پر ہیں۔ قرائن بتاتے ہیں کہ کسی انتہائی عیار اور چالاک قاتل نے مقتولہ کو قریب سے گولی مار کر قتل کر دیا اور پھر اس کے ہاتھ کی انگلی پسٹل کے ٹریگر میں پھنسا دی۔ تاکہ ایسا لگے کہ مقتولہ نے خودکشی کی ہے۔ اس پر کس کی انگلیوں کے نشانات ہیں؟ میں نے اسی لیے آپ دونوں کو پولیس اسٹیشن طلب کیا ہے کہ اگر تم جانتے ہو تو سیدھے طریقے سے بتادو۔''

''یقین کیجیے مقتولہ نے خودکشی کی ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ کچھ بھی کرسکتی تھی۔ یہ اس کی میڈیکل رپورٹس ہیں جو اس کی ذہنی کیفیات اور بیماری کی ہیں۔'' جان نے اپریل سے باربرا کی میڈیکل رپورٹس کی فائل لے کر انسپکٹر کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، مگر جب تک تمہارے فنگر پرنٹس کی رپورٹ نہیں آجاتی، تم دونوں پولیس کی حراست میں رہو گے......'' انسپکٹر نے فائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ہوگا؟'' اپریل نے پریشانی سے جان کے کان میں کھسر پھسر کی......

''کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' جان نے آہستگی سے جواب دیا۔

''گولی تو تم نے ہی ماری تھی۔'' اپریل نے اسی لہجے میں کہا۔

''خاموشی بہتر ہے۔'' جان بولا۔

اگلے ہی روز فنگر پرنٹ ایگزامنر کی رپورٹ آگئی۔ دوسرا فنگر پرنٹ جان کی انگلیوں کے نشانات سے ملتا تھا۔ انسپکٹر نے کہا۔

''اگر تم آسانی سے قتل کا اعتراف کرلوگے تو بہتر رہے گا کیس میرے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہوچکا ہے۔ یہ میری میز پر پڑی نیل پالش کی شیشی بھی ایک پختہ گواہی ہے تمہارے خلاف۔ کیمیکل ایگزامن رپورٹ کے مطابق مارکیٹ میں ملنے والی اسی برانڈ کی نیل پالش میں مضرِ صحت کیمیکل کی مقدار اتنی زیادہ نہیں جتنی اس میں شامل ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق تم نے یا دونوں نے دانستہ طور پر اس میں کیمیکل کی مقدار اس لیے بڑھا دی تاکہ اس کیمیکل سے مقتولہ کے جسمانی ہارمونز کا توازن بگڑ جائے اور وہ ڈپریشن یا کسی شدید نفسیاتی دباؤ کے تحت خودکشی کرلے اور جب مرنے والی نے خودکشی نہ کی تو تم نے اسے اشتعال دلا کر اسے قتل کر ڈالا۔''

اقبالی بیان میں جان نے اپنا جرم قبول کرتے ہوئے اپریل کو بھی اپنا ساتھی اور اعانتِ جرم کا شریک بتایا تو انسپکٹر نے کہا۔ ''یقیناً تم نے انتہائی مضبوط جال بنا تھا مگر اس کی کچھ گانٹھیں ڈھیلی رہ گئی تھیں۔''

''کاش مجھے اپریل کی خطیر انشورنس کی رقم کا لالچ نہ ہوتا۔'' جان مردہ آواز میں بولا۔ دونوں لاک اپ کی طرف بڑھ گئے۔

شیخ نظام الدین

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ کی مصلحتوں کو اگر انسان سمجھنے بیٹھے تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ایک بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک ایک ایک پل کی تقدیر تحریر کرتا ہے کہ اس کا کون سا وقت اور کتنا وقت کس عمل میں صرف ہوگا... اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور بعد از مرگ اس کی واپسی کے سفر میں تمام اعمال اس کا زادِ سفر کس طرح ٹھہریں گے۔ اللہ کے نیک بندے اسی غور و فکر میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کرتے اور لوگوں کو سکھاتے اور واپسی کا سفر اختیار کرلیتے ہیں۔ آپ کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

رب کائنات کا قرب حاصل کرنے والے ایک

ولی کا قصہ



لکھنؤ کے قریب کاکوری کے ایک گاؤں نگراواں میں ایک ایسا خاندان اقامت گزیں تھا جس کا شجرۂ نسب سہروردیہ سلسلے کے بانی حضرت شہاب الدین سے تعلق رکھتا تھا اور اگر شہاب الدین سہروردی سے آگے نظر ڈالی جائے تو پھر یہ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی تک پہنچتا تھا۔ اس خاندان کے صدق و ایمان پر سبھی متفق تھے۔ لوگ ان کی مثالیں دیتے تھے لیکن ان میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا تھا جس نے اپنے علم، زہد اور غیر معمولی کارناموں سے... نسلوں پر گہرے اور یادگار اثرات چھوڑے ہوں۔

اس خاندان میں 1160ھ میں ایک بچہ پیدا ہوا، والدین نے بچے کا نام نظام الدین رکھا۔ اس کی پرورش و پرداخت نہایت ناز و نعم میں ہوئی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو اسے پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا کاکوری میں علمی خاندانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ یہ اپنے وقت کے جید ترین علماء سے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ گھر والے بہت خوش تھے کہ نظام الدین نے اپنے معاملات میں خود ہی دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ انہیں اپنی تعلیم کے سلسلے میں بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ لوگوں سے یہ پوچھتے رہتے تھے کہ بڑے بڑے عالم کہاں ملیں گے اور انہیں علم حاصل کرنے کے لیے کن عالموں سے رجوع کرنا چاہیے۔

ایک دن ایک عالم کاکوری پہنچا۔ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ بستی کے لوگ اس سے ملنے اور ہم کلام ہونے کو باعثِ عزت سمجھتے۔ نظام الدین کو علم کی طلب تو تھی ہی، یہ بھی اس عالم کے پاس جا پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت انہیں دے دیں۔ عالم نے پوچھا۔ ”میاں صاحبزادے! تم مجھ سے کیا پڑھو گے؟ میں آج یہاں ہوں کل کہیں اور چلا جاؤں گا اور پڑھنے پڑھانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد برابر کا وقت دیں۔ جو ظاہر ہے کہ میں نہیں دے سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کس طرح پڑھا سکتا ہوں۔“

نظام الدین نے مایوسی سے کہا۔ ”حضرت! اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ہمیشہ تشنہ ہی رہوں گا!“

عالم نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے تو تم لکھنؤ چلو، وہاں کہیں رہنے کا انتظام کر لو، پڑھا میں دیا کروں گا۔“

نظام الدین نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”افسوس کہ میں لکھنؤ نہیں جاسکوں گا حالانکہ جی بہت چاہتا ہے جانے اور پڑھنے کو۔“

عالم نے کہا۔ ”اگر تم لکھنؤ نہیں جاسکتے تو اور کہاں جاسکتے ہو۔ علم کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ یہ سفر کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے سیکڑوں اور ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے علم حاصل کیا تھا اور تم چند میل کا سفر بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں طلب صادق نہیں، ورنہ ایسی بات نہ کرتے۔“

نظام الدین کے دل پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ وہ کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے، آخر پوچھا۔ ”اس وقت علم کے گہوارے کون کون سے ہیں؟ کیا آپ اس سلسلے میں میری راہنمائی فرمائیں گے؟“

عالم نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ اور دہلی..... مشہور یہی دونوں ہیں ورنہ ان دو کے علاوہ بھی کئی شہر ہیں۔“

نظام الدین اس وقت تو خاموش رہے، کچھ بھی نہیں بولے مگر کئی دن تک شش و پنج میں مبتلا رہے۔ وہ کوئی اہم اور بڑا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ گھر کے بزرگوں نے انہیں فکر میں ڈوبے دیکھا تو پوچھا۔ ”نظام الدین! آخر کس سوچ میں ہو؟ خیریت تو ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ سے آنے والے عالم نے مجھے یہ عجیب و غریب بات بتائی ہے کہ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے تحصیلِ علم کے لیے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے طے کیے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو میں کتنا بدنصیب ہوں۔ اس عظیم مقصد کے لیے چند میل کا فاصلہ بھی طے نہ کر سکا۔“

ایک بزرگ نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بات درست ہے کیونکہ ہزاروں میل کا سفر کرنے والے بزرگ اس نکتے سے واقف تھے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے لیکن جب ہمارے ذہن سے یہ بات نکل گئی، ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ کسی ایک جگہ لوگ پیدا ہوئے اور وہیں مر کھپ گئے اور ان کے بارے میں دنیا یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”تب پھر میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں علم کی خاطر سفر کروں گا۔ میں لکھنؤ نہیں دہلی جاؤں گا کیونکہ اس بڑے مقصد کے لیے اتنا مختصر سفر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

گھر والے سناٹے میں آگئے۔ وہ نظام الدین کو منع بھی نہیں کر سکتے تھے، پھر بھی ایک بزرگ نے کہا۔ ”لیکن اپنے اس سفر سے پہلے اس کی اونچ نیچ پر ضرور غور کر لینا۔ اس راہ میں دشواریاں بھی بہت پیش آتی ہیں۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ کسی بھی عظیم مقصد کی حصولیابی کی راہ میں مشکلات اور دشواریاں بھی عظیم ہی پیش آتی ہیں۔ میں ہر صعوبت اور ہر مشکل پر قابو پانے کا تہیہ کر چکا ہوں۔“

نظام الدین کے جواب میں بڑی استقامت تھی۔ ان کے ایک، ایک لفظ میں قوتِ ارادی کا پرتو موجود تھا۔

اس گفتگو کے کئی دن بعد نظام الدین نے اپنے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ سیدھے لکھنؤ پہنچے۔ وہاں دہلی جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گئے اس قافلے میں وہ لوگ بھی تھے جو اکثر و بیشتر سفر کرتے رہتے تھے۔ ان سے انہوں نے یہ معلوم کیا کہ دہلی میں وہ کون لوگ ہیں جن کی علمیت کا چرچا ہے اور جو درس و تدریس میں مرجع خلائق ہیں۔ ان کے اس سوال کا تقریباً ہر ایک کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”حضرت کلیم اللہ جہان آبادی۔ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ اور عالم بے بدل کلیم اللہ جہان آبادی۔“

نظام الدین نے دہلی پہنچتے پہنچتے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں سلسلۂ چشتیہ کے اس آستانے پر دستک دینی ہے۔ وہ کلیم اللہ کے بارے میں

معلوم نہیں کیا کچھ سوچتے رہے۔ انہیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید یہ دروازہ ان کے لیے نہ کھلے کیونکہ کلیم اللہ کے آستانے پر ان جیسے معلوم نہیں کتنے لوگ حاضریاں دیتے ہوں گے اور ان میں ہر شخص اس لائق نہیں ہوتا ہوگا کہ کلیم اللہ کا شرفِ شاگردی حاصل کر لے۔

نظام الدین دہلی پہنچ کر قافلے سے جدا ہو گئے اور کلیم اللہ کے آستانے کا پتا پوچھتے ہوئے پہنچ گئے۔ رات کا وقت تھا اور آستانے میں محفلِ سماع گرم تھی۔ یہ در پر دستک دینا چاہتے تھے کہ شیخ کے کسی مرید نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ نظام الدین نے پوچھا۔ ''میں شیخ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا شیخ نے ملاقاتیوں پر کوئی پابندی عائد کر رکھی ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''اس وقت اندر محفلِ سماع گرم ہے اور شیخ کا یہ عام حکم ہے کہ وہ اپنی اس محفل میں کسی اجنبی یا عام شخص کو نہیں داخل ہونے دیتے۔ اس لیے اگر تم نے دستک بھی دی تو اندر سے یہی جواب ملے گا کہ صبح حاضری دینا۔''

نظام الدین کا دل ٹوٹ گیا۔ مرید سے عالمِ یاس میں پوچھا۔ ''شیخ کو یہ کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا اجنبی یا کوئی عالم شخص ہے؟''

مرید نے حیرت سے انہیں دیکھا اور سوال کیا۔ ''تم ہمارے شیخ کی بابت کیا کچھ جانتے ہو؟''

نظام الدین نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ سنا ہے کہ شیخ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔''

مرید نے پوچھا۔ ''بس یا اور کچھ بھی؟''

نظام الدین نے کہا۔ ''بس، اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟''

مرید نے کہا۔ ''تب پھر اے اجنبی...... تجھ کو رات کہیں اور بسر کرنا چاہیے۔ صبح آ جانا، ممکن ہے شیخ کی نظرِ کرم ہو جائے ورنہ میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ تمہیں اپنے حلقۂ درس میں نہیں بٹھائیں گے۔''

نظام الدین نے پوچھا۔ ''یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنا چاہتا ہوں؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''تم اپنی وضع قطع اور صورت شکل سے طالبِ علم نظر آتے ہو اور شیخ چونکہ روشن ضمیر ہیں اس لیے وہ آنے والے کے ارادے، نیت اور خصوصیت سے اسے دیکھے بغیر ہی واقف ہو جاتے ہیں۔''

نظام الدین نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں تمہارے شیخ کا اس وقت امتحان کیوں نہ لے لوں۔ میں دروازے پر دستک ضرور دوں گا، خواہ یہ دروازہ کھلے یا نہ کھلے۔''

مرید نے مزاحمت کی۔ ''میں دروازے پر دستک نہیں دینے دوں گا۔''

لیکن نظام الدین نے مرید کی مزاحمت سے پہلے ہی دستک دے دی۔ مرید دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے، بولا۔ ''اجنبی! تم نے یہ بہت برا کیا۔ بہر حال تم نے جو غلطی کی، اس کا اعادہ نہیں ہونے دوں گا۔''

نظام الدین نے کہا۔ ''بہتر ہے، میں دستک تو دے ہی چکا ہوں اور میں اپنی طلبِ صادق سے واقف ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے پیر و مرشد اپنی روشن ضمیری سے یہ سب جانتے ہیں یا نہیں۔''

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ مرید نے مڑ کر اندر کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کہا۔ ''میں نے بڑی کوشش کی کہ دروازے پر دستک نہ ہونے دوں لیکن یہ ضدی شخص دھوکا دے کر دستک دینے میں کامیاب ہو گیا۔'' پھر پوچھا۔ ''شیخ نے یہی کہا ہوگا کہ اس شخص کو رخصت کر دیا جائے؟''

آنے والے نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ شیخ نے پوچھا ہے کہ دستک دینے والے کا نام کیا ہے؟''

مرید حیران و پریشان نظام الدین کی صورت دیکھنے لگا۔

نظام الدین نے جواب دیا۔ ''اپنے پیر و مرشد سے عرض کر دو کہ نظام الدین شرفِ باریابی چاہتا ہے۔''

وہ شخص واپس چلا گیا تو مرید نے نظام الدین کا مذاق اڑایا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس وقت ذلت اور خواری تیرا مقدر بن چکی ہے ابھی تک میں نے تم اور تمہیں سے مخاطب کیا لیکن جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ تو ضدی اور خودسر انسان ہے تو میں تو اور تجھے پر اتر آیا۔''

نظام الدین نے جواب دیا۔ ''تم جن لفظوں میں بھی چاہو، مجھے مخاطب کرو۔ میں ہر حال میں نظام الدین ہی رہوں گا۔ تم نہ تو میرا مرتبہ بڑھا سکتے ہو اور نہ گھٹا سکتے ہو۔ میں جو ہوں وہی رہوں گا۔''

اس دوران وہ شخص واپس آ گیا۔ بولا۔ ''اے اجنبی! تجھے پیر و مرشد یاد فرما رہے ہیں، وہ تجھ سے اسی وقت ملنا چاہتے ہیں۔''

نظام الدین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ انہیں واقعی طلب کر لیا جائے گا، پوچھا۔ ''کیا واقعی؟ کیا مجھے اندر طلب کیا گیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں، تجھ کو اسی وقت بلایا گیا ہے۔ پیر و مرشد نے فرمایا کہ جاؤ نظام الدین کو بلاؤ۔''

اب تو نظام الدین کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ وہ بوجھل قدموں سے اندر داخل ہو گئے اور اضطراب، بے چینی سے شیخ کی طرف بڑھتے

رہے۔ کچھ دیر بعد یہ شیخ کلیم اللہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت شیخ کے آس پاس جو لوگ موجود تھے، انہیں حیرت تھی کہ یہ شیخ کو آج ہو کیا گیا ہے جو ایک اجنبی کو محفلِ سماع میں بلا لیا۔

ایک ارادت مند نے پوچھا۔ ''حضرت! دخلِ اجنبی در مجلسِ سماع دستورِ حضور نیست'' (حضرت! اجنبی کو مجلسِ سماع میں داخل کرنا حضور کا دستور نہیں ہے)

شیخ نے جواب دیا۔ ''ایں مرد عزیز است اجنبی نیست'' (یہ شخص عزیز و آشنا ہے، اجنبی نہیں)

نظام الدین نے شیخ کو سلام کیا۔ شیخ نے سلام کا جواب دے کر دریافت فرمایا۔ ''کہو، کیونکر آنا ہوا؟''

نظام الدین نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں تحصیلِ علم کی خاطر حاضر ہوا تھا، آپ کی نظرِ کرم کا طالب ہوں۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''بس یا اس کے علاوہ بھی کچھ؟''

نظام الدین نے جواب دیا۔ ''میں آیا تو اسی غرض سے ہوں، اس کے علاوہ اور کیا یہاں سے مل سکتا ہے، میں نہیں جانتا۔ حضور جو کچھ دیں گے، لے لوں گا۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''تم رہتے کہاں ہو؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں آپ کے شہر میں نو وارد ہوں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اگر آپ نے مجھ کو اپنے حلقۂ درس میں شامل کر لیا تو رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی کر لوں گا۔''

شیخ نے کہا۔ ''میں نے تجھے اپنے حلقۂ درس میں شامل کیا اور تجھے رہنے کا ٹھکانا بھی دیا، تو یہیں میرے آستانے میں رہے گا، میں تیری طلبِ صادق کی قدر کرتا ہوں۔''

حاضرین رشک سے اس نو وارد کو دیکھنے لگے۔ شیخ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ نظام الدین کو اس کے رہنے کی جگہ دکھا دی جائے۔ چنانچہ نظام الدین کو ایک چھوٹا سا حجرہ دے دیا گیا۔

اب تک جو کچھ اور جس انداز میں ہوا تھا، نظام الدین کو اس پر یقین نہیں آتا تھا لیکن جب اس حجرے میں ایک رات بھی بسر کر لی تو انہیں یقین آگیا کہ وہ اپنا گوہرِ مقصود پا چکے ہیں لیکن انہیں شیخ کے مریدوں کی کیفیت دیکھ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ مریدین میں اکثر سکر و وجد میں مبتلا نظر آتے۔ نظام الدین سوچتے، ان لوگوں کی یہ حالت کیونکر ہو جاتی ہے۔ انہیں تو بس ایک ہی بات معلوم تھی، وہ یہ کہ شیخ کے آس پاس جو لوگ موجود ہیں، وہ سب ان کی طرح طالبِ علم ہیں پھر یہ وجد و جذب کی کیفیت کیوں طاری ہو جاتی ہے اور اگر ان پر طاری ہو جاتی ہے تو پھر خود نظام الدین پر یہ کیفیت کیوں نہیں طاری ہوتی؟ سوچتے سوچتے سر میں درد ہونے لگا مگر ان سوالوں کا کوئی معقول جواب نہیں مل سکا۔

دوپہر کا وقت تھا، نظام الدین اپنے استاد سے درس لے رہے تھے۔ یکا یک ایک ہلکا سا شور اٹھا اور لوگ زور زور سے باتیں کرنے لگے پھر یہ لوگ کھڑے ہو کر ایک طرف بھاگے۔ نظام الدین نے کسی سے پوچھا۔ ''بھائی! آخر بات کیا ہے؟ یہ لوگوں میں خاموش ہلچل سی کیوں مچی ہوئی ہے؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''میاں صاحبزادے! شاید تم یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

نظام الدین نے کہا۔ ''اگر میں یہاں کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا تو ایسا سوال نہ کرتا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''میاں سادہ لوح صاحب! یہاں ظاہری تعلیم بھی دی جاتی ہے اور باطنی تعلیم بھی۔ تم نے شیخ سے کہا کہ تم ان سے ظاہری اور دنیاوی علوم حاصل کرنا چاہتے ہو، اس لیے باطنی علوم کے بارے میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا گیا اور تم جب جذب و کیف میں مبتلا لوگوں کو دیکھتے ہو تو حیران اور پریشان اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگتے ہو اور اس کا سبب جاننے کی کوشش کرتے ہو۔''

نظام الدین نے آنے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بھائی! یہ کون صاحب ہیں اور انہیں ہاتھوں ہاتھ کیوں لیا جا رہا ہے؟''

ایک مرید نے جواب دیا۔ ''ہمارے پیر و مرشد۔ شیخ کلیم اللہ کے مرشد شیخ یحییٰ مدنی ان دنوں مدینہ میں اقامت گزیں ہیں۔ یہ آنے والا شخص شیخ مدنی کا مرید ہے اور اپنے پیر بھائی شیخ کلیم اللہ سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ یہاں والے اس کی زیارت اور ملاقات کی خاطر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔''

نظام الدین نے پوچھا۔ ''آنے والا اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ ہمارے شیخ کا پیر بھائی ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''نظام الدین! افسوس کہ تم ہمارے شیخ کے مرتبے اور مقام سے واقف نہیں ہو۔''

نظام الدین نے کہا۔ ''کیوں واقف نہیں، ہمارے شیخ اس عہد کے نامی گرامی بلکہ بے نظیر و بے عدیل عالم ہیں۔''

مرید نے کہا۔ ''افسوس کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے'' اس کے بعد مرید نے نظام الدین کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ بولا۔ ''تم

میرے ساتھ آؤ اور جو کچھ دیکھو اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

نظام الدین اس کے ساتھ شیخ کے حجرے کی طرف بڑھے۔ مدینے سے آیا ہوا شخص اس وقت شیخ کے حجرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی حجرے میں داخل ہو گئے۔ ان داخل ہونے والوں میں نظام الدین بھی شامل تھے۔

مہمان نے اندر داخل ہوتے ہی السلام وعلیکم یا شیخ، کہہ کر شیخ کلیم اللہ کو مخاطب کیا۔

شیخ نے وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، کہہ کر جواب دیا اور اپنے پیر بھائی پر ہوش وخرد سوز نظر ڈالی۔ آنے والا مہمان ان نظروں کی تاب نہ لا سکا اور چیخ مار کر گر گیا۔ شیخ کے مریدوں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا کہ مہمان زمین پر گر چکا تھا۔

نظام الدین کی حیرت اور پریشانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا، اپنے مرید ساتھی سے پوچھا۔ "کیا یہ شخص کچھ بیمار ہے... یہ بے ہوش کیوں ہو گیا؟"

مرید نے بڑے افسوس سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم اپنے شیخ کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے تو تمہیں یہاں سے چلا جانا چاہیے اور کسی ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جو محض عالم ہو اور کچھ نہیں۔"

نظام الدین نے بڑے دکھ سے کہا۔ "بھائی! میں جو نہیں جانتا اگر اس کی بابت کچھ جاننا چاہتا ہوں تو تم مجھے شرمندہ کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

مرید نے کہا۔ "بھائی! تو بات ہی ایسی کر رہا ہے۔ اپنے شیخ کلیم اللہ عالم باعمل کے ساتھ ہی یگانہ روزگار صوفی بھی ہیں۔ ان کا ظاہر بھی روشن ہے اور باطن بھی روشن ہے۔ ان کی باتوں میں اثر اور نظروں میں سحر ہے۔ مدینے سے آنے والے پیر بھائی کی نظریں شیخ کی پُرسوز نظروں کی متحمل نہ ہو سکیں اور یہ شخص بے ہوش ہو کر گر گیا۔"

اب نظام الدین کے اندر حرکت سی ہوئی اور کچھ مدوجزر سا پیدا ہو گیا، پوچھا۔ "شیخ میں یہ اثر کمال کیونکر پیدا ہو گیا؟"

مرید نے جواب دیا۔ "ریاضت اور مجاہدے سے، تزکیہ نفس اور چلہ کشی سے۔"

نظام الدین نے پوچھا۔ "اگر میں بھی یہ بات حاصل کرنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

جواب ملا۔ "نفس کشی، مجاہدہ، ریاضت!"

نظام الدین نے پوچھا۔ "کتنے دنوں تک؟"

جواب ملا۔ "اپنے پیر و مرشد استاد سے رجوع کرو اور پوچھو کہ ان جیسا مقام تم کتنے دنوں میں حاصل کر لو گے؟"

نظام الدین کو شرم سی آگئی، سر جھکا کر پوچھا۔ "میں یہ باتیں تم سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ انہیں اپنے استادِ محترم سے نہیں پوچھ سکتا۔"

مرید نے کہا۔ "بھائی! اپنے شیخ کی مردم شناسی اور عرفان کا یہ حال ہے کہ بات ابھی تمہارے ہونٹوں تک بھی نہیں آئی کہ یہ سب کچھ سمجھ گئے۔ ان کے پاس پست ہمت اور......"

نظام الدین نے بات کاٹ دی، بولے۔ "ہاں ... میں اپنے پیر و مرشد جیسا بننا چاہتا ہوں، کیونکہ مادی ترقیاں وقتی ہوتی ہیں اور میں پائیدار اور ناقابل شکست ترقی کرنا چاہتا ہوں۔"

مرید کو ان کی کسی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ نظام الدین مریدوں کو چیرتے اور دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے شیخ کے قریب پہنچ گئے اور انہیں جی بھر کے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے دل کو ٹٹول رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شیخ کی نظروں کا ان کے دل پر اثر ہوتا ہے یا نہیں؟

شیخ نے انہیں سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے نظام؟ خیریت تو ہے؟"

نظام الدین کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوا، بولے۔ "کوئی خاص بات نہیں استادِ محترم!"

شیخ نے کہا۔ "نہیں، کوئی خاص بات ہے۔ مجھے تم پریشان نظر آرہے ہو۔"

نظام الدین کا دل بھر آیا، بولے۔ "استادِ محترم! میں اپنی مجبوری اور بے بسی پر پریشان ہوں۔ آپ کی نظروں نے آپ کے پیر بھائی کو بے ہوش کر دیا مگر یہی نظریں مجھ پر کوئی اثر نہیں کر رہیں۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "نظام! یہ دنیا ہی دوسری ہے، اس کی بابت دور کے لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔"

نظام الدین نے پوچھا۔ "کیا میں اس دوری کو ختم کر سکتا ہوں؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، اگر تم چاہتے ہو کہ یہ دوری دور ہو جائے تو اس کے لیے تیاری کرو، اس طرح جس طرح ایک طالب علم امتحان کی تیاری کرتا ہے۔"

کچھ لوگوں نے شیخ کو بتایا کہ بے ہوش ہونے والا پیر بھائی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، آپ نے اس کو ڈانٹ دیا۔ ”یہ کیا بات ہے کہ تو کم ظرفوں کی طرح ایک چلو میں الو ہوا جا رہا ہے، ظرف پیدا کر۔ تحمل اور صبر سے کام لے۔“

شیخ کا پیر بھائی آنسو بہا رہا تھا، بولا۔ ”شیخ! جب میں مدینے سے چلا تھا تو پیرومرشد نے مجھ سے بطورِ خاص کہا تھا کہ شیخ کلیم اللہ سے نظریں نہ ملانا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ چنانچہ آج جب غلطی سے میں نظریں ملا بیٹھا تو میں نے اپنے اندر ایک زلزلہ سا محسوس کیا اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔“

شیخ نے کہا۔ ”بہرحال اتنی قوت پیدا کرو کہ آنکھیں ملا سکو۔“ پھر نظام الدین سے پوچھا۔ ”اور تم نے بھی کچھ محسوس کیا یا نہیں؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں نے ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی جو دوسروں کو بتا کر حیرت زدہ کر دوں۔“

شیخ نے کہا۔ ”یہ بات بھی نہیں ہونا چاہیے۔ تم بالکل کورے ہو، اس پر کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ کچھ نقش و نگار بنائے جا سکتے ہیں۔“ پھر کچھ توقف اختیار کیا، پوچھا۔ ”علوم دو قسم کے ہوتے ہیں، ظاہری اور باطنی۔ کیا تمہیں ان دونوں سے دلچسپی ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”ابھی تک تو میں ظاہری علوم حاصل کرتا رہا ہوں۔“

شیخ نے کہا۔ ”لیکن اگر تم چاہو تو باطنی علوم بھی حاصل کر سکتے ہو۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”محنت سے...... بہت جدوجہد کرنا پڑے گی۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

شیخ نے سکوت اختیار کیا، ایسا سکوت جو مہینوں قائم رہا۔

نظام الدین کو شبہ ہوا کہ شیخ بے التفاتی برت رہے ہیں، انہیں بڑا دکھ ہوا مگر شیخ سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خود بھی خاموش ہو گئے اور کسی موقع کا انتظار کرنے لگے۔

ایک دن ظہر کی نماز کے بعد جب شیخ نے اٹھ کر اپنے جوتے تلاش کیے تو دیکھا نظام الدین انہیں ہاتھوں میں لیے مؤدب کھڑے ہوئے ہیں۔ پھر یہ جوتے شیخ کے قدموں میں رکھ دیے۔ شیخ نے نظام الدین کو بغور دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”توجہ بکسب علوم باطنی اولیٰ و احسن است (علوم باطنی حاصل کرنے کی توجہ کرنا اوّل و احسن ہے)

نظام الدین نے جواب میں شعر پڑھا۔

سپردم بتو مایہ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

اس شعر نے شیخ کی حالت غیر کر دی، وہ تڑپ گئے اور کہا۔ ”نظام الدین! یہ تو نے کیسا شعر پڑھ دیا؟“

نظام الدین گھبرا گئے، وہ سمجھے شاید اس شعر نے شیخ کو کسی وجہ سے آزردہ کر دیا ہے۔

شیخ نے کہا۔ ”تو پریشان نہ ہو جب میں مدینے سے چلا تھا تو میرے پیرومرشد شیخ یحییٰ مدنی نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک شخص جس کا نام نظام الدین ہو گا، تیرے پاس آئے گا۔ وہ کچھ عرصہ تجھ سے علوم ظاہری حاصل کرے گا پھر اچانک اس کی توجہ علوم باطنی کی طرف ہو جائے گی۔ جب وہ تجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرے گا تو یہ شعر (مندرجہ بالا شعر) پڑھے گا۔ جب اور جو شخص یہ شعر پڑھے گا، اس کی طلب صادق ہو گی اور اس پر خصوصی توجہ دینا لازم ہو جائے گا۔“

نظام الدین بے حد خوش ہوئے مگر اس خوشی میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں شامل ہوئی۔

شیخ کی خدمت میں ایک اور مرید آ گیا۔ یہ شخص بھی مدینہ منورہ سے آیا تھا۔ شیخ نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”کسی کے آنے سے اتنا اداس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟“

آنے والے نے شیخ کی طرف دیکھا اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ نظام الدین نے دوسری بار یہ منظر دیکھا تھا۔ پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیا ہے؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”نظام! یہ بھی ایک علم ہے جو تمہیں بھی تعلیم کیا جائے گا۔“

نظام الدین نے ایک سوال اور کیا۔ ”معلوم نہیں کیوں، میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ آنے والا بے ہوش شخص کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے۔ کون سی خاص خبر؟ مجھے پتا نہیں لیکن کیا شیخ کو بھی اس کا کوئی علم نہیں؟“

شیخ نے نظام الدین سے نظریں ملاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ شخص مدینہ منورہ سے بڑی اندوہناک خبر لایا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس سے کہوں کہ تو جو خبر لایا ہے اسے سنا دے لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنے پیرومرشد کی بابت کوئی اندوہناک خبر سنوں، اس لیے میں اس سے کوئی سوال بھی نہیں کر سکا۔“

مریدوں نے بے ہوش شخص کو کوشش کر کے ٹھیک کر دیا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی شیخ نے اس سے پوچھا۔ ”میرے نو وارد مہمان! میرے پیر و مرشد کا کیا حال ہے، وہ خیریت سے تو ہیں؟“

آنے والا زار و قطار رونے لگا، اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ روتے ہوئے جواب دیا۔ ”شیخ! آپ کے پیر و مرشد کا وصال ہو چکا ہے۔“

شیخ نے ایک آہ بھری اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اس دن شیخ ہمیشہ سے زیادہ ملول اور افسردہ رہے۔ انہیں کچھ اچھا ہی نہ لگتا تھا۔ آخر اسی عالم میں انہوں نے نظام الدین سے کہا۔ ”نظام! کئی دن کے غور و فکر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں باطنی علوم بھی سکھائے جائیں چنانچہ کل سے یہ کام شروع ہو جائے گا۔“

نظام الدین پر خوشی کا ایسا دورہ پڑا کہ گر گئے اور دیر تک نیم مدہوشی کی کیفیت میں مبتلا رہے۔

حسبِ وعدہ نظام الدین کو درس دیا جانے لگا۔ نظام الدین نے بھی اپنا سب کچھ بھلا دیا۔ انہیں بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ شیخ کا خلیفہ کون ہوگا؟ کیونکہ مریدوں نے نظام الدین کو بتا دیا تھا کہ درویش میں مراتب ہوتے ہیں اور یہ باقاعدہ ایک نظام ہے۔

نظام الدین کی محنت اور لگن نے شیخ کو بہت خوش کر دیا۔ ایک عرصے بعد جب نظام الدین کو ایک مقام مل گیا تو شیخ نے انہیں طلب کیا۔ نظام الدین پیر و مرشد کے روبرو ادب سے کھڑے ہو گئے۔

شیخ نے پھر سوال کیا۔ ”کچھ جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد خود ہی ارشاد فرمائیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

شیخ نے پھر سوال کیا۔ ”یہاں تمہیں کیسا لگتا ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”بہت اچھا۔ میں نے یہاں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے جہان آباد سے بہتر کوئی اور سرزمین نہیں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”اگر میں تجھ کو یہ حکم دوں کہ تو جہان آباد کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین پر چلا جا تو تجھے کیسا لگے گا؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد کا حکم سر آنکھوں پر...... آپ کے حکم کی تعمیل میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا، خوش و خرم رہوں گا۔“

شیخ نے حکم دیا۔ ”تب پھر تم دکن چلے جاؤ۔ میں نے دکن کی ولایت تمہارے حوالے کی۔ دکن کے شہر اورنگ آباد میں تم قیام کرو گے۔“

نظام الدین دم بخود پیر و مرشد کو دیکھتے رہ گئے۔

شیخ نے پوچھا۔ ”میری صورت کیا دیکھتے ہو؟ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

نظام الدین نے اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں سر رکھ دیا، کہا۔ ”میں اعتراض کروں گا، یہ آپ نے کس طرح سوچ لیا؟ میں شیخ کے حکم کی تعمیل میں کل ہی اورنگ آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ میں تو اس لیے پیر و مرشد کی شکل دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اور حکم دیا جائے۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”نہیں، کوئی اور حکم نہیں ہے۔ تم فوراً ہی دکن چلے جاؤ۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”کیا ابھی؟ کیا اسی وقت؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”ہاں ابھی...... اسی وقت!“

نظام الدین اسی وقت دکن روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

اورنگ آباد پہنچ کر نظام الدین نے رشد و ہدایت کا کام شروع کر دیا۔ خواجہ گیسو دراز کی رشتے دار خاتون سے آپ نے شادی کر لی۔ خود کو ذکر و فکر میں مشغول کر دیا۔ آپ کا شہرہ ہوا تو آپ کے در پر لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ آپ ان میں شیر و شکر ہو گئے۔ آپ لوگوں کو ہدایتیں بھی فرماتے اور ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے۔

چشتیہ سلسلے میں چونکہ قوالی جائز ہے اس لیے نظام الدین کو بھی اس کا بہت شوق تھا، ملک کے دور دراز خطوں کے لوگ آپ کے پاس پیاس بجھانے آتے اور شاداں و فرحاں واپس جاتے۔

محفلِ سماع برپا تھی اور لوگ مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔ جامی کا کلام سنایا جا رہا تھا۔ آپ پر حالت وجد طاری تھی۔ اسی دوران ایک شخص محفل میں داخل ہوا اور آپ کے قریب بیٹھ گیا۔ محفل میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس شخص سے واقف ہوتا۔ وہ بے باکی سے محفل میں آیا تھا اور بدتمیزی سے آپ کے شانے سے اپنا شانہ بھڑا کر بیٹھ گیا۔

قوالی زور و شور سے جاری تھی۔ اس شخص نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص سے کہا۔ ”جناب! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ قوالی سے ہمیں کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ کیا اس طرح ہمیں لہو و لعب میں نہیں مبتلا کر دیا گیا؟“

مخاطب نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پیر و مرشد نظام الدین پاس ہی بیٹھے ہیں اور وہ سماع کے دوران بات چیت پسند نہیں کرتے۔

اجنبی نے جواب نہ پا کر پھر چھیڑ چھاڑ کی، بولا۔ ”قوالی کے جواز میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھجن کی متبادل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کے بعض صوفیاء اور خاص کر خواجہ معین الدین چشتی نے برصغیر کے ہندوؤں میں جب یہ دیکھا کہ وہ بھجن سے بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں اور ان کے دل و دماغ پر بھجن اور بھجن گانے والے کی خوش الحانی کا خاص اثر ہوتا ہے تو اس کی جگہ قوالی کو رائج کیا گیا اور جب قوال حقانی یا معرفت کا کلام اپنے مخصوص انداز اور آواز میں سناتے ہیں تو سماع پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ غلط ہے کیونکہ قوالی کے رواج کا محض ہندوستان سے ہی تعلق نہیں، یہ ایران اور عراق عرب میں بھی رواج پا چکی ہے۔“

کسی نے اس اجنبی کی بات کا پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر وہ عاجز ہو گیا، بولا۔ ”کیا تم سب گونگے ہو گئے ہو، میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے...... یا پھر تمہاری خاموشی کا یہ مطلب لوں کہ تم لوگ میری بات کی صداقت تسلیم کر چکے ہو۔“

نظام الدین کو اس شخص کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! یہ محفل سماع ہے۔ تو خاموش کیوں نہیں رہتا؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”اگر آپ کے پاس میری باتوں کا کوئی جواب ہے تو مرحمت فرما دیں، میں خاموش ہو جاؤں گا۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”میرے پاس تیرے ہر سوال اور ہر اعتراض کا جواب ہے لیکن یہ وقت سوالوں اور اعتراضوں کے جواب کا نہیں ہے۔ پھر کسی وقت آ جانا، میں تجھے مطمئن کر دوں گا۔“ پھر پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”عبدالغنی!“

آپ نے فرمایا۔ ”تو غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ تیرا نام عبدالغنی نہیں ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”پھر کیا ہے میرا نام؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نام تیرا ہے تو تو ہی بتائے گا بھی!“

اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام جو تھا، بتا دیا، میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں کب یہ کہہ رہا ہوں کہ جھوٹ بول۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے باتیں کر کے تو اپنی ذمے داریوں کو پورا کر، ورنہ خواہ مخواہ کی لن ترانیاں فضول ہیں۔“

وہ شخص جز بز ہو کر چلا گیا۔ آپ نے حاضرین سے پوچھا۔ ”اس اجنبی کو اس محفل میں کون لایا تھا؟“

کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ”کوئی بھی نہیں، یہ شخص اپنے طور پر آیا تھا۔“

کافی دنوں بعد وہی شخص دوبارہ آ گیا لیکن اس دن قوالی نہیں ہو رہی تھی۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ”تو نے اس روز اپنا کیا نام بتایا تھا...... عبدالغنی؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں عبدالغنی بتایا تھا، کیوں کیا آپ کو میرے نام پر کسی قسم کا اعتراض ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”مجھے اعتراض کا کوئی حق نہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ فقیروں سے جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں، تیرا نام عبدالغنی ہرگز نہیں ہو سکتا، کچھ اور ہے۔“

اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ نے بجا فرمایا۔ واقعی میرا نام عبدالغنی نہیں، عبداللہ ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جہاں تک میں جانتا ہوں تیرا یہ نام بھی نہیں، تو مسلسل جھوٹ بولے جا رہا ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، اب میں تو آپ سے بات کر نہیں سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، اس طرح نہیں سوچتے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دن جو باتیں تو کر رہا تھا انہیں ایک دن میرے سامنے بھی بیان کر دے کہ میں اس کا مدلل جواب دے سکوں۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! میں نے کہہ جو دیا، اب میں یہاں ایک بات بھی نہیں کروں گا کیونکہ میرے دل و دماغ میرے اس خیال کو تکذیب میں ڈال رہے ہیں۔ اب میں کس منہ سے آپ سے بات کروں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تیرے سوالوں کے جواب میں دوں گا تاکہ تو مطمئن ہو جائے۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں تو اسی دن مطمئن ہو گیا تھا، آج اس لیے آیا ہوں کہ اس دن کی گستاخی کی آپ سے معافی مانگ لوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اب تو میرا پیچھا چھوڑ دے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! یوں کام نہیں چلے گا۔“

آپ نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میری باتیں غور سے سن، تو نے پہلی بار اپنا نام عبدالغنی بتایا تھا مگر اس کے بعد تو عبداللہ ہو گیا۔ افسوس کہ تو نے جھوٹ سے توبہ نہیں کی۔ تیرا نام نہ تو عبدالغنی ہے اور نہ عبداللہ۔ تیرا نام تو عبدالحیٔ ہے، فقیروں سے کیا پردہ۔“

وہ شخص شرمندہ ہو کر آپ کے قدموں میں گر گیا اور اپنے جھوٹ کی معافی مانگنے لگا۔

آپ نے فرمایا۔ ”جا، میں نے تو تجھ کو معاف کر دیا مگر آئندہ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔ میری ایک بات یاد رکھنا، جس چیز کے بارے میں تجھے علم حاصل نہ ہو، اس پر زبان نہ کھولنا۔ جن لوگوں نے تصوف میں اپنی زندگیاں گزار دیں، اس بارے میں ان کا علم زیادہ ہو گا یا وہ جنہیں اس کی ابجد کا بھی علم نہیں۔“

وہ شخص شرمندگی اور ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلیاں دیں۔ تب کہیں عبدالحیٔ کے ہوش و حواس قابو میں آئے۔

☆☆☆

ان دنوں دہلی میں بڑی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ امراء اور سردار آپس ہی میں جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ ان حالات میں ایک تورانی امیر قمرالدین علی خان کو دکن کی تسخیر کا خیال آیا۔ یہ امیر دکن میں ایک طاقت ور حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں فقراء کی دعائیں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ نظام الدین کے پیر و مرشد کلیم اللہ جہان آبادی کی خدمت میں گیا اور مدعا بیان کیا، بولا۔ ”حضرت! دہلی اور اس کے مضافات میں جو انتشار اور بدامنی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالات ابھی اور زیادہ خراب ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں مغلیہ سلطنت کی بوسیدہ دیواروں کے مقابل دکن میں ایک مضبوط حصار کھڑا کر دیا جائے جہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو پناہ مل جائے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ وہاں ایک اسلامی حکومت قائم کی جائے۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”پھر یہ حکومت کس طرح قائم کی جا سکتی ہے؟“

قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں نے انسانوں کی فوج تو تیار کر لی ہے، آپ کے پاس دعاؤں کا لشکر لینے آیا ہوں۔ اگر آپ کی دعائیں اور میری فوج مل کر دکن پر حملہ آور ہوں گی تو میری فتح یقینی ہو جائے گی۔“

شیخ سوچ میں پڑ گئے، وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگے۔ قمرالدین علی خان کو شبہ ہوا کہ شاید انہیں ٹال دیا جائے گا۔ فوراً شیخ کے دونوں ہاتھ فرطِ عقیدت سے پکڑ لیے اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں جو کچھ چاہتا ہوں، اس سے مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود مقصود ہے۔ امید ہے آپ اس عاجز کو مایوس نہیں کریں گے۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”دکن کی ولایت تو نظام الدین کے حوالے کی جا چکی ہے، وہی کچھ کر سکتا ہے۔“

قمرالدین علی خان نے کہا۔ ”وہ بھی آپ ہی کے ایما اور سفارش پر کچھ کریں گے۔ میں تو آپ کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا، کچھ نہ کچھ لے کر ہی جاؤں گا۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”میں نظام الدین سے تیری سفارش کر دوں گا، کام وہی کرے گا۔“

قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”آپ جو مناسب سمجھیں کریں، میں نہیں جانتا۔“

شیخ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ ”ایک ٹھیکری تو دینا۔“

شیخ کو ٹھیکری دے دی، آپ نے اس پر سیاہ روشنائی سے لکھ دیا۔ ”نظام الدین! کتا آ رہا ہے ہڈی ڈال دو۔“

قمرالدین علی خان نے اپنی فوج اور سفارش کے ساتھ دکن پر چڑھائی کر دی۔ اس عالم میں اورنگ آباد پہنچے اور نظام الدین کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ شیخ نظام الدین کے در پر ایک خادم نے قمرالدین علی خان کو روک لیا اور پوچھا۔ ”آپ کا ان سے کیا کام ہے؟“

قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں دہلی کے شیخ کلیم اللہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ میں تمہارے شیخ کے نام ایک سفارشی ٹھیکری لے کر آیا ہوں۔“

خادم نے کہا۔ ”اس وقت پیر و مرشد کھانا تناول فرما رہے ہیں، آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“

قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں انتظار کر لوں گا مگر تم یہ خبر اندر تو پہنچا دو۔“

خادم اندر چلا گیا۔ اس وقت تک آپ نے چند لقمے ہی کھائے تھے، خادم نے کہا۔ ”حضرت! ایک شخص حضرت کلیم اللہ کی سفارشی ٹھیکری لے کر آیا ہے اور باریابی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

آپ نے فوراً حکم دیا۔ ”اسے فوراً اندر لاؤ۔ اس کو دروازے پر روکا ہی کیوں۔ فوراً اندر بلا لو۔“

خادم نے اسی وقت قمرالدین علی خان کو نظام الدین کے روبرو پہنچادیا۔ شیخ نظام نے پوچھا۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا؟“

قمرالدین علی خان نے ٹھیکری ان کی طرف بڑھادی۔ شیخ نظام نے ٹھیکری کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور خوشی سے پوچھا۔ ”ہاں تو تم میرے پیرومرشد کے پاس سے آرہے ہو؟“

قمرالدین علی خان نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہیں سے آرہا ہوں۔“

شیخ نظام نے دسترخوان پر سے سات روٹیاں لے کر اس پر ایک ہڈی رکھ دی اور قمرالدین علی خان کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے کھانا کھالو، اس کے بعد بات کروں گا۔“

قمرالدین علی خان نے شکم سیر ہوکر کھانا کھایا اور چپ چاپ مؤدب بیٹھ گئے۔

شیخ نظام نے پوچھا۔ ”اور کچھ یا بس؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”بس۔ اب حاجت نہیں رہی۔“

شیخ نظام نے پوچھا۔ ”ہاں تو اب اپنا مطلب بیان کرو۔“

انہوں نے کہا۔ ”حضرت! ہندوستان میں ایک افراتفری مچی ہوئی ہے۔ مغلیہ سلطنت روبہ زوال ہے۔ میں چاہتا ہوں دکن میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کروں۔ فوج میرے پاس ہے دعاؤں کی ضرورت ہے جو آپ سے ملے گی۔ پیرومرشد شیخ کلیم اللہ نے یہ کام آپ کے سپرد فرمادیا ہے۔ نظرِ کرم کا امیدوار ہوں، بس اسی لیے حاضری دی ہے۔“

شیخ نظام نے اپنے زرد پیراہن کا ایک حصہ پھاڑ کر قمرالدین علی خان کے سر پر باندھ دیا اور کہا۔ ”آج سے تو نظام ہے، اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کردے۔“

قمرالدین وہاں سے خوشی خوشی اٹھ کر اپنی فوج میں گئے اور دکن پر لشکرکشی شروع کردی۔ گھمسان کا رن پڑا اور قمرالدین نے فتح پائی اور انہوں نے نظام الملک آصف جاہ کا لقب اختیار کیا اور شاہی لباس میں زرد رنگ کی دستار کو اپنا طرۂ امتیاز بنالیا۔

کچھ عرصے بعد مبارز خان نے آصف جاہ کے خلاف بغاوت کردی۔ آصف جاہ نے پریشانی میں ایک بار پھر شیخ نظام سے رجوع کیا اور پورا واقعہ بتا کے درخواست کی۔ ”حضرت! میں جو کچھ بھی کررہا ہوں، مسلمانوں کے لیے کررہا ہوں لیکن افسوس کہ مسلمان ہی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟“

آپ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”تم مبارز خان کا مقابلہ کرو۔ وہ ناکام رہے گا، کامیابی تمہاری قسمت میں لکھی گئی ہے۔“

آصف جاہ نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں چاہتا ہوں مجھے کوئی ایسی بین علامت فتح مل جائے جس سے میں مطمئن ہوجاؤں اور پریشان خاطری دور ہوجائے۔“

شیخ نظام کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”نظام! کل جمعرات ہے، تم اپنے ڈیرے پر غور کرنا۔ ایک صندلی پنجہ ظاہر ہوگا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ فتح تمہاری ہے۔“

آصف جاہ اپنی فوج میں واپس چلا گیا، وہ کسی حد تک مطمئن ہوچکا تھا۔ دوسرے دن جمعرات تھی۔ آصف جاہ اپنے خیمے میں جم کر بیٹھ گیا، اس کی نظریں خیمے کی دیواروں پر جمی ہوئی تھیں۔ دوپہر تک اسی صندلی پنجے کی جستجو میں رہا۔ آخر ظہر کے وقت یہ پنجہ خیمے کی دیوار پر سائے کی طرح نمودار ہوا۔ آصف جاہ مارے خوشی کے سجدے میں گر گیا۔ جو لوگ اس وقت خیمے میں تھے وہ آصف جاہ کی اس حرکت سے پریشان ہورہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ ”حضرت! یہ سجدہ کس خوشی میں ہورہا ہے؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”کیا تم لوگ خیمے کی اس دیوار پر کچھ دیکھ رہے ہو؟“

اب سبھی اس پنجے کی طرف دیکھنے لگے اور سبھی نے متفقہ آواز میں کہا۔ ”ہاں، ہم سب دیوار پر ایک پنجے کا سایہ سا دیکھ رہے ہیں مگر یہ پنجہ ہے کس کا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”یہ میری فتح کا پنجہ ہے، میری کامیابی کی علامت ہے۔“

آصف جاہ کی باتیں کسی پاگل کی بڑ لگ رہی تھیں مگر وہ بے حد خوش تھا۔ اس کے بعد آصف جاہ اور مبارز خان کی فوجیں ٹکرائیں، لاشیں گرنے لگیں، خون برسنے لگا، زخمیوں کی چیخ و پکار نے میدانِ کارزار کو عرصۂ حشر بنادیا۔ شام تک مبارز خان کی فوجیں پسپا ہوکر راہِ فرار اختیار کررہی تھیں اور آصف جاہ کی سپاہ ان کا پیچھا کررہی تھیں۔ جب فتح مکمل ہوگئی تو نظام الملک آصف جاہ نے شیخ کے دربار میں حاضری دی اور ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

پھر آصف جاہ دکن کے نظم و نسق میں مشغول ہوگیا۔ کافی عرصے بعد وہ اس حال میں شیخ کی خدمت میں پہنچا کہ گاڑیوں پر روپے لدے ہوئے تھے اور مویشیوں کی پشت پر کپڑے کے تھان رکھے تھے۔ آصف جاہ نے انہیں شیخ نظام کی بارگاہ کے باہر کھڑا کردیا اور خود

اندر شیخ کی خدمت میں پہنچا۔

شیخ نظام نے مسکرا کر اس دنیادار کو دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے..... کوئی اور حاجت؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! آج میں آپ سے یہ اجازت لینے آیا ہوں کہ اس جگہ جہاں آپ سکونت پذیر ہیں، آپ کے لیے ایک شان دار محل تعمیر کرادوں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”اگر تم محل کی تعمیر کا کام آج ہی سے شروع کرادو تو اس میں کتنا وقت صرف ہوگا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”تقریباً دو سال مگر آپ کو اس کی کیا فکر؟“

شیخ نے پوچھا۔ ”اور اس میں کتنا روپیا صرف ہوگا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں مگر میں نے تو یہ تہیہ کرلیا ہے کہ جتنا بھی روپیا صرف ہوگا میں خرچ کروں گا اور حضرت کی شایانِ شان آستانہ تعمیر کرادوں گا۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”آصف جاہ! اگر تو چاہتا ہے کہ میں خوش ہوجاؤں تو وہ سارا روپیا میری خانقاہ کے باہر اس کے چبوترے پر ڈھیر کردے، میں اس سے خوش ہوجاؤں گا۔“

نظام الملک نے باہر نکل کر گاڑیوں پر سے روپیا اتروا کر چبوترے پر ڈھیر کرادیا۔ سورج کی روشنی میں روپوں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ آصف جاہ اندر گیا اور شیخ کو مطلع کیا۔ ”حضرت! آپ کے حکم کے بموجب روپے کا ڈھیر چبوترے پر لگا دیا گیا ہے، ایک نظر ملاحظہ بھی فرمالیں۔“

شیخ نظام اپنی جگہ سے اٹھے اور خانقاہ کے باہر تشریف لے گئے۔ وہاں چبوترے پر بہت سارا روپیا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مریدوں کو حکم دیا۔ ”جاؤ اور بازاروں اور گلی کوچوں میں جاکر یہ اعلان کردو کہ شیخ نظام فقرا اور مساکین کو کچھ دینا چاہتا ہے، وہ میری خانقاہ کے در پر آجائیں اور اپنا حصہ لے جائیں۔“

مریدوں نے شیخ کا یہ پیغام گلی گلی اور بازار بازار پہنچا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فقراء اور مساکین کا جم غفیر خانقاہ کے در پر اکٹھا ہوگیا۔ شیخ نے سارے روپے اسی وقت تقسیم کرنا شروع کردیے، آصف جاہ اس منظر کو بڑی دلچسپی اور عقیدت سے دیکھتا رہا۔ جب سارا روپیا تقسیم ہوگیا تو پوچھا۔ ”حضرت! یہ آپ نے کیا کیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ جو کچھ کیا آپ کی نظروں کے سامنے کیا، پھر یہ سوال کیسا؟“

آصف جاہ نے کہا۔ ”میری خواہش تھی کہ میں آپ کے لیے ایک شاندار محل تعمیر کراؤں مگر آپ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ پتا نہیں کیوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو اتنی ساری رقم کو دو سال تک خرچ کرتا رہتا اور پھر کہیں ایک محل تعمیر کراتا لیکن تو نے دیکھا میں نے ذرا سی دیر میں کئی شاندار محل تعمیر کراڈالے۔ بابا! ہم درویش لوگ اپنی کٹیوں ہی میں اچھے لگتے ہیں، محل تو نوابوں اور بادشاہوں کے لیے ہوتے ہیں۔“

آصف جاہ کا دل بھر آیا، وہ رونے لگا۔ آہستہ سے کہا۔ ”قربان جایئے اس سادگی اور سخاوت کے..... حرص اور طمع کو آپ نے زیر کرکے پوری دنیا کو اپنا مطیع و منقاد کرلیا ہے، سبحان اللہ۔“

اس کے بعد آصف جاہی خاندان میں یہ دستور ہوگیا کہ جب خانقاہ میں عرس ہوتا تو خانقاہ کی طرف سے حکمراں نواب کو جو تبرک بھیجی جاتی، اس میں سات روٹیاں اور ان پر ایک ہڈی رکھی ہوتی۔ یہ دونوں چیزیں ایک زرد رنگ کے کپڑے میں رکھ کر باندھ دی جاتیں۔ اس کے بعد جو حکمراں نواب آپ کی خانقاہ میں آتا تو اس کے سر پر زرد رنگ کا کپڑا بندھا ہوتا۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں میں ایک صاحب تھے سعید بیگ۔ آپ سعید بیگ پر بے حد مہربان تھے اور بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ صاحب ہر روز بڑی پابندی سے آیا کرتے تھے لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ سعید بیگ غائب رہنے لگے۔

جب سعید بیگ کی غیر حاضری کو ایک ہفتہ گزر گیا تو شیخ نے دوسرے مریدوں سے پوچھا۔ ”لوگو! کیا بات ہے؟ یہ سعید بیگ کہاں غائب ہوگیا، کچھ اس کا بھی کسی کو پتا ہے؟“

کئی مریدوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”سعید بیگ معلوم نہیں کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اگر شیخ کا حکم ہو تو اس کے گھر جاکر اس کی خیر خبر لے آئیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، میرا خیال ہے تم میں اس وقت بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے جو سعید بیگ کی پریشانیوں سے واقف ہے۔“

ایک مرید نے عرض کیا۔ ”پیرومرشد بجا فرماتے ہیں۔ میں سعید بیگ کی پریشانیوں سے واقف ہوں اگر حکم ہو تو بیان کردوں۔“

شیخ نے حکم دیا۔ ”بیان کرتا کہ اس کا علاج کیا جائے۔“

مرید نے عرض کیا۔ ''پیرومرشد! سعید بیگ جس محلے میں رہتے ہیں، اس کے متصل ایک دوسرے محلے میں ایک جوگن رہتی ہے۔ یہ نہایت حسین مگر سنگ دل عورت ہے۔ سعید بیگ نے اس کو معلوم نہیں کہاں دیکھا تھا کہ دل دے بیٹھے۔ کئی بار اس کے در پر حاضری بھی دی اور جوگن سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی مگر وہ اتنی سخت دل اور بے نیاز ہے کہ سعید بیگ پر کوئی توجہ ہی نہیں دیتی۔ اس کی بے التفاتی اور بے نیازی سعید بیگ کے لیے جان لیوا ہو رہی ہے۔ شاید اسی لیے سعید بیگ یہاں بھی نہیں آ رہے ہیں۔''

شیخ نے اسی مرید کو حکم دیا۔ ''اچھا اب تو سعید بیگ کے گھر چلا جا اور اس کو بتا دے کہ میں نے اس کو طلب کیا ہے۔''

مرید نے پوچھا۔ ''اسی وقت یا کسی بھی وقت؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اسی وقت کیونکہ اس نازک وقت میں فوری دستگیری درکار ہے۔''

مرید بھاگا بھاگا سعید بیگ کے گھر پہنچا اور بہ آوازِ بلند اعلان کیا۔ ''سعید بیگ! تم اسی وقت میرے ساتھ شیخ کے پاس چلو، وہ تمہیں یاد فرما رہے ہیں۔''

سعید بیگ نے پوچھا۔ ''مجھ سے شیخ کا کوئی خاص کام؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''شیخ کو تیرے معاشقے کا علم ہو چکا ہے، شاید وہ اس سلسلے میں تیری مدد کریں۔''

سعید بیگ اسی وقت مرید کے ساتھ ہو لیا۔ شیخ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ جیسے ہی شیخ کے سامنے پہنچے، شیخ نے پوچھا۔ ''ارے سعید بیگ! تیرا کیا حال ہے؟ میں تیری بابت کیا سن رہا ہوں؟''

سعید بیگ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے، جواب دیا۔ ''حضور! ہنگام دستگیری وقت عنایت است'' (حضور! یہ مدد کا وقت ہے، کچھ وقت عنایت ہوا ہے)

آپ نے پوچھا۔ ''اس جوگن میں تجھ کو کیا نظر آ گیا ہے؟''

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں کیا نظر آ گیا۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔ میرے دل و دماغ پر اس کا قبضہ ہے۔ سوتے جاگتے اسی کا خیال اور اسی کا تصور طاری رہتا ہے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''اور اس کا کیا حال ہے؟''

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ''جو میرا حال ہے، وہ اس کا نہیں ہے۔ اگر میں اس کے پاس چلا جاؤں تو شاید وہ مجھ پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرے۔ وہ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''تو گویا یہ یک طرفہ عشق ہے؟''

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ''جی پیرومرشد! یہ یک طرفہ عشق ہے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم اس کے عشق سے باز آ جاؤ؟''

سعید بیگ نے رو، رو کر عرض کیا۔ ''جو اس کے عشق میں مزہ ہے اور دل کو جو لذت اور سرور حاصل ہو رہا ہے، میں اس سے دستبردار ہونے کے بجائے موت سے ہم آغوش ہو جانا بخوشی گوارا کر لوں گا۔''

شیخ نے کہا۔ ''بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ تمہیں ایسی بات نہیں کرنا چاہیے۔''

سعید بیگ کے زخم خوردہ دل پر اور چوٹ لگی، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''حضرت! میرے حق میں دعا کیجیے کہ مجھے موت آ جائے۔ میں اپنی زندگی سے ذرا بھی خوش نہیں۔ ناکام اور نامراد رہ کر زندگی گزارنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''زندگی خدا کا عطیہ ہے، اس کو ختم کرنے کی خواہش کفرانِ نعمت ہے۔ اس سلسلے میں میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''

سعید بیگ نے مایوسی سے کہا۔ ''حضرت! میں تو آپ کے پاس استعانت کی آرزو لے کر حاضر ہوا تھا اور آپ ہی مجھے مایوس کر دینا چاہتے ہیں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں، خدا سے مدد کی دعا کر، ضرور کامیاب ہو جائے گا۔''

سعید بیگ نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال یہ تھا کہ اگر آپ میرے حق میں دعا فرما دیں گے تو میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''مگر وہ جوگن کہتی کیا ہے؟''

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ''وہ کہتی تو کچھ بھی نہیں، وہ نہ تو میری طرف دیکھتی ہے اور نہ ہی مجھ سے بات کرتی ہے، حالانکہ دوسرے کئی جو اس کی چاہت میں آتے ہیں، ان سے باتیں بھی کرتی ہے اور ان کی طرف دیکھتی بھی ہے۔''

شیخ نے خلافِ معمول حکم دیا۔ ''اچھا اب تو جا سکتا ہے، پھر کسی دن آ جانا۔''

اس کے بعد سعید بیگ چلا گیا۔ حاضرین پر سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ شیخ نے مریدوں سے کہا۔ ''میں تو لوگوں کو عشقِ حقیقی کی

طرف دعوت دیتا ہوں اور سعید بیگ یہ چاہتا ہے کہ میں عشقِ مجازی میں اس کی مدد کروں، بھلا یہ کیونکر...... زمانہ کیا کہے گا، دنیا کیا کہے گی۔"

جب چار مرید اکٹھا ہوئے اور شیخ نظام اپنے حجرے میں چلے گئے تو ایک نے دوسرے مریدوں سے سرگوشی میں کہا۔ "پیرومرشد نے سعید بیگ کو مایوس کر کے اس کا دل توڑ دیا، اس پر رحم آتا ہے۔ سوچو، اس کی کس طرح مدد کی جاسکتی ہے۔"

ایک دوسرے مرید نے جواب دیا۔ "پیرومرشد کو بہلا پھسلا کر اس جوگن کے گھر لے جایا جائے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہوگئے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ سعید بیگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو۔"

تیسرا مرید بولا۔ "لیکن پیرومرشد کو وہاں تک کس طرح لے جایا جائے؟"

جس نے یہ مشورہ دیا تھا، بولا۔ "میرا دماغ اپنا کام کر رہا ہے، شاید میں پیرومرشد کو وہاں تک لے جانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔"

کئی مریدوں نے فرطِ خوشی میں نعرہ لگایا۔ "پیرومرشد زندہ باد۔"

کئی دن بعد ایک مرید شیخ نظام کے تخلیہ میں گیا اور رو رو کر عرض کیا۔ "حضرت! اب تو سعید بیگ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ کیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں اس کے حق میں مستقلاً دعا کرتا رہتا ہوں۔"

مرید نے درخواست کی۔ "اگر مرشد جوگن کے گھر تک تشریف لے چلیں تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا اور میرا دل کہتا ہے کہ سعید بیگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا۔"

آپ نے پوچھا۔ "کیا سعید بیگ نے یہ خواہش کی ہے؟"

مرید نے جواب دیا۔ "نہیں یہ ہماری خواہش ہے، ہم سب کی خواہش ہے۔"

آپ کچھ سوچنے لگے، پھر فرمایا۔ "سعید بیگ بھی آخر کیا کرے، عشق تو آخر عشق ہے اور عشق ایک ایسی آگ ہے جس میں بہت کچھ جل جاتا ہے۔ میں سعید بیگ کی ضرور مدد کروں گا۔"

شیخ کے اس جواب نے مریدوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی، ان سب نے موقع غنیمت جانا اور اسی وقت شیخ کو تیار کرا کر جوگن کے پاس چلے۔ راستے میں کہا۔ "بھائی! میری سمجھ میں یہ بات تو آتی نہیں کہ ایک تیسرے درجے کی عورت نے آخر وہ کونسا جادو کر دیا ہے کہ سعید بیگ کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔"

ایک مرید نے عرض کیا۔ "حضرت! میں تو اس کو اسی حال میں دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اس عشق کے طفیل اس میں جو جذب وکیف پیدا ہوگیا ہے، وہ بہت کام کی چیز ہے۔"

شیخ نے کہا۔ "ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ سعید بیگ نے اس تیسرے درجے کی عورت سے عشق کیوں کیا؟"

ایک مرید نے جواب دیا۔ "حضرت! یہ وقت میرے خیال میں کیوں اور کیا کا نہیں ہے۔"

شیخ خاموش ہوگئے۔ کچھ دیر بعد لوگ جوگن کے در پر پہنچ گئے۔ اندر جوگن کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ دیوانہ وار باہر آگئی اور شیخ کے قدموں کو بوسہ دیا۔

شیخ نے اس حسین عورت کو بڑے غور سے دیکھا اور دل ہی دل میں اس کے حسن کا اعتراف کرلیا پھر جوگن سے پوچھا۔ "اے عورت! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تجھ میں یہ گھمنڈ کیوں ہے اور کیا تو غرور اور گھمنڈ کے انجام سے بھی واقف ہے؟"

جوگن نے جواب دیا۔ "حضرت! بات یہ ہے کہ اس زمین پر جو بھی آیا، بالآخر زمین کے اندر چلا گیا۔ مجھے اپنی کسی چیز پر بھی کوئی غرور نہیں۔ میں اپنے اور اپنے حسن کے فانی ہونے کا اقرار کرتی ہوں۔"

شیخ نے پوچھا۔ "کیا تو میرے مرید سعید بیگ سے واقف ہے؟"

جوگن نے جواب دیا۔ "پتا نہیں واقف ہوں یا نہیں۔ اگر وہ صاحب میرے سامنے لائے جائیں تو شاید میں کوئی جواب دے سکوں۔"

کسی مرید نے کہا۔ "جوگن! تو نے پیرومرشد کو بٹھایا نہیں، یہ کھڑے کھڑے باتیں کرنے کا سبب؟"

جوگن گھبرا گئی، بولی۔ "معاف کیجیے گا، یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔" اس کے بعد وہ شیخ کو اندر لے گئی اور بڑے احترام سے بٹھا کر خود سامنے کھڑی ہوگئی۔

مریدوں کا خیال تھا پیرومرشد سعید بیگ کی بابت کچھ اور باتیں بھی کریں گے مگر آپ نے پھر کوئی بات نہیں کی اور کچھ دیر بعد یوں ہی واپس چلے آئے۔ آپ کے اس طرزِ عمل سے دوسروں کو بڑی مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن سعید بیگ نے شیخ کی خدمت میں حاضری دی، آپ نے سعید بیگ کو حکم دیا۔ "سعید بیگ! اپنی جوگن سے آج ضرور

مل لینا، اس نے تمہیں بلایا ہے۔“

سعید بیگ نے شیخ سے تو کچھ بھی نہیں پوچھا، مریدوں سے ضرور سوال کیا۔ ”کیا پیرومرشد نے جوگن سے کسی قسم کا وعدہ لے لیا ہے؟“

ایک مرید نے جواب دیا۔ ”میں تو جوگن کے پاس ہی موجود رہا۔ میرا خیال ہے وہاں تو ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ جوگن نے شیخ سے کب یہ کہہ دیا تھا کہ سعید بیگ کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔“

سعید بیگ نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ”اگر میں شیخ کے حکم کے بموجب وہاں چلا بھی جاؤں تو پتا نہیں وہ جوگن مجھ سے کیا سلوک کرے اور یہ کہ مجھ سے بات بھی کرے یا فوراً ہی نکال باہر کرے۔“

ایک دوسرے مرید نے کہا۔ ”جب پیرومرشد نے وہاں جانے کا حکم دے ہی دیا ہے تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔“

سعید بیگ اسی وقت جوگن کے پاس روانہ ہوگئے۔ جب یہ جوگن کے گھر پہنچے تو وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ سعید بیگ کو دیکھتے ہی بولی۔ ”میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی، دیر کہاں کردی؟“

سعید بیگ نے ایسا محسوس کیا گویا جوگن سے ان کی بڑی بے تکلفی ہے اور وہ سالوں سے ملتے جلتے چلے آرہے ہیں۔ سعید بیگ نے جواب دیا۔ ”میں پیرومرشد کے پاس گیا ہوا تھا اور وہیں سے تمہارے پاس آرہا ہوں۔“

جوگن نے کہا۔ ”تب پھر مجھے بھی اپنے پیرومرشد کے پاس لے چلو۔“

سعید بیگ نے پوچھا۔ ”کب؟“

جوگن نے جواب دیا۔ ”ابھی۔“

سعید بیگ جوگن کو لے کر پیرومرشد کے پاس چلے گئے۔ شیخ نظام نے ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا؟“

جوگن نے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھ کو بیعت کرلیجیے اور یہ کہ میں اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری اس مشکل کو آسان کردیں۔“

شیخ نے اسی وقت جوگن کو بیعت کرلیا اور سعید بیگ سے اس کا نکاح پڑھا دیا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً اور اچانک ہوا تھا، کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

آپ نے سعید بیگ سے پوچھا۔ ”سعید بیگ! تجھ کو تیرا گوہر مقصود مل گیا لیکن اب میرے پاس آنا جانا نہ چھوڑ دینا۔“ پھر جوگن سے کہا۔ ”اور تو بھی اس نیک اور شریف مرد کی مطیع وفرماں بردار رہے گی۔ اس کا بڑا خیال رکھنا۔“

جوگن نے جواب دیا۔ ”میں تو انہیں نعمت سمجھ کر قبول کر رہی ہوں، پھر کفرانِ نعمت کا ارتکاب کیوں کروں گی۔“

سعید بیگ جوگن کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ شیخ کے مریدوں کو بڑی حیرت تھی لیکن اس ملاپ سے خوشی بھی بے حد ہوئی تھی۔

آپ نے ایک عرصے تک لوگوں کی خدمت کی، آپ نے جو انگوٹھی پہن رکھی تھی، اس کے نگین پر کندہ تھا۔

ذکرِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

آپ مصنف بھی تھے اور آپ کی کتاب نظام القلوب نے بڑی شہرت حاصل کی۔ آپ کی خوراک بہت معمولی تھی۔ جو لباس پہنتے تھے، وہ معمولی اور پیوند لگا ہوا ہوتا تھا۔ آپ کے پاس جو کچھ بھی آتا، آپ اسے دوسروں میں تقسیم فرما دیتے۔

آپ عشق کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ بار بار فرمایا۔ ”اے عزیز! کمال عشق چاہیے تاکہ تو اس مقام تک پہنچ جائے جس سے اونچا کوئی اور مقام نہیں۔ یہ عاشقوں کا مقام ہے اور کمال عشق کے بغیر یہ مقام نہیں حاصل ہوتا۔“

آپ یہ بھی فرماتے تھے۔ ”عبادت کے لیے خلو معدہ ضروری ہے اور خاص کر وہ لوگ جو مبتدی ہوں، انہیں اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔“

آپ کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بیاسی سال تک اس عالمِ رنگ و بو کو اپنے فیض سے نوازتے رہے۔ آخر 12 ذیقعد 1242ھ کو بعد نمازِ عشا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

ماخذات

تاریخ مبارک شاہی — یحییٰ بن احمد سرہندی
آثار الصنادید — سرسید احمد خان
تاریخ فرشتہ — محمد قاسم فرشتہ
عہدِ سلاطین دہلی — صلاح الدین ناسک
تاریخ فیروز شاہی — شمس سراج عفیف
طبقاتِ اکبری — نظام الدین احمد



بہروپیا

ابراہیم جمالی

انسان لاکھ بھیس بدلے... رہتا تو انسان ہی ہے۔ یہ اور بات کہ اس کا ضمیر اسے کس کس سانچے میں ڈھلنے پر آمادہ کرتا ہے... رنگ بدلتی دنیا میں وہ بھول گیا تھا کہ فطرت کا یہی کمال ہے کہ ایک رنگ کو دوسرے سے الگ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

کھیل تماشا کرنے والے ایک بہروپیے کا اصل روپ

فقیرے بہروپیے کا بیٹا ملنگی، بڑی حویلی والے شیخ صاحب کے بیٹے کا لنگوٹیا یار تھا۔ بچپن ہی سے ان کا یارانہ چلا آرہا تھا۔ بچپن میں وہ دونوں کچھ عرصے تک مسجد میں بھی ساتھ پڑھتے رہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب شیخوں میں بھی مسجد اور تکیوں کی تکریم پائی جاتی تھی۔ ان کی نظر میں مولوی اور درویشوں کی عزت ہوتی تھی۔ اس وقت وہ خود چنگیری میں روٹی رکھ کر اور اسے اپنی پگڑی کے شملے سے ڈھانپ کر مسجد کے مولوی کے لیے کھانا لے جاتے تھے۔ جب انہیں بخار یا سر میں درد ہوتا تو تکیے کے سائیں سے دم کرانے جاتے......

یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب شیخ صاحب صرف "مٹی ڈھونے والے" تھے یعنی ملبا اٹھانے کا کام کرتے تھے۔

پچیس تیس گدھے، اتنی ہی بوریاں، کام کرنے والے ایک دو مزدور اور پانچ چھ کدالیں اور بیلچے...... شیخوں کی یہی کل مایا تھی۔ کسی کو ملبا اٹھوانا ہوتا تو وہ شیخوں کو بلوا لیتا۔ یہی ان کا روزگار تھا۔ انہوں نے کمیٹی کے داروغہ سے بھی بہتر تعلقات بنائے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ذرا سہولت سے ملبا اٹھانے دیتے تھے۔ پھر وہ سنگ و خشت کے ضرورت مند گاہک کو تلاش کرکے اس کے ہاں ڈال آتے تھے۔

ایک جگہ سے ملبا اٹھا کر دوسری جگہ پہنچانے سے انہیں

اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ قدرے بہتر انداز سے گزر بسر ہو سکے۔لیکن وہ دن بھر مٹی میں مٹی بن کر رہتے تھے۔ منہ، سر، داڑھی، کپڑے اور جوتے خاک سے اٹ جاتے تھے۔ ان دنوں میں انہیں اپنی عقل بھی مٹی معلوم ہوتی تھی۔ لوگ انہیں ”شیخ ملبا“ اور ”شیخ مٹی والے“ کہہ کر پکارتے۔ انہی دنوں میں انہوں نے اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لیے مسجد میں بٹھایا تھا اور مولوی صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گزارش کی تھی۔

”بزرگو! میں تو اس لڑکے کی دنیا سنوارنے کے قابل نہیں۔ آپ مہربانی فرما کر اسے رب کے راستے پر لا کر اس کا دین ہی سنوار دیں۔“

فقیرے بہروپیے نے بھی انہی دنوں میں اپنے بیٹے کو مسجد میں بٹھایا تھا۔ اس طرح بہروپیے کا بیٹا شیخ کے بیٹے کا دوست بن گیا۔ مولوی صاحب پڑھانے کے دوران بھی کسی ضرورت کے تحت اٹھ کر مسجد سے باہر جاتے تو بہروپیے کا بیٹا ملنگی فوراً اٹھ کر ان کی گدی پر بیٹھ جاتا۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک طرف چبوترہ بنا ہوا تھا۔ مولوی صاحب اس چبوترے پر گدی بچھا کر بیٹھتے تھے۔ جوتیوں والی جگہ پر ایک حقہ رکھا رہتا، جس کی لمبی ناڑ مولوی صاحب کے زانوں پر دھری رہتی۔ وہ وقفے وقفے سے اسے اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیتے۔

مولوی صاحب کے مسجد سے باہر جاتے ہی حقے کی ناڑ ملنگی کی بغل میں چلی جاتی۔ وہ دائیں ہاتھ میں کتاب تھام کر اور بائیں ہاتھ سے مولوی صاحب کی چھڑی لہرا کر بھاری آواز میں کہتا۔

”سنو اوئے شیطانو! اگر تم لوگوں نے اپنا سبق یاد کر کے نہیں سنایا تو میں تمہیں مرغا بنا دوں گا...... اور تو سن اوئے شیخ کے سپوت! اگر تو نے سبق نہیں سنایا تو میں نے تیرے باپ کا نکاح توڑ کے تیری ماں سے خود ہی نکاح پڑھا لینا ہے۔ ساتھ حکم شرع شریف کے۔“

اس کی اس نقالی پر بچے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ شیخ ملبا کا بیٹا اس سے چھڑی چھین کر اس کے پیچھے لپکتا اور پھر خود بھی ہنستے ہنستے گر جاتا

پھر اچانک ملبا شیخ کے دن پھر گئے۔

کہتے ہیں کہ ایک جگہ سے ملبا اٹھاتے ہوئے کھدائی کے دوران انہیں خاصے قیمتی زیور ہاتھ لگ گئے تھے۔ کوئی کہتا کہ انہیں زیر زمین طلائی اشرفیوں سے بھری ہوئی دیگ مل گئی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ ان کی لاٹری کھل گئی تھی...... بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ ان کے دن پھر گئے تھے۔ دولت ہاتھ آتے ہی انہوں نے بڑی حویلی خرید لی۔ اس کے ساتھ ہی کپڑے کا کارخانہ بھی لگا لیا۔ پھر انہوں نے فوراً اپنے بیٹے کو مسجد سے اٹھوا کر انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا۔ لیکن بچپن کی محبت اور دوستی اتنی گہری تھی کہ شیخ صاحب کے بیٹے کو جب بھی فرصت ملتی، وہ سیدھا فقیرے بہروپیے کے گھر جا پہنچتا۔

بہروپیا کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا۔ دونوں دوست اس کی بھیس بدلنے والی چیزوں سے کھیلتے رہتے۔

بہروپیے کی کوٹھری کسی عجائب خانے سے کم نہ تھی۔ دیواروں پر مختلف قسم کے بے شمار لباس ٹنگے ہوئے تھے۔ ان میں سادھو سنتوں کے گیروے رنگ کے لباس سے عالم فاضل کے چوغے اور پگڑیاں تک تھیں۔ ریلوے گارڈ کی وردی سے لے کر پولیس افسروں تک کے ڈریس موجود تھے۔ یعنی بھیس بدلنے کے تمام لوازمات وہاں دیکھے جا سکتے تھے۔

شیخ صاحب کا بیٹا اس کوٹھری میں پہنچتے ہی گویا بے خود سا ہو جاتا۔ کبھی وہ سفید داڑھی لگا کر بوڑھا بن جاتا اور کبھی لمبے پراندے والی وگ لگا کر کسی عورت کی طرح مٹکنے لگتا۔ کبھی وہ اور ملنگی چور سپاہی بن کر کھیلتے رہتے۔

”اگر تمہیں بھیس بدلنے کا فن سیکھنا ہے تو پہلے کسی ماہرِ فن کو استاد بناؤ۔“ ملنگی ہنستے ہوئے اس سے کہتا۔ ”کسی اور کو استاد نہیں بناتے تو ہمارے ہی گھٹنے چھو لو۔ پھر تمہارا باپ بھی تمہیں پہچان جائے تو استاد نہ کہنا۔“

”چل اوئے بڑ بولے۔“ شیخ کا بیٹا بھی ہنستے ہوئے جواب دیتا۔ ”پہلے تم اپنے باپ سے تو کچھ سیکھ لو پھر دوسروں کا گرو بننے کا سوچنا۔“

☆☆☆

جب ملنگی کا بہروپیا باپ کئی دنوں کے بعد گھر لوٹا تو اس نے بیٹے کا قد کاٹھ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ اب اسے باپ دادا کا ہنر سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔ پھر وہ جاتے ہوئے اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گیا۔

باپ بیٹا کئی دنوں تک گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرتے رہے۔ اس دوران میں ملنگی اپنے باپ دادا کا کسب حاصل کرتا رہا۔ ساتھ ہی باپ اسے موقع بھی دیتا رہا کہ وہ لوگوں کو اپنے ہنر کے جوہر دکھاتا رہے۔ طویل عرصے تک جہاں نوردی کرنے کے بعد وہ واپس لوٹے تو باپ نے بیٹے کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

”چل بیٹا، تیار ہو جا۔ اب تیری زندگی کا سب سے

اہم وقت آگیا ہے۔ جو کسب تم نے محنت سے سیکھا ہے، وہ اپنے شہر کے لوگوں کو بھی دکھا تا کہ لوگ تمہارے باپ دادا کو یاد رکھیں۔ یاد رکھنا بیٹے! یہ روپ بہروپ سب مالک کی لیلا ہے۔ لیکن جس نے اپنے ہنر اور کسب کی داد اپنے شہر، اپنی جنم بھومی سے حاصل نہیں کی، اس کا فن اور کسب.... بیکار ہے۔ جس کلاکار کے فن کا لطف اس کے اپنے لوگوں نے اٹھایا ہے، اس کے کمالِ فن کو دنیا نے بھی سراہا ہے اور اس کے سر پر عزت اور شہرت کا تاج رکھا ہے۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا...... چل بیٹا! اپنے شہر والوں کو اپنا فن دکھا دے۔ تم پردیسیوں کو تو خوش کرتے آئے ہو۔ اب ذرا اپنوں کو بھی راضی کر لو۔"

ملنگی اپنا کسب دکھانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران میں شیخ کے بیٹے سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ پرانا یار ملا تو وہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔

"یار، دیس دیس گھوم کر آئے ہو۔" شیخ کے بیٹے نے کہا۔ "ہمارے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟"

"شیخ جی! فنکار کے پاس اس کے فن سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ بیچ میں آج کی رات ہے۔ کل چاند چڑھے گا اور پورا جگ دیکھے گا۔" پھر وہ اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لیتے ہوئے بولا۔ "اور ہاں، شیخ جی! اگر آپ کو میرا شاگرد بننا ہے تو لڈو کا تھال اور پگڑی دوپٹا تیار رکھنا۔"

"بس اوئے، بڑا آیا استاد!" شیخ کے بیٹے نے کہا۔ "تم تین چار سال میں ایسا کیا سیکھ آئے ہو جو تمہیں استاد بننے کا شوق چرا رہا ہے۔ ارے بے وقوف! ہم انگریزی اسکول سے پڑھے ہوئے ہیں اور والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ ارے ہم نے اپنے جیسا اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔ اونہہ...... بڑا آیا ہمارا استاد بننے۔ بھلا دکھاؤ تو سہی، کیا کاریگری ہے تمہارے اندر، کون سے گن ہیں تیری کلا میں، کیسے موتی ہیں تمہارے پلے؟"

☆☆☆

اگلے دن شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک خوبرو نوجوان بے خودی کے عالم میں گلی گلی بھٹک رہا ہے۔ بہترین لباس میں ملبوس دراز قد اور وجیہہ نوجوان عشق کی چوٹ کھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کبھی وہ بے خیالی کے عالم میں بڑبڑانے لگتا اور کبھی دیوانوں کی طرح ہنسنے لگتا۔

"ماں باپ کا لاڈلا معلوم ہوتا ہے۔" لوگ اس نوجوان کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔

"انہوں نے اسے بہترین پوشاک اور قیمتی جوتے پہنائے ہوئے ہیں...... لیکن افسوس کہ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ عشق کا مارا لگتا ہے۔"

کسی نے اس نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری واسکٹ بہت سوہنی ہے۔ یہ ہمیں دے دو۔"

"سوہنی" لفظ سنتے ہی نوجوان نہال ہوگیا.... وہ بے خودی کے عالم میں بولا۔ "سوہنی کے نام پر میری جان بھی قربان...... یہ لو۔"

پھر اس نے بلیڈ سے زری والی واسکٹ کا ٹکڑا کاٹ کر اچھال دیا۔

"تمہاری جوتی بہت سوہنی ہے۔" کسی نے ہانک لگائی۔

اس نے دونوں پیروں سے جوتیاں اتار کر اپنی آنکھوں سے لگالیں اور بولا۔ "اگر یہ سوہنی ہیں تو انہیں پیروں میں نہیں پہن سکتا...... میں سوہنی کی ایسی ہتک نہیں کر سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔ پھر وہ جوتی کو اٹھا کر سوہنی کہنے والے کی طرف لپکا اور اسے جوتیاں تھما کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بھٹکتا رہا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں لیکن اسے گویا کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ کہیں بیٹھ جاتا تو بیٹھا ہی رہتا۔ رونے لگتا تو روتا ہی چلا جاتا۔ اس کی صورت، اس کی جوانی اور اس کے حال کو دیکھ کر لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"یارو، جس کا ایسا گبرو جوان بیٹا سودائی ہوجائے، اس ماں کا کیا حال ہوگا؟"

کسی نے کہا۔ "اگر اس کی سوہنی اسے اس حال میں دیکھ لے تو شاید ہیر کی طرح کچھ کھا کر جان دے دے گی۔"

وہ دیوانہ مستانہ سب باتوں سے بے نیاز ایک ہفتے تک شہر کی گلیوں میں خاک اڑاتا رہا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی لیکن کوئی یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ عشق گزیدہ نوجوان آیا کہاں سے ہے۔

☆☆☆

وہ دیوانہ اچانک کہیں غائب ہوگیا اور شہر میں ایک نیا چاند چڑھ آیا۔

سفید دودھیا لباس میں ملبوس ایک خوب صورت نرس گھر گھر جا کر عورتوں سے ملنے لگی۔ اگر وہ گندمی رنگت کی نہ ہوتی تو اسے خاص ولایتی سمجھا جاتا۔ اس کے ناک نقش بھی اسے دیسی ثابت کرتے تھے۔ البتہ اس کی گفتگو سے یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ کسی ولایتی اسپتال میں ٹریننگ لیتی

رہی ہے۔

وہ چہکتی مٹکتی جس طرف سے بھی نکلتی، لوگوں کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتیں۔ اس کے بیگ میں بخار کی گولیاں، کھانسی کا شربت، مرہم اور پٹیاں موجود تھیں۔ آدھی بیماری تو اسے دیکھتے ہی دور ہوجاتی تھی، جب وہ پیار سے کہتی۔

''دیکھو دیری نا ہیں لگتا۔ تم ابھی اچھا ہوتا۔''

ایسے میں روگیوں کو اپنا روگ دور ہوتا محسوس ہوتا۔ کوئی بزرگ خاتون اسے دعا دیتی۔ ''اللہ تمہیں خوش رکھے۔ سر کا سائیں سلامت رہے۔''

یہ سن کر وہ ہنستے ہنستے دہری ہوجاتی اور پوچھتی۔ ''اماں! سر کا سائیں کیا ہوتا ہے؟''

جب اسے اس بات کا مطلب بتایا جاتا تو وہ شرماتے ہوئے بتاتی کہ ابھی اس کا بیاہ نہیں ہوا۔ عورتیں کھی کھی کر کے ہنسنے لگتیں۔

دو چار دنوں میں وہ ''مس صاحبہ'' ہر گھر کی سہیلی بن گئی اور اس کا انتظار کیا جانے لگا۔

☆☆☆

شہر میں خوب صورت اور ملنسار نرس کا چرچہ ہونے لگا۔ ایسے میں شہر کے نئے کوتوال آگئے۔ انہوں نے آتے ہی شہر کی تمام چھابڑیاں اٹھوا دیں۔ ٹھیلے اور تھڑے ہٹوا دیے اور جگہ جگہ موجود گندگی کے ڈھیر صاف کرا دیے۔ شہر بھر کی ایسی صفائی ستھرائی ہوگئی کہ لوگ حیران رہ گئے۔ شہر کے لوگوں کے دلوں میں ان کا رعب بھی بیٹھ گیا تھا۔ اونچے لمبے قد پر وردی انہیں بارعب بناتی تھی۔ ایک دن وہ بازار سے گزرتے ہوئے رک گئے اور لوگوں سے مخاطب ہوئے۔

''یہ رکاوٹ سے پاک کھلی سڑکیں آپ ہی کے فائدے کے لیے ہیں۔ ناجائز تجاوزات سے آپ کی آمد و رفت میں خلل پڑتا ہے۔ گندگی سے آپ کی صحت خراب ہوسکتی ہے۔ آپ لوگ بھی اس بات کا خیال رکھیں اور جگہ جگہ کچرا نہ پھینکیں۔ اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، مکھیوں اور مچھروں کا عذاب بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

اس کے علاوہ چوراچکوں، نوسربازوں اور جیب کتروں سے بھی شہر کو پاک کردیا۔ مطلب یہ کہ جب سے یہ نئے افسر شہر میں آئے تھے ہر طرف امن و امان قائم ہوگیا تھا۔

☆☆☆

شہر کے باتصویر ہفت روزہ نے ''عشق گزیدہ نوجوان، مہربان نرس'' اور ''فرض شناس کوتوال'' کی تصویریں صفحۂ اول پر چھاپیں۔ درمیان میں فقیرے بہروپیے کے بیٹے ملنگی کی پورے قد سے ایک تصویر چھاپی گئی تھی۔ کیپشن میں لکھا تھا۔

''ملنگی ...... فنِ بہروپ کا فنکار!

''ایسے فنکار ہمارے اپنے دیس میں تو کیا دوسرے ملکوں میں بھی کم ہی پائے جاتے ہیں۔''

دوسرے اخباروں نے بھی بہروپ کے فن پر مضامین شائع کیے۔ انہوں نے نامور بہروپیوں کے فن سے ملنگی کی صلاحیت کا موازنہ کیا تھا اور ملنگی کو سب سے بڑا کلاکار قرار دیا تھا۔

پورے شہر میں ملنگی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ جہاں دیکھیے، لوگ اس کی باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ اس کے باپ کو مبارکبادیاں وصول کرنے سے فرصت نہیں تھی۔ پھولوں کے ہار ایک طرف، لوگوں نے باپ بیٹے کو نوٹوں کے ہاروں سے لاد دیا تھا۔

ملنگی اپنے گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالے اور اخبارات کے پرچے ہاتھ میں اٹھائے اپنے یار، شیخ صاحب کے بیٹے سے ملنے چل دیا۔ دونوں دوست ملے تو ملنگی نے کہا۔

''اب لے آؤ پگڑی اور دوپٹا...... لڈوؤں کے تھال کے ساتھ۔ آج ہم تمہیں اپنا شاگرد بنائیں گے۔''

''اتنا تیز مت چلو دوست!'' شیخ صاحب کے بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میدان میں اڑنے والی دھول کو بیٹھ جانے دو۔ ممکن ہے دھول کے بیٹھتے ہی میدان کی دوسری طرف سے کوئی تم سے بھی بڑا پہلوان اور فنکار نمودار ہوجائے۔''

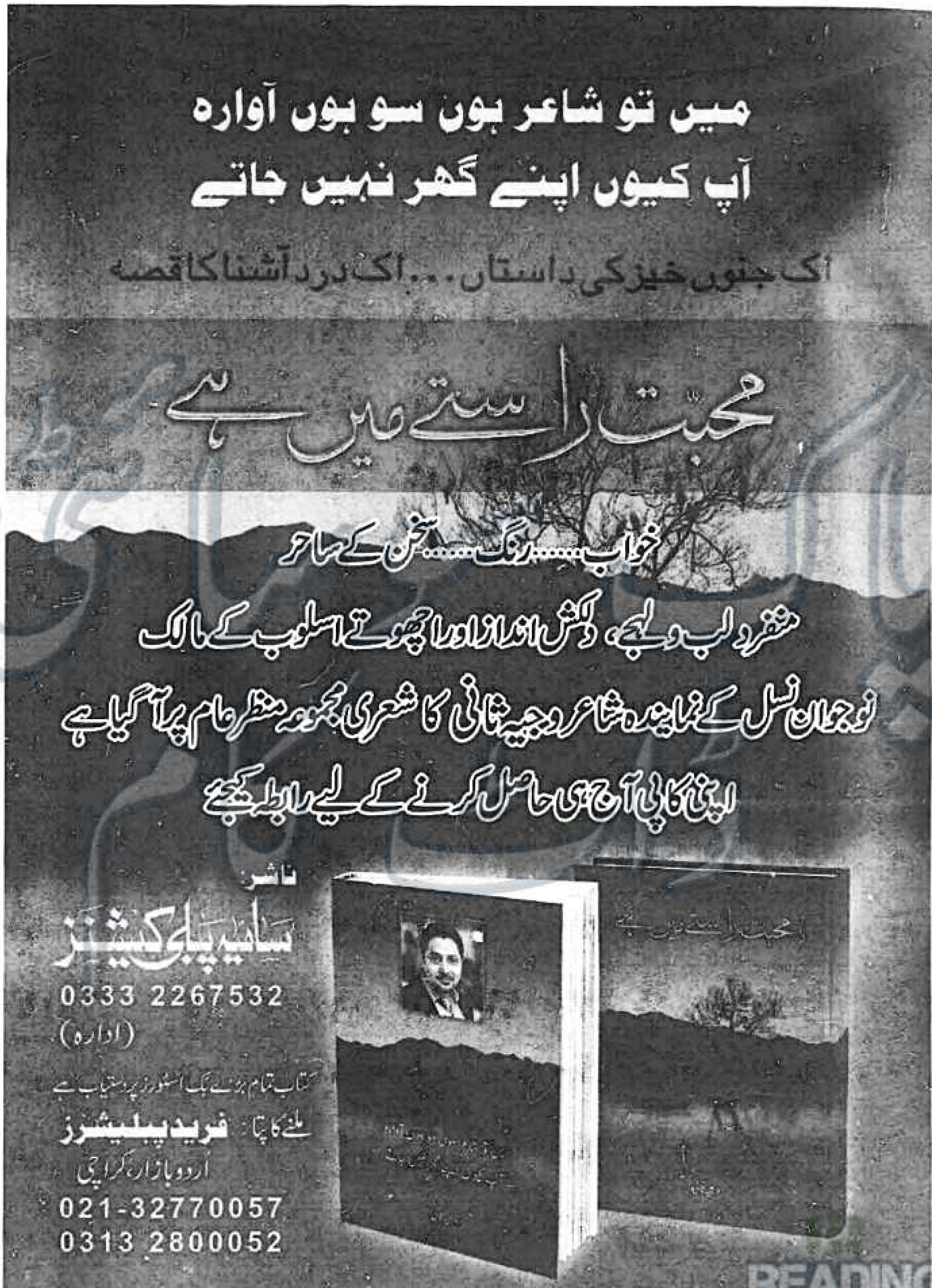
''پہلوان تو بے شک کئی سامنے آسکتے ہیں شیخ جی! لیکن بہروپ کا فنکار ہم سے بڑھ کر نہ ہوگا۔ یہ ہم دعوے سے کہتے ہیں۔'' ملنگی نے یقین سے کہا۔

شیخ جی پھر ہنس دیا۔ ''بڑی باتیں مت کرو پیارے! یہاں ایک سے بڑھ کر ایک فنکار پڑا ہوا ہے۔''

ملنگی نے کہا۔ ''جب تک مجھ سے بھی بڑا فنکار سامنے نہیں آئے گا، میں کیسے مان سکتا ہوں۔''

بہرحال اس شہر میں ہمیشہ باصلاحیت انسان سامنے آتے رہے ہیں۔ مداری کی پٹاری کی طرح اس میں سے نت نئی اور حیران کن ''چیزیں'' نکلتی رہی ہیں۔

ملنگی کے بہروپ کے قصے شہر میں گردش کر ہی رہے تھے کہ الیکشن کا غلغلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف گہما گہمی اور رونق پیدا ہوگئی۔ قد آدم پوسٹروں سے دیواریں سج گئیں۔ جگہ جگہ



میں تو شاعر ہوں سو ہوں آوارہ
آپ کیوں اپنے گھر نہیں جاتے
اک جنوں خیز کی داستان... اک درد آشنا کا قصہ
محبت راستے میں ہے
خواب...... رنگ...... سخن کے ساحر
منفرد لب و لہجے، دلکش انداز اور اچھوتے اسلوب کے مالک
نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر وجیہ ثانی کا شعری مجموعہ منظر عام پر آ گیا ہے
اپنی کاپی آج ہی حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے
ناشر
ساہیہ پبلی کیشنز
0333 2267532
(ادارہ)
کتاب تمام بڑے بک اسٹورز پر دستیاب ہے
ملنے کا پتا: فرید پبلیشرز
اردو بازار، کراچی
021-32770057
0313 2800052

جلسے ہونے لگے، جلوس نکلنے لگے اور نکمے لوگوں کی مصروفیات نکل آئیں۔ وہ بھی کچھ عرصے کے لیے برسرِروزگار ہوگئے۔ انہیں رقوم فراہم کی گئیں کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ جو ان کے پوسٹر اور بینرز اتارنے کی کوشش کرے اسے سبق سکھائیں تاکہ دوبارہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے۔ ان کا دوسرا کام یہ تھا کہ وہ اپنے امیدوار کے جلسوں میں نعرے لگائیں اور خوب شور مچائیں۔

دراصل اس شہر میں الیکشن کے پوسٹر وغیرہ لگانے کے ساتھ ہی یہ انتظام کرنا بھی لازمی ہوتا ہے کہ مخالفین انہیں پھاڑ اور اتار نہ دیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا تھا کہ ایک پارٹی کے کارکن دیواروں پر اپنے امیدوار کے پوسٹر لگاتے جاتے اور ان کے پیچھے مخالف پارٹی کے لفنگے انہیں پھاڑ کر لیر لیر کردیتے۔ شہر میں ہر امیدوار کے کارکن گویا چوکیداری کرتے پھرتے تھے۔

اس شہر کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ جہاں الیکشن کے دوران خوب شور شرابا اور رونق ہوتی تھی وہیں کوئی نہ کوئی مثبت مسئلہ بھی اٹھایا جاتا تھا پھر اس مسئلے پر لوگ بڑھ چڑھ کر بولتے تھے۔ لیکن اس وقت سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر بڑی حویلی کے شیخ صاحب کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ جب سے شیخ صاحب کے ہاتھ دولت لگی تھی، اسی وقت سے عام آدمی اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ نہ تو عام لوگ انہیں اپنا سمجھتے تھے اور نہ ہی شیخ صاحب انہیں انسان گردانتے تھے۔

جب سے شیخ صاحب شہر کے درمیان میں سے نکلنے والے گندے پانی کے نالے کے حق میں اڑ کر کھڑے ہوگئے تھے، اسی وقت سے شہر کے لوگ ان کے مخالف ہوگئے تھے۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ گندے نالے کو شہر کے درمیان میں سے ہٹایا جائے۔ اس کا رخ بدلا جائے، زیرزمین کوئی انتظام کیا جائے اور اسے ہر صورت میں پاٹ دیا جائے۔ جبکہ شیخ صاحب اس کے سخت مخالف تھے۔

دراصل اسی گندے نالے کے پانی سے شیخ صاحب کی زمینیں سیراب ہوتی تھیں۔ وہ گندا نالا طویل عرصے سے اسی جگہ موجود تھا۔ شہر سے باہر، نالے کے قریب واقع زمین شیخ صاحب نے منہ مانگے دام ادا کرکے خریدی تھی۔ اس کی واحد وجہ یہی تھی کہ نالے کے پانی سے سبزیاں کثرت سے اور بہترین پیدا ہوتی تھیں۔ اس سے شیخ صاحب کو خاصی آمدنی ہوتی تھی۔

لوگوں کا مطالبہ شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ گندا نالا شہر کے حسن کو برباد کررہا ہے۔ لہٰذا اسے پاٹ کر اس کی جگہ گرین بیلٹ تیار کی جائے۔ شہر کا گندا پانی کسی دوسری طرف نکالا جائے۔

ظاہر ہے اس طرح شہر کے حسن کو چار چاند لگ جاتے اور لوگوں کو مکھیوں اور مچھروں کے علاوہ تعفن سے بھی نجات مل جاتی۔ لیکن شیخ صاحب اپنا یومیہ ہزاروں روپے کا نقصان کیسے برداشت کرسکتے تھے۔ اس لیے وہ کسی کی بات نہیں سنتے تھے اور سب کو ان کی بات سننی پڑتی تھی کیونکہ وہ شہر کی کمیٹی کے پردھان تھے اور ان کی مرضی کے خلاف گندا نالا تو ایک طرف، کمیٹی کا کوڑا اٹھانے والے گدھے کا رخ بھی نہیں موڑا جاسکتا تھا۔

ان انتخابات میں شیخ صاحب بھی کمیٹی ممبر کے امیدوار تھے۔ اگر وہ ممبر منتخب ہوجاتے تو ان کا پردھان بننا مشکل نہ تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ ”ملبا شیخ“ کو ممبر بنانا گندے نالے کی عمر کو طول دینے کے مترادف ہے۔ بولنے اور لکھنے والے ملبا شیخ اور گندے نالے کے حوالے سے طرح طرح کی کہانیاں سامنے لے آئے۔ جلسے اور جلوسوں میں وہ کہانیاں بیان کرکے لوگوں کو ہنسایا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پورا شہر اس بات پر متفق ہوگیا کہ گندا نالا اور ملبا شیخ دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ ان دونوں سے ایک ساتھ ہی جان چھڑانی پڑے گی۔

اس قسم کی باتیں تو کی جارہی تھیں اور محض باتیں کرنا خاصا آسان بھی ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ شیخ صاحب کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس شہر کی کسی ماں نے ایسا سورما پیدا ہی نہیں کیا جو آگے بڑھ کر ممبری کے لیے شیخ صاحب سے ٹکرائے اور ان کی جگہ خود شہر کا پردھان بن جائے۔

آخرکار اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے شہر کے لوگوں نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس میں شہر کے تمام لوگوں کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ طے شدہ وقت پر شہر کے خاصے لوگ وہاں پہنچ گئے تو ایک شخص ڈائس پر آکر ان سے مخاطب ہوا۔

”بھائیو اور دوستو! اس گندے نالے کی سیاہ کیچڑ اور بدبودار پانی ہمارے شہر کے لیے کلنک کا ٹیکا ہے۔ جب تک بیماری کی یہ نہر ہمارے شہر کے درمیان بہتی رہے گی۔ تب تک ملیریا، بدبو، پھوڑے جیسے روگ پر بھنکتی مکھیوں اور مچھروں سے ہماری جان نہیں چھوٹے گی اور جب تک بڑی حویلی والے شیخ صاحب میونسپل کمیٹی کے چیئرمین رہیں گے،

اس نالے کو پاٹنے کا ہر جتن ناکام رہے گا۔ بس یوں سمجھیے کہ شیخ صاحب اور گندا نالا ساتھ ہی رہیں گے اور ساتھ ہی جائیں گے۔ ہے کوئی ایسا شخص جو شیخ صاحب سے ٹکر لے؟ پھر وہ کامیاب ہو یا ناکامیاب...... لیکن ایک بار شیخ صاحب کو یہ معلوم ضرور ہو جانا چاہیے کہ شہر کی پیشانی پر اس کالک کے دھبے کو دھونے والے بہادر لوگ بھی اس شہر میں بستے ہیں۔"

مقرر بیٹھ گیا تو ہر طرف قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی میں بولنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ حاضرین کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ اچانک ساکت لوگوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک نوجوان کو راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہونے لگے۔ شیخ صاحب کا بیٹا آگے بڑھا اور اسٹیج پر آکر بولنے لگا۔

"میرے بزرگو اور بھائیو! میں کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کروں گا، نہ ہی مجھے تقریر کرنا آتی ہے۔ میں سیدھا سادہ اور کام کرنے والا بندہ ہوں، میں خود ایک عرصے سے اس گندے نالے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ لیکن اس سے نجات کی مجھے کوئی راہ نہیں سوجھی۔ آج آپ لوگوں کی باتوں نے مجھے بھی راہ سجھائی ہے۔ میں زیادہ باتیں کرنے کے بجائے صرف اتنا کہوں گا کہ شیخ صاحب میرے والد ہیں۔ انہوں نے مجھے پالا پوسا اور تعلیم دلوائی ہے۔ ایک اچھے گھرانے میں میری شادی کرائی ہے...... لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شہر بھی میرا کچھ لگتا ہے۔ میرا اس سے بھی ایک تعلق ہے۔ جس طرح میرے والدین کی خدمت مجھ پر فرض ہے اسی طرح یہ شہر بھی مجھ پر کچھ حق رکھتا ہے۔ میں اس کی فضاؤں میں سانس لیتا ہوں۔ اس کا اناج کھا کر اور پانی پی کر پلا بڑھا ہوں۔ اسی شہر کی گلیوں اور میدانوں میں کھیل کود کر بڑا ہوا ہوں...... اس کا بھی مجھ پر حق ہے۔ میں اپنے خوب صورت شہر، اپنی جنم بھومی کی پیشانی سے کالک کا یہ داغ دھودوں گا اور اس کے سینے سے گندگی کے اس ناسور کو ختم کر کے ہی دم لوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے اپنے سگے باپ سے بھی کیوں نہ ٹکر لینی پڑ جائے۔ میں ایک اصولی مؤقف اور اپنے شہر کی بھلائی کے لیے یہ کر گزروں گا۔"

شیخ صاحب کے بیٹے کی باتیں سن کر شہر کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ وہ اسے کندھے پر اٹھا کر شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر نعرے لگانے لگے۔

"ملبا شیخ...... مردہ باد۔ ان کا بیٹا زندہ باد۔"

یہ نعرے اس وقت تک گونجتے رہے جب تک ملبا شیخ کی جگہ ان کا بیٹا پہلی مرتبہ ممبر اور پھر میونسپلٹی کا چیئرمین نہ بن گیا۔

☆☆☆

اب لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ کب کمیٹی کے مزدور کدالیں، بیلچے اور ٹوکریاں لے کر آتے ہیں اور نالے کو پاٹنے کا کام شروع ہوتا ہے۔

شیخ صاحب کا بیٹا الیکشن کے دوران باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے سسرال میں رہنے لگا تھا۔ لوگ کہنے لگے تھے کہ یہ گندا نالا باپ بیٹے کے درمیان ایک خلیج کی طرح حائل ہو گیا ہے۔ جو خلیج بنگال کی طرح کبھی پاٹا نہیں جاسکے گا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ لاکھ اختلافات سہی، قریبی اور سگے رشتوں میں ہمیشہ کے لیے دوریاں قائم نہیں رہ سکتیں اور یہ بات مناسب بھی نہیں ہے۔

کچھ ہی عرصے کے بعد لوگوں نے سنا کہ شیخ صاحب کا بیٹا میونسپلٹی کا چیئرمین بنتے ہی دوبارہ بیوی کو لے کر باپ کی حویلی میں آگیا تھا لیکن لوگ اس بات کا انتظار ہی کرتے رہے کہ کمیٹی کی جانب سے نالا پاٹنے کا کام کب شروع کیا جاتا ہے۔

سب سے زیادہ فکر اس کے یار ملنگی کو تھی۔ وہ سینہ ٹھونک کر لوگوں سے کہتا رہا تھا۔ "میرا یار بڑے شیخ صاحب کے تمام گناہ دھو دے گا۔ باپ نے شہر سے جو دغابازی کی ہے، ان کا بیٹا اس کی تلافی کردے گا۔ وہ نالے کو بند کرا کے شہر کو شیشے کی طرح صاف کردے گا۔ میرا یار بڑا جی دار اور وعدے کا پکا آدمی ہے۔ دیکھنا، اس نے جو کہا ہے، وہ کر دکھائے گا۔"

لیکن لوگوں کا انتظار طویل ہوتا چلا گیا۔ گندا نالا اپنی تمام غلاظت اور بدبو کے ساتھ موجود رہا۔ ملنگی کا جوش اور جذبہ بھی ماند پڑنے لگا۔ آخر کار وہ ایک دن شیخ صاحب کے بیٹے سے ملنے گیا۔ چپڑاسی نے چک اٹھا کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ شیخ صاحب کا بیٹا بڑی شان سے پردھان کی کرسی پر براجمان تھا۔ لیکن آج ملنگی نے ہنستے ہوئے اپنی بات شروع نہیں کی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہی سنجیدگی سے بولا۔

"شیخ جی! آپ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ نالا پاٹنے کا وعدہ اب تک کیوں پورا نہیں ہوا؟"

شیخ صاحب کا بیٹا اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ کان سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور اس کی ٹھوڑی کو انگوٹھے سے ٹھوکا دے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"اوئے فقیرے بھانڈ کی اولاد! دیکھا اصل بہروپیا؟"

انجام ناآشنا

ناہید سلطانہ اختر

جذبۂ عشق... کہیں گل وگلزار کی صورت پھلتا پھولتا ہے اور کہیں چنگاری بن کر دھیرے دھیرے دلوں کو گرماتا ہے مگر جب... مخالف ہوا چل جائے تو سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتا ہے اور اس راکھ میں حسرتیں، ناکامیاں اور... ادھورے خواب تمام عمر کی بے چینی، اپنے مطلوب کی خوشیوں سے بھرپور زندگی کو بھی دکھوں سے بھر دیتی ہے۔ ہاں ایسا تب ہی ہوتا ہے جب کوئی وعدہ کرے اور بھول جائے... کسی کے دل میں زبردستی اترے اور پھر رستہ بدل جائے... خوشیوں کا سودا کرے اور غموں کے تحفے دے جائے... ساتھ ساتھ چلنے کا عہد کرے اور قدم قدم پر مکر وفریب سے سمت بدل جائے۔ ایسے میں بھلا کس طرح یہ ادراک ہو سکتا ہے کہ یہ انجام کیوں ہوا اور یہ آشنائی... بےاعتنائی میں کیونکر بدل گئی... شاید مقدر کی بساط پر ایسی ہی چالیں چلی جاتی ہیں جن کا کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ اور بات کہ کسی کے دامن میں کامیابی کے پھول کھلتے ہیں اور کوئی شکستگی کی دھول میں کہیں گم ہو جاتا ہے... اس کے باوجود... قدرت کا تعاقب موت تک جاری رہتا ہے اور مکافات کا جال کہیں نہ کہیں خطاکار کو قید کر لیتا ہے۔

تتلی سمجھ کر محبت سے کھیلنے والے ایک عاقبت نااندیش

عاشق کی داستان لہو

سر سے پاؤں تک لحاف تانے وہ جسم میں اترتی سردی کو ماہ نور کے تصور سے گرمانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے دروازے کا دستہ آہستگی سے گھمانے اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کا خیال تھا شاید بھابی ہوں۔ گھر میں اس کی موجودگی کا اطمینان کرنے کو وہ اکثر یونہی چھاپا مارا کرتی تھیں۔

”آج سردی بہت ہے بھابی۔“ وہ لحاف کے اندر ہی سے بولا۔

دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا مگر قدموں کی چاپ کمرے سے باہر جانے کے بجائے نزدیک ہوتی سنائی دی اور پھر دبی دبی سی آواز آئی۔ ”میں ہوں۔“

لحاف منہ پر سے ہٹا تا وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں پھیلی تاریکی کے باوجود وہ اسے اس کی آواز سے پہچان سکتا تھا۔

”تم!“ وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں!“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اس وقت!“

”تم نے کہا تھا نا...... آؤ۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بول رہی تھی۔

ہاں...... کہا تو تھا اس نے مگر اب جب وہ آ گئی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

”تمہارے گھر والے؟“ اس نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

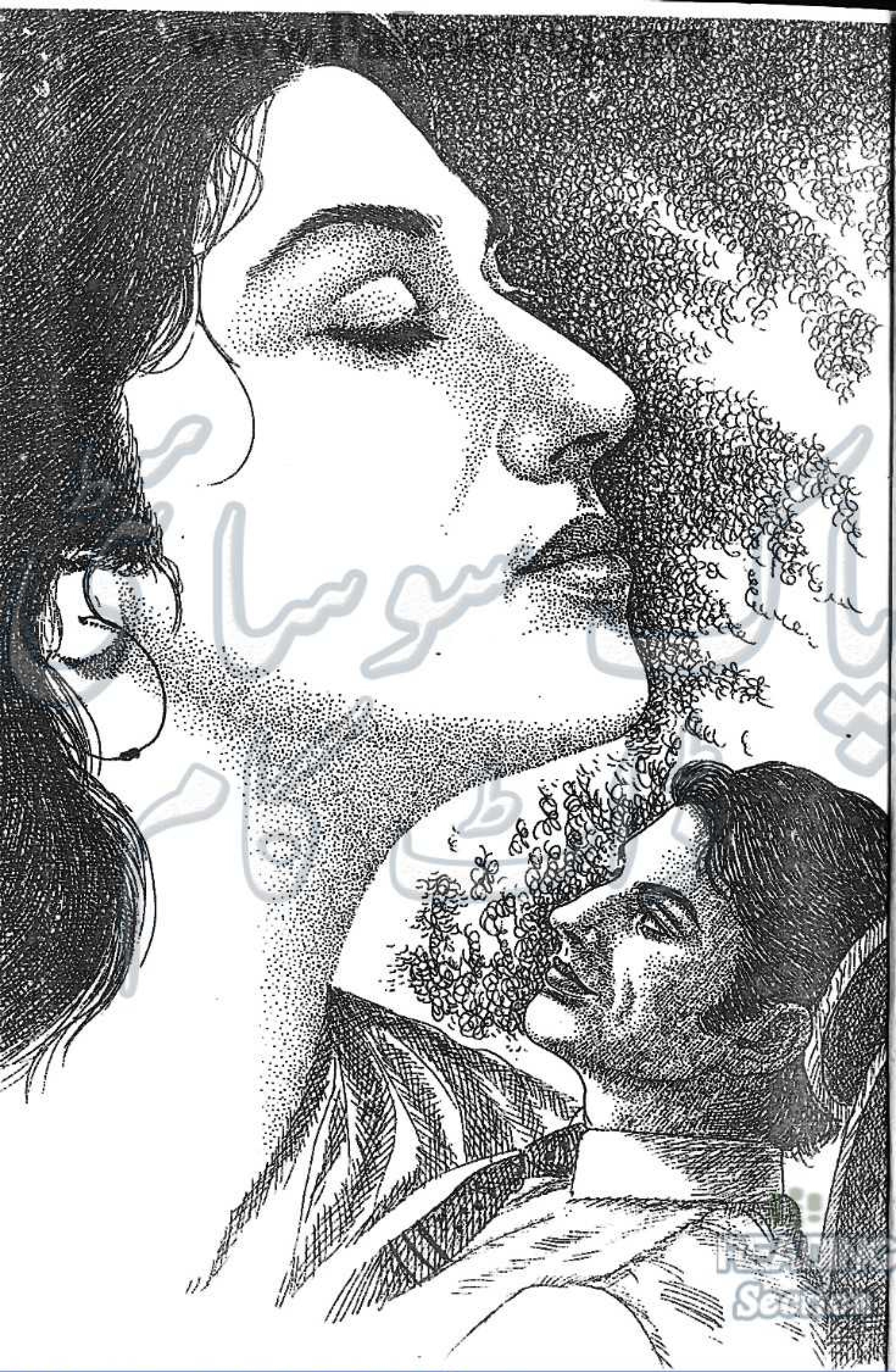
”سو رہے ہیں۔“

”تم آئیں کیسے؟“

”دیوار کود کر۔“ اس نے بتایا پھر بولی۔ ”تم نے کہا تھا نا عاقب...... آؤ...... میں آ گئی۔“ اس کے لہجے میں اترا ہٹ تھی۔

وہ اس کے بہت قریب آ گئی تھی...... اتنی کہ وہ اس کی گرم سانسیں اپنے وجود پر محسوس کر سکتا تھا۔

”عاقب!“ اس کی آواز میں ڈر تھا، تشویش تھی، اندیشے تھے...... مگر فیصلہ کن کیفیت بھی تھی۔ ”میں صرف تم سے شادی کروں گی عاقب۔“



کمرے میں وہ تھا، ماہ نور، تاریکی اور......

صبح کو پھٹنے سے پہلے وہ گھر کی زیریں منزل پر راحمہ کے دروازے پر کھڑا دروازے کو اپنی انگشت شہادت کی اگلی پور سے آہستہ سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ راحمہ کی نیند بڑی چوکنی تھی۔

''کون؟'' راحمہ نے پوچھا۔

''میں ہوں بھابی۔''

راحمہ نے دروازہ کھول دیا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''وہ...... بھابی...... وہ......'' زبان اس کا ساتھ دے رہی تھی نہ الفاظ۔ ''بھابی...... وہ......''

''بول بھی چکو عاقب...... مجھے وحشت ہو رہی ہے۔''

''وہ...... ماہ نور...... رات وہ...... ہماری طرف آگئی تھی۔''

''ہاہ!'' راحمہ کا منہ کھلا اور اس کا ہاتھ میکانکی طور پر منہ تک گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عاقب کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''پھر گئی کیسے؟''

''گئی نہیں...... اوپر کمرے میں ہے۔''

''اوہ میرے خدا!'' راحمہ کو جیسے چکر ہی تو آنے لگا تھا۔ ''رات بھر تمہارے کمرے میں رہی؟'' اس نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

عاقب کا سر جھک گیا۔

بھابی نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور اس کی نظریں فرش سے جا لگیں، وہ مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا...... جرم تو سرزد ہو چکا تھا...... بلکہ گناہ!

یکایک راحمہ کانپنے لگی اور اس کے دانت بجنے لگے۔

''صبح...... ہونے...... والی ہے...... اسے...... جلدی...... واپس...... بھیجو۔'' راحمہ نے مسلسل بجتے دانتوں کی کٹکٹاہٹ میں کہا۔

''وہ واپس جانے کو تیار نہیں۔'' عاقب نے کہا۔

اپنے لرزتے وجود کے ساتھ راحمہ نے گھر کے لاؤنج سے اوپر جاتے زینے کا رخ کیا۔ جس کھیل کا وہ اتنے دنوں سے خود بھی ایک اہم کردار بنی رہی تھی اس کے اس منظر نے حقیقی زندگی میں اس کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں ہوگا۔

☆☆☆

دونوں گھر عقبی طرف سے تقریباً چھ فٹ بلند ایک مشترکہ دیوار سے ملے ہوئے تھے۔ یہ دیوار عاقب کے والد محمد عارف نے جنہیں اب مرحوم و مغفور ہوئے بھی سات آٹھ برس بیت چکے تھے اپنی عملی زندگی کے ابتدائی برسوں میں سرکاری نرخ پر خریدے جانے والے پانچ سو مربع گز کے پلاٹ کی احاطہ دیوار تعمیر کراتے ہوئے کھڑی کرائی تھی۔ اچھا وقت تھا جو انہیں یہ پلاٹ مل گیا تھا ورنہ چند برسوں بعد تو وہ اس علاقے میں پانچ سو مربع گز تو کجا اسّی گز کا پلاٹ خریدنے کی بھی نہ سوچ پاتے۔ زمین کی قیمتیں نہایت تیزی سے بڑھی تھیں۔ بھلا ہو بینک کی نوکری کا جس نے انہیں قرضہ لے کر اس پلاٹ پر مکان تعمیر کروانے کا حوصلہ بھی دیا۔

محمد عارف اپنے دور طالب علمی میں رہے تو تھے معاشیات کے طالب علم اور حصول تعلیم کے بعد بنے پیشہ ور بینکار مگر طبعاً وہ نہایت آرٹسٹک آدمی تھے۔ سو مکان تعمیر کرواتے ہوئے انہوں نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ ان کا تعمیر کرایا ہوا مکان فقط در و دیوار کا ڈھانچا نہ دکھائی دے بلکہ اس میں زندگی بھی متحرک ہو۔ بہی خواہوں کا مشورہ تھا کہ وہ اپنے مکان کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ مکانیت کا عنصر مدنظر رکھیں مگر محمد عارف نے سنی سب کی کیا وہ جو ان کا جی چاہا۔ انہوں نے گھر کی تعمیر میں وسعتِ مکانیت سے زیادہ دلکشی کو مقدم رکھا۔ کمرے بڑے نہ بنائے لیکن عمارت کے تین اطراف کشادہ لان اور کیاریوں کا اہتمام کیا۔ گھر میں کار پورچ ضروری نہ ہوتا تو وہ چوتھی جانب بھی پھول اور سبزہ بچھوا دیتے۔ گھر کے ہر کمرے میں انہوں نے بڑی بڑی کھڑکیاں رکھوائیں جن سے سبزہ دکھائی دیتا اور رنگ برنگ موسمی پھول اپنی چھب دکھاتے۔ عارف صاحب کے گھر جو آتا ان کے مکان کی تعمیر و بناوٹ اور گھر کے ہر حصے سے سبزہ دکھائی دینے کی تعریف کیے بنا نہ رہتا۔

محمد عارف نہ تو جدی پشتی امیر آدمی تھے نہ ہی کوئی اعلیٰ منصب دار۔ اچھی شہرت کے حامل ایک مالیاتی ادارے میں گریڈ ون افسر تھے۔ کچھ اپنی جمع پونجی اور کچھ ادارے سے قرض لے کر انہوں نے بچوں کے لیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر ٹھکانا بنوا لیا تھا۔ کوئی اچھا وقت تھا کہ انہوں نے پلاٹ خرید کر ڈال دیا تھا ورنہ بعد میں تو وہ اتنا بڑا پلاٹ خریدنے اور اس پر اپنے بچوں کے لیے اتنا عمدہ مکان تعمیر کرنے کی ہمت ہی نہ کر پاتے۔ ان کے تین بیٹے تھے ثاقب، عاطف اور عاقب۔ تینوں کے لیے ان کی آنکھوں میں سنہری خواب سجے تھے۔

محمد عارف کا اپنا بچپن، نوجوانی اور پھر عملی زندگی کے دو عشرے بہت معمولی مکانوں میں گزرے تھے۔ بچپن اور

نوجوانی ساٹھ مربع گز پر دو کمروں کے ایک مکان میں جہاں آٹھ نفوس کا بڑی مشکل سے گزارہ ہوا کرتا تھا۔ اپنے دوستوں کو وہ کبھی گھر کے اندر بلا کر نہیں بٹھا سکے۔ گھر کے باہر کھڑے کھڑے ہی بات چیت ہوتی اور وہیں سے رخصت کر دیتے۔ بہت ہوا تو کانچ کے گلاس میں پانی۔ شادی کے بعد وہ دو ڈھائی برس تو گھر والوں کے ساتھ اسی مکان میں رہے لیکن جب گزارہ بہت مشکل ہو گیا تو پھر وہ بیوی اور بچے کے ساتھ کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ کرائے کے مکان میں کوئی اٹھارہ برس رہے، اسی دوران پلاٹ کی خریداری عمل میں آئی اور پلاٹ کا قبضہ ملتے ہی انہوں نے محکمے سے قرض لینے کی درخواست دے دی اور اپنی جمع پونجی سے مکان کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ ایک آرام دہ اور باعزت گھر ان کی دیرینہ خواہش تھی۔ خود انہیں تو اپنے باپ کی طرف سے اچھا گھر نہیں مل سکا تھا لیکن اپنی آرزوئے دیرینہ کی تشنگی دور کرنے کے لیے انہوں نے اپنے بچوں کے لیے ایک عمدہ مکان بنوا دیا تھا۔ جو دیکھنے میں بھلا اور رہنے میں آرام دہ اور پُرسکون تھا۔ مکان کی زیریں منزل پر ڈرائنگ، ڈائننگ تھا۔ ٹی وی لاؤنج تھا۔ کچن اور تین بیڈ رومز مع اٹیچڈ باتھ۔ مکان کی بالائی منزل پر انہوں نے ایک کمرا مع اٹیچڈ باتھ تعمیر کرایا تھا، بطور خاص اپنے لیے۔ اس کمرے میں انہوں نے چہار اطراف کھڑکیاں کھلوائی تھیں۔ ان کھڑکیوں سے وہ دور تک نظارہ کر سکتے تھے۔ ان کی اہلیہ کو زیریں منزل پر رہنا زیادہ پسند تھا۔ سب کچھ نیچے ہی تو تھا۔ لاؤنج، کچن، بچوں کے کمرے، کارپورچ، لان مگر مشکل یہ تھی کہ نیچے تینوں بیڈ رومز پر تینوں بیٹوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ انہیں مجبوراً اوپر ہی آنا پڑتا کہ میاں جو اوپر رہتے تھے، اس مکان میں شفٹ ہونے کے بعد وہ برس بھر ہی جی پائیں۔ ایک روز تیز بخار چڑھا جو پینل کے ڈاکٹر کی دوا سے ٹھیک ہی نہ ہو کر دیا۔ پانچویں چھٹے دن اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ اسپتال جا کر دو دن اور زندہ رہیں۔ ناک، منہ سے خون جاری ہو گیا۔ تشخیص جاری تھی کہ چل بسیں۔ گھر ویران ہو گیا۔ اہلیہ کی موت محمد عارف کے لیے صدمہ تو تھی ہی وہ تنہا بھی رہ گئے۔ بیٹوں سے ہر بات تو نہیں کہی سنی جا سکتی تھی۔ دل کا روگ محمد عارف کا خاندانی روگ تھا۔ ایک روز دورۂ قلب سے دوچار ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ گھر اور بھی ویران ہو گیا لیکن جانے سے پہلے وہ تینوں بیٹوں کے رشتے طے کر گئے تھے، بڑے بیٹے ثاقب کا اپنے ایک دوست کی بیٹی راحمہ سے، منجھلے عاطف کا اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی رخشندہ سے اور عاقب کا اپنی بہن کی بیٹی نسرین سے۔ یہ بھی خدا کا بندوبست ہی تھا۔ ایک ثاقب تو ضرور اپنے پیروں پر کھڑا تھا باقی دونوں تو ابھی پڑھ ہی رہے تھے۔

ثاقب نے بی کام کیا تھا۔ اس کا نتیجہ نکلتے ہی محمد عارف نے اسے بھاگ دوڑ کر کے ایک بینک میں بھرتی کروا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے ملازمتیں آسانی سے نہیں ملتیں۔ لہٰذا موقع ملتے ہی بچوں کو ان کے پیروں پر کھڑا

بچے ہمارے عہد کے

یہ کہانی کسی انسان کے بچے کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک بھیڑ کے بچے کی ہے اور بھیڑ کا یہ بچہ آج کے عہد کا ہے۔ جنگل میں بھیڑ کا ایک بچہ نالے سے پانی پی رہا تھا کہ ایک شیر کا ادھر سے گزر ہوا۔ بھیڑ کے بچے کو دیکھ کر شیر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیونکہ وہ کئی دن سے بھوکا تھا وہ آہستہ آہستہ بھیڑ کے بچے کی طرف بڑھنے لگا۔ بچے نے شیر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ لیا۔ اس نے شیر سے کہا۔ ”آپ بے شک مجھے کھا جائیں۔ کیونکہ میں اپنی زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔“

”زندگی سے تنگ کیوں آ گئے ہو......؟“ شیر نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”جناب میری ماں اتنی ہی ظالم ہے۔ جتنی موٹی تازی ہے۔ وہ ہر وقت مجھے مارتی رہتی ہے اور وقت بے وقت مجھے حکم دیتی رہتی ہے، اب یہی دیکھ لیں کہ یہ وقت میرے ناشتے کا ہے اور اس نے مجھے یہ حکم دے کر بھیجا ہے کہ جاؤ دیکھ کر آؤ۔ نالے میں پانی ہے یا نہیں۔“ بھیڑ کے بچے نے کن انکھیوں سے شیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا تم فوراً جا کر اسے بھیج سکتے ہو۔ لیکن میرا نہ بتانا اور یہ بھی کہنا کہ نالے میں پانی بہت ہے۔“ شیر نے کہا۔

”کیوں نہیں؟ ابھی بھیجتا ہوں۔ اس طرح اس ظالم سے میرا چھٹکارا ہو جائے گا۔“

بھیڑ کا بچہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ شام تک نہ تو اس کی ماں آئی اور نہ وہ خود۔

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

کر دینا چاہیے۔ ثاقب ذہین تھا۔ اسکول سے کالج تک اس نے ہمیشہ اچھی تعلیمی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بی کام میں فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ عمر تقریباً بیس برس کے لگ بھگ۔ محمد عارف کے ایک کولیگ کے قریبی رشتے دار ایک معروف بینک میں اے وی پی لگے ہوئے تھے، ان سے کہہ سن کر محمد عارف نے ثاقب کو نوکری پر لگوا دیا۔ ارادہ تھا کہ جلد ہی اس کی شادی بھی کر دیں گے۔ گھر میں ویسے بھی ایک خاتون کی اشد ضرورت محسوس ہوتی تھی مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔

باپ کی موت کے وقت عاطف انجینئرنگ یونیورسٹی میں سال اول کا طالبِ علم تھا اور عاقب اسکول میں نویں جماعت میں زیرِ تعلیم...... چھوٹا ہونے کی وجہ سے عاقب دونوں بھائیوں کا لاڈلا تھا۔ البتہ ثاقب اور عاطف میں وہ ذہنی ہم آہنگی اور پیار نہیں تھا جو بھائی ہونے کے ناتے ان میں آپس میں ہونا چاہیے تھا۔ ثاقب مزاجاً قدرے خودغرض جبکہ عاطف جیسے کو تیسا۔ مزاج کا یہی اختلاف ان کی دوری کا سبب تھا۔ دونوں کی بالکل نہ بنتی۔ باپ کی موت بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب نہ کر سکی تاہم عاقب سے دونوں ہی محبت کرتے تھے۔ باپ کی موت کے بعد عاقب سے دونوں ہی پدری شفقت کا رویہ رکھتے۔ اس کی کوئی خواہش کوئی فرمائش رد نہ کی جاتی۔ عاطف کو ثاقب پانچ روپے دینے کا بھی روادار نہ تھا جبکہ عاقب کے لیے اس کے پاس اس کی کسی ضرورت کے معاملے میں انکار کی گنجائش نہ تھی۔ باپ کی موت کے بعد عاطف کو خود کفیل ہونے کے لیے ٹیوشنز کا سہارا لینا پڑا۔ یونیورسٹی سے چھٹی کے بعد وہ تین چار گھروں میں بچوں کو ٹیوشن دینے جاتا اور یوں اسے اپنی ضرورتوں کے لیے ثاقب کا دستِ نگر نہیں بننا پڑا تھا بلکہ بچوں کو پڑھانے سے اسے اتنی آمدن ہو جاتی کہ وہ عاقب کو بھی کچھ دینے دلانے کے لائق ہو گیا تھا۔

گھر میں ایک خاتون کی کمی کا احساس تو عارف صاحب کی زندگی کے آخری برسوں سے کیا جا رہا تھا۔ وہ گئے تو یہ احساس دوچند ہو گیا۔ اس پر طرہ ثاقب اور عاطف کے درمیان اختلافِ مزاج.... کوئی ناگزیر بات ہوتی تو عاقب ان دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتا۔ کبھی وہ ثاقب کو پیغام رسانی کرتا کبھی عاطف کو ثاقب کا سندیسہ پہنچاتا۔ عاقب کو اپنی اس اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔

ثاقب اپنے پیروں پر تو کھڑا ہی تھا۔ گھر میں عورت کی کمی کا خلا پُر کرنے کے لیے اس نے شادی کا ارادہ کر لیا۔ لڑکی ڈھونڈنی نہیں پڑی تھی۔ رشتہ مرحوم و مغفور والد اپنی زندگی میں طے کر گئے تھے۔ لڑکی والوں کو معلوم تھا لڑکا خود مختار ہے، باصلاحیت ہے۔ آگے بڑھنے کی دھن رکھتا ہے۔ گھر میں ساس تھی نہ نند۔ گھر جانے والی کا اپنا ہی راج ہونا تھا۔ سو جیسے ہی ثاقب نے شادی کا ارادہ کیا لڑکی والوں نے تیاری پکڑ لی۔ ثاقب سے کہہ دیا تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں جو ہماری بیٹی کے مقدر میں ہوگا وہ اسے تمہارے گھر جانے کے بعد مل جائے گا۔ لڑکی والوں کی تو واہ واہ ہو گئی۔ ثاقب نے طلائی زیورات کا ایک سیٹ خریدا۔ بارہ تیرہ ریشمی لبادے۔ دلہن کے لیے دو جوڑے جوتے اور ایک ہینڈ بیگ۔ اور ساتھ ہی ایک وینٹی بکس۔ معمولی خرچے پر دلہن گھر آ گئی۔ ولیمہ کی دعوت البتہ کافی خرچہ کرا گئی۔ بہر حال گھر میں عورت کی آواز اور اس کی ہنسی کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ ثاقب کے کمرے میں بہار سی آ گئی۔ گھر میں زندگی کا احساس ہوتا۔ ثاقب کی دلہن عاطف کا بھی اتنا ہی خیال رکھتی جتنا عاقب کا۔ عاطف کو ٹیوشنز سے جو آمدن ہوتی اس کا ایک حصہ وہ بھابی کو بھی دے دیتا۔ شروع میں تو وہ بہت حیران ہوئی لیکن پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ پیسے وہ اسے گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے دیا کرتا تھا۔ ثاقب کی دلہن راحمہ کے آ جانے سے گھر، گھر لگنے لگا تھا۔ گھریلو کام کاج میں راحمہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ثاقب نے ایک ملازمہ رکھ دی تھی جو صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے آتی اور سہ پہر کو تین چار بجے کے لگ بھگ واپس چلی جاتی۔ راحمہ کے آنے سے ثاقب ہی نہیں عاطف اور عاقب بھی گھر میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ گھر کی بالائی منزل پر واقع کمرا بند کر دیا گیا تھا۔ گھر میں چار افراد تھے۔ سب کی اپنی اپنی خواب گاہ تھی۔ بالائی منزل پر واقع کمرا اب جھاڑ پونچھ کے لیے ہی کھولا جاتا۔

راحمہ بھی بہت خوش تھی۔ تین مردوں والے گھر میں اسے اپنا وجود انتہائی اہم محسوس ہوتا۔ ثاقب کی تو وہ خیر شریکِ زندگی ہی تھی۔ عاطف اور عاقب بھی گھر میں ہوتے تو اس کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے۔

نصیبوں والی تو وہ واقعی تھی۔

☆☆☆

شادی کے دوسرے برس بیٹے کی پیدائش نے نہ صرف ثاقب اور راحمہ کے رشتے کو نئے معنی دیے بلکہ گھر میں بھی نئے رنگ بکھیر دیے۔ عاطف اور عاقب ننھے عاشر کو گود میں اٹھائے پھرتے۔ راحمہ بچے کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں دن بھر مصروف رہتی۔ ثاقب دفتر سے گھر آنے کے بعد

عاشر سے کھیلنے کے لیے اپنی باری کا منتظر رہتا۔ عاطف اسے گود سے اتارتا تو عاقب اٹھالیتا۔ عاقب اتارتا تو عاطف۔ عاشر کے دم سے ثاقب اور عاطف کے درمیان رابطے کا فقدان بھی قدرے کم ہوگیا تھا۔ عاشر کے بہانے وہ ایک دوسرے سے ہمکلام ہونے لگے تھے۔ گھر کا ماحول خاصا بہتر ہوگیا تھا۔

انجینئرنگ یونیورسٹی میں اپنے آخری سمسٹر کے دوران ہی عاطف نے ملازمت کے لیے کوشش شروع کردی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے ایک آئل ریفائنری میں ملازمت مل گئی۔ برس بھر وہاں کام کیا پھر ابوظہبی میں زیادہ بہتر ملازمت مل جانے پر بیرون ملک چلا گیا۔ بیرون ملک ملازمت دلکش مراعات کا پیکیج تھی۔ عمدہ مشاہرہ، مفت رہائش اور طبی سہولیات، جتنے دن کام اتنے دن چھٹی مع تنخواہ اور چھٹی وطن میں گزارنے کے لیے مفت فضائی آمدورفت ٹکٹ۔ ثاقب اور عاطف کے درمیان فاصلہ مزید سمٹ گیا۔ ان کے باہمی تعلقات میں سردمہری کی جگہ گرمجوشی آگئی تھی۔ عاطف چھٹی پر ابوظہبی سے پاکستان آتا تو بھائیوں، بھاوج اور بھتیجے کے لیے بہت سے تحائف اور سوغاتیں لے کر آتا۔ گھر میں عاطف کی اہمیت خاصی بڑھ گئی تھی۔ راحمہ کا جی چاہتا عاطف کی شادی اپنے ہی خاندان کی کسی لڑکی سے کروا دے مگر مشکل یہ تھی کہ مرحوم سسر جن کی وجہ سے وہ اس گھر میں راج کررہی تھی، عاطف کا رشتہ اپنی زندگی ہی میں طے کر گئے تھے اور خود عاطف ہی نہیں ثاقب کو بھی مرحوم باپ کے فیصلوں کا پورا احترام تھا۔ عاقب تو ابھی زیر تعلیم تھا اس کی شادی کا معاملہ ہنوز دلی دور است والا معاملہ تھا تاہم عاطف اب خود کفیل تھا اس کی شادی میں کوئی قباحت نہ تھی۔

عاطف کو ٹٹولنے کے لیے راحمہ نے اپنے ہی خاندان کی ایک دو لڑکیوں کا دبی زبان سے تذکرہ کیا مگر اس نے کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ اس سلسلے میں مصلحتاً بھی گول مول بات کرنے کے بجائے اس پر واضح کردیا کہ شادی کے لیے وہ اپنی چچازاد رخشندہ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے نہیں کہ اسے رخشندہ پسند تھی یا وہ اس سے محبت کرتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے مرحوم باپ کا انتخاب تھی۔

"تمہیں رخشندہ سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے عاطف۔"

راحمہ نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

"ارے بھابی...... اچھی کا کیا ہے...... ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے مگر شادی بندے کو بڑوں کی مرضی سے کرنی چاہیے اور یہ تو ڈیڈی کا فیصلہ ہے...... میں اس فیصلے کا احترام کروں گا...... آخر بھائی نے بھی تو آپ سے اسی لیے شادی کی کہ ڈیڈی کا فیصلہ تھا۔ ورنہ بھائی کی پرسنالٹی تو آپ جانتی ہی ہیں کتنی ڈیشنگ تھی بلکہ ہے۔"

راحمہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ کیا وہ اسے یہ جتانے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ اس کے بھائی کے جوڑ کی نہ تھی اور اگر اس کے مرحوم باپ کا انتخاب نہ ہوتی تو اس کے بھائی کو اس سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی۔

عاطف کی شادی کے لیے ثاقب کو بڑا بھائی ہونے کے ناتے چچا سے صرف یہ کہنے کی ضرورت پڑی کہ وہ عاطف کے لیے باپ کے طے کردہ رشتے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے عاطف کے مشورے سے شادی کی تاریخ طے ہوگئی اور اگلی بار جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو رخشندہ اس کی شریک حیات بن کر اس گھر میں آگئی۔

گھر میں اب ایک نہیں دو عورتیں تھیں۔ گھر کی رونق میں مزید اضافہ ہوگیا۔ راحمہ کو اس کی شادی پر ملنے والے جہیز کا سامان ہی بہت تھا اب جو رخشندہ کا جہیز آیا تو چیزیں رکھنے کے لیے جگہ کم پڑنے لگی۔ عاقب نے اپنا کمرا خالی کیا اور گھر کی بالائی منزل پر واقع کمرے میں شفٹ ہوگیا۔

عاطف شادی کے بعد ایک دو مرتبہ چھٹی پر گھر آیا پھر اس نے ابوظہبی میں ہی ایک اسٹوڈیو فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ اسے چھٹی ملتی تو وہ خود پاکستان آنے کے بجائے رخشندہ کو ابوظہبی بلالیتا۔ دونوں مکمل پرائیویسی کے ساتھ گھر میں رہتے۔ نہ رخشندہ کو گھر میں اور لوگوں کی موجودگی کے خیال سے حجاب ہوتا نہ عاطف کو محتاط رہنا پڑتا۔ جب جی چاہتا دونوں کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکل جاتے۔ جتنی دیر چاہتے لمبی تان کر سوئے رہتے۔ نہ کسی کے کچھ کہنے سننے کی فکر نہ کسی کے اعتراض کا خدشہ۔ روز و شب ان کے اپنے ہوتے زندگی اپنی ہوتی۔ رخشندہ تو راحمہ سے بھی بڑھ کر قسمت کی دھنی نکلی۔ اس کا ایک پاؤں پاکستان میں تو دوسرا ابوظہبی میں ہوتا کبھی جب عاطف کو وطن اور عزیز و اقارب کی یاد ستانے لگتی تو وہ خود بھی چند دنوں کو پاکستان آجاتا اور رخشندہ کو ساتھ لے کر یا اسے واپس چھوڑ کر ابوظہبی چلا جاتا۔ آمدن اور مراعاتِ ملازمت کے اعتبار سے وہ بڑے بھائی سے کہیں زیادہ خوش حال تھا۔ راحمہ جو اپنے مقدر پر نازاں رہا کرتی تھی اب رخشندہ کی خوش قسمتی پر رشک کرتی۔ دیسی چیزوں کو تو وہ اب کم ہی لائقِ اعتنا سمجھتی

تھی۔ اس کے کپڑے، جوتے، ہینڈ بیگ، کاسمیٹکس سب غیر ملکی ہوتا۔ جو پرفیوم وہ استعمال کرتی ان سے گھر مہکتا رہتا اور گھر میں رخشندہ کی موجودگی کا احساس حاوی رہتا۔ رخشندہ ابوظہبی جاتی تو راحمہ کے لیے بھی تحائف لے کر آتی جنہیں راحمہ بہت دیکھ دیکھ کر استعمال کرتی۔ اس کا جی چاہتا ثاقب بھی کہیں باہر چلا جائے۔ اسے اور عاشر کو اپنے پاس بلائے اور وہ بھی رخشندہ کی طرح غیر ملکی چیزیں استعمال کرے اور اترائے۔ وہ اکثر ثاقب کو بھی باہر جانے کی ترغیب دینے کی کوشش کرتی مگر ثاقب اندھا دھند چھلانگ لگانے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اپنے دیس میں بھی بہت سوں سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ قسمت میں اگر پردیس کی روزی لکھی تھی تو وہ بھی مل جانی تھی۔ کوشش کر لینے میں حرج نہیں تھا مگر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔

مستقبل کے لیے عاطف نے شہر کے ایک پوش رہائشی علاقے میں ایک لگژری اپارٹمنٹ بک کرالیا۔ باپ کا گھر ان تینوں بھائیوں ہی کے لیے تھا مگر آج نہیں تو کل ان سب کو اپنے بال بچوں کے لیے علیحدہ علیحدہ گھر کی ضرورت لازم تھی۔ فی زمانہ شادی کے بعد اولاد اپنے والدین کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی وہ تو پھر بھائی تھے۔ عقلمندی اسی میں تھی کہ علیحدہ گھر بسانے کی داغ بیل ڈال دی جاتی سو اسی خیال کے تحت عاطف نے اپارٹمنٹ بک کرالیا تھا۔ آج وہ اور رخشندہ دو تھے کل دو سے تین پھر چار بھی ہونے والے تھے انشاءاللہ۔

راحمہ کی دعائیں رنگ لائیں۔ ثاقب کو سعودی عرب کی ایک معروف کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کی جاب مل گئی۔ پرکشش مشاہرہ کے ساتھ کچھ اور مراعات بھی پیکیج کا حصہ تھیں۔ راحمہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ وہ خوش تھی کہ رخشندہ کی طرح اب وہ بھی اپنے شوہر کے پاس سعودی عرب آ، جا سکے گی بلکہ خدا نے چاہا تو عمرہ اور حج کی سعادت بھی حاصل کرے گی۔ کیا عجب کہ ثاقب جو ابھی تو کمپنی کی فراہم کردہ شیئرڈ اکاموڈیشن میں رہائش اختیار کرنے جارہا تھا آنے والے دنوں میں فیملی کو بھی اپنے ساتھ رکھ سکتا۔

ثاقب کے سعودی عرب جانے کے بعد گھر میں عاقب واحد مرد رہ گیا۔ راحمہ کی اس سے گاڑھی چھننے لگی۔ رخشندہ تو کبھی پاکستان میں ہوتی کبھی ابوظہبی میں ہوتی۔ عاقب سے بطور دیور اس کی وہ نہیں بن سکی تھی جو عاقب کی اسی رشتے میں راحمہ سے تھی۔

☆☆☆

ابوظہبی میں عاطف کے سینئرز میں انصار حسین نے اہل وعیال کو مستقلاً ابوظہبی میں رکھا ہوا تھا۔ جس گھر میں انصار حسین کی فیملی کرایہ دار تھی اس کا ایک حصہ خالی ہوا تو عاطف نے اسٹوڈیو فلیٹ چھوڑ کر انصار حسین کے گھر میں خالی ہونے والا حصہ کرائے پر لے لیا اور رخشندہ کو مستقل طور پر ابوظہبی بلالیا۔ انصار حسین اور عاطف ایک ساتھ چھٹی پر آتے، اپنی اپنی فیملی کے ساتھ چھٹی گزارتے اور چھٹی گزار کر ایک ساتھ فیلڈ پر واپس چلے جاتے۔ عاطف کے جانے کے بعد رخشندہ اطمینان سے انصار حسین کی بیوی بچوں کے ساتھ رہتی۔ اس نئے بندوبست سے اسے بار بار پاکستان سے ابوظہبی آنے جانے کی ضرورت نہ رہی۔ رخشندہ کے ابوظہبی چلے جانے کے بعد عاقب اور راحمہ کی اور زیادہ بے تکلفی ہوگئی تھی۔

سعودی عرب جانے کے دس ماہ بعد ثاقب نے راحمہ اور عاشر کو عمرہ کرنے کے لیے دو ہفتوں کو سعودی عرب بلایا اور اس دوران میں ان کا قیام ہوٹل میں رکھا۔ انہیں اپنے ساتھ ٹھہرانے کی سہولت نہ تھی اسے۔

راحمہ اور عاشر کے سعودی عرب جانے کے بعد عاقب کو گھر میں اکیلا ہی رہنا پڑا۔ وہ بی کام کر چکا تھا اور ثاقب نے وطن سے دور ہونے کے باوجود اسے اپنے جاننے والوں سے کہہ سن کر اسی بینک میں ملازم کرا دیا تھا جہاں وہ خود بھی سعودی عرب جانے سے قبل ملازم رہا تھا۔

راحمہ اور عاشر کے سعودی عرب جانے کے بعد عاقب کے لیے تنہا گھر میں رہنا مشکل ہوگیا۔ والدین کی آخری اولاد اور نوعمری ہی میں ماں کی محبت سے محرومی کے بعد باپ اور بڑے بھائیوں کا لاڈلا ہونے کے ناتے اس کا زندگی کی سختیوں اور تنگی سے سابقہ نہ ہونے کے برابر رہا تھا۔ ثاقب اور عاطف تو اس کی اوائل عمر میں اسے پیار سے اپنی ''بہنا'' کہا کرتے تھے۔ وہ شرمیلا اور ڈرپوک قسم کا تھا۔ گھر سے بلاضرورت کم ہی باہر نکلتا۔ عاطف کی شادی کے بعد گھر میں سامان کے لیے جگہ تنگ ہوجانے پر وہ گھر کی بالائی منزل پر واقع اکلوتے کمرے میں شفٹ ہو تو گیا تھا مگر شام ہوتے ہی وہ اس کمرے کی کھڑکیاں دروازے بند کرلیتا۔ رات کو سونے سے قبل ملحقہ غسل خانہ میں اور بیڈ کے نیچے جھانک کر کمرے میں کسی اور کے نہ ہونے کا پورا اطمینان کرنے کے بعد ہی بستر پر جاتا۔ اسے چور، ڈاکو، جن، بھوت، کتا، بلی سب سے خوف آتا تھا اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ماں کے انتقال کے بعد باپ اور بھائیوں نے اسے ''ڈیمپرڈ'' بنا کر رکھا تھا۔ راحمہ تو اسے کبھی کبھی لاڈ سے

"منا پیٹا" کہا کرتی تھی۔ دورانِ تعلیم اور ملازمت کے بعد بھی عاقب کا معمول رہا تھا، گھر سے سیدھا وہاں جاتا جہاں جانا ہوتا اور وہاں سے سیدھا گھر واپس آتا۔ اپنی عمر کے عام نوجوانوں کی طرح اسے بلاضرورت باہر گھومنے پھرنے کی ذرا عادت نہیں تھی۔ مزاجاً وہ بڑے بھائیوں کا آمیزہ تھا۔ ثاقب کی طرح خود بین اور خود غرض اور عاطف کی طرح ذہین اور متکبر۔

راحمہ اور عاشر کے سعودی عرب جانے کے بعد عاقب کے دفتر سے سیدھا گھر واپس آنے کے معمول میں تو تبدیلی نہ آئی تاہم اکیلے گھر میں اسے وحشت سی ہوتی۔ راحمہ جانے سے قبل اس کے لیے بہت سا کھانا پکا کر فریج میں رکھ گئی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ حسبِ خواہش چائے یا کھانے سے فارغ ہو کر اوپر اپنے کمرے میں آ جاتا۔ کھڑکیاں، دروازے بند کرتا اور بستر پر پڑ جاتا۔ اس کی نیند تو دس گھنٹے سے کسی صورت کم نہ ہوتی۔ صبح اٹھتا تو نہایت تازہ دم ہوتا۔

سعودی عرب جانے کے بعد راحمہ اس سے روزانہ فون پر بات کرتی۔ عاشر سے بھی اس کی بات کراتی۔ ثاقب بھی اس کا حال چال پوچھتا اور اسے اطمینان دلاتا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ راحمہ اور عاشر جلد ہی پھر اس کے ساتھ ہوں گے۔

"بھائی! مجھے اکیلے گھر میں ڈر لگتا ہے۔" راحمہ کو سعودی عرب گئے دوسرا یا تیسرا دن تھا جب عاقب نے ثاقب سے یہ بات کہی۔

ثاقب ہنس دیا پھر بولا۔ "یار! چھ فٹ کے جوان آدمی ہو کر ڈرتے ہو۔"

"گھر جو اکیلا ہے۔" عاقب نے جھینپ کر کہا۔

"گھر اکیلا نہیں...... گھر میں تو تم ہو...... اصل میں تم اکیلے ہو۔" ثاقب بولا۔

"ہاں...... یہی سمجھ لیں۔"

"فکر مت کرو...... کچھ عرصے کی بات اور ہے...... ہم تمہیں دو کیلا بھی کر دیں گے۔" ثاقب کے لہجے میں شوخی آمیز معنی خیزی تھی۔ "بھائی کی جان بہادر بنو...... شادی کے بعد بھی اگر تم یونہی ڈرتے رہے تو نسرین کیا سوچے گی...... مرد بنو یار مرد۔"

عاقب کو شرم سی آ گئی۔ واقعی وہ بہت ڈرپوک تھا، اسے مردوں کی طرح نڈر بننے کی ضرورت تھی۔

ہوٹل کے کمرے میں ثاقب کے پہلو میں بیٹھی اور اسپیکر آن ہونے کے باعث دونوں بھائیوں کی گفتگو براہِ راست سنتی راحمہ نے نسرین کے ذکر پر آہستگی سے پہلو بدلا۔ عاطف کے مزاج کی وجہ سے وہ رخشندہ کا اپنی دیورانی بنتا تو جبراً قہراً برداشت کر گئی تھی نسرین کو وہ کسی قیمت پر اس گھر میں قبول کرنے کو تیار نہیں تھی جہاں اس کی حکمرانی تھی۔ ثاقب سے شادی کے بعد وہ اپنے تمام سسرالی گھرانوں میں آ، جا کر دیکھ چکی تھی کہ سب کے سب نچلے متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ ایک اس کے سسر اور ان کے تینوں بیٹے ہی تھے جو پڑھ لکھ کر اتنے خوشحال اور مستحکم ہو گئے تھے ورنہ باقی سب تو معمولی پڑھے لکھے اور چھوٹی چھوٹی ملازمتوں یا کاروبار سے وابستہ تھے۔ رخشندہ ایف اے تھی اور اسی پر اتراتی تھی۔ نسرین میٹرک آرٹس گروپ میں کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ ہانڈی روٹی کر کے دوپہر کو سلائی کڑھائی کے اسکول چلی جاتی اور اسی پر اس کی جاہل اماں جان یوں فاخر ہوتیں جیسے صاحبزادی سلائی کڑھائی میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ عاقب کو نسرین اور اس کے گھر والوں سے متنفر کرنے کے لیے راحمہ گاہے بگاہے اس کے سامنے ان کی برائیاں کرتی رہتی یا بہانے بہانے سے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتی۔ کبھی اسے نسرین کی شین قاف پر اعتراض ہوتا کبھی اس کی ڈریسنگ میں کیڑے نکالتی۔

"منا پیٹا سچ پوچھو تو نسرین اور اس کے گھر والے کہیں سے بھی تمہارے جوڑ کے نہیں۔" وہ عاقب سے کہتی۔

"کیا بتاؤ گے تم اپنے بینک کے ساتھیوں کو کہ تمہارے سسر ویلڈنگ کا کام کرتے ہیں۔" وہ اسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتی۔

"اور وہ تمہارا ہونے والا ہم زلف...... گوالا لگتا ہے شکل اور جسم کے بھدے پن سے۔"

عاقب کا چہرہ شرم سے تمتمانے لگتا۔

"انکل کو چاہیے تھا جوڑ دیکھ کر فیصلہ کرتے۔" راحمہ کن انکھیوں سے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہتی۔

"بس بھابی ڈیڈی نے یہ سوچا ہو گا کہ اپنے ہیں۔" عاقب کہتا۔

"ارے بھئی اپنے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا جائے۔" راحمہ تڑکا لگاتی۔

عاقب شرمندہ سا ہو جاتا۔

"بس ایک تمہارے بڑے بھائی کے لیے انکل اچھا فیصلہ کر گئے۔ ورنہ رخشندہ کون سی کوئی دودھ کی دھلی آئی تھی...... سب کچھ ہمارے گھر آ کر ہی سیکھا۔ ہائی ہیل پر لنگڑا لنگڑا کر چلتی تھی۔ اسے میک اپ کرنا میں نے سکھایا۔ اب

بیگم صاحبہ ہم ہی کو سبق پڑھاتی ہیں...... برانڈ سے کم بات ہی نہیں کرتی...... ہماری فیملی میں دیکھو کیسے سلجھے ہوئے نفیس لوگ ہیں...... ایک سے بڑھ کر ایک...... اسی لیے لڑکیوں کے پڑھتے پڑھتے ہی ان کے رشتے طے ہو جاتے ہیں...... بڑی آپا کی بیٹی ماہم کے لیے انجینئر کا رشتہ آیا ہوا تھا مگر وہ کہتی ہیں جانے بوجھے لوگوں میں رشتہ دیں گی...... بھائی کی چھوٹی بیٹی فائزہ تو اتنی پیاری لڑکی ہے کہ میرا عاشر اگر بڑا ہوتا تو میں اسے کسی اور گھر نہ جانے دیتی۔''

عاقب نہایت سعادت مندی سے سنے جاتا۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا تھا کہ راحمہ کا خاندان نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور معاشی و معاشرتی ہر اعتبار سے ایک مستحکم خاندان تھا۔ راحمہ کے خاندان کی لڑکیاں خوبرو، تعلیم یافتہ، اسمارٹ اور روشن خیال تھیں اور اچھے اچھے گھرانوں میں بیاہی جارہی تھیں۔ عاقب اس کے خاندان والوں سے مل کر ہمیشہ متاثر و مرعوب ہوتا۔ راحمہ کی خواہش تھی کہ عاقب کی شادی نسرین سے نہیں اس کے اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے ہوتا کہ ایک گھر میں اسی کے خاندان کی دو بہوئیں ہونے کی وجہ سے رخشندہ کے مقابلے میں اس کا پلڑا بھاری ہو جائے۔

☆☆☆

تنہائی بہت بڑا دکھ ہے۔ راحمہ کو سعودی عرب گئے دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ ہفتے کے اختتام پر اس کی وطن واپسی تھی۔ عاقب اس روز بھی دفتر سے گھر واپس آنے کے بعد حسب معمول پیٹ پوجا کر کے اوپر آگیا تھا۔ موبائل فون سے لگا ایئر فون کانوں میں اڑسے وہ موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ نظر غیر شعوری طور پر گھر کے پچھواڑے مکان کی چھت کی جانب اٹھی جہاں ایک نوجوان لڑکی کھڑی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ لڑکی مسکرا دی۔ اس کا چونکنا یقینی تھا۔

گھر کے پچھواڑے اس مکان میں جاوید اختر زمان رہا کرتے تھے۔ مانسہرہ سے تعلق تھا۔ کاروباری آدمی تھے۔ نہایت چھوٹی سی فیملی تھی جاوید اختر زمان، ان کی اہلیہ اور جاوید صاحب کے معمر والد۔ جاوید صاحب کا برقی آلات کا کاروبار تھا۔ شہر کے وسط میں مصروف کاروباری مرکز میں ان کا شوروم تھا۔ خوشحال آدمی تھے۔ ان کے گھر میں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بعض کئی کئی دن ان کے ہاں قیام بھی کرتے۔ عاقب اور دونوں بڑے بھائیوں کی جاوید اختر، ان کی اہلیہ اور والد سے رسمی سلام دعا رہا کرتی تھی۔ راحمہ اور رخشندہ سے بھی ان کی اہلیہ کی علیک سلیک تھی۔ جاوید صاحب کا گھرانا مذہبی گھرانا تھا۔ جاوید صاحب اور ان کے بوڑھے والد اپنی ضعیفی کے باوجود باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے باقاعدگی سے محلہ کی مسجد آتے جاتے دکھائی دیتے۔ جاوید صاحب لاولد تھے۔ ان کے دو بھائی اور ایک بہن مانسہرہ ہی میں مقیم تھے۔ تاہم جاوید صاحب کے ہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ عارف صاحب مرحوم جاوید اختر زمان کے گھرانے کو اچھا پڑوسی کہا کرتے تھے۔ دونوں گھر پچھواڑے پر ایک مشترکہ دیوار سے ملے ہونے کے باوجود جاوید اختر کے گھر سے کبھی اونچی آواز نہ سنائی دیتی۔ آس پاس کے دیگر گھروں کی چھتوں پر تو بعض پر اکثر و بیشتر اور بعض پر گرمیوں کی شاموں میں خواتین اور لڑکیاں ہواخوری کے لیے ٹہلتی دکھائی دیتی تھیں لیکن جاوید اختر کے مکان کی چھت پر کبھی کوئی خاتون دکھائی نہ دیتی۔ مہمان بھی آتے تو گھر کے اندر ہی رہتے یا گھر کے لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ ان کی چھت پر ایک نوجوان لڑکی کا دکھائی دینا اور وہ بھی محویت سے اسی کو دیکھتے ہوئے عاقب کے لیے اچنبھے والی بات تھی اور اس پر مستزاد اس کے ہڑبڑانے پر لڑکی کا مسکرا دینا۔ وہ موسیقی سے لطف اندوز ہونا بھول کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ شام سے رات تک اور رات کو سونے سے پہلے تک اسے اسی لڑکی کے خیال نے گھیرے رکھا۔ رات میں جتنی دفعہ آنکھ کھلی، کروٹ بدلی اسی کا خیال آیا۔ صبح جاگا تو پھر دھیان اسی طرف گیا۔

''لڑکی'' عاقب کے لیے کوئی ان دیکھی، انجانی جنس نہ تھی۔ ہر جگہ لڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ راحمہ کے ساتھ اس کے خاندان کی تقریبات میں جاتا تو ایک سے بڑھ کر ایک فیشن ایبل لڑکی دکھائی دیتی۔ مگر پڑوس کی چھت پر دکھائی دینے والی اس لڑکی سے پہلے کبھی کوئی لڑکی اسے دیکھ کر اس طرح نہ مسکرائی تھی۔

دفتر میں فرقان علی سے عاقب کی خاصی بے تکلفی تھی۔ فرقان عمر میں اس سے بڑا اور عہدے میں سینئر تھا مگر ثاقب سے دوستی رکھنے کے باعث عاقب کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ بلکہ برادرانہ تھا۔ عاقب نے پڑوس کی چھت پر لڑکی کے مسکرانے کا تذکرہ اس سے کیا تو وہ ہنس کر بولا۔ ''خوش قسمت ہو بیٹے کہ لڑکی تمہیں دیکھ کر مسکرائی۔ ہمیں دیکھ کر تو آج تک کوئی لڑکی روئی بھی نہیں۔''

''آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے فرقان بھائی۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔'' عاقب بولا۔

موسمِ بہار کے سنگ پاکیزہ کے رنگ
بہار کے دل فریب و خوشنما رنگوں سے سجا اپریل 2016ء کا سالگرہ نمبر

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگہت سیما کا خوب صورت ناول اختتامی پڑاؤ کے ساتھ

انجم انصار، دُرِّثمن بلال و نایاب جیلانی کے قسط وار مسحور کُن سلسلے

کھوئے کھوئے لمحے ...... **تابندہ نعیم** کی بھرپور کاوش کا خوب صورت اختتام

رضوانہ پرنس، ثمینہ عظمت علی کی خوب صورت کہانیاں خاص آپ کی نذر

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور **محترمہ اختر شجاعت** کی ایمان افروز حکایتیں

وہ آئے بزم میں
شیریں حیدر کی شیریں بیانیاں

عظمیٰ آفاق سعید کی کتاب کی رونمائی کی پُر لطف تقریب کا احوال

اس کے علاوہ

نگہت اعظمی، شیریں حیدر، میمونہ صدف، ہاجرہ ریحان، عقیلہ حق، ریحانہ زیدی و دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی حسین تحریریں......

اس کے ہمراہ جدید تفریحی معلومات و دیگر خوش بیانیاں لیے مستقل سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

''ایسا ہی ہوتا ہے بیٹے...... ایسی وارداتوں میں نیند اڑ ہی جاتی ہے۔''
''پلیز! مجھے مشورہ دیں۔''
''کیسا مشورہ؟''
''گھر میں اکیلا ہوں میں...... کیا بھابی کے آنے تک نیچے شفٹ کر جاؤں؟''
''نیچے شفٹ کرنے سے کیا ہوگا؟''
''وہ چھت پر آئی بھی تو میں اسے دکھائی نہیں دوں گا۔''
''بہادر بنو یار! کیا لڑکیوں کی طرح منہ بسور رہے ہو...... اب نظر آئے چھت پر تو اس سے فون نمبر مانگ لینا...... بھابی کے آنے تک فون پر گپ شپ کرتے رہنا وقت اچھا گزر جائے گا۔''
''جوتے بھی پڑیں گے۔''
''کس سے؟''
''بھابی سے، ثاقب بھائی سے، عاطف بھائی سے اور اگر پھپھو کے گھر میں خبر ہوگئی تو ان سے بھی...... نسرین جس سے میری بات طے ہے انہی کی تو بیٹی ہے۔''
''چھوڑو یار لوگ شادی کے بعد دوسری لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہیں تم بات طے ہونے کے خیال سے گھبرا رہے ہو۔''
''آپ بڑے تیز ہیں یار فرقان بھائی۔''
''اگر تم للو نہیں ہو تو لڑکی پھنسا کر دکھاؤ۔'' فرقان مسکرایا۔
''چیلنج کر رہے ہیں؟''
''یہی سمجھ لو۔''
''او کے۔''

☆☆☆

راحمہ اور عاشر کی وطن واپسی کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ راحمہ اداس تھی، ثاقب کو چھوڑ کر جانے کو جی نہ چاہ رہا تھا اس کا۔
''میں آپ کو پہلے سے بھی زیادہ مس کروں گی۔'' راحمہ نے ثاقب سے کہا۔
''مجھ سے پوچھو...... تمہارے ساتھ تو وہاں عاشر ہوگا عاقب ہوگا...... میں یہاں اکیلا ہوں گا۔''
''ہمیں اپنے ساتھ ہی رہنے کو کیوں نہیں بلا لیتے؟'' راحمہ نے کہا۔
''دل تو بہت چاہتا ہے مگر...... وہاں بھی تو گھر ہے۔ اسے بھی اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا...... جس کا قبضہ وہی مالک...... میں تو سوچتا ہوں اتنی رقم اکٹھی کرلوں کسی طرح

کہ عاطف اور عاقب کو ان کا حصہ دے کر مکان صرف ہمارا ہوجائے...... پھر بے شک دونوں ہمارے ساتھ بھی رہیں یہ کھٹکا نہیں ہوگا کہ مکان میں حصے دار ہیں۔''
''بات تو بہت اچھی ہے۔'' راحمہ نے گرمجوشی سے تائید کی۔ ''مگر کیا وہ دونوں راضی ہوجائیں گے؟''
''پیسا ملے گا تو کیوں راضی نہ ہوں گے...... اپنا حصہ لیں اور الگ گھر بنائیں...... سوچ رہا ہوں چھٹی پر پاکستان آؤں تو عاقب کی شادی بھی کر دی جائے...... سر پر بیوی بچوں کی ذمے داری پڑے تو پھر انسان اپنا گھر بنانے کی بھی سوچتا ہے۔''
''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ مگر......'' راحمہ بولتے بولتے رک گئی۔
''مگر؟'' ثاقب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''عاقب سے نسرین کا کوئی جوڑ نہیں۔'' راحمہ نے دبی زبان سے کہا۔
''جوڑ ہو یا نہ ہو اپنے گھر کی لڑکی تو ہے...... باہر والیاں تو آکر تگنی کا ناچ نچاتی ہیں۔''
''میں نے آپ کو کتنا نچایا بھلا!'' راحمہ نے ثاقب کو تیکھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
ثاقب لاجواب ہوکر اس کا منہ دیکھنے لگا پھر جھینپ کر بولا۔ ''تمہاری بات اور ہے۔''
''جی نہیں...... یہ کہیے اچھی بری لڑکیاں اپنے خاندان میں بھی ہوسکتی ہیں، غیر خاندان میں بھی...... ساری بات ماؤں کی تربیت کی ہوتی ہے...... ہمارے خاندان میں مائیں اپنی بیٹیوں کی تربیت اور گرومنگ کا پورا خیال رکھتی ہیں۔'' راحمہ کے لہجے میں فخر و رعونت کا احساس تھا۔
''پھپھو بھی اچھی ماں ہیں۔'' ثاقب بولا۔
''مگر تعلیم یافتہ ہونے سے بہت فرق پڑتا ہے...... ایک تعلیم یافتہ ماں کی بیٹی کی اپروچ ہی اور ہوتی ہے...... برا مت مانیے گا...... نسرین کو آپ کی پھپھو نے گھر داری ضرور سکھائی ہے مگر اس کے پہننے اوڑھنے اور بات چیت کرنے سے گنوار پن جھلکتا ہے۔''
ثاقب کچھ شرمندہ سا ہوگیا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کے خاندان کی عورتیں کیا مرد بھی اکثر تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ قریبی خاندانی رشتوں میں بس ایک اس کے والد ہی تھے جو تعلیم سے اپنی رغبت کے باعث خود بھی لکھ پڑھ گئے تھے اور تینوں بیٹوں کو بھی حصول تعلیم کی جانب راغب رکھا تھا۔ ثاقب کے اپنے خاندان کے برعکس راحمہ کا خاندان

پڑھے لکھے لوگوں کا خاندان تھا۔ اس خاندان کے مرد ہی نہیں عورتیں بھی تعلیم یافتہ، مہذب اور روشن خیال تھیں۔

’’نسرین تمہاری صحبت میں رہے گی تو بدل جائے گی۔‘‘ ثاقب مسکرایا۔

’’کیوں میرا کام یہی رہ گیا ہے کہ آپ کے خاندان کی جاہل لڑکیوں کو بدلتی رہوں۔ ایک وہ رخشندہ بیگم ہیں۔ شادی ہوکر ہمارے گھر آئیں تو ہائی ہیل سینڈلز پہنتیں تو لنگڑا کر چلتی تھیں۔ میک اپ انہیں کرنا نہ آتا تھا۔ بلش آن لگانے کی تمیز نہیں تھی۔ پورا چہرہ سرخ کر کے بیر بہوٹی بن جاتی۔ پرفیوم کو پفیوم کہتی تھی آج بیگم صاحبہ کے نخرے ہی نہیں ملتے...... مجھے دیکھ دیکھ کر سب کچھ سیکھا اور اب جب بھی آتی ہے تو مجھ ہی کو ٹپس بتاتی ہے...... ہماری بلی ہم ہی سے میاؤں...... آپ کے ڈیڈی کو رشتے طے کرتے ہوئے دیکھ تو لینا چاہیے تھا کہ کہاں رشتے کر رہے ہیں۔‘‘

’’وہ رشتے طے نہ کرتے تو تم مجھے کہاں سے ملتیں۔‘‘ ثاقب نے راحمہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’قسمت میں ہوتا تو مل ہی جاتی۔‘‘ راحمہ نے توقف کیا پھر بولی۔ ’’عاطف اور رخشندہ کا بھی جوڑ تو نہیں تھا مگر پھر کچھ گوارا لیکن...... عاقب اور نسرین کا تو کوئی جوڑ ہی نہیں...... ابھی اتنی موٹی اور بے تکی ہے شادی کے بعد تو اور پھیل جائے گی۔‘‘

’’بھئی اب جو بھی ہو...... ڈیڈی کا فیصلہ تھا اور ان کے فیصلے کا احترام ضروری ہے۔‘‘

’’چاہے لڑکے کی زندگی برباد ہوجائے؟‘‘ راحمہ نے دائیں ابرو چڑھا کر ثاقب کو دیکھا۔

’’انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا...... نسرین جس ماحول میں رہے گی آہستہ آہستہ اس میں ڈھل جائے گی۔‘‘

’’میں تو کہتی ہوں اب بھی موقع ہے...... سوچ لیں...... نسرین کو آپ کے خاندان میں اسی کی طرح کا کوئی رشتہ مل جائے گا...... عاقب کے لیے اس کے جوڑ کی لڑکی دیکھیں...... عاقب ہینڈسم ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ بینک میں ملازم ہے۔ اس کا ایک اسٹیٹس ہے خود اپنی وجہ سے بھی اور آپ دونوں بڑے بھائیوں کی وجہ سے بھی...... اس کی شادی کسی اچھے خاندان کی خوش شکل، تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی سے ہونی چاہیے۔‘‘

’’نہیں راحمہ...... ڈیڈی جو فیصلہ کر گئے، کر گئے۔ ہم کون ہوتے ہیں اس فیصلے میں رخنہ ڈالنے یا اسے تبدیل کرنے والے۔‘‘ ثاقب نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

’’یہ فیصلہ ہے؟‘‘

’’میرا نہیں...... ڈیڈی کا...... اور ڈیڈی کا ہر فیصلہ ان کی زندگی میں بھی پتھر کی لکیر ہوا کرتا تھا...... ان کی موت کے بعد بھی پتھر کی لکیر ہی رہے گا...... اور ہاں دیکھو مجھ سے تو تم نے یہ بات کہہ دی...... عاطف، رخشندہ اور خاندان کے کسی اور فرد خاص طور پر عاقب کے سامنے یہ بات اپنے منہ سے نہ نکالنا ورنہ ہماری نیت پر بھی شک کیا جائے گا اور ہمیں مرے ہوئے باپ کے فیصلے سے روگردانی کا مجرم بھی ٹھہرایا جائے گا...... انسان کی زندگی میں ساری اہمیت زبان ہی کی ہوتی ہے...... پھپو بے چاری کب سے انتظار میں بیٹھی ہیں...... بس اب دیر نہیں کرنی...... چھٹی پر گھر آیا تو یہ کام نمٹا کر ہی واپس آؤں گا...... تم بھی پھپو کے کان میں یہ بات ڈال دینا...... میں بھی یہاں سے فون کر کے کہہ دوں گا...... ہماری امانت ہمیں سونپنے کی تیاری کریں۔‘‘

راحمہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ ثاقب سے اتنی مغز ماری بے کار ثابت ہوئی تھی۔ عاقب کے لیے اپنے ہی خاندان کی کسی لڑکی کو بیاہ کر لانے کی خواہش ثاقب سے ہونے والی اس گفتگو کے بعد حسرت کا روپ دھار گئی۔

☆☆☆

برسوں کا فاصلہ گویا دنوں میں طے ہوگیا تھا۔ پڑوس کے مکان کی چھت پر نظر آنے والی اس لڑکی سے عاقب کی لائن مل چکی تھی۔ دونوں کو رات کا بے چینی سے انتظار رہتا۔ رات ہوتے ہی وہ موبائل فون پر راز و نیاز میں مشغول ہوجاتے اور رات بھر یہ آنکھ مچولی چلتی رہتی۔

اس کا نام ماہ نور تھا۔ جاوید اختر زمان کی بیوی کی سگی چھوٹی بہن کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ ایک ٹریفک حادثے میں مر گیا تھا۔ اس وقت وہ صرف ڈھائی سال کی تھی اور والدین کی اکلوتی تھی۔ باپ کی موت کے بعد اس کی ماں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ بھائی کے گھر میں رہتے ہوئے بڑی تنگدستی کی زندگی بسر کی اور بیٹی ماہ نور کو پالا پوسا۔ ماہ نور اسکول کے آخری سال میں تھی کہ ماں بیمار پڑ گئی۔ کینسر تشخیص ہوا۔ بھائی علاج کے لیے لاہور بھی لے گیا مگر پتا چلا کینسر بہت پھیل چکا تھا۔ چند ہی ماہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ ماں کے انتقال کے بعد ماہ نور کو اس کی خالہ اور خالو اپنے ساتھ کراچی لے آئے۔ دونوں لاولد تھے۔ ماہ نور کو انہوں نے اپنی بیٹی بنالیا اس کی خالہ اس کے آجانے سے بہت خوش تھی۔ ماہ نور میٹرک پاس کر چکی تھی۔ کراچی لے آنے کے بعد خالہ اور خالو اسے اپنے ہی علاقے کے ایک کالج میں

داخل کروانے کے لیے کالجوں میں داخلے کھلنے کے منتظر تھے لیکن اس بات سے بے خبر کہ جس یتیم و لیسر بھانجی کو وہ بیٹی بنا کر اپنے گھر لائے تھے وہ تو پڑوس کے رہائشی نوجوان سے چند ہی دن میں بہت پینگیں بڑھا کر ان کی سوچ سے بھی آگے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''مجھے نہ کالج میں داخلے سے دلچسپی ہے نہ کہیں اور...... مجھے بس تم سے شادی کرنی ہے عاقب۔'' اس نے عاقب سے کہہ دیا تھا۔

ابھی تک دونوں میں فون پر ہی راز و نیاز چل رہے تھے۔ چھت پر دور دور سے ایک دوسرے کا دیدار بھی کر لیتے۔ ادھر ادھر دیکھ کر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس انہیں کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا کبھی کبھار ہلکی سی اشارہ بازی بھی ہو جاتی۔ رہیں باتیں تو وہ رات بھر دونوں ہی دل کھول کر کرتے تھے۔ فون پر پیکیج کی سہولت نے دونوں ہی کا کام آسان کر رکھا تھا۔ تنگی ویسے بھی دونوں میں سے کسی کو نہیں تھی۔ عاقب خود کفیل تھا۔ ماہ نور کو خالہ اور خالو کے گھر میں ہر قسم کی فراغت میسر تھی۔ جنک فوڈ خریدنے کے بہانے قریبی مارکیٹ جاتی اور وہاں سے موبائل فون کارڈ بھی خرید لاتی۔ ویسے تو عاقب نے بھی کہہ رکھا تھا بیلنس ختم ہو جائے تو وہ اس کے فون پر لوڈ کرا سکتا ہے مگر کیا ضرورت تھی اسے۔ خوشحال خالہ اور خالو کی زیر سرپرستی آ کر عاقب کا احسان لینے کی...... جتنے عیش و عشرت میں وہ آج کل تھی اس کا تو اس نے اپنی ماں کی زندگی میں ماموں کے گھر میں بھی خواب میں نہیں سوچا تھا۔ خالہ اور خالو نے اسے ماں کی پہلی جمعرات کے بعد ماموں کے گھر سے اپنے ساتھ کراچی لاتے ہوئے انہیں زبان دی تھی کہ وہ ماہ نور کو اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ وہ واقعی ایسا ہی کر رہے تھے۔ بیوی کی خوشنودی کی خاطر جاوید صاحب ماہ نور کو اپنے گھر میں بہت اہمیت دیتے اور جب باہر سے گھر آتے تو ماہ نور کو نہ دیکھنے پر ان کا اپنی اہلیہ سے پہلا سوال یہی ہوتا۔ ''ماہ نور بیٹی کہاں ہے؟''

ماہ نور کو خالہ کے گھر میں علیحدہ کمرا، علیحدہ ٹی وی، کیبل اور موبائل فون کی سہولت میسر تھی۔ خالہ نے اسے بہت سے نئے کپڑے بھی بنا دیے تھے۔ وہ جب بازار جاتیں اس کا ساتھ جانا لازم ہوتا اور وہ اسے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور خرید دیتیں۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی تھی۔ فریج ہر وقت بھرا رہتا۔ خالو جو پھل اور میٹھا کھانے کے انتہائی شوقین تھے اتنے پھل اور میٹھی اشیا خرید لاتے کہ گھر میں مہمانوں کی آمد پر ان کی خاطر تواضع کے لیے باہر سے کچھ منگوانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ گھر کا کام کاج کرنے کے لیے گھر میں گاؤں سے آئی ہوئی ایک کل وقتی ملازمہ تھی اور دوسرا کراچی ہی کا ایک آدمی جو بوقت ضرورت ڈرائیوری بھی کرتا۔ خالہ نے ماہ نور کو گھر میں ہر وقت پہننے کے لیے سونے کے دو کنگن، لاکٹ، بالیاں اور دو انگوٹھیاں بھی بنوا دی تھیں۔ ماہ نور کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ماں کے بعد اسے اتنی چاہنے والی خالہ کی سرپرستی میسر آ جائے گی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے آ جانے سے خالہ اور خالو کو بھی یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے برسوں بعد ہی سہی وہ اچانک صاحب اولاد ہو گئے تھے۔

☆☆☆

راحمہ کو وطن واپسی پر عاقب کی چوری پکڑنے میں زیادہ دن نہیں لگے۔ ایک روز نیچے سے چھت پر آتے ہوئے اس نے ماہ نور کو اپنی چھت پر کھڑے اور اسے اور عاقب کو اشارے بازی کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ماہ نور گھبرا کر منظر سے ہٹ گئی عاقب جھینپ کر کان کھجانے لگا۔

''یہ کیا ہو رہا تھا؟'' راحمہ نے عاقب کو گھورا۔

''کچھ نہیں بھابی...... کچھ بھی تو نہیں۔'' عاقب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

راحمہ نے اس کا کان اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا اور بولی۔ ''میں نے دیکھ لیا ہے بچو۔''

''وہ...... بھابی...... پلیز...... کسی اور کو مت بتائیے گا۔'' عاقب نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''چلو نہیں بتاؤں گی کسی اور کو...... مگر یہ بتاؤ کب سے ہے یہ چکر اور یہ لڑکی ہے کون؟''

''تھوڑے دنوں سے...... جاوید صاحب کی بیگم کی بھانجی ہے۔'' عاقب نے اس کے دونوں سوالوں کا جواب دیا۔

''آئی ہوئی ہے؟''

''اب یہیں رہتی ہے...... ان لوگوں کے پاس...... آپ کے سعودی عرب جانے سے کچھ دن پہلے آئی تھی اپنی امی کے انتقال کے بعد۔''

''اچھا اچھا...... سعودیہ جانے سے پہلے میں نے برابر والی سے سنا تو تھا کہ جاوید صاحب کی بیگم کی بہن کا انتقال ہو گیا ہے۔ تعزیت کے لیے جانے کا ارادہ تھا مگر کوئی ساتھ جانے والا نہیں ملا۔ جا ہی نہ سکی پھر تمہارے بھائی کے پاس جانا ہو گیا۔''

''اب ہو آئیے گا۔''

''دیکھوں گی...... ویسے بھی ان کا گھر دوسرے رخ

پر ہونے کی وجہ سے ہمارے اچھے تو تعلقات نہیں ہیں ان لوگوں سے...... کسی روز چھت سے نظر آگئیں جاوید صاحب کی بیگم اپنے لان میں بیٹھے تو تعزیت کرلوں گی...... اچھا تو یہ جاوید صاحب کی مرحومہ سالی کی بیٹی ہے۔'' راحمہ اصل موضوع پر آگئی۔

عاقب نے نظریں جھکا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''ہے تو خوب صورت!''

''سمجھدار بھی ہے۔'' عاقب نے ترت کہا۔

''سمجھدار ہے تبھی تو دیکھ کر پھنسایا ہے اس نے تمہیں۔''

''نہیں نہیں، وہ تو بس ایک بار دیکھ کر مسکرائی تھی۔ فون نمبر میں نے ہی مانگا تھا اس سے۔''

''اچھا جی!'' راحمہ نے عاقب کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ''تو بات فون تک پہنچی ہوئی ہے۔''

''بھائی کو مت بتایئے گا۔''

راحمہ جو عاقب اور نسرین کے طے کردہ رشتے میں دراڑ ڈلوانے کی کوشش میں ناکام رہی تھی ایک عجیب سے احساس سے دوچار ہوئی۔ وہ کام جو وہ نہیں کر پائی تھی۔ پڑوس کی اس لڑکی سے وہ کام لیا جاسکتا تھا۔ عاقب کے لیے اگر اس کے حسب منشا اس کے اپنے خاندان کی کوئی لڑکی نہیں تو پھر نسرین بھی نہیں۔ بے شک کوئی اور ہی سہی...... غیر سہی...... ایک ہی خاندان کی دو لڑکیاں آجانے سے وہ تو اقلیت نہیں بنے گی نا...... دو فرسٹ کزنز مل کر تو اس کے خلاف نہ جانے کیا کیا سازشیں کریں گی...... جذبۂ رقابت اور حسد انسان کی سوچ اور فکر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

''ثاقب کو نہیں بتاؤں گی مگر ایک شرط پر۔'' راحمہ نے کہا۔

''وہ کیا؟'' عاقب چونکا۔

''جو ہوا ہے اب تک وہ بھی مجھے بتا دو...... اور آئندہ بھی بتاتے رہنا۔''

عاقب نے کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے راحمہ کو دیکھا۔

''رازداری کا وعدہ کرتی ہوں۔'' راحمہ نے اپنا ہاتھ عاقب کی جانب بڑھایا۔ عاقب نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

نسرین ان دونوں ہاتھوں کے بیچ کہیں گم ہوگئی۔

☆☆☆

ایک طرف راحمہ نے ثاقب کی خواہش کے مطابق اس کا یہ پیغام پھپو کے گھر پہنچا دیا کہ ثاقب چھٹی پر گھر آئے گا تو عاقب کی شادی کر کے جائے گا۔ دوسری جانب وہ عاقب اور ماہ نور کے درمیان کھیلے جانے والے کھیل کی نہ صرف تماشائی بلکہ عاقب کی رازداں بھی بن گئی۔ وہ عاقب سے ماہ نور کی بابت چھیڑ چھاڑ رکھتی، اس کے اور ماہ نور کے درمیان فون پر ہونے والی باتیں کرید کرید کر پوچھتی۔ عاقب شروع شروع اس کی چھیڑ چھاڑ اور کرید پر جھینپتا، شرماتا اور گھبرا بھی جاتا مگر راحمہ کی مسلسل چھیڑ چھاڑ نے بالآخر اسے بھی بے حجاب کر دیا اور وہ اسے فون پر ماہ نور سے ہونے والی باتیں نہ صرف زبانی کلامی بتانے لگا بلکہ اپنے اور ماہ نور کے میسجز بھی اسے بے تکلفی سے دکھانے اور پڑھوانے لگا۔ ماہ نور کے معاملے میں اس کے اور راحمہ کے درمیان کوئی حجاب رہا نہ راز۔ تاہم راحمہ نے اس معاملے میں ماہ نور سے فاصلہ رکھا ہوا تھا اور عاقب کو بھی یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ماہ نور کو یہ نہ بتائے کہ وہ اس کے اور عاقب [illegible] چکر سے آگاہ تھی۔

''کیوں نہ بتاؤں بھابی؟'' عاقب نے پوچھا۔

''اس لیے منا بیٹے کہ اسے اگر یہ پتا چل گیا کہ بھابی کو بھی اس کی اور تمہاری دوستی کا علم ہے تو وہ اس ڈر سے کہ بھابی کسی سے کچھ کہہ سن نہ دیں تم سے اپنا افیئر ختم بھی کر سکتی ہے۔''

یہ دلیل عاقب کے دل کو لگ گئی۔

☆☆☆

نسرین کے گھر والوں نے شادی کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن ثاقب کی پھوپی کا راحمہ کو فون آجاتا اور وہ اسے نسرین کے جہیز کی تیاری سے متعلق تازہ ترین معلومات اسے بتا کر اس سے رائے مشورہ بھی چاہتیں۔

''اس لیے تم سے مشورہ کرتی ہوں راحمہ کہ تم گھر کی بڑی ہو۔ تمہیں پتا ہے کہ گھر میں کس چیز کی ضرورت ہے کس کی نہیں...... ایسی چیزیں جن کی ضرورت نہ ہو خوامخواہ جہیز میں دینے سے فائدہ۔'' پھپو نے ایک دن کہا۔

''جی پھپو آپ ٹھیک کہتی ہیں...... اور بہت شکریہ کہ آپ مجھے اتنی اہمیت دیتی ہیں۔'' راحمہ نے اوپری دل سے کہا۔

''اہمیت دینے کی کیا بات بیٹا تمہیں اللہ نے رشتے میں، مقام میں بڑائی دی ہوئی ہے اس گھر میں۔''

''آپ کی محبت ہے پھپو۔''

''میں تو نسرین کو بھی سمجھاتی رہتی ہوں کہ اس گھر جا کر اپنی بڑی جیٹھانی کو بڑی بہن اور ماں کا سا مقام دینا...... ہر اچھی بری اسی سے پوچھنا...... اسی سے صلاح مشورہ رکھنا...... بھئی ماں کا کام تو یہی ہوتا ہے کہ وہ بیٹیوں کو صحیح سیکھ دے۔''

''بالکل پھپو...... آپ ٹھیک کہتی ہیں۔''

''بیٹا! نسرین اس گھر سے تمہارے گھر آکر تمہاری ہی ہوگی...... ہمارے گھر میں تو بس اب تھوڑے سے دنوں کی مہمان ہے یہ۔'' پھپو کی آواز بھرا گئی۔

راحمہ دل ہی دل میں ہنسی۔ پھپو کو کیا معلوم عاقب کو ان کی بیٹی میں شاید پہلے کبھی دلچسپی رہی ہو مگر اب تو رتی بھر بھی نہیں تھی، اس کی پینگیں تو ماہ نور کے ساتھ روز افزوں تھیں۔

کالجوں میں داخلے شروع ہو چکے تھے۔ ماہ نور نے بھی خالہ کے ساتھ جا کر گھر کے قریب ہی واقع ایک کالج میں داخلے کی درخواست جمع کروا رکھی تھی۔ میرٹ لسٹ میں اس کا نام نہیں آسکا تھا۔ کالج انتظامیہ نے دوسری اور تیسری لسٹ کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔

''اگر دوسری اور تیسری لسٹ میں بھی نام نہ آیا تو؟'' عاقب نے اس سے پوچھا۔

''تو خالو جی کہتے ہیں کسی پرائیویٹ کالج میں داخل کرا دیں گے۔''

''یار! ہمارے کالج میں داخلہ لے لونا۔''

''تمہارا کالج! تمہارا کون سا کالج ہے؟''

''تمہاری خالہ کے گھر کے پیچھے...... بس ایک دیوار ہی تو ہے درمیان میں...... آجاؤ کسی روز داخلہ لینے۔''

عاقب جو شروع میں بہت گھبرایا گھبرایا رہتا تھا اب اس سے ایسی ہی باتیں کرنے لگا تھا۔

''خالہ میرا حلوا بنا دیں گی۔''

''بہت لذیذ، بہت میٹھا ہوگا۔''

''بدتمیز!''

''کسی روز آؤ نا۔''

''کہاں؟''

''ہمارے گھر۔''

''تمہاری بھابی میری خالہ سے دعا سلام ہی نہیں رکھتیں۔ ان کا آنا جانا ہوتا خالہ کے ہاں تو شاید میں بھی خالہ کے ساتھ کسی دن آہی جاتی تمہارے ہاں۔'' اس نے شاکی لہجے میں کہا۔

''بھابی دراصل مصروف، بہت رہتی ہیں۔''

''مصروف تو خالہ بھی بہت رہتی ہیں۔''

''بھابی کے ساتھ بچہ بھی تو ہوتا ہے نا...... اسے اسکول بھیجنا، ہوم ورک کرانا...... بھابی سارا دن کاموں میں لگی رہتی ہیں۔''

''خالہ کے ساتھ میں ہوتی ہوں...... خالہ بھی دن بھر کاموں میں لگی رہتی ہیں، نوکر ہیں مگر ان سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔''

''تمہارے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔''

''امی کے ساتھ رہ کر سیکھا ہے...... امی نے بڑی مشکل زندگی گزاری، امی کہا کرتی تھیں جب بندے کی زندگی مشکل سے گزرے تو اسے دوسرے کی بات کا جواب دینا آجاتا ہے۔''

''امی کی زندگی مشکل سے گزری؟''

''بہت...... اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے...... مجھے تو اب یوں لگتا ہے جیسے خالہ کے گھر میں، میں جنت میں رہ رہی ہوں۔''

''تم میری بات گول کر گئیں۔''

''کون سی بات؟''

''کسی روز آؤ نا۔''

''کہاں؟''

''ہماری طرف۔''

''خالہ کے بغیر میں کیسے آسکتی ہوں؟''

''خالہ کے بغیر تم مجھ سے عشق بھی تو کر رہی ہو۔''

''مگر ان کے بغیر آ نہیں سکتی تمہاری طرف۔''

''مجھ سے شادی کرنے کو کہتی ہو اور آ نہیں سکتیں...... اگر تمہاری خالہ اور خالو مجھ سے تمہاری شادی کرنے پر راضی نہ ہوئے تو کیا تب بھی تم ایسی ہی بزدلی دکھاؤ گی؟''

''نہیں نہیں عاقب...... شادی تو میں تمہی سے کروں گی۔''

''پکا؟''

''بالکل۔''

''لیکن یار ایک مسئلہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ڈیڈی میری بات اپنی بہن یعنی میری پھپو کی بیٹی سے طے کر گئے تھے اور بڑے بھائی کہتے ہیں چھٹی پر پاکستان آئے تو میری شادی کر کے جائیں گے۔''

''تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی مجھے؟'' وہ یک لخت روہانسی ہوگئی۔

''بتانے کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔''

''اب کیسے آگیا؟''

''کیونکہ تم کالج میں داخلہ لینے والی ہو۔ پھپو شادی کی تیاری کر رہی ہیں اور بڑے بھائی دو مہینے بعد چھٹی پر آنے والے ہیں...... تمہارا کالج میں داخلہ ہوگیا اور بھائی نے میری شادی پھپو کے ہاں کر دی تو پھر تم مجھ سے کیسے

شادی کرسکو گی؟"

"تم میرے علاوہ کسی اور سے کرلو گے شادی؟"

عاقب سے جواب نہ بنا تو اس نے الٹا سوال داغ دیا۔ "تم کرلو گی؟"

"نہیں۔" اس نے بلا توقف فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ماہ نور عمر کے اس حصے میں تھی جہاں شعور و دانش سے زیادہ جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسے عاقب دنیا کے ہر دوسرے انسان سے بڑھ کر اچھا اور اپنا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر عاقب نے اپنے چہرے سے لحاف ہٹائے بغیر قدموں کی چاپ کو بھابی کی آمد پر محمول کرتے ہوئے کہا۔ "آج سردی بہت ہے بھابی۔"

دروازہ آہستگی سے بند ہوگیا۔ قدموں کی چاپ نزدیک ہوتی گئی پھر مہین سی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چھلانگ لگا کر گرم بستر سے نکل آیا۔ "تم!" زیرو پاور بلب کی نیلگوں روشنی میں ماہ نور اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"ہاں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اس وقت!"

"تم نے کہا تھا نا...... آؤ۔"

وہ اپنی بات سے مکر نہ سکتا تھا مگر...... اب جب وہ آ گئی تھی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

"تمہارے گھر والے؟"

"سو رہے ہیں۔"

"تم آئیں کیسے؟"

"دیوار کود کر۔"

وہ اس کی جرأت رندانہ پر حیران رہ گیا۔ اتنی سردی اور اندھیرے میں وہ دو گھروں کی مشترکہ دیوار پھلانگ کر اس تک پہنچی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آ گئی...... اتنی کہ وہ اس کی گرم سانسیں اپنے وجود پر محسوس کرسکتا تھا۔

"عاقب! میں صرف تم سے شادی کروں گی۔"

کمرے میں وہ تھا، ماہ نور، تاریکی اور......

صبح پو پھٹنے سے پہلے وہ گھر کی زیریں منزل پہ راحمہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑا دروازے کو آہستگی سے کھٹکھٹا رہا تھا۔

"کون؟" راحمہ نے پوچھا۔

"میں ہوں بھابی۔"

"خیریت!" راحمہ نے دروازہ کھول کر پوچھا۔

"وہ...... بھابی...... وہ......" زبان اس کا ساتھ دے رہی تھی نہ الفاظ۔ "بھابی...... وہ......"

"بول بھی چکو عاقب...... مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"وہ...... ماہ نور...... رات وہ...... ہماری طرف آ گئی تھی۔"

"ہاہ!" راحمہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "پھر گئی کیسے؟"

"وہ گئی نہیں...... اوپر کمرے میں ہے۔"

"اوہ میرے خدا!" راحمہ چکرا سی گئی۔ "رات بھر تمہارے کمرے میں رہی؟" اس نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

عاقب کا سر جھک گیا۔

بھابی نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور اس کی نظریں فرش سے جا لگیں۔ وہ مجرم بنا کھڑا تھا...... مجرم تو تھا وہ...... بلکہ گناہ گار!

یکایک راحمہ کی تھرتھری چھوٹ گئی اور دانت بجنے لگے۔ "صبح ہونے والی ہے اسے جلدی واپس بھیجو۔" اس نے مسلسل بجتے دانتوں کی کٹکٹاہٹ میں کہا۔

"وہ واپس جانے کو تیار نہیں۔" عاقب نے کہا۔

"کیا!" راحمہ نے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے لرزتے وجود کے ساتھ گھر کے لاؤنج سے اوپر جاتے زینے کا رخ کیا۔ جس کھیل کا وہ اتنے دنوں سے خود بھی ایک اہم کردار بنی رہی تھی اس کے اس منظر نے اس کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں ہوگا۔

☆☆☆

کمرے کا منظر اور ماہ نور کی جھکی جھکی نظریں زبانِ حال سے گزشتہ شب کی داستان سنا رہی تھیں۔ راحمہ نے عاقب کی طرف دیکھا اس نے نظریں چرالیں۔ راحمہ نے کمرے کی جاوید اختر کے مکان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کا پردہ چٹکی سے پکڑ کر نہایت احتیاط سے ذرا سا ہٹایا اور باہر جھانکا۔ جاوید صاحب کے گھر میں مکمل سناٹا تھا اور کسی کمرے میں روشنی نہ تھی۔ اس کا مطلب تھا اہلِ خانہ ابھی سو رہے تھے۔ راحمہ پردہ چھوڑ کر پلٹی اور اس نے ماہ نور کو ڈانٹا۔ "کتنی بڑی غلطی کی تم نے...... اٹھو...... اپنے گھر جاؤ......" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور عاقب کو گھورتے ہوئے بولی۔ "یہ نالائق تمہیں دیوار چڑھا دے گا۔"

ماہ نور ٹس سے مس نہ ہوئی بیٹھی رہی۔

"سنا نہیں تم نے میں کیا کہہ رہی ہوں۔" راحمہ نے تیور مزید بگاڑے۔

ماہ نور بدستور سر جھکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔

"اٹھو بھی۔" راحمہ نے اس کے نزدیک پہنچ کر اس کا بازو جھنجوڑا۔

ماہ نور منہ سے کچھ نہیں بولی لیکن اس نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا مطلب!" راحمہ غرائی۔

"مجھے نہیں جانا۔" ا نو نے دھیمی آواز میں کہا۔

"پاگل ہوئی ہو! مرواؤ ہمیں اور...... خود بھی مروگی۔" راحمہ کے لہجے میں ناگواری تھی۔ "اٹھو...... ابھی روشنی نہیں ہوئی...... تمہارے گھر والے جاگ گئے تو انہیں پتا چل جائے گا کہ تم گھر میں نہیں ہو۔"

"پتا چلنے دیں۔" وہ بولی۔

"دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا...... قیامت کردیں گے تمہارے گھر والے۔"

"کرنے دیں۔" اس کا انداز سرفروشانہ ہو گیا۔

راحمہ نے عاقب کو دیکھا اور غرائی۔ "کھڑے دیکھ کیا رہے ہو...... اسے بھیجو اس کے گھر۔"

عاقب دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

"میں کیا بکواس کر رہی ہوں عاقب۔" راحمہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"بھابی...... وہ جا نہیں رہی تو میں کیا کروں۔" عاقب بے بسی سے بولا۔

"پھر انجام بھگتنے کو تیار ہو جاؤ...... نہ اس کے گھر والے بخشیں گے تمہیں نہ تمہارے اپنے بھائی۔"

"آپ بتائیں میں کیا کروں؟"

"کرو یہ کہ......" راحمہ نے بیڈ پر بیٹھی ماہ نور کی طرف انگلی اٹھائی۔ "گناہ کی اس پوٹلی کو اس کے گھر میں پھینک دو۔" راحمہ بھول رہی تھی کہ گناہ کے اس کھیل کو ہوا دکھانے میں اس نے بھی حصہ ڈال رکھا تھا۔

"چلو بھئی اٹھو۔" عاقب نے ماہ نور سے کہا۔

"نہیں جاؤں گی۔"

راحمہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر ہیجانی کیفیت میں چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

"دیکھو...... پلیز...... ابھی وقت ہے...... تم خاموشی سے اپنے گھر واپس جا سکتی ہو...... چلی جاؤ......" راحمہ نے اپنا لہجہ بدل لیا۔

ماہ نور ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں جیسا تم نے کیا...... گھر جاؤ......" راحمہ نے اسے پچکارا۔

"نہیں جانا...... نہیں جانا۔"

"تمہیں پتا ہے تم نہیں گئیں تو ہم لوگ کتنی مشکل میں آجائیں گے۔" راحمہ گڑگڑائی۔

"میں بھی تو مشکل میں آجاؤں گی۔"

"ہاں تو اسی لیے تو کہہ رہی ہوں چلی جاؤ اپنے گھر۔"

"نہیں جانا۔"

"آخر کیوں!"

"بس۔"

"بس کا مطلب۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ راحمہ کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔

راحمہ پھر کھڑکی تک پہنچی اور اس نے اسی احتیاط سے پھر باہر جھانکا اور یک لخت گھبرا کر پلٹی۔ "تمہارے گھر میں ایک کمرے کی بتی جل گئی ہے...... کوئی جاگ گیا ہے شاید۔"

اس نے ایک نظر راحمہ کو دیکھا۔ تھوڑی سی گھبرائی مگر اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"اب خود ہی نمٹنا اس مصیبت سے۔" راحمہ نے عاقب پر آنکھیں نکالیں۔

عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔

"تھانہ کچہری ہو جاتا ہے ایسے قصوں میں۔" راحمہ بھبکی۔

"میرا کیا قصور بھابی...... وہ خود آئی ہے۔"

"ہاں ہاں...... تم تو جیسے بہت معصوم...... دودھ پیتے بچے ہونا...... سب کچھ کر کے بیٹھ گئے اور کہتے ہو میرا کیا قصور۔"

"عاقب تم نے خود ہی تو بلایا تھا مجھے۔" ماہ نور دھیمی آواز میں بولی۔

راحمہ نے چونک کر عاقب کو دیکھا پھر ماہ نور کو گھورتے ہوئے ترش لہجے میں بولی۔ "اور تم اتنی بھولی تھیں کہ اس کے بلانے پر آگئیں...... وہ بھی رات کو...... شرم نہیں آئی تمہیں؟"

ماہ نور نے پھر کر عاقب کو دیکھا۔ "عاقب! بتاؤ نا انہیں تم نے مجھ سے کیا کہا ہے۔"

راحمہ نے چونک کر سوالیہ نظروں سے عاقب کو یوں دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ اس نے ایسا کیا کہا تھا، ماہ نور سے۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ "کیا کہا ہے؟" اس کی خاموشی نہ ٹوٹنے پر راحمہ کو پوچھنا پڑا۔

"کچھ نہیں۔" عاقب بولا۔

"جھوٹ مت بولو...... بتاؤ نا تم نے مجھ سے کہا ہے کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔"

صورتِ حال یہ نہ ہوتی جو کہ اس وقت تھی تو راحمہ

خوشی سے بے اوسان ہوگئی ہوتی۔ یہی تو چاہتی تھی وہ کہ عاقب اپنی پھوپی زاد نسرین کے بجائے کسی اور سے شادی کرلے تا کہ اس گھر میں نسرین کے بہانے اس کی پھوپی کے جاہل اور کمتر گھرانے کا عمل دخل نہ ہونے پائے۔ مگر اس وقت صورت حال کچھ اور تھی۔

''شادی ایسے ہوتی ہے۔'' راحمہ نے ماہ نور کو گھورا۔

اس نے سر جھکالیا۔

''کھڑے کیا ہو اب اس مصیبت کا کوئی حل نکالو۔''

راحمہ عاقب کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔

عاقب اسے شرمساری سے دیکھنے لگا۔

''میرا منہ کیا تک رہے ہو..... کچھ کرو..... صبح ہوگئی ہے۔''

''فر..... فرقان..... بھائی کو..... بتاؤں۔'' عاقب اٹکتے ہوئے بولا۔

''وہ کیا کرلے گا۔''

''یہ جا نہیں رہی تو..... شاید وہی کچھ مشورہ دے دیں۔''

''صبح صبح اس کا فون کھڑکاؤ گے؟''

''مجبوری ہے نا بھابی۔''

''کرلو۔'' راحمہ نے ماہ نور پر ناگواری سے نظر ڈالی اور پھر اسی کھڑکی کی طرف پیش قدمی کی۔ کھڑکی پر پڑا پردہ پھر اسی احتیاط سے ذرا سا ہٹا کر جاوید اختر کے گھر کی طرف دیکھا پھر گھبرا کر پیچھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے سب جاگ گئے ہیں۔''

''آٹھ نو بجے سے پہلے کسی کو پتا نہیں چلے گا...... میرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے..... میں کھڑکی سے کود کر آئی ہوں۔'' ماہ نور نے کہا۔

راحمہ کے جبڑے آپ ہی آپ بھینچ گئے۔ کیسی فتنہ لڑکی تھی۔

فرقان سے بات کرنے کو عاقب نیچے چلا گیا۔

''فرقان بھائی آپ ہماری طرف آسکتے ہو؟'' عاقب فون پر فرقان علی سے کہہ رہا تھا۔

''اتنی صبح! خیریت؟'' فرقان علی اپنے بستر میں تھا۔

''ایمرجنسی ہے فرقان بھائی۔''

''کیا ہوا؟'' فرقان اٹھ بیٹھا۔

''آپ آؤ گے تو بتاؤں گا..... فون پر بتانے والی بات نہیں۔''

''میں تو ابھی جاگا ہوں..... شاور لوں گا..... تیار ہوں گا..... پھر نکلوں گا تمہاری طرف آنے کے لیے..... اتنی دیر میں تم کیوں نہیں آجاتے میری طرف۔'' فرقان علی کے وہم وگمان میں بھی وہ نہ تھا جو ہو چکا تھا۔ ''بائی دی وے ایمرجنسی کی نوعیت کیا ہے؟ ثاقب اور عاطف تو خیریت سے ہیں نا؟''

''جی..... جی..... ادھر تو سب خیریت ہے...... رات وہ آگئی تھی ہماری طرف۔'' عاقب نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

''وہ! وہ کون؟''

''یار وہی نا...... ماہ نور...... جس سے میری ڈائٹنگ چل رہی تھی۔''

''اچھا' اچھا! کیا کہا تمہاری طرف آگئی تھی؟''

''جی..... اور اب اپنے گھر واپس جانے کو تیار نہیں۔''

''یعنی رات کو وہ تمہاری طرف ہی رہی؟''

''جی۔''

''او مائی گاڈ!'' فرقان علی کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اس کے گھر والوں کو پتا نہیں چلا؟''

''پتا چلتا تو کھینچ کر نہ لے جاتے...... اب جاگیں گے تو پتا چلے گا۔''

''آئی کیسے؟''

''دیوار پھلانگ کر۔''

''یار بھیجو اسے اس کے گھر ورنہ ایسے پھنسو گے کہ جان چھڑانی مشکل ہوجائے گی۔''

''وہ جانے کو تیار ہی نہیں۔''

''بس تو اب کچھ بھی بھگتنے کو تیار رہو۔''

''فرقان بھائی! پلیز بتائیں نا کیا کروں؟''

''میں کیا بتاؤں۔''

''آپ ہی نے تو کہا تھا فون نمبر مانگنے کو۔''

''یہ تم کافی دن پہلے کی بات یاد دلا رہے ہو مجھے۔'' فرقان کے لہجے سے عیاں تھا کہ اس نے عاقب کی بات کا برا منایا تھا۔ ''یار! یہ کب کہا تھا میں نے کہ وہ تمہارے گھر آجائے تو رات بھر مزے کرنا۔'' فرقان یکلخت تلخ ہوگیا۔

''پلیز فرقان بھائی میری مدد کریں۔'' وہ گڑگڑایا۔

''بھابی بھی بہت پریشان ہیں۔''

''ہونا چاہیے...... جانتے ہو کیا ہوتا ہے ایسی باتوں کا انجام...... پولیس، تھانہ، کچہری...... اور دشمنیاں الگ لڑکی والوں کے لیے عزت کا مسئلہ ہوتا ہے۔''

''غلطی ہوگئی فرقان بھائی۔''

''تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بھائی دونوں باہر ہیں...... گھر میں ایک عورت ہے اور ایک بچہ...... تم لاکھ چھپاؤ گے بچہ کہیں نہ کہیں اگل دے گا۔''

"اسے کچھ پتا نہیں......وہ تو ابھی سو رہا ہے۔"
"سب سے پہلے تو کوشش کرو کہ وہ چپ چاپ اپنے گھر چلی جائے......"
"بہت سمجھایا......نہیں جا رہی۔"
"تو اسے لے کر نکلو وہاں سے ورنہ برے پھنسو گے۔"
"کہاں لے کر جاؤں؟" عاقب نے پریشانی کے عالم میں کہا۔
"یہ بات تمہارے سوچنے کی ہے یار۔"
"ٹھیک ہے فرقان بھائی۔" عاقب کو فرقان کی سرد مہری سے افسوس ہوا۔
راحمہ بھی نیچے آگئی تھی۔ "کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔
"وہ تو لفٹ ہی نہیں کرا رہے......بس یہ کہا یا تو اسے واپس بھیجو ورنہ وہاں سے لے کر نکلو۔"
"ہاں عاقب! اسے لے ہی جاؤ۔"
"کہاں لے جاؤں بھابی؟"
راحمہ جو انتہائی پریشان دکھائی دے رہی تھی سوچ میں پڑ گئی۔ "خاندان میں کہیں لے جاؤ گے تو عزت بچانی مشکل ہو جائے گی......وہ وہ باتیں بنیں گی کہ خدا کی پناہ۔" راحمہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
"جاہل بھرے پڑے ہیں نا خاندان میں اس لیے۔"
"ٹھیک کہتے ہو۔" عاقب نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔
"آپ اپنی امی کے ہاں بات کریں۔"
"پاگل ہوئے ہو......تمہارے ساتھ میری بھی ذلت ہو گی۔"
"پھر؟"
"فرقان کے پاس ہی جاؤ......وہ سمجھدار آدمی ہے کوئی راستہ نکال دے گا۔"
"اور اگر نہ نکالا کوئی راستہ؟"
"جاؤ تو سہی۔" راحمہ زچ ہو کر بولی۔

☆☆☆

فرقان علی چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ دو بہنیں شادی شدہ تھیں، دو کنواری، والدہ حیات تھیں۔ والد کا انتقال ہوئے برسوں بیت چکے تھے۔ فرقان خود بھی شادی شدہ تھا۔ عمر کوئی پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ دو بچوں کا باپ تھا۔ اکلوتی اولاد نرینہ ہونے کے باعث قدرے من موجی مگر تھا مرد آدمی۔ جو کہہ دیتا اسے نبھانا فرض جانتا۔ تھا تو وہ ثاقب کے دوستوں میں اور اس کا ہم پیشہ بھی مگر مراسم اس کے تینوں بھائیوں سے تھے۔ عاقب کو تو وہ بچے کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ ہنسی مذاق میں اس نے عاقب کو پڑوس کی چھت والی لڑکی سے پینگیں بڑھانے کا مشورہ تو دے دیا تھا اور عاقب اپنے اور ماہ نور کے درمیان فون پر ہونے والی باتیں بھی کبھی کبھار اس سے شیئر بھی کر لیا کرتا تھا مگر فرقان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اونٹ اس کروٹ بیٹھے گا۔
چادر میں لپٹی ماہ نور کو اپنے ہمراہ لیے عاقب... علی الصباح فرقان کے گھر پہنچا تو فرقان بھبک اٹھا۔ "یار! کچھ عقل ہے تمہیں...... ماں بہنوں والا آدمی ہوں، بیگم بھی ہے گھر میں......کیا سوچیں گی سب کی سب۔"
عاقب شرمندہ ہو گیا۔
"کچھ شرم کرو یار۔" فرقان علی نے اسے ڈانٹا۔
"پلیز فرقان بھائی۔" عاقب دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ "کچھ کریں۔"
"کیا کروں۔" فرقان نے آنکھیں نکالیں۔
"اسے اندر بلا لوں؟"
"اندر بلا کر کیا کرو گے...... اندر گھر میں خواتین مجھ سے پوچھیں گی نہیں یہ کون ہے۔ یار کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی ذلیل کرانا چاہتے ہو۔"
عاقب نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ دونوں اس وقت ڈرائنگ روم میں تھے۔ عاقب کے بیل بجانے پر فرقان کی والدہ نے دروازہ کھولا تھا اور عاقب کو صبح سویرے پریشان حال دروازے پر کھڑے دیکھ کر چونک گئی تھیں۔ عاقب ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ تینوں بھائیوں کا ان کے ہاں آنا جانا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتیں عاقب نے کہا۔ "آنٹی فرقان بھائی سے ملنا تھا۔"
فرقان کی والدہ نے ایک اچٹتی نظر گاڑی میں بیٹھی ماہ نور پر ڈالی جس نے چادر اوڑھ رکھی تھی اور آنکھوں کے سوا پورا چہرہ چادر سے چھپا رکھا تھا۔ فرقان کی والدہ اسے دروازے پر ہی کھڑا چھوڑ کر فرقان کو باہر بھیجنے کے لیے گھر کے اندر جانے کو مڑیں۔
فرقان اسے گھر کے اندر لے آیا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر کے رخ کھلنے والے دوسرے دروازے کی چٹخنی چڑھا لی۔ اس نے گھر کے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھی چادر پوش لڑکی کو دیکھ کر بھی اسے اندر بلانے سے گریز کیا تھا مگر اب عاقب اس سے لڑکی کو اندر بلانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ ثاقب سے اس کے پرانے تعلقات تھے۔ عاقب کی غلطی

پر وہ اس کے بڑے بھائی سے اپنے دیرینہ تعلق سے یکلخت آنکھیں نہیں پھیر سکتا تھا پہلے تو اس نے منع کیا پھر کچھ سوچ کر اس نے قدرے تامل سے کہا۔ ”بلالو۔“

عاقب گیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ درمیانہ قامت کی حامل تھی۔ محتاط روی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

”بیٹھو۔“ فرقان نے اس سے کہا۔

وہ سمٹی سمٹی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”تم بھی بیٹھو۔“ فرقان نے عاقب سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر فرقان نے اس سے پوچھا۔

”گھر کیوں نہیں گئیں تم اپنے؟“

وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کی انگلیاں ہیجان کے عالم میں باہم مروڑنے لگی۔

”اس نے تو حماقت کی ہے۔“ فرقان نے ایک نظر عاقب کو دیکھا پھر ماہ نور کی جانب نگاہ کی۔ ”تم کیوں بے وقوفی کرنا چاہتی ہو۔“ فرقان اپنے گھر والوں کے خیال سے دبی دبی آواز میں بول رہا تھا۔

وہ چادر کے کنارے سے اپنی آنکھیں مسلنے لگی۔

”گھر سے نکلی لڑکی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔“ وہ اسی طرح اپنی آنکھیں مسلتی رہی۔

”چلی جاؤ اپنے گھر۔“ فرقان نے سمجھایا۔ وہ رونے لگی۔

”اب رونے سے کیا فائدہ۔“

”خالو مجھے قتل کردیں گے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”چادر اس کے چہرے سے ڈھلک گئی تھی۔

فرقان نے اندازہ کیا وہ بہ مشکل سولہ سترہ سال کی رہی ہوگی۔ ”خالہ تو مجھے زبردستی ساتھ لائی تھیں...... خالو کی مرضی نہیں تھی۔“ اس نے مزید کہا۔

”اور تم نے خالہ کی محبت اور مہربانی کا انہیں یہ انعام دیا؟“

اس نے سر جھکا لیا۔

”اپنے ساتھ خالہ کو بھی مشکل میں ڈال دیا...... اب کیا کروگی...... کہاں جاؤ گی؟“

وہ اضطراب سے دوچار نظر آنے لگی۔

”بولو۔“ فرقان نے تقاضا کیا۔

اس نے اپنی جھکی جھکی نظریں عاقب کی طرف اٹھائیں۔ ”انہی کے ساتھ رہوں گی اور کہاں جاؤں گی۔“

”سن لیا!“ فرقان نے عاقب کو دیکھا۔ ”اب عورتوں کی طرح مت چھپو مرد بنو اور مردوں کی طرح بہادری دکھاؤ۔“

”میں...... میں پیچھے تو نہیں ہٹ رہا فرقان بھائی۔“

عاقب کو غیرت آگئی۔

”تو پھر اس بے چاری کو تحفظ دو۔“

”بھابی گھبرا رہی تھیں کہ اس کے گھر والے آجائیں گے، پولیس آجائے گی...... یہ ہوجائے گا، وہ ہوجائے گا۔“

”ان کی پریشانی بھی جائز ہے...... ایسے معاملات میں یہی ہوتا ہے...... لڑکی والے خاموش تھوڑی بیٹھتے ہیں۔“

”مشورہ دیں نا کیا کروں؟“

”ثاقب کو فون کرو...... عاطف کو خبر کرو۔“

”نہیں، نہیں۔“ عاقب نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

”وہ دونوں تو میرے ٹکڑے کردیں گے۔“

”غلط نہیں کریں گے...... لڑکے والوں کی بھی عزت جاتی ہے یار۔“ فرقان غصے سے بولا۔

ڈرائنگ روم کے اندر کی طرف کھلنے والے بند دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور فرقان کی والدہ جو دیر سے بند دروازے کے پیچھے کان لگائے کھڑی تھیں بولیں۔

”فرقان کیا بات ہے بیٹے؟“

”کچھ نہیں امی۔“

”دروازہ کھولو۔“

”کھولتا ہوں امی۔“

”میں اتنی صبح اس لڑکے کے آنے پر پہلے ہی کھٹک گئی تھی...... میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔“ دروازے کے پیچھے سے فرقان کی والدہ کی آواز سن کر ماہ نور بھی چونکی سی ہوگئی تھی۔

فرقان نے دروازہ کھول دیا۔ والدہ اندر آگئیں اور انہوں نے خشونت سے پہلے عاقب کو ایک نظر دیکھا پھر ماہ نور پر اپنی نگاہیں مرکوز کردیں۔

”بیٹھیے امی۔“ فرقان نے دبی زبان سے کہا۔

”کیا بیٹھوں...... یہ......“ انہوں نے پھر عاقب کو دیکھا مگر اس بار حقارت اور نفرت سے۔ ”اس لڑکی کو بھگا کر لایا ہے نا۔“

عاقب نے شرمندہ ہوکر پہلو بدلا اور نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”آنٹی یہ خود آگئی تھی۔“

”خود کیسے آگئی تھی۔“ والدہ تڑخ کر بولیں۔

”پڑوس کے گھر میں رہتی ہے۔“ فرقان نے ماں کو بتایا۔

”چکر چل گیا ہوگا۔“ والدہ نے ناگواری سے کہا پھر اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔ ”اللہ بچائے آج کل کی لڑکیوں سے اور لڑکوں سے بھی۔“ پھر ماہ نور کو غصے سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”شرم نہ آئی ماں باپ کی عزت کو داغدار کرتے ہوئے۔“

''امی اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے ہیں...... عاقب کے پڑوس میں اس کی خالہ اور خالو رہتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ اپنے ہاں لے آئے تھے۔''

''لڑکی! تمہیں چاہیے تھا عزت سے بیٹھتیں...... خالہ اور خالو تو اب تمہیں منہ بھی نہیں لگائیں گے۔''

''منہ کیا نہیں لگائیں گے...... یہ کہتی ہے خالو تو اسے مار دے گا۔'' فرقان نے ماں سے کہا۔

''ہونا تو یہی چاہیے۔'' وہ بولیں۔

ماہ نور رونے لگی۔

''اب مگرمچھ کے آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو ڈانٹا پھر بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پرائے پھڈے میں الجھنے کی ضرورت نہیں...... انہیں یہاں سے چلتا کرو۔''

''پلیز آنٹی۔'' عاقب نے ان کے سامنے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے پھر متوحش ہو کر فرقان کو دیکھا۔ ''پلیز! پلیز! میری مدد کریں...... اسے لے کر کہاں جاؤں گا۔''

''جہاں مرضی آئے جاؤ...... فرقان کو اس قصے میں گھسیٹنے کی ضرورت بالکل نہیں۔''

''فرقان بھائی!'' عاقب نے اسے ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔

صوفے پر بیٹھی ماہ نور دفعتاً اوندھے منہ گر پڑی۔ وہ تینوں بے ساختہ چونکے۔ ڈرائنگ روم میں بچھے قالین پر اوندھے منہ گری ماہ نور کے پورے جسم پر ارتعاش سا طاری تھا۔ عاقب نے لپک کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔

''بے ہوش ہو گئی ہے، بے ہوش...... اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دو کو جوتا سنگھاؤ اسے۔'' فرقان کی والدہ نے کہا۔

عاقب ہونقوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔

''میں پانی لاتی ہوں۔'' فرقان کی والدہ دروازے کی طرف لپکیں۔

عاقب اور فرقان کی نظریں باہم ملیں۔ ''یار تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' فرقان کے لہجے میں ناگواری تھی۔ عاقب شرمندہ ہو گیا۔ وقت وقت کی بات تھی۔ وہ پہلے بھی اس گھر میں آتا رہا تھا۔ چائے، کافی سے اس کی تواضع ہوتی رہی تھی مگر آج......

ماہ نور کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے فرقان کی والدہ نے خود کلامی کی۔ ''چھوٹی عمر کی ہے۔'' پھر عاقب کو دیکھ کر بولیں۔ ''یتیم بچی ہے...... تو نے ہی کچھ عقل سے کام لیا ہوتا۔''

ماہ نور نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر بے حس و حرکت رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں دروازے کی آڑ میں آن کھڑی ہوئی تھیں۔ فرقان کی نظریں دیوار گیر گھڑی پر تھیں۔ دفتر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔

''ذرا سوچو تو۔'' فرقان کی والدہ نے عاقب کو گھورا۔ ''اس کی جگہ تمہاری اپنی بہن ہوتی اور تمہاری اپنی جگہ کوئی اور لڑکا...... تو تم اس وقت کیا کرتے ہے؟''

عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔

یکایک عاقب کا فون بجا اس نے چونک کر موبائل جیب سے نکالا اور کال ریسیو کی۔ ''جی بھابی!''

کمرے میں موجود دونوں خواتین اور فرقان کی نظریں اسی پر تھیں۔

''اچھا...... پھر...... اوہو...... ہوں...... ہوں...... ہوں......''

راحمہ کی کال سننے کے دوران عاقب کے چہرے کی کیفیت متغیر ہوتی رہی۔ بالآخر عاقب نے یہ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ ''میں آپ کو فون کرتا ہوں بھابی۔''

''کیا ہوا؟'' فرقان نے پوچھا۔

''ماہ نور کی خالہ آئی تھیں ہمارے گھر...... جس کرسی پر چڑھ کر یہ دیوار پھلانگی تھی وہ انہیں دیوار کے نزدیک رکھی ملی اور دیوار پر اس کے جوتوں کے نشان بھی تھے۔'' عاقب نے بتایا۔

''شہادتیں بھی مل گئیں...... اب تم تیار ہو جاؤ۔'' فرقان نے عاقب سے کہا۔

عاقب سراسیمہ دکھائی دینے لگا۔

''شاباش۔ ہے بھئی!'' فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔ ''ہوائی دیدہ ہے آج کل کی لڑکیوں کا...... دیوار پھلانگتے ٹانگ ٹوٹ جاتی۔ کہیں جا، بے جا چوٹ لگ جاتی تو؟''

ماہ نور ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

''تمہاری بھابی نے اس کی خالہ سے کیا کہا؟'' فرقان نے عاقب سے پوچھا۔

''انہوں نے کہا آپ کی لڑکی ہماری طرف تو نہیں آئی۔''

''بیٹا! پھنس گئے ہو بری طرح...... اسے گھر سے لے کر نہ نکلے ہوتے تو جب خالہ آئی تھیں اسے چپ چاپ ان کے سپرد کر دیتے...... ان کی بھی عزت بچ جاتی، تمہاری بھی...... اب بھی وقت ہے...... اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھے...... لے جاؤ اسے یہاں سے اور پہنچا دو اس کے گھر۔'' فرقان نے کہا۔

"نہیں...... میں گھر نہیں جاؤں گی۔" ماہ نور رونے لگی۔

"پھر کہاں جائے گی تو!" فرقان کی والدہ نے اسے گھورا۔ اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو دیتی۔

"خالد سے بات کروں؟" فرقان نے والدہ کو دیکھتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"کس لیے؟" وہ چونکیں۔

"جوہر میں اس کا فلیٹ خالی پڑا ہے...... فی الحال وہاں رہ لیں گے یہ دونوں۔"

"بغیر کسی رشتے کے!" والدہ نے تیوری چڑھا کر فرقان کو دیکھا۔ وہ جھینپ گیا۔ "دیکھو بھئی۔" فرقان کی والدہ نے اب عاقب کی طرف اپنا روئے سخن کیا۔ "میں بیٹیوں والی ہوں...... اس لڑکی کو دیکھ کر میرا دل اس خیال سے کانپ رہا ہے کہ آج اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اس کے دل پر کیا گزرتی، بیٹی کی آب تو ہیرے موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے...... تم اسے ادھر ادھر کہیں لے جا کر ڈالو گے تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو...... شکاری کتے پھر رہے ہیں گھر سے نکلی لڑکیوں کی بو سونگھتے...... گند کو مزید گند بنانے کے بجائے اسے یہیں چھوڑ دو ہمارے پاس...... محفوظ تو رہے گی اور...... جا کر اس کے گھر والوں سے بات کرو۔"

"مگر میں...... میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" ماہ نور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چپ کر۔" فرقان کی والدہ نے اسے ڈانٹا۔

وہ سہم سی گئی۔

"جاؤ بھئی تم جاؤ۔" والدہ عاقب سے بولیں۔

ماہ نور کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے عاقب کہ...... تمہیں اپنے بھائیوں کو ضرور بتا دینا چاہیے...... تم اکیلے نہیں نمٹ سکو گے اس مسئلے سے...... دوسری بات یہ کہ اس وقت گھر جاؤ گے تو لوگوں کی نظر میں آؤ گے...... کیونکہ یہ وقت تو کام پر جانے والوں کا گھر سے نکلنے کا وقت ہوتا ہے گھر آنے کا نہیں...... بہتر ہے گھر جانے کے بجائے معمول کے مطابق بینک جاؤ...... ویسے بھی دو لڑکے چھٹی پر ہیں...... اور ہاں اپنی بھابی سے احتیاط کے ساتھ رابطے میں رہو۔"

عاقب جو فرقان کی بات سننے کو ٹھٹک گیا تھا اس کی بات سے متفق نظر آیا۔ البتہ فرقان کی والدہ کچھ جز بز ہوئیں مگر چپ رہیں۔

"ناشتا کرو گے؟" فرقان نے رسماً پوچھا۔

"ابھی دل نہیں چاہ رہا...... کرلوں گا۔" عاقب دروازے سے نکل گیا۔

"چلو بھئی اندر چلو۔" فرقان کی والدہ ماہ نور سے بولیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ فرقان ڈرائنگ روم میں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ تھا اور اس کے ضمیر کی عدالت۔

"تم ہی تھے جس نے عاقب کو اس لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھانے کی ترغیب دی تھی...... تم ہی اس کے رازدار اور صلاح کار رہے...... تم جانتے تھے کہ یہ لڑکا اپنی پھوپی زاد سے منسوب ہے پھر بھی تم نے اس کی ایک غیر لڑکی سے دل لگی پر حوصلہ افزائی کی...... مزے لے لے کر سنتے رہے۔ وہ تو نوجوان تھا...... تم تو شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے...... اس کے گھر میں تو کوئی بہن نہیں تھی...... تم تو بہنوں والے تھے...... دو اب بھی بیٹھی ہیں گھر میں...... ذرا سوچو...... اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو...... تمہاری ان دو غیر شادی شدہ بہنوں میں سے کوئی...... خدانخواستہ اس طرح کسی غیر گھر میں منہ چھپائے بیٹھی ہو...... رو رہی ہو...... کانپے، لرزے اور بے ہوش ہو جائے تو......!"

فرقان کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس کا ضمیر ایک ماہر وکیل کی طرح اسے اس کے جرم کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہاں...... میں بھی شریک جرم ہوں۔" لڑکی کی کم عمری، اس کی خوب صورتی، اس کے چہرے سے ہویدا ناتجربہ کاری، اس کا چادر میں بار بار منہ چھپا کر رونا، سسکنا اور اس کی آنکھوں میں ڈبڈباتے آنسو فرقان کو ناقابلِ بیان دکھ اور احساسِ شرمندگی سے دوچار کر رہے تھے۔ اپنا یہ دکھ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

فرقان کے گھر سے نکل کر عاقب نے راحمہ کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔ بینک جاتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرنے کے دوران وہ آئندہ کے بارے میں فکرمند رہا۔ بینک پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ راحمہ کا پھر فون آ گیا۔ وہ فون سننے کو باہر نکل آیا۔ راحمہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے عاقب کو بتایا ماہ نور کی خالہ اپنے شوہر کے ساتھ پھر ان کے گھر آئی تھیں۔ ماہ نور کا خالو اپنے اور ان کے گھر کی اس مشترکہ دیوار کے دوسری طرف جائزہ لینے آیا تھا جس کے نزدیک انہیں اپنے گھر میں کرسی رکھی ملی تھی اور جوتوں کے نشانات دکھائی دیے تھے۔

"عاقب وہ دونوں مجھ سے کھوج لگانے کی کوشش کر

''امی اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے ہیں...... عاقب کے پڑوس میں اس کی خالہ اور خالو رہتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ اپنے ہاں لے آئے تھے۔''

''لڑکی! تمہیں چاہیے تھا عزت سے بیٹھتیں...... خالہ اور خالو تو اب تمہیں منہ بھی نہیں لگائیں گے۔''

''منہ کیا نہیں لگائیں گے...... یہ کہتی ہے خالو تو اسے مار دے گا۔'' فرقان نے ماں سے کہا۔

''ہونا تو یہی چاہیے۔'' وہ بولیں۔

ماہ نور رونے لگی۔

''اب مگر مچھ کے آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو ڈانٹا پھر بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پرائے پھڈے میں الجھنے کی ضرورت نہیں...... انہیں یہاں سے چلتا کرو۔''

''پلیز آنٹی۔'' عاقب نے ان کے سامنے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے پھر متوحش ہو کر فرقان کو دیکھا۔ ''پلیز! پلیز! میری مدد کریں...... اسے لے کر کہاں جاؤں گا۔''

''جہاں مرضی آئے جاؤ...... فرقان کو اس قصے میں گھسیٹنے کی ضرورت بالکل نہیں۔''

''فرقان بھائی!'' عاقب نے اسے ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔

صوفے پر بیٹھی ماہ نور دفعتاً اوندھے منہ گر پڑی۔ وہ تینوں بے ساختہ چونکے۔ ڈرائنگ روم میں بچھے قالین پر اوندھے منہ گری ماہ نور کے پورے جسم پر ارتعاش سا طاری تھا۔ عاقب نے لپک کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔

''بے ہوش ہو گئی ہے بے ہوش...... اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دو کو جوتا سنگھاؤ اسے۔'' فرقان کی والدہ نے کہا۔

عاقب ہونقوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔

''میں پانی لاتی ہوں۔'' فرقان کی والدہ دروازے کی طرف لپکیں۔

عاقب اور فرقان کی نظریں باہم ملیں۔ ''یار تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' فرقان کے لہجے میں ناگواری تھی۔ عاقب شرمندہ ہو گیا۔ وقت وقت کی بات تھی۔ وہ پہلے بھی اس گھر میں آتا رہا تھا۔ چائے، کافی سے اس کی تواضع ہوتی رہی تھی مگر آج......

ماہ نور کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے فرقان کی والدہ نے خود کلامی کی۔ ''چھوٹی عمر کی ہے۔'' پھر عاقب کو دیکھ کر بولیں۔ ''یتیم بچی ہے...... تو نے ہی کچھ عقل سے کام لیا ہوتا۔''

ماہ نور نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر بے حس و حرکت رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں دروازے کی آڑ میں آن کھڑی ہوئی تھیں۔ فرقان کی نظریں دیوار گیر گھڑی پر تھیں۔ دفتر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔

''ذرا سوچو تو۔'' فرقان کی والدہ نے عاقب کو گھورا۔ ''اس کی جگہ تمہاری اپنی بہن ہوتی اور تمہاری اپنی جگہ کوئی اور لڑکا...... تو تم اس وقت کیا کرتے ہو؟''

عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔

یکایک عاقب کا فون بجا اس نے چونک کر موبائل جیب سے نکالا اور کال ریسیو کی۔ ''جی بھابی!''

کمرے میں موجود دونوں خواتین اور فرقان کی نظریں اسی پر تھیں۔

''اچھا...... پھر...... اوہو...... ہوں...... ہوں......''

راحمہ کی کال سننے کے دوران عاقب کے چہرے کی کیفیت متغیر ہوتی رہی۔ بالآخر عاقب نے یہ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ ''میں آپ کو فون کرتا ہوں بھابی۔''

''کیا ہوا؟'' فرقان نے پوچھا۔

''ماہ نور کی خالہ آئی تھیں ہمارے گھر...... جس کرسی پر چڑھ کر یہ دیوار پھلانگی تھی وہ انہیں دیوار کے نزدیک رکھی ملی اور دیوار پر اس کے جوتوں کے نشان بھی تھے۔'' عاقب نے بتایا۔

''شہادتیں بھی مل گئیں...... اب تم تیار ہو جاؤ۔'' فرقان نے عاقب سے کہا۔

عاقب سراسیمہ دکھائی دینے لگا۔

''شاباش ہے بھئی!'' فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔ ''ہوائی دیدہ ہے آج کل کی لڑکیوں کا...... دیوار پھلانگتے ٹانگ ٹوٹ جاتی۔ کہیں جا، بے جا چوٹ لگ جاتی تو؟''

ماہ نور ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

''تمہاری بھابی نے اس کی خالہ سے کیا کہا؟'' فرقان نے عاقب سے پوچھا۔

''انہوں نے کہا آپ کی لڑکی ہماری طرف تو نہیں آئی۔''

''بیٹا! پھنس گئے ہو بری طرح...... اسے گھر سے لے کر نہ نکلے ہوتے تو جب خالہ آئی تھیں اسے چپ چاپ ان کے سپرد کر دیتے...... ان کی بھی عزت بچ جاتی، تمہاری بھی...... اب بھی وقت ہے...... اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھے...... لے جاؤ اسے یہاں سے اور پہنچا دو اس کے گھر۔'' فرقان نے کہا۔

"نہیں...... میں گھر نہیں جاؤں گی۔" ماہ نور رونے لگی۔

"پھر کہاں جائے گی تو!" فرقان کی والدہ نے اسے گھورا۔

اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو دیتی۔

"خالد سے بات کروں؟" فرقان نے والدہ کو دیکھتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"کس لیے؟" وہ چونکیں۔

"جوہر میں اس کا فلیٹ خالی پڑا ہے...... فی الحال وہاں رہ لیں گے یہ دونوں۔"

"بغیر کسی رشتے کے!" والدہ نے تیوری چڑھا کر فرقان کو دیکھا۔ وہ جھینپ گیا۔ "دیکھو بھئی۔" فرقان کی والدہ نے اب عاقب کی طرف اپنا روئے سخن کیا۔ "میں بیٹیوں والی ہوں...... اس لڑکی کو دیکھ کر میرا دل اس خیال سے کانپ رہا ہے کہ آج اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اس کے دل پر کیا گزرتی۔ بیٹی کی آب تو ہیرے موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے...... تم اسے ادھر ادھر کہیں لے جا کر ڈالو گے تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو...... شکاری کتے پھر رہے ہیں گھر سے نکلی لڑکیوں کی بو سونگھتے...... گند کو مزید گند بنانے کے بجائے اسے یہیں چھوڑ دو ہمارے پاس...... محفوظ تو رہے گی اور...... جا کر اس کے گھر والوں سے بات کرو۔"

"مگر میں...... میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" ماہ نور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چپ کر۔" فرقان کی والدہ نے اسے ڈانٹا۔

وہ سہم سی گئی۔

"جاؤ بھئی تم جاؤ۔" والدہ عاقب سے بولیں۔

ماہ نور کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے عاقب کہ...... تمہیں اپنے بھائیوں کو ضرور بتا دینا چاہیے...... تم اکیلے نہیں نمٹ سکو گے اس مسئلے سے...... دوسری بات یہ کہ اس وقت گھر جاؤ گے تو لوگوں کی نظر میں آؤ گے...... کیونکہ یہ وقت تو کام پر جانے والوں کا گھر سے نکلنے کا وقت ہوتا ہے گھر آنے کا نہیں...... بہتر ہے گھر جانے کے بجائے معمول کے مطابق بینک جاؤ...... ویسے بھی دو لڑکے چھٹی پر ہیں...... اور ہاں اپنی بھابی سے احتیاط کے ساتھ رابطے میں رہو۔"

عاقب جو فرقان کی بات سننے کو ٹھٹک گیا تھا اس کی بات سے متفق نظر آیا۔ البتہ فرقان کی والدہ کچھ جز بز ہوئیں مگر چپ رہیں۔

"ناشتا کرو گے؟" فرقان نے رسماً پوچھا۔

"ابھی دل نہیں چاہ رہا...... کرلوں گا۔" عاقب دروازے سے نکل گیا۔

"چلو بھئی اندر چلو۔" فرقان کی والدہ ماہ نور سے بولیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ فرقان ڈرائنگ روم میں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ تھا اور اس کے ضمیر کی عدالت۔

"تم ہی تھے جس نے عاقب کو اس لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھانے کی ترغیب دی تھی...... تم ہی اس کے رازدار اور صلاح کار رہے...... تم جانتے تھے کہ یہ لڑکا اپنی پھوپی زاد سے منسوب ہے پھر بھی تم نے اس کی ایک غیر لڑکی سے دل لگی پر حوصلہ افزائی کی...... مزے لے لے کر سنتے رہے۔ وہ تو نوجوان تھا...... تم تو شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے...... اس کے گھر میں تو کوئی بہن نہیں تھی...... تم تو بہنوں والے تھے...... دو اب بھی بیٹھی ہیں گھر میں...... ذرا سوچو...... اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو...... تمہاری ان دو غیر شادی شدہ بہنوں میں سے کوئی...... خدانخواستہ اس طرح کسی غیر گھر میں منہ چھپائے بیٹھی ہو...... رو رہی ہو...... کانپے، لرزے اور بے ہوش ہو جائے تو......!"

فرقان کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس کا ضمیر ایک ماہر وکیل کی طرح اسے اس کے جرم کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہاں...... میں بھی شریک جرم ہوں۔" لڑکی کی کم عمری، اس کی خوب صورتی، اس کے چہرے سے ہویدا ناتجربہ کاری، اس کا چادر میں بار بار منہ چھپا کر رونا، سسکنا اور اس کی آنکھوں میں ڈبڈباتے آنسو فرقان کو ناقابلِ بیان دکھ اور احساسِ شرمندگی سے دوچار کر رہے تھے۔ اپنا یہ دکھ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

فرقان کے گھر سے نکل کر عاقب نے راحمہ کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔ بینک جاتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرنے کے دوران وہ آئندہ کے بارے میں فکر مند رہا۔ بینک پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ راحمہ کا پھر فون آگیا۔ وہ فون سننے کو باہر نکل آیا۔ راحمہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے عاقب کو بتایا ماہ نور کی خالہ اپنے شوہر کے ساتھ پھر ان کے گھر آئی تھیں۔ ماہ نور کا خالو اپنے اور ان کے گھر کی اس مشترکہ دیوار کے دوسری طرف جائزہ لینے آیا تھا جس کے نزدیک انہیں اپنے گھر میں کرسی رکھی ملی تھی اور جوتوں کے نشانات دکھائی دیے تھے۔

"عاقب وہ دونوں مجھ سے کھوج لگانے کی کوشش کر

لنچ بریک کے دوران عاقب نے بینک سے باہر نکل کر راحمہ کو خود فون کیا۔ فرقان جو کام کے دوران ایک دو مرتبہ ضرور اس کی طرف آکر اس سے بات چیت کرلیا کرتا تھا اس روز ایک مرتبہ بھی اس کی سیٹ کی طرف نہیں آیا تھا۔

راحمہ نے اسے بتایا ماہ نور کی خالہ کے گھر میں پراسراری خاموشی تھی۔ گھر کا رخ دوسری طرف ہونے کے باعث کچھ پتا نہ چل رہا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا تھا۔

"چھٹی کے بعد گھر ہی آؤ گے نا؟" راحمہ نے اس سے پوچھا۔

"کہہ نہیں سکتا۔"

"کیا مطلب کہہ نہیں سکتے۔" راحمہ چونکی۔ "میں اکیلی رہوں گی کیا!"

"آپ اپنی امی کے ہاں چلی جائیں۔"

"بہت اچھے! ادھر تم گھر سے غائب ادھر میں امی کے ہاں...... انہیں تو پھر پکا شک ہو جائے گا۔"

"آجاؤں گا...... فکر نہ کریں۔"

سہ پہر کو ماہ نور کے خالو اور ماموں کے ساتھ پولیس کے تفتیشی اہلکار دیوار کے دوسری طرف گھر کا اسی طرح جائزہ لینے آگئے جیسے صبح ماہ نور کے خالو اور خالہ لے کر گئے تھے۔ تفتیشی اہلکاروں نے راحمہ سے بھی پوچھ گچھ کی اور گھر میں رہنے والے دیگر افراد کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان کے جاتے ہی راحمہ نے عاقب کو فون کیا۔

"انہوں نے تمہارے بینک کا نام پتا بھی پوچھا مجھ سے۔" راحمہ نے بتایا۔

"بھابی! اب تو میرا گھر آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا...... رات کو پولیس آگئی اور مجھے اٹھا کر لے گئی تو......" عاقب کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"تمہارے بھائی کو بتانا ضروری ہو گیا ہے۔" راحمہ نے کہا۔

"نہیں بھابی ابھی نہ بتائیں۔"

"تو پھر کب بتاؤں؟" راحمہ تنک کر بولی۔

"ہوسکتا ہے معاملہ سیٹل ہو جائے۔"

"پھر بھی...... ثاقب کو پتا تو چلے گا نا کبھی نہ کبھی...... وہ بگڑیں گے مجھ پر کہ اتنی بڑی بات تم مجھ سے چھپا گئیں...... لڑکی اپنے گھر سے رات کو ہمارے گھر آگئی۔ رات اس نے تمہارے کمرے میں گزاری۔ اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا کہ وہ درمیان کی دیوار سے ہمارے گھر میں کودی ہے...... پولیس نے آکر پوچھ گچھ کرلی ہے...... اب کیا میں

رہے تھے...... خالہ کہنے لگیں۔ آپ کو دیوار پر سے کسی کے کودنے کی آواز نہیں آئی...... میں نے کہا مجھے کیا پتا...... میں تو سوئی ہوئی تھی نیند میں کس کو ہوش رہتا ہے۔"

"پھر؟"

"پھر انہوں نے تمہارا پوچھا...... میں نے کہا وہ تو اپنے بینک چلا گیا...... عاقب انہوں نے لان سے گیٹ تک چپا چپا دیکھا...... پوچھ رہے تھے گیٹ آپ کو صبح بند ملا یا کھلا۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

"نہیں میں نے کہا میں نے نوٹ نہیں کیا۔"

"اوہو بھابی کہہ دینا تھا کھلا ملا...... وہ سمجھتے ماہ نور نے فرار کے لیے ہمارا گیٹ استعمال کیا ہے۔"

"خیر میں نے تو وہی کہا جو تمہیں بتایا ہے...... ویسے ایک بات ہے۔"

"کیا؟" عاقب کے لہجے میں بیتابی تھی۔

"مجھے لگتا ہے انہیں یہ علم نہیں کہ تمہاری اور ان کی لڑکی کی فون پر بات چیت رہتی تھی۔"

"بھابی! تھوڑے دن ہی تو رہی اور...... وہ اپنے کمرے میں چھپ کر بات کرتی تھی...... پھر نمبر بھی ڈیلیٹ کردیتی تھی۔"

"ہے حرفوں کی بنی۔" راحمہ نے کڑوے کسیلے لہجے میں کہا۔ عاقب کو حیرت ہوئی۔ راحمہ تو اس کی تعریفوں کے پل باندھے رہتی تھی اس کے سامنے۔ "اللہ! عاقب اتنی پیاری لڑکی ہے کہ میرا بس چلے تو اسے اپنے گھر لے آؤں۔" اور اب وہی کہہ رہی تھی کہ حرفوں کی بنی ہے۔

"بھابی...... مجھے بتاتی رہیے گا کیا ہو رہا ہے۔" عاقب نے کہا۔

"ہاں ہاں...... خالہ کہہ رہی تھیں...... کچھ دیر دیکھتے ہیں...... پتا نہ چلا تو خاندان والوں کو بھی بتانا پڑے گا اور ہوسکتا ہے پولیس کو بھی رپورٹ کرائیں گے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" عاقب نے راحمہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"پریشان کیسے نہ ہوں...... پولیس تو جب تفتیش کرنے پر آتی ہے تو عورت دیکھتی ہے نہ مرد...... یہ تم نے کیا کردیا عاقب...... سوچ تو لیتے۔"

عاقب کو اپنا دل ڈوبتا اور ٹانگیں بے جان ہوتی لگ رہی تھیں۔

☆☆☆

اس بات کا انتظار کروں کہ تمہارے بجائے پولیس مجھے تھانے لے جا کر بٹھا دے اور تب تمہارے بھائی کو اطلاع ہو اور وہ مجھے چھڑانے آئیں...... نہ بابا نہ تمہاری وجہ سے میں اپنی عزت اور اپنے گھر کو داؤ پر نہیں لگا سکتی...... جانتے ہو کتنے غصے والے ہیں تمہارے بھائی۔''

''جانتا ہوں بھابی۔'' اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔

بینک سے چھٹی کے بعد وہ پریشانی کے عالم میں بہت دیر بلا مقصد ادھر ادھر گھومتا پھرا۔ فرقان کے پاس جانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ راحمہ نے اس دوران دو تین مرتبہ فون کیا۔ اس نے ثاقب کو خبر دے دی تھی۔ وہ نہایت پریشان ہوا تھا۔

''بھائی نے کیا کہا آپ سے؟''

''کہہ رہے تھے ایمرجنسی کی بنیاد پر چھٹی لینے کی کوشش کرتا ہوں اور پاکستان آتا ہوں...... عاطف اور رخشندہ تو کل پہنچ رہے ہیں۔''

''اچانک!'' عاقب چونکا۔

''اچانک نہیں...... عاطف کو ثاقب نے فون کیا تھا۔ وہ چھٹیوں پر ہے۔ اسے چھٹی لینے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لہٰذا وہ اور رخشندہ تو کل آ رہے ہیں۔''

عاقب کو اس خبر سے حوصلہ بھی ملا مگر اس خیال سے پریشانی بھی ہوئی کہ بھائی آ کر اس کا نہ جانے کیا حشر کریں گے۔

رات ہونے پر وہ فرقان کے گھر پہنچا اور اسے عاطف کی یقینی اور ثاقب کی ممکنہ آمد کی اطلاع دی۔

''چلو اچھا ہوا...... انہیں بتانا ضروری بھی تھا...... وہ آئیں گے تو معاملہ کچھ نہ کچھ سنبھال ہی لیں گے۔''

''ماہ نور ٹھیک ہے؟'' عاقب نے دبی زبان سے پوچھا۔

''ہاں...... امی اور بہنوں کے کمرے میں ہی ہے...... امی بتا رہی تھیں بہت سادہ لڑکی ہے...... خالو اور ماموں کے ڈر سے اس کا دم نکلا ہوا ہے...... کہتی ہے میں گھر گئی تو وہ مجھے مار دیں گے...... خاندان میں اس سے پہلے بھی ایک لڑکی کو پسند کی شادی پر مارا جا چکا ہے۔''

''مجھے نہیں بتایا اس نے۔''

''تم نے اسے دوسری ہی باتوں میں جو الجھائے رکھا ہو گا۔''

''وہ غلطی ہو گئی فرقان بھائی۔''

''مگر دیکھو اب پیچھے مت ہٹنا...... اس غلطی کو اب نبھانا ہے۔''

عاقب نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کھانا کھاؤ گے؟''

''نہیں...... شکریہ...... بس چلتا ہوں۔''

''کیا گھر جاؤ گے؟''

''نہیں...... آج تو نہیں...... گاڑی کسی پبلک پلیس پر کھڑی کروں گا اور اسی میں سو جاؤں گا...... اول تو نیند کسے آنی ہے۔''

''بھابی؟''

''وہ مینیج کر لیں گی۔''

''والدہ کی ڈانٹ ڈپٹ کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں تم سے کہتا یہیں سو جاؤ۔''

''نہیں نہیں ٹھیک ہے...... فرقان بھائی مردوں کا کیا...... کہیں بھی پڑ سکتے ہیں...... ماہ نور کا مسئلہ تھا...... آپ نے اسے اپنے گھر میں رکھ کر بڑی مہربانی کی۔''

''والدہ کو دعائیں دو۔''

''بہت دعائیں فرقان بھائی۔''

''احتیاطاً کل تم بینک نہ آؤ تو بہتر ہے۔''

''ہاں یہی میں بھی سوچ رہا تھا...... پولیس نے بھابی سے مجھ سمیت گھر کے تمام لوگوں کے بارے میں تو انفارمیشن لے لی ہے...... پولیس بینک آ گئی اور مجھے لے گئی تو بدنامی ہو گی۔''

''بیٹے مجھے تو تمہاری نوکری بھی اب خطرے میں لگ رہی ہے۔''

''یہاں زندگی خطرے میں لگ رہی ہے فرقان بھائی۔''

''محتاط رہو۔''

''چلتا ہوں۔''

''اوکے۔''

☆☆☆

رات گیارہ بجے تک وہ راحمہ سے فون پر رابطے میں رہا۔ پھر ایک کاروباری مرکز کی پارکنگ لاٹ میں جگہ تاک کر گاڑی کھڑی کی اور پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے دور تھی مگر...... سولی پر بھی آ جاتی ہے کے مصداق بالآخر وہ سو ہی گیا...... رات کو دو سوا دو بجے کا وقت تھا جب اس کے موبائل کی آواز نے اسے نیند سے جگایا۔ اس نے نمبر دیکھا۔ راحمہ کا نمبر تھا۔

''جی بھابی۔''

''عاقب! پولیس آئی تھی۔'' راحمہ نے دبی دبی آواز میں بتایا۔

''اچھا!'' وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''تمہارا پوچھ رہے تھے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا...... میں نے امی کو بلالیا تھا...... انہیں مجبوراً سب کچھ بتانا پڑا تھا...... انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ وہ گھر میں نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا...... اب تو ماہ نور کے گھر والوں کا بھی اور پولیس کا بھی تم پر شک پکا ہے...... محلے والوں کو بھی پتا چل گیا...... بدنامی ہے عاقب...... تم نے کسی کو منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا ہمیں۔''

''یہ باتیں بعد میں کر لیجیے گا...... یہ بتائیں پھر کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا...... پولیس کی موبائل وین آئی تھی...... چلے گئے پولیس والے لیکن مجھے یقین ہے پھر آئیں گے...... ہوسکتا ہے کل تمہارے بینک بھی جائیں۔''

''عاشر کو گھر کے اندر ہی رکھیے گا بھابی۔''

''مجھے اسی کا ڈر تھا...... آپا امی کو میرے پاس چھوڑنے آئیں تو میں نے عاشر کو ان کے ساتھ ہی بھیج دیا...... ایک تو اس خیال سے کہ بچہ ہے کچھ الٹی سیدھی نہ بول دے کسی سے...... دوسرے ماہ نور کے گھر والوں کا کیا اعتبار میرے بچے ہی کو کوئی نقصان پہنچادیں...... تم نے اچھا نہیں کیا عاقب۔''

''بھابی اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔''

''آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

☆☆☆

خالہ کے گھر میں ماہ نور کے کمرے سے عاقب کے خلاف ثبوت بھی مل گیا۔ ویلنٹائن ڈے پر عاقب نے اسے گھر کی اسی دیوار پر سے جسے پھلانگ کر وہ اس کے پاس آئی تھی ایک ٹیڈی بیئر اور اس کے ساتھ گلاب کے پھول کی ایک مصنوعی ٹہنی دی تھی۔ دونوں چیزوں کو اس نے اپنی الماری میں کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی تلاشی لی گئی تو یہ دونوں چیزیں ہاتھ لگیں۔ ٹیڈی بیئر کے گلے میں جھولتے چھوٹے سے کارڈ پر لکھا تھا۔ ''ٹو مائی لو ماہ نور...... فرام عاقب۔''

پولیس کو عاقب کی تلاش میں اس کے بینک پر چھاپا مارنے کے لیے یہ ثبوت کافی تھا مگر عاقب بینک سے غیر حاضر تھا۔ منیجر نے پولیس کے استفسار پر فرقان سے پوچھا۔ ''عاقب کے بارے میں کوئی خبر ہے فرقان صاحب؟''

''جی نہیں۔'' فرقان نے سپاٹ چہرے کے ساتھ لاعلمی کا اظہار کیا۔

☆☆☆

اگلے دن عاطف اور رخشندہ کراچی پہنچ گئے۔ جاوید اختر کے گھر کی چھت جہاں شاذ ہی کوئی فرد نظر آیا کرتا تھا چہل پہل کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ایک آتا ایک جاتا اور ہر آتے جاتے کی نظر ادھر ہی ہوتی۔ ماہ نور کی الماری سے ملنے والے ویلنٹائن کارڈ اور عاقب کے گھر سے غائب ہونے اور بینک سے غیر حاضری نے ماہ نور کے گھر والوں کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ انہوں نے ماہ نور کی گمشدگی کیس میں عاقب کو ملزم نامزد کر دیا تھا۔

جاوید اختر زمان کی شہر کے کاروباری حلقے میں اچھی ساکھ تھی۔ اپنے علاقے کے حوالے سے سیاسی اثر ورسوخ بھی تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران تک بھی رسائی تھی۔ لڑکی کی بازیابی عزت ووقار کا معاملہ تھا۔ دامے، درمے، سخنے ہر طرح سے وہ ماہ نور کی جلد از جلد بازیابی کی کوشش کر رہے تھے۔ جاوید اختر کے اثر ورسوخ کی بنا پر تفتیشی اہلکار دنوں کی کارروائی گھنٹوں میں کر رہے تھے۔ جہاں عام آدمی اپنے ساتھ ہونے والے کسی ظلم کی پولیس کو فریاد کرنے جائے اور خود ہی مجرم بنا کر بٹھالیا جائے وہاں ماہ نور کی بازیابی کے لیے پولیس کا دوسرے ہی دن عاقب کے بینک پہنچ جانا جاوید اختر کے اثر ورسوخ کی ہی دلیل تھی۔

جاوید اختر کے گھر سے زبانی کلامی دھمکیاں بھی ملنا شروع ہو چکی تھیں۔ راحمہ گھر میں اکیلی ہوتی تو شاید گھر چھوڑ کر ہی چلی گئی ہوتی مگر عاطف اور رخشندہ کے آجانے سے اس کو حوصلہ مل گیا تھا۔ ثاقب بھی ایمرجنسی میں چھٹی لے کر پہلی دستیاب پرواز سے وطن آنے کے لیے بے چین بیٹھا تھا۔

عاطف نے آتے ہی راحمہ سے واقعے کی تفصیلات حاصل کیں۔ سم ٹریکنگ کے خوف سے عاقب نے پرانی سم کی جگہ نئی سم لگالی تھی۔ راحمہ سے نیا نمبر لے کر عاطف نے عاقب کو فون کیا تو اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ راحمہ نے اپنے نمبر سے اس کی بات کرائی۔

''کہاں ہو؟'' عاطف کے لہجے سے ناراضگی عیاں تھی۔

''یہیں ہوں بھائی۔'' عاقب مردہ سی آواز میں بولا۔

''یہیں کے بچے! یہ کیا کیا ہے تو نے۔'' ہمیشہ نہایت میٹھے لہجے میں بات کرنے والا بھائی انتہائی حقارت سے بات کر رہا تھا۔ وہ چپ رہا۔ کہنے کو تھا ہی کیا۔ ''فرقان بھائی کا نمبر دو مجھے۔''

''اوکے۔''

مصیبت کی اس گھڑی میں عاطف کو فرقان ہی سے رجوع کرنا تھا۔ اپنے خاندان والوں کا تو اسے پتا تھا نہ کسی میں اتنی سمجھ تھی کہ اس سر پڑی سے نکلنے کی کوئی راہ سجھا سکتا۔ ثاقب نے بھی فون پر اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ فرقان سے رابطہ کرے۔

فرقان پیسے کے اعتبار سے تو بیکار تھا مگر سیاست اس کا شوق، دلچسپی اور شاید حالات کا تقاضا بھی تھا۔ ملکی سیاست پڑھے لکھے، دبنگ اور مضبوط کردار کے حامل افراد کی طلب گار تھی۔ فرقان اپنی خاندانی ذمہ داریوں اور پہلے تعلیم پھر روزی، روٹی کے چکر میں سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا تو نہ بنا سکا تاہم ایک سیاسی جماعت سے اس کی ذہنی وابستگی ضرور ہو گئی تھی۔ اسے بار ہا اس جماعت میں سیاسی عہدوں کی پیشکش ہوئی مگر اس نے عہدہ لینے کے بجائے بلاعہدہ کام کرنا زیادہ پسند کیا۔ وہ خود کو جماعت کا ''ادنیٰ کارکن'' کہا کرتا تھا مگر جماعت کے بڑے بھی اس کی سیاسی بالغ نظری کے معترف تھے۔ تھا تو وہ جوان مگر اس کی ''اپروچ'' جماعت کے بزرگوں کو بھی حیران کر دیتی تھی۔ جماعت میں جب کوئی بحران پیدا ہوتا وہ اس بحران کا حل نکالنے والوں کے اجلاس میں ضرور بلایا جاتا۔ اپنا کام کر کے وہ خاموشی سے منظر سے نکل جاتا۔ والدہ کی خواہش و ہدایت اور اپنی خاندانی ذمے داریوں کے باعث فرقان علی کو اپنا ''ایکسپوژر'' یا نگاہوں میں آنا پسند نہیں تھا۔ گھر میں ایک نہیں کئی عورتیں اسی کو اپنا کھیون ہار سمجھتی تھیں۔ نہ وہ انہیں مایوس کرنا چاہتا تھا نہ کسی آزمائش میں ڈالنا چاہتا تھا مگر اس کا کیا علاج کہ پھر بھی وہ لوگوں کی نگاہوں میں تھا۔ اپنے ہی نہیں مخالفین بھی اسے جانتے تھے اور یہ پہچان اسے لوگوں سے تعلقات اور گھر سے باہر آمد و رفت میں محتاط رہنے کا پابند کرتی تھی مگر ثاقب کے گھرانے سے اس کے تعلقات ہر احتیاط سے ماورا تھے۔ ثاقب اس کا دوست تھا۔ عاطف اور عاقب کو وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتا تھا بلکہ عاقب تو اس کی نظر میں بچہ تھا۔ بینک میں اسے ملازم رکھوانے میں اس کی کوشش بھی شامل تھی۔ ہر انسان کی طرح فرقان بھی اپنی ذات میں متضاد صفات سے ماورا نہ تھا۔ عاقب کو بچہ سمجھتا مگر کبھی کبھی اس سے ہم عمروں کی طرح راز و نیاز کرنے لگتا۔ عاقب کو ماہ نور سے پینگیں بڑھانے کی صلاح اس کی انہی متضاد صفات کا شاخسانہ تھا اور اپنی اس غلطی کے ازالے کے لیے وہ اس مسئلے کے حل میں اپنا حصہ بٹانے کا خواہاں تھا۔

عاطف کا فون آئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ عاقب کا فون آ گیا۔ ''فرقان بھائی عاطف بھائی نے آپ کا نمبر لیا تھا مجھ سے، آپ کی بات ہوئی؟''

''ہاں...... وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔''

''فرقان بھائی انہیں ذرا ٹھنڈا کرنے کی کوشش کیجیے گا...... بہت غصے میں لگ رہے تھے وہ۔''

''تمہیں تو الٹا لٹکا دینا چاہیے...... سارے گھر کو پریشان کر کے رکھا ہوا ہے تم نے۔''

''بس اس دفعہ معافی دلوا دیں...... آئندہ میرے باپ کی بھی توبہ۔''

''معافی ملنا آسان نہیں بیٹے...... تمہارے گھر والے تو شاید معاف کر دیں مگر لڑکی کے گھر والے اور پولیس نہیں بخشے گی تمہیں۔''

عاطف آیا تو دونوں بہت دیر بیٹھے اس معاملے کی ہر اونچ نیچ پر غور کرتے رہے۔ اس دوران عاطف کے ایما پر فرقان نے فون کر کے عاقب کو بھی بلا لیا۔ وہ آیا تو سر جھکا ہوا تھا نظریں نیچی تھیں۔ عاطف نے اسے زہر خند نگاہوں سے دیکھا اور ترشی سے بولا۔ ''جی تو چاہتا ہے تمہیں شوٹ کر دیا جائے۔''

اس کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔

''سر جھکانے سے کام نہیں چلے گا...... پرسوں ثاقب بھائی بھی پہنچ رہے ہیں۔ وہ دیکھنا کیا حشر کریں گے تمہارا۔''

''وہ تو جو حشر کرے سو کرے۔ خدانخواستہ یہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ جو حشر کریں گے اس کا یہ تصور بھی نہیں کر سکتا...... لڑکی کا معاملہ ہے مذاق بات نہیں...... اور ابھی تو وہ اپنے گھر واپس جانے سے انکار کر رہی ہے۔ اگر کہیں اس نے گھر واپس جانے کا ارادہ کر لیا تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں...... لڑکی کے اغوا کا مقدمہ بنے گا اور یہ سیدھا اندر۔'' فرقان نے کہا۔

''سن لیا!'' عاطف نے اسے گھورا۔ وہ شرمندہ دکھائی دینے لگا۔ ''یہ رہ کہاں رہا ہے؟'' عاطف نے فرقان کو دیکھا۔

''پوچھ لو۔'' فرقان نے کہا۔

''ہاں بھئی کہاں......؟''

وہ متذبذب دکھائی دینے لگا۔

''جو گھر کا نہیں رہتا وہ کہیں کا بھی نہیں رہتا عاطف۔'' فرقان نے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے...... اور گھر کا وہی نہیں

رہتا جسے گھر کی عزت کا پاس نہیں ہوتا۔" عاطف کے لہجے میں تلخی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن تفتیشی افسر پھر آیا اور اس نے عاطف سے دھمکی آمیز لہجے میں بات کی۔ "شام تک اگر تمہارا بھائی تھانے نہ پہنچا تو تمہیں اور تمہارے گھر کی عورتوں اور بچوں کو اٹھا کرلے جاؤں گا...... بند کردوں گا تھانے میں۔"

"جرم بھائی نے کیا ہے اور پتا نہیں کیا بھی ہے کہ نہیں اور دھمکی آپ مجھے اور میرے گھر کی عورتوں اور بچوں کو اٹھا کرلے جانے کی دے رہے ہیں۔ کیا عجیب بات ہے انسپکٹر صاحب۔" عاطف بگڑ کر بولا۔

"اتنی عجیب بھی نہیں...... جب تم اور تمہارے گھر کی عورتیں تھانے میں ہوں گی تو وہ کیا اس کا باپ بھی آئے گا۔"

"پلیز!" عاطف نے بدزبانی پر ٹوکا۔ "بھائی کی گمشدگی سے ہم لوگ خود پریشان ہیں۔"

"آجائے گا...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... جب اسے پتا چلے گا کہ گھر والے لاک اپ میں ہیں تو وہ سامنے آجائے گا...... مگر ہمیں لڑکی بھی چاہیے...... شرم نہیں آتی دوسروں کی عزت پر ڈاکا ڈالتے۔" تفتیشی افسر نے اہانت سے کہا پھر تیوری چڑھائی۔ "لڑکی کی بازیابی ضروری ہے۔"

"آپ پورا گھر دیکھ سکتے ہیں۔" عاطف نے کہا۔

"اوئے! بیوقوف سمجھتے ہو ہمیں...... لڑکی کوئی تم نے اس گھر میں رکھی ہوگی۔"

"تم سے آپ کا مطلب؟" اب عاطف نے تیور بدلا۔

"تمہارا بھائی۔" انسپکٹر نے اپنی بھویں اچکائیں۔

"مطلوب آپ کو میرا بھائی ہے اور غصہ آپ مجھے دکھا رہے ہیں۔"

"اس سے کہو شام تک تھانے پہنچ جائے ورنہ...... خیر نہیں۔" تفتیشی افسر نے آنکھیں دکھائیں۔ عاطف نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔

شام ہوگئی۔ رات بھی خیریت سے گزری۔ اگلے روز تفتیشی افسر پھر آدھمکا۔ "آپ سے تو وہ ضرور ہوگا رابطے میں۔" اس نے عاطف کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"جی نہیں...... میں تو خود اس کے غائب ہونے کی خبر سن کر باہر سے آیا ہوں...... آپ مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ میں کسے الزام دوں...... یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میرا بھائی ہی کسی واردات کا شکار ہوا ہو۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر تم نے رپورٹ کیوں نہیں کرائی ابھی تک؟"

"تلاش کر رہے ہیں ہم...... خدانخواستہ نہ ملا تو رپورٹ ہی کرائیں گے۔"

"اسے حاضر کرو تھانے میں۔"

"کہاں سے حاضر کریں؟"

"کہیں سے بھی۔"

ثاقب آیا تو عاطف اسے ساتھ لے کر بڑی رازداری سے فرقان کے پاس پہنچا اور تینوں میں خاصی دیر گفتگو رہی۔ فرقان نے کہا۔ "اب بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ان دونوں کا نکاح کردیا جائے اور لڑکی یہ بیان دے دے کہ وہ بالغ ہے اپنی مرضی سے آئی ہے اور اس نے اپنی پسند سے عاقب سے شادی کی ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے فرقان...... عاقب کی مانگ پھپو کے گھر میں ہے وہ لوگ شادی کی تیاری کر رہے ہیں۔" ثاقب بولا۔

"سوچ لو...... میں نے تو وہ صلاح دی ہے جس سے عاقب کی بچت ہوسکتی ہے...... اور تم سب بھی کسی بڑی پریشانی سے بچ سکتے ہو۔"

"گھر والوں سے مشورہ کرلیا جائے۔" ثاقب نے کہا۔

"مجھے جیسے معلوم نہیں کہ گھر میں کون ہے...... دو خواتین بے چاری جنہیں قانونی موشگافیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جو تم کہو گے اسے آمنا وصدقنا کہیں گی۔"

"اس کمینے سے تو پوچھنا پڑے گا کہ وہ راضی ہے یا نہیں۔" ثاقب نے غصے سے کہا۔

"اسے راضی ہونا پڑے گا میرے بھائی اور یہ کام فوراً کرنے والا ہے۔"

"لڑکی راضی نہ ہوئی تو؟"

"یہی بات تو عاقب کے حق میں جارہی ہے کہ لڑکی کہتی ہے وہ شادی کرے گی تو صرف عاقب سے۔"

"تم سے کس نے کہا؟"

"گھر کی خواتین سے وہ خاصی بے تکلف ہوگئی ہے۔"

"بلاؤ اس خبیث کو۔" ثاقب نے عاطف سے کہا۔

عاطف نے فرقان کو دیکھا۔ "فرقان بھائی آپ فون کریں۔"

"میں کیسے لیتا ہوں۔"

عاقب آیا تو اسی طرح سر جھکائے اور شرمندہ شرمندہ

سا۔ ثاقب نے اسے جی بھر کر صلواتیں سنائیں۔ وہ ایک لفظ نہیں بولا۔

''الو کے پٹھے اجیل کی ہوا نہیں کھانا چاہتا تو تیرا اس سے نکاح کرنا پڑے گا ہمیں۔'' ثاقب نے کہا۔

عاقب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس سے تمہارا سو فیصد تو نہیں لیکن بڑی حد تک بچاؤ ہو جائے گا۔'' فرقان بولا۔

''بتا کیا مرضی ہے تیری؟'' ثاقب نے اس سے جواب کے لیے تقاضا کیا۔ وہ چپ رہا۔ ایک ذرا سی بھول نے اسے قعرِ مذلت میں دھکیل دیا تھا۔ میٹھے بول بولنے والی زبانیں اس سے تو تڑاق کر رہی تھیں۔

ثاقب نے عاطف کو اشارہ دیا کہ وہ اس سے پوچھے۔ ''بول بھئی کیا مرضی ہے تیری؟''

''بتاؤ عاقب۔'' فرقان نے کہا۔

''آپ لوگوں کی مرضی۔'' وہ دبی زبان سے بولا۔

''ہماری مرضی کا تو نے اس وقت تو نہیں سوچا ہوگا جب لڑکی تیرے پاس آئی تھی۔'' ثاقب نے غصے سے کہا۔

''آگے کی سوچو۔'' فرقان نے ثاقب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے فرقان...... تم نے جو سوچا ٹھیک ہی سوچا ہے۔ لڑکی سے بھی پوچھ لو۔''

فرقان اٹھا اور اس نے اندر جا کر والدہ سے بات کی۔

نکاح خواں کا بندوبست فرقان ہی نے کیا۔ ''نکاح نامے کی خانہ پری کی جانے لگی تو مہر کی رقم کے بارے میں ثاقب، عاطف، عاقب اور فرقان نے ایک طرف ہو کر آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ عاقب نے بھائیوں پر چھوڑا اور دونوں بھائیوں نے اتفاقِ رائے سے کہا۔ ''شرعی مہر۔''

''یعنی؟'' فرقان نے پوچھا۔

''ساڑھے بتیس روپے۔''

فرقان نے اختلاف کیا۔ ''مہر شرعی سے مراد ہے وہ مہر جو شرع محمدیؐ کے مطابق مرد کی حیثیت دیکھ کر مقرر کیا جائے...... میرا خیال ہے مہر دو لاکھ سے کم نہ رکھا جائے۔''

''دو لاکھ!'' ثاقب نے آنکھیں پھاڑیں۔ ''اس بھگوڑی کی اوقات ہے اتنی۔''

''وہ تمہارے گھر کی عزت بننے جا رہی ہے ثاقب۔''

فرقان کو ثاقب کی بات بری لگی تھی۔

''فرقان بھائی کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو یہ کہاں سے دے گا دو لاکھ۔'' عاطف نے دبی زبان سے کہا۔

''اونچ نیچ کی نیت کیوں رکھی جائے۔'' فرقان بولا۔

عاطف اس کی بات پر جھینپ گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔

''میرا بھی وہ مطلب نہیں جو تم سمجھ رہے ہو...... لڑکی کا وکیل بنا ہوں...... اس کے حق کا تحفظ میری ذمے داری ہے...... یتیم بچی ہے...... اس وقت اس کا اپنا کوئی نہیں...... نہ تم لوگوں نے اسے عروسی جوڑا دیا ہے نہ کوئی زیور...... مہر دو لاکھ سے کم نہیں ہوگا۔''

ثاقب اور عاطف نے ایک دوسرے کو دیکھا اور عاقب نے ان دونوں کا نکھیوں سے جائزہ لیا۔ گھر کے اندر فرقان کے گھر کی خواتین ماہ نور کو اوڑھانے کے لیے سرخ رنگ کا کوئی دوپٹا تلاش کر رہی تھیں۔ مہر دو لاکھ روپیا ہی لکھا گیا۔

عاقب اور ماہ نور کا نکاح ہو گیا۔

نکاح کے بعد ثاقب اور عاطف یوں گھر واپس ہوئے جیسے میت کی تدفین کر کے آنے والے قبرستان سے لوٹا کرتے ہیں۔ گاڑی عاقب کے پاس تھی۔ ثاقب اور عاطف نے گاڑی اسی کے پاس رہنے دینا مناسب سمجھا۔ فرقان ان دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر پہنچانے آیا۔ ثاقب نے اسے اصرار کر کے کھانے کے لیے روک لیا۔ عاقب اور ماہ نور کے نکاح کی خبر نے راحمہ اور رخشندہ دونوں کو ششدر کر دیا۔

''پھپو کو کیا جواب دیں گے؟'' رخشندہ نے عاطف سے کہا۔

''کیا کرتے مجبوری تھی۔'' عاطف کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

راحمہ دل ہی دل میں خوش تھی۔ اس کے جذبۂ حسد کو تسکین ملی تھی۔ ماہ نور سے عاقب کے نکاح کے بعد نسرین کے اس گھر میں بیاہ کر آنے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ بھی اس گھر میں آ کر رخشندہ ہی کی طرح اپنی اوقات بھول جاتی۔

کھانے کے بعد ثاقب نے راحمہ سے قہوہ بنانے کو کہا اور تینوں مردلان میں آ بیٹھے۔ عاطف کو یکایک خیال آیا۔ اس کا موبائل فون بیلنس ختم ہونے کو تھا۔ فرقان کی گاڑی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ نزدیکی مارکیٹ سے فون کارڈ لینے چلا گیا۔ ابھی واپس نہ لوٹا تھا کہ ماہ نور کے گھر والوں کی مخبری پر پولیس کا چھاپا پڑا اور ثاقب کے ساتھ پولیس فرقان کو بھی لے گئی۔ عاطف گھر لوٹا تو راحمہ اور رخشندہ سراسیمہ گیٹ کے باہر کھڑی ملیں۔ آئندہ خطرے کے پیشِ نظر عاطف نے ان دونوں اور عاشر کو لے کر فوراً وہاں سے نکل کر کہیں اور پناہ

لینے میں عافیت جانی۔

☆☆☆

خاندان بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ عاقب نے کسی لڑکی کو بھگا کر اس سے نکاح کرلیا تھا۔ نسرین کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہوا تھا۔ عاقب کی پھوپی ہاتھ مل مل کر عاقب اور اس لڑکی کو کلپ کلپ کر بددعائیں دے رہی تھیں۔

گو فرقان کا بہ ظاہر کوئی بیچ نہ تھا مگر شومئی قسمت کہ علاقہ تھانے کا ایس ایچ او جو مخالف جماعت کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا اس کا چہرہ آشنا تھا۔

''تو آپ ہیں لڑکی کے اغوا کے پیچھے۔'' ایس ایچ او جانباز علی نے اپنا ڈنڈا ہاتھ کی ہتھیلی پر دھیرے دھیرے مارتے ہوئے کہا۔

''جناب! یہ میرے دوست ہیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔'' ثاقب نے صفائی پیش کی۔

''چور کا یار گرہ کٹ...... '' ایس ایچ او نے تحقیر سے کہا۔

''آپ توہین کررہے ہیں ایس ایچ او صاحب۔'' فرقان نے احتجاج کیا۔

''توہین!'' ایس ایچ او نے اسے گھورا پھر ثاقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دوسروں کی عزت پر ڈاکا ڈالنے والوں کا ساتھ دیتے ہو...... شرم نہیں آتی پھر اپنے جلسوں جلوسوں میں نعرے لگاتے ہو کہ ہم بہنوں، بیٹیوں کی عزتوں کے رکھوالے ہیں۔''

فرقان نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر ثاقب نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں صلاح دی کہ اس وقت چپ رہنے میں عافیت تھی۔

ایس ایچ او نے اپنے معاون اہلکاروں کو طلب کیا اور دونوں کو حوالات میں بند کردینے کا حکم دیا۔ ثاقب نے گھبرا کر فرقان کو دیکھا۔

''جب تک لڑکی اور لڑکا تھانے میں پیش نہیں ہوجاتے تم دونوں حوالات میں رہو گے۔'' ایس ایچ او نے ثاقب اور فرقان کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں...... میں ایک کال کرسکتا ہوں؟'' فرقان نے کہا۔

''کسے کرو گے؟ پارٹی کو؟''

''جی نہیں...... اپنے دوست کو۔''

''کرلو۔'' ایس ایچ او کا انداز کچھ اس طرح تھا جیسے کہتا ہو کرلو فون دیکھتا ہوں تمہارا فون کرنا کیا کام دکھاتا ہے۔

شہر کے ایک دوسرے تھانے کے انچارج اشفاق احمد سے فرقان کے بہت پرانے مراسم تھے۔ دونوں ایک ہی کالج سے فارغ التحصیل تھے۔ گریجویشن کے بعد اشفاق نے پولیس کے محکمے میں نوکری کرلی تھی۔ فرقان نے بینکاری کا شعبہ اپنایا تھا۔ اشفاق اور جانباز علی ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ہم پیشہ تھے۔ ہم عہدہ تھے۔ ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ وقت پڑنے پر ایک دوسرے کو ممنونِ احسان بھی کرتے رہتے تھے۔

فرقان نے اشفاق کے موبائل یا آفس کے نمبر پر فون کرنے کے بجائے اس کی بیوی کے نمبر پر فون کیا اور اسے محتاط الفاظ میں بتایا کہ وہ اس وقت فلاں تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ وہ یہ بات اپنے شوہر کو ضرور بتادے۔

''آپ فکر نہ کریں بھائی میں ابھی ان کے موبائل پر بات کرتی ہوں۔'' اشفاق کی بیوی نے کہا۔

''اور ہاں اسے کہیں والدہ کو ذرا تسلی دے دے۔ انہیں پتا چلے گا تو وہ بہت پریشان ہوں گی۔''

''اوکے او کے۔''

فرقان کو یقین تھا اشفاق اس کی خیر خبر ضرور لے گا۔ وہ اگر اس وقت مشکل میں تھا تو کیا' بارہا فرقان کے کام آیا تھا۔ جماعت کے اثر ورسوخ پر اسے اس کی مرضی کے تھانوں میں تعیناتیاں دلوائی تھیں۔ مجرموں تک رسائی میں جماعت کے ایکٹوسٹوں سے اسے مدد دلوائی تھی۔ اسے آنا چاہیے تھا آخر آئندہ بھی تو اسے اسی شہر میں نوکری کرنی تھی۔ آئندہ بھی کام پڑنے تھے۔ فطرتاً بھی اشفاق بے فیض اور طوطا چشم نہیں تھا۔ اسے دوستی اور تعلق کا بھرم رکھنا آتا تھا۔ اس کی بیوی کے بھی فرقان کی والدہ، بہنوں اور بیگم سے خاصے اچھے تعلقات تھے۔ دونوں گھرانوں میں ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا۔

ثاقب اور فرقان کو حوالات میں بند کردیا گیا۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر راحمہ، رخشندہ اور عاشر کے ساتھ خود بھی اپنی سسرال منتقل ہوجانے کے بعد عاطف اپنے زیر استعمال فرقان کی گاڑی اس کے گھر پہنچانے گیا تو اس کی والدہ ہول گئیں۔ ''فرقان کہاں ہے؟''

''آجائیں گے...... آپ پریشان نہ ہوں۔'' عاطف نے انہیں تسلی دی۔

''ہے کہاں وہ؟''

''آجائیں گے...... آجائیں گے۔''

''مجھے بتاؤ تو...... تم اس کی گاڑی کیوں لے کر آئے ہو۔'' والدہ روہانسی ہوگئیں۔

عاطف کو انہیں حقیقتِ حال سے آگاہ کیے بنا چارہ نہ

رہا۔ ان کے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ عاقب اور ماہ نور جنہیں گھر کی خواتین نے ان کے نکاح کی خوشی میں اچھا کھانا کھلانے کی تیاری کر رکھی تھی چور بنے بیٹھے تھے کہ انہی کی وجہ سے اس گھر کا واحد مرد حوالات چلا گیا تھا۔

''میں کیا کروں... کہاں جاؤں... کس سے کہوں!''

فرقان کی والدہ سینہ پیٹ رہی تھیں۔

''آہستہ امی...... محلے والوں کو آواز گئی تو اور مشکل ہو جائے گی۔'' فرقان کی بہن نے ماں کو سمجھایا۔ فرقان کی والدہ کو اپنے گھر میں عاقب اور ماہ نور کی موجودگی سخت کھٹک رہی تھی۔ سمجھدار اور تحمل مزاج نہ ہوتیں تو شاید دونوں پر برس ہی پڑتیں۔ بعید نہ تھا کہ اپنے گھر سے نکال باہر کرتیں۔

''آنٹی! آپ فکر نہ کریں...... فرقان بھائی آ جائیں گے...... انہوں نے ہماری پریشانی میں ہمارا ساتھ دیا ہے...... ہم ان کے لیے اپنا خون بھی بہانے سے دریغ نہیں کریں گے۔'' عاطف نے کہا۔

''تبھی تم یہاں بیٹھے ہو آرام سے اور میرا بچہ......''

والدہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی اور سب چونکے۔ فون کال اشفاق کی تھی۔ وہ فرقان کی والدہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''ہاں بیٹے...... میں بات کر رہی ہوں۔''

''السلام علیکم آنٹی۔''

''وعلیکم السلام۔''

''آنٹی میں اس وقت فرقان کے پاس ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔''

''کیسے بے فکر ہو جاؤں بیٹے...... مجھ بیوہ کی وہ ایک ہی آنکھ ہے۔''

''میں جانتا ہوں...... جانتا ہوں آپ اس سے کتنا پیار کرتی ہیں...... میرا بھی وہ دوست نہیں بھائی ہے...... ان شاء اللہ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ میں اسے خود اپنے ساتھ گھر لے کر آؤں گا۔''

''میری اس سے بات تو کرواؤ۔'' والدہ کے لہجے میں یک گونہ بے قراری تھی۔

''ہاں...... کر لیں۔''

''السلام علیکم!'' فرقان نے اشفاق سے فون لے کر کہا۔ والدہ اس کی آواز سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''پلیز امی۔''

''دیکھا یہ ہوتا ہے پرائے پھڈے میں پڑنے کا انجام۔''

''امی! احتیاط سے...... اس وقت تو خیر میں اشفاق کے فون سے بات کر رہا ہوں اور میں نے اسے ساری بات بتا بھی دی ہے مگر جب تک میں یہاں ہوں احتیاط سے بات کریں...... جیسے اس قصے سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہے سمجھ گئی۔''

فرقان نے فون اشفاق کو تھما دیا۔

''ٹھیک ہے آنٹی...... میں خود آؤں گا آپ کی طرف۔''

''میرا بچہ کب گھر آئے گا؟''

''آ جائے گا...... آ جائے گا...... آپ تسلی رکھیں۔''

ایس ایچ او جانباز علی سے اپنے مراسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اشفاق اپنی ذمے داری پر فرقان کو لاک اپ سے باہر نکال لایا تھا اور دونوں تھانے کے ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھے تخلیہ میں باتیں کر رہے تھے۔ اشفاق نے اس کے لیے چائے بھی منگوالی تھی۔ ''رات میں نے تیرے ساتھ ہی گزارنی ہے۔'' اشفاق نے فرقان سے کہا۔

''کیوں؟'' فرقان چونکا۔

''کیونکہ میں اگر تیرے ساتھ نہ بیٹھا تو جانباز علی کی نیت اچھی نہیں لگتی مجھے تیرے بارے میں۔''

فرقان کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''کچھ کہا اس نے؟''

''ہاں...... کہہ رہا تھا لڑکی والے سورس فل لوگ ہیں...... آئی جی تک جا پہنچے ہیں...... آئی جی کہتا ہے چوبیس گھنٹے میں لڑکی بازیاب ہو جانی چاہیے...... لڑکی کی بازیابی کے لیے تم دونوں کی چھترول یقینی ہے۔ میں رات بھر تمہارے ساتھ بیٹھا رہوں گا۔ جانباز کچھ تو مروت کرے گا میری۔''

''ثاقب کا کیا ہوگا...... وہ بے چارہ تو کمزور سا آدمی ہے میری طرح سخت جان نہیں...... دو منٹ کی چھترول بھی برداشت نہیں کر سکے گا...... اگل دے گا سب کچھ۔''

''ایسے کمزور لوگوں کے لیے تم کیوں خود کو خطرے میں ڈالتے ہو...... معلوم ہے نا جانباز علی تمہاری جماعت سے کتنی خار رکھتا ہے۔''

''معلوم ہے۔''

''دو دن پہلے تمہاری مخالف جماعت کا جو لیڈر مارا گیا ہے وہ جانباز علی کا قریبی تھا۔ اس کی پرخاش میں وہ تمہیں کوئی زک پہنچا سکتا ہے۔''

''تمہاری اس سے کوئی بات ہوئی؟''

''ہاں...... جب میں آیا تو تھوڑی دیر اس کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ یہ جو بندے تم نے اٹھائے ہیں ان میں فرقان میرا جگری ہے۔ اسے کچھ نہیں

ہونا چاہیے۔‘‘

’’پھر؟‘‘ فرقان کے لہجے میں بیتابی تھی۔

’’اس نے مجھے آئی جی والی بات بتائی اور کہا تمہاری خاطر میں اتنا کرسکتا ہوں کہ اگر یہ کل تک لڑکی اور اسے بھگا کر لے جانے والے کو حاضر کردیں تو کسی کو ان دونوں بندوں کو ہاتھ نہ لگانے دوں۔ وہ بھی صرف تمہاری خاطر...... ورنہ تمہیں معلوم ہے ہم بندہ بھی بازیاب کروالیتے ہیں اور چھترول بھی خوب لگاتے ہیں۔‘‘

’’لڑکی کسی نے نہیں بھگائی وہ خود آگئی تھی ان لوگوں کے گھر۔‘‘ فرقان نے اسے آہستگی سے بتایا۔

’’اب کہاں ہے؟‘‘

’’اسی کے ساتھ ہے...... وہ اپنے گھر واپس ہی نہیں جانا چاہتی...... دونوں نے نکاح بھی کرلیا ہے۔‘‘

’’ارے تو پھر لمبے چکر میں کیوں پڑے ہوئے ہیں یہ لوگ اور تمہیں بھی پریشانی میں ڈال دیا...... ان سے کہو دونوں کو تھانے میں پیش کریں اور لڑکی بیان دے دے کہ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں، عاقل و بالغ ہوں اور میں نے اس لڑکے سے نکاح کرلیا ہے...... اس کے بیان کے بعد تمہاری اور تمہارے یار ثاقب کی جان بھی چھوٹ جائے گی۔‘‘

’’ثاقب سے بات کرسکتے ہیں ہم لوگ؟‘‘

’’ہاں ہاں کیوں نہیں...... تم بیٹھو میں اسے ساتھ لے کر آتا ہوں۔‘‘

اشفاق گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ثاقب کو اپنے ساتھ لے کر آگیا۔ ثاقب کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اشفاق نے پہلے تو اس کے لیے چائے منگوائی پھر صلاح کاری شروع کی۔

’’دیکھو بھئی لڑکی تو پولیس نے تم لوگوں سے بہر حال بازیاب کرنی ہے۔ بات اوپر تک پہنچ گئی ہے اور جب اوپر سے ڈنڈا پڑے تو پولیس مردے کو بھی قبر سے نکال لاتی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ لڑکی پیش کردی جائے۔ دونوں نکاح تو کر ہی چکے ہیں۔ لڑکی شوہر کے حق میں بیان دے دے بس کافی ہے۔ ورنہ خوامخواہ تمہاری بھی سختی اور میرے یار فرقان کے گھر والے بھی مفت میں پریشان اور بدنام الگ...... اس کی نوکری کا معاملہ بھی ہے...... اپنے بچے بھی تو پالنے ہیں اس نے۔‘‘

ثاقب نے فرقان کو دیکھا جیسے اس کی صلاح جاننا چاہتا ہو۔

’’میرا کوئی مسئلہ نہیں ثاقب...... پریشانی، بدنامی سب سہہ سکتا ہوں...... نوکری کی بھی پروا نہیں...... رزق دینے والا اوپر بیٹھا ہے...... مگر...... تم شاید پولیس کی سختی نہ سہہ سکو کیونکہ میری طرح سخت جان نہیں ہو...... جب کل بھی مسئلے کا حل یہی ہے، آج بھی یہی تو...... سوچ لو۔‘‘ فرقان نے کہا۔

’’میں نے کیا سوچنا ہے یار...... سوچنا تو اس خبیث عاقب کو چاہیے تھا لاک اپ کا بس نام ہی سنا تھا اس نے اندر بٹھا دیا۔‘‘ ثاقب کے لہجے میں ملال تھا۔

’’بہتر ہے یہاں سے جلدی نکلو...... میں خود بھی پولیس والا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ جو پولیس کے شکنجے میں نہ آئے وہی اچھا...... خوامخواہ تمہارا پیسا بھی خرچ ہوگا وقت بھی ضائع ہوگا اور جان پر بھی سختی۔‘‘ اشفاق بولا۔

’’ٹھیک ہے اشفاق صاحب جیسے آپ بہتر سمجھیں۔‘‘

’’گڈ! تو میں کہہ دوں ان لوگوں سے کہ لڑکی کو پیش کر رہے ہیں؟‘‘

’’جی۔‘‘

’’صرف لڑکی کو نہیں لڑکے کو بھی پیش ہونا پڑے گا۔‘‘ فرقان بولا۔

’’ظاہر ہے...... نکاح کا قانونی ثبوت بھی پیش کرنا پڑے گا......‘‘ اشفاق نے کہا۔ ’’تو پھر کب پیش کروگے دونوں کو؟‘‘

’’جب آپ کہیں۔‘‘ ثاقب نے گویا پتوار اشفاق کے ہاتھ میں دے دی۔

’’میرا خیال ہے صبح۔‘‘ فرقان نے کہا پھر توجیہہ بھی پیش کی۔ ’’اس وقت تو بے چاری لڑکی بھی پریشان ہوگی۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... میں کہہ دیتا ہوں جانباز علی سے کہ صبح لڑکی اور لڑکا دونوں پیش ہورہے ہیں۔‘‘

رات بھر اشفاق تھانے میں فرقان کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ گو اس نے جانباز علی کو اس امر کی یقین دہانی کرادی تھی کہ صبح لڑکی پیش کردی جائے گی لہٰذا احراست میں لیے گئے افراد پر کوئی سختی نہ کی جائے لیکن پھر بھی اس نے فرقان کے پاس سے جانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ فرقان سے تو جانباز علی کی سیاسی مخاصمت بھی تھی۔ اس پر اندھا بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تھانوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا بھلا!

☆☆☆

عاقب جو فطرتاً ایک بزدل نوجوان تھا، تھانے میں پیش ہونے کو تیار نہ تھا مگر عاطف نے اسے غیرت دلائی۔

’’کمینے انسان تیری وجہ سے بڑا بھائی حوالات میں بند ہے

کیا وہ بند ہی بیٹھا رہے گا۔''
''انہیں لڑکی چاہیے نا اسے پیش کر دیں...... وہ کہہ دے گی میں اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''
''تھانہ اور کچہری تجھ جیسے ذلیل آدمی کا چہرہ بھی دیکھنا چاہیں گے۔''
''اور اگر تھانے والوں نے مجھے اندر کر دیا؟''
''تو میں شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ تجھ جیسے ننگ خاندان سے ہمیں چھٹکارا ملا...... تیری وجہ سے بڑا بھائی اندر ہے۔ سارا گھر پریشان ہے...... راحمہ بھابی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے...... بے چارے فرقان بھائی کی بلاوجہ میں تختی...... والدہ اس کی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں...... بیوی کو بار بار دورے پڑ رہے ہیں اور تو بزدلی دکھا رہا ہے...... تجھ سے اچھی تو وہ لڑکی ہے جو تھانے جا کر بیان دینے کو تیار ہے۔''
''دیکھ لیں بھائی۔''
''اب مجھے تو جو دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا...... دیکھ لیا کہ تو کتنا خود غرض ہے...... کوئی اور ہوتا تیری جگہ تو کہتا میرا باپ جیسا بھائی میری وجہ سے اندر ہے اسے باہر نکالنے کے لیے تو میں اپنی جان پر بھی کھیل جاؤں گا۔''
عاطف نے عاقب کو اتنی غیرت دلائی کہ وہ بالآخر پولیس کے سامنے پیش ہونے کو تیار ہو ہی گیا۔ ماہ نور کو پولیس اسٹیشن لے جانے سے قبل اسے اچھی طرح سمجھایا بجھایا گیا۔ نو بیاہتا دلہن کا روپ دینے کے لیے اسے فرقان کی ایک بہن نے اپنا زرق برق جوڑا جو اس نے اپنے ایک کزن کی شادی پر سلوایا تھا اور صرف ایک مرتبہ ہی پہنا تھا پہننے کو دیا۔ عاطف اس کے لیے رخشندہ کا ایک امیٹیشن جیولری سیٹ لے آیا۔ فرقان کی بیوی نے کندنی کنگن جو اس کی والدہ اس کے لیے انڈیا سے بطور سوغات لائی تھیں، ماہ نور کی کلائیوں میں پہنا دیے۔ یہ کنگن اسے واپس ملتے نہ ملتے اس کا شوہر گھر تو واپس آجاتا بس...... ماہ نور کا میک اپ بھی کر دیا گیا تاکہ بنی سنوری ہونے کی بنا پر وہ نو بیاہتا دلہن ہی دکھائی دے۔
ماہ نور اور عاقب تھانے میں پیش ہو گئے۔ ماہ نور کے گھر والوں کو اس کی بازیابی کی اطلاع دے دی گئی۔ اس کی خالہ، خالو، ماموں اور دوسرے بہت سے رشتے دار تھانے پہنچ گئے۔ اسے اپنے حق میں کرنے اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے انہوں نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ منت سماجت کی، واسطے دیے۔ اسے کچھ نہ کہنے سننے کی یقین دہانی کرائی۔ پورے تحفظ کی ضمانت دی۔ خالہ اس کے پیروں میں پڑ گئی۔ مردوں نے اپنی ٹوپیاں سر سے اتار کر اس کے قدموں میں ڈال دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ پولیس کو اپنا بیان دے چکی تھی کہ وہ عاقل و بالغ ہے اپنی مرضی سے خالہ کا گھر چھوڑ کر نکلی تھی۔ عاقب سے اس کا نکاح ہو چکا ہے۔ وہ اس کا شوہر ہے، اب وہ اسی کے ساتھ رہنا اور بسنا چاہتی ہے۔
ماہ نور اور عاقب کے پیش ہو جانے کے بعد ثاقب اور فرقان کو پولیس حراست سے نجات مل گئی۔ فرقان کو ہمراہ لے کر اشفاق حسب وعدہ اس کی والدہ کے پاس پہنچا۔
''آنٹی! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا نا...... پوچھ لیں اس سے کسی نے اسے انگلی بھی نہیں لگائی ہے۔''
''جیتے رہو بیٹا...... جیسے تم نے میرا دل ٹھنڈا کیا تمہاری ماں کا دل بھی تمہاری طرف سے سدا ٹھنڈا رہے...... بہت بہت شکریہ۔''
''لیکن ایک بات کہوں برا نہ مانیے گا۔''
''ہاں ہاں...... کہو۔''
''دوستی اپنی جگہ لیکن دوستی کی خاطر بدنامی کو گلے لگانا عقلمندی نہیں...... اس لڑکے کے بھائی سے فرقان کی دوستی ہے، ٹھیک ہے لیکن اس دوستی کی خاطر گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو اپنے گھر میں رکھ لینا عقلمندی نہیں تھی...... بہنوں والا گھر ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے...... جس کی لڑکی جاتی ہے وہ تو سانپ کی طرح بل کھا رہا ہوتا ہے۔''
''ٹھیک کہتے ہو بیٹا...... غلطی مجھ سے بھی ہوئی۔ میں نے سوچا جوان لڑکی ہے وہ کمبخت تو نہ جانے کہاں کہاں لیے چھپاتا پھرے گا اسے، یہیں بیٹھی رہے تو بہتر۔''
''آپ کی ہمدردی کو سو سلام آنٹی مگر یہ خطرناک معاملے ہوتے ہیں۔ دشمنی بندھتی ہے تو نسلوں چلتی ہے...... جس گھر کی بزرگ عورت اپنی عزت کی خاطر گھر سے بھاگی لڑکی کے پیروں میں پڑ جائے اور مرد سروں سے ٹوپیاں اتار کر اس کے قدموں میں ڈال دیں اور وہ پھر بھی ان کے بجائے اس لڑکے کا ساتھ دے جس کی خاطر اس نے گھر چھوڑا ہو، وہ پھر ایسی لڑکی کا جو حشر نہ کریں کم ہے۔''
''تمہارا مطلب ہے وہ اس سے انتقام لیں گے۔''
فرقان کی والدہ سینے پر ہاتھ دھر کر بولیں۔
''کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''
''اللہ رحم کرے...... اس بچی پر بھی اور ہم پر بھی۔ ویسے لڑکی ہے اچھی...... ساری گھرداری آتی ہے اسے سخت وقت دیکھ رکھا ہے...... ہر حال میں گزارہ کرنے والی لڑکی ہے...... میری بچیوں اور بہو سے تو وہ ایسے گھل مل گئی تھی

جیسے انہی کے ساتھ رہتی آئی ہو۔"

"فی الحال دور دور رہیے گا...... اسی میں بہتری ہے...... یہ میرا مشورہ ہے آگے آپ کی مرضی۔"

☆☆☆

ماہ نور نے عدالت میں بھی اپنا وہی بیان دہرایا جو اس نے تھانے میں پولیس کو دیا تھا۔ عدالت نے اسے عاقب کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی، خالہ اور ماموں نے عدالت سے بے نیل و مرام جاتے ہوئے اس سے کہا۔ "تو آج سے ہمارے لیے مرچکی...... اپنے باپ کی اولاد ہے تو آج کے بعد ہمیں اپنا منہ نہ دکھانا۔"

ماہ نور اور عاقب گھر آگئے۔ راحمہ اور رخشندہ بھی ڈرتی ڈرتی واپس آگئیں۔ ثاقب کو پھوپی اور ان کے گھر والوں سے معذرت کرنا پڑی کہ عاقب کی ناخلفی نے انہیں باپ کا طے کردہ رشتہ نبھانے لائق نہ چھوڑا تھا۔

"نہ میں تمہاری پھوپی نہ تم میرے بھتیجے...... ارے تم نے اس لڑکی سے عاقب کا نکاح کرتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ میری بچی پر کیا گزرے گی۔" پھوپی نے تلخی سے کہا۔

"مجھے آپ لوگوں کے دکھ کا پورا احساس ہے پھپو لیکن حالات ہی ایسے ہوگئے تھے کہ......" ثاقب اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"روز حشر بھائی سے بھی گلہ کروں گی اور تم لوگوں کے گریبان بھی پکڑوں گی جو تم نے میری معصوم بچی کے ساتھ کیا ہے۔" پھوپی جذباتی ہوکر رونے لگیں۔

"پھپو ہمارا کیا قصور...... غلطی تو عاقب کی ہے بلکہ سچ پوچھیں تو عاقب کی بھی اتنی نہیں جتنی اس لڑکی کی ہے...... وہ خود ہی آگئی تھی ہمارے گھر۔" ثاقب نے صفائی پیش کی۔

"ارے تو ایسی کیا گھر بسائے گی...... جسے اپنے خاندان کی عزت کا خیال نہیں وہ تمہاری کیا عزت رکھے گی...... رہ جائے تو میرا نام بدل دینا۔" پھوپی نے بڑے یقین سے پیشگوئی کی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جسے اپنے خاندان، اپنے خالہ خالو کی عزت کا پاس نہیں جنہوں نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی، عزت سے رکھا...... وہ عاقب کی کب بن کر رہے گی...... اس وقت تو اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ خالہ، ماموں کے پاس واپس جاتی تو وہ اسے قتل کردیتے اس لیے اس نے عاقب کے حق میں بیان دے دیا۔"

ثاقب کو بھی اپنا ہمنوا پاکر پھوپی نے بڑے تیقن سے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "صرف چھ ماہ کا ٹائم دے رہی ہوں...... نہ بھاگ جائے تمہارے گھر سے بھی تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

"پھپو!" ثاقب نے ہچکچاتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔ "آپ تھوڑے دن انتظار کرلیں۔"

"کس بات کا!" پھوپی چونکیں۔

"وہ جائے گی تو ہم لوگوں کو عاقب کے لیے پھر آپ کے دروازے پر ہی آنا ہے۔"

پھوپی نے ثاقب کو گھورا پھر تلخ لہجے میں بولیں۔ "میری بچی کو تم نے ایسی گری پڑی سمجھ رکھا ہے...... ارے اس ارادے سے تو میں تم لوگوں کو اپنی چوکھٹ بھی نہ چڑھنے دوں گی کبھی...... اور عاقب! اس لفنگے سے تو کہنا مجھے اپنی صورت بھی نہ دکھائے کبھی ورنہ ماروں گی ہزار گنوں گی ایک!"

ثاقب شرمندہ ہوکر اٹھا۔

ماہ نور کے خالو نے دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار اونچی کروالی۔ محلے داروں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اپنی ہی لڑکی کو موردالزام ٹھہراتے تھے اور اب اس کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ چند محلے داروں سے یہ بھی پتا چلا کہ اپنے طور پر بھائی چارگی میں جب انہوں نے ماہ نور کے خالو کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جو ہونا تھا ہوچکا اب وہ اپنی لڑکی یا اس کے سسرال والوں میں سے کسی کو کوئی زک پہنچانے کی نیت نہ رکھیں تو اس نے کہا۔ "عزت کا معاملہ تھا وہ تو گئی اب سات خون بھی کردیے جائیں تو عزت واپس نہیں آسکتی۔ میں تو جوان لڑکی کی ذمے داری لینے کے حق میں ہی نہیں تھا، میری بیوی بیوقوف تھی جو مرنے والی بہن کی محبت میں اس کی بیٹی کو گھر لے آئی...... ہمارا اب اس سے کوئی لینا دینا نہیں...... زندگی بھر اس سے تعلق ختم...... اس کے ماموں اور مامی کا بھی یہی خیال ہے۔"

☆☆☆

ثاقب اور عاطف دونوں ہی کو اپنے گھر کی عزت خاک میں مل جانے کا نہایت ملال تھا۔ یہ وہ گھرانا تھا جس کی ان کے باپ کی وجہ سے محلے میں عزت رہی تھی۔ ثاقب اور عاطف نے بھی اپنے طرزعمل سے باپ کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کے بعد بھی اس عزت کو برقرار رکھا تھا۔ مجال تھی جو دونوں میں سے کسی نے محلہ کی کسی لڑکی کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی کوشش کی ہو۔ عاقب سے بھی انہیں ایسا کوئی اندیشہ نہ تھا مگر ہونی کو کون روک سکا ہے۔ حالات و واقعات سے انہیں اب بھی یہ یقین تھا کہ زیادہ غلطی لڑکی کی تھی۔ کیوں آئی وہ رات کو گھر کی دیوار پھلانگ کر ان کے

گھر میں؟ کیوں رہی وہ رات بھر عاقب کے کمرے میں؟ اور کیوں آمادہ نہ ہوئی اپنی خالہ کے گھر واپس جانے کو؟ گئی عزت کا بھرم رکھنے کی خاطر لوگ کیا کچھ نہیں کر گزرتے؟ آ ہی گئی تھی تو صبح ہونے سے پہلے اگر اپنے گھر چلی گئی ہوتی تو اتنی ذلت اور رسوائی تو نہ ہوتی۔ ایک چچا کے گھر کے سوا کہ ان کی بھی مجبوری تھی کہ ان کی بیٹی رخشندہ عاطف سے بیاہی ہوئی تھی، باقی سارا خاندان ان کے گھرانے سے قطع تعلق کر بیٹھا تھا۔

عاقب اور ماہ نور کے گھر آ جانے کے بعد ثاقب اور عاطف نے دونوں پر اپنی ناراضگی کا اظہار اپنی خاموشی سے کیا۔ ماہ نور نے شروع شروع میں ان سے بے تکلف ہونے اور ان کے آگے بچھ بچھ جانے کی پوری کوشش کی مگر دونوں میں سے ایک کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ وہ چائے بنا کر ان کے آگے رکھتی تو وہ پیالیاں پرے سرکا دیتے۔ کھانا پکاتی تو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا نہ کھاتے۔ اس سے سامنا ہوتا تو تیوری چڑھا لیتے۔ اسے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے۔ کھانے کی میز پر آتی تو دونوں اٹھ کر چلے جاتے۔ دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کو بھی اسے زیادہ رخ دے کر بات نہ کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ رخشندہ تو خیر اسے لفٹ ہی نہ کراتی راحمہ البتہ بات کر لیتی تھی۔ ماہ نور نے اس سے اور عاقب سے کئی مرتبہ ثاقب، عاطف اور رخشندہ کی بے رخی کا گلہ کیا۔

”خود مجھ سے بھی بات نہیں کرتے ہیں دونوں بھائی۔“ عاقب نے کہا۔ اس کی یہ بات تو ٹھیک تھی۔ وہ دونوں اس سے بھی ہمکلام نہ ہوتے تھے۔

”ٹھیک ہو جائے گا سب۔“ راحمہ ماہ نور کو ڈھیر سے تسلی دیتی۔

ماہ نور کا دل برا ہوتا۔ سوائے عاقب اور راحمہ کے اس گھر کے باقی لوگ اس سے کس قدر حقارت اور اہانت کا رویہ رکھتے تھے جیسے وہ کوئی پرلے درجے کی گری پڑی مخلوق تھی۔ عاقب بھی دونوں بھائیوں کے سامنے بلی سے ڈرے چوہے کی طرح سہما سہما رہتا۔ ان کی موجودگی میں اس سے بات کرنے سے گریز کرتا۔ اس کے جائز جذباتی تقاضوں کے ساتھ وہ اس کی مادی ضرورتوں سے بھی بے نیازی اختیار کیے ہوئے تھا۔ عجیب شوہر تھا۔ خالہ کے گھر سے جن تین کپڑوں میں وہ اس کے گھر آئی تھی، ان کے علاوہ فرقان کی ایک بہن نے اسے اپنا ایک عام سا جوڑا پہننے کے لیے دیا تھا اور نکاح کے موقع پر ایک فینسی سوٹ جو اس کے اصرار کے باوجود فرقان کی والدہ نے بیٹی کو اس سے واپس نہیں لینے دیا تھا۔ شوہر اور سسرال کی طرف سے اسے ایک دھجی تک تو ملی نہیں تھی اور نہ کسی کو اس کا احساس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں جوتے بھی ابھی تک وہی تھے جو وہ خالہ کے گھر سے پہن کر نکلی تھی۔ زیور تو دور کی بات شوہر کے گھر میں اسے عزت بھی نہ مل رہی تھی۔ وہ دن بھر کسی ملازمہ کی طرح گھر کے کاموں میں لگی رہتی، کسی کا سراہنا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ سمجھا جاتا۔ عاقب بھی عجیب دبو سا آدمی تھا گھر والوں کے اس رویے پر احتجاج کرنا تو درکنار اس کا دل رکھنے کو بھی کچھ نہ کہتا۔

واپسی کے لیے پہلے ثاقب نے رخت سفر باندھا۔ سفر پر جاتے ہوئے آدمی کا دل ویسے بھی رقیق ہو رہا ہوتا ہے۔ عاقب سے اس کی کیسی ہی ناراضگی سہی خون کا رشتہ تھا۔ جانے سے قبل اس نے عاقب سے بات چیت شروع کر دی۔ ثاقب کی دیکھا دیکھی عاطف کی بھی اس سے بات چیت شروع ہو گئی، جانے سے پہلے ثاقب نے عاقب کو سمجھایا۔ ”ذرا احتیاط سے رہنا...... دشمن کو کبھی بے خبر نہ سمجھے آدمی...... دشمن تاک کر حملہ کرتا ہے...... سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی بھائی۔“

”اور اس لڑکی کو کبھی قابل اعتبار نہ سمجھنا...... جسے اپنے خاندان کی عزت کی پروا نہیں ہوئی وہ تمہاری عزت کی پروا کب کرے گی...... کسی بھی وقت تمہاری عزت مٹی میں ملا سکتی ہے۔“

”صحیح!“ عاطف نے جو تینوں بھائیوں کے اس خفیہ اجلاس میں شریک تھا ثاقب کی بات کی پرجوش تائید کی اور اپنی طرف سے گرہ لگائی۔ ”یہ زیادہ عرصہ رہے گی نہیں...... ایسی عورتیں ایک کی ہو کر نہیں رہتیں۔“

راحمہ کو ثاقب پر اپنے اور بیٹے کو سعودی عرب بلائے جانے کے لیے دباؤ ڈالنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ”مجھے تو اب یہاں رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ماہ نور کے گھر والے کسی بھی وقت کچھ کر سکتے ہیں...... میں تو عاشر کے لیے بہت فکرمند رہنے لگی ہوں جب تک اسکول سے گھر واپس نہیں آ جاتا میرا تو دل سولی پر لٹکا رہتا ہے۔“ اس نے ثاقب سے کہا۔

”فکر مت کرو راحمہ۔“ ثاقب نے اسے تسلی دی۔ ”کوشش میں تو میں پہلے بھی لگا ہوا تھا اب زیادہ کوشش کروں گا تمہیں اور عاشر کو جلد از جلد وہیں بلانے کی...... اور ہاں تم اس کو زیادہ منہ نہ لگایا کرو۔“

”کسے؟“ راحمہ نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔

”ارے وہی جس کی وجہ سے مجھے حوالات کا منہ دیکھنا

پڑا..... اب کیسی نیک پروین بنی پھرتی ہے اس گھر میں۔"

"شکر ہے وہ موٹی بھدو نسرین نہیں آئی اس گھر میں۔" راحمہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

"خاندان میں منہ دکھانے کا نہیں رکھا اس نے ہمیں۔" ثاقب کے لہجے میں تلخی تھی۔ "میں تو سوچ رہا ہوں جب تک سعودیہ میں دانہ پانی لکھا ہے لکھا ہے جب وہاں سے دانہ پانی اٹھ جائے تو یہاں واپس آنے کے بجائے کہیں اور نکلا جائے۔"

"کہاں؟" راحمہ چونکی۔

"دبئی، انگلینڈ، امریکا، کینیڈا...... کہیں بھی۔"

راحمہ کو یک گونہ خوشی ہوئی۔ انگلینڈ، امریکا اور کینیڈا جانا تو اس کا خواب تھا۔

ثاقب کے جانے کے بعد عاطف اور رخشندہ نے بھی واپسی کی تیاری کی۔ جانے سے قبل عاطف نے بھی عاقب کو ماہ نور پر بھروسا نہ کرنے اور اس کے خاندان والوں سے ہوشیار خبردار رہنے کی تلقین کی۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں راحمہ، عاشر، عاقب اور ماہ نور رہ گئے۔ عاقب کی بینک سے بنا اطلاع کئی روز غیر حاضری کا سبب بینک والوں سے چھپا نہ رہ سکا مگر فرقان نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ عمل میں لاکر معاملہ بحال کرا دیا تھا۔

راحمہ کو ماہ نور کی صورت گویا ایک فل ٹائم کیئر ٹیکر میسر آ گئی تھی۔ دونوں بھائیوں کے جانے کے بعد راحمہ اور ماہ نور میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ راحمہ آرام کرتی اور ماہ نور سارا گھر سنبھالتی۔ ملازمہ سے اپنی نگرانی میں گھر کے کام کرواتی۔ صبح ناشتا اور دونوں وقت کھانا پکانا اب ماہ نور ہی کی ذمے داری بن گئی تھی۔ عاقب بالائی منزل سے نیچے شفٹ ہو گیا تھا۔ اوپر والا کمرا اب ہفتے میں ایک آدھ بار صفائی کے لیے ہی کھولا جاتا۔ ماہ نور کبھی کبھی دزدیدہ نظروں سے خالہ کے گھر کی طرف دیکھتی تو اسے وہاں کوئی دکھائی نہ دیتا۔ دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار اونچی ہو کر فصیل شہر کی طرح درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔ خالہ کے گھر سے ماہ نور کو کبھی کوئی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ ماہ نور اپنا دھیان اور دل دونوں نئے گھر میں لگائے رکھنے کی کوشش کرتی مگر کبھی کبھی دونوں ہی بھٹک کر خالہ اور اس کے گھر کی طرف نکل جاتے۔

☆☆☆

عاقب نہایت بے پروا شوہر ثابت ہوا۔ اسے بس اپنی ذات، اپنے آرام، اپنی تسکین کا خیال رہتا۔ ماہ نور کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔ فون پر دونوں بھائیوں سے ملنے والی ہدایتیں اور نصیحتیں اس پر مستزاد ثابت ہوتیں۔ وہ اسے ماہ نور کو سختی میں رکھنے، اس کا کبھی اعتبار نہ کرنے اور اس پر پیسا خرچ نہ کرنے کی صلاح دیتے۔۔۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی بیویاں تو خاندانی تھیں۔ عزت سے رخصت ہو کر آئی تھیں اس کی بیوی کی طرح غیر خاندانی اور اپنے گھر سے بھاگ کر نہیں۔ ماہ نور کی تضحیک اور اس کی طرف سے عاقب کا دل برا کرنے کو وہ دونوں بہت کچھ کہہ جاتے۔ کبھی کبھی رخشندہ بھی اس سلسلے میں اپنا حصہ ڈال دیتی اور اپنی گفتگو میں ہر پھر کر نسرین کا ذکر لے آتی۔ "نسرین کی ہائے لی ہے تمہاری بیوی نے۔ خوش نہیں رہ سکتی۔" وہ عاقب سے کہتی۔

گو خاندان والوں سے ملنا جلنا تقریباً ختم ہی ہو گیا تھا لیکن راحمہ کسی نہ کسی سے رابطے میں رہتی۔ اس کے ذریعے عاقب کو پھوپی اور ان کے گھر والوں کی شدید ناراضی کا پتا چلتا رہتا۔ صدمے کی ماری پھوپی نے نسرین کی شادی اپنے جیٹھ کے بیٹے سے کر دی تھی جس کی پہلی شادی ناکام ہو چکی تھی۔ جوڑیا بازار میں باپ کی دکان پر بیٹھتا تھا اور نرا انگوٹھا چھاپ تھا۔ عاقب کو نسرین کی شادی کی نہ خوشی ہوئی نہ رنج...... وہ اس کے مرحوم باپ کا فیصلہ تھا اور بس...... اگر ماہ نور اس کی زندگی میں نہ آئی ہوتی تو بڑے دونوں بھائیوں کی طرح وہ بھی باپ کے فیصلے کے مطابق نسرین سے شادی کر کے اسے اپنے گھر لے آیا ہوتا اور وہ بھی اس گھر میں اسی طرح ہنسی خوشی بس رہی ہوتی جیسے اس کے بھائیوں کی بیویاں بسی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

راحمہ سے کیے وعدے کے مطابق ثاقب نے جلد ہی راحمہ اور عاشر کو اپنے پاس بلا لیا۔ راحمہ کے میکے والوں نے چین کا سانس لیا۔ ماہ نور والے واقعے کے بعد سے اس کے گھر والوں کو اس کی اور عاشر کی بہت فکر رہنے لگی تھی۔ دشمن اور رقیب کو آدمی بھی سویا ہوا نہ سمجھے۔ وار کرتا ہے اور پھر کرتا ہے۔

راحمہ کے جانے کے بعد گھر میں عاقب اور ماہ نور رہ گئے۔ عاقب صبح دفتر چلا جاتا۔ بینک کی نوکری تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے جانے کا وقت تو معلوم ہوتا ہے واپسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ عاقب شام کو گھر واپس لوٹتا۔ کبھی رات بھی ہو جاتی۔ ماہ نور دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی۔ راحمہ اور عاشر کے جانے کے بعد عاقب نے ثاقب کی صلاح پر ملازمہ کی بھی چھٹی کر دی تھی۔ "تم اکیلی تو ہوتی ہو...... کرنے کو کچھ ہوتا نہیں تمہارے پاس...... گھر کے کام خود کرو گی تو مصروف بھی رہو گی، دل بھی بہلا رہے گا۔" اس نے ماہ نور

سے کہا۔

''کام کا مسئلہ نہیں عاقب...... آپ چلے جاتے ہو تو گھر میں کوئی بات کرنے والا ہی نہیں ہوتا...... میں بور ہوجاتی ہوں۔''

''ٹی وی کس مرض کی دوا ہے۔'' عاقب نے کہا۔

''ٹی وی بھی آدمی کتنی دیر دیکھ سکتا ہے...... دل بھر جاتا ہے۔''

''پھر تو تم ایک دن یہ بھی کہو گی کہ مجھ سے بھی تمہارا دل بھر گیا ہے۔''

''کیسی بات کرتے ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں...... خالہ کا گھر چھوڑ آئیں تو یہ گھر بھی چھوڑ کر جاسکتی ہو۔'' دونوں بھائیوں کی باتیں اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔

''عاقب!'' ماہ نور نے اسے صدمے کی کیفیت میں دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''مجھے آپ کی بات سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔''

''میں غلط تو نہیں کہہ رہا...... جسے اپنے خاندان کی عزت کا پاس نہیں اسے شوہر کی عزت کا کب احساس ہوگا۔''

ماہ نور کی آنکھیں بھر آئیں۔

''مگر مچھ کے آنسو مت بہاؤ...... مجھے ٹسوے بہانے والی عورت سے شدید نفرت ہے۔''

''ایسی کتنی عورتیں دیکھ رکھی ہیں آپ نے؟''

عاقب نے ہاتھ اٹھایا اور اس کا زوردار طمانچہ ماہ نور کے گال پر پڑا۔

''آپ نے مجھے مارا۔''

''جواب دو گی تو اس سے بھی بری پٹو گی۔''

ایک دفعہ اس کا ہاتھ اٹھا تو وہ ذرا ذرا سی بات پر اسے مارنے پیٹنے لگا۔ خالہ کا گھر پڑوس میں ہونے کے خیال سے وہ اونچی آواز میں بات کر پاتی نہ اس کے مارنے پر آہ و بکا کرتی۔ گھٹ گھٹ کر روتی اور رو پیٹ کر چپ ہوجاتی، کوئی اس کی فریاد سننے والا بھی نہ تھا۔ کپڑے لتے، جوتا، زیور، سیر و تفریح کی تو اسے عاقب سے کوئی امید ہی نہ نظر آتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے کھانے پینے کی تنگی بھی دینا شروع کردی۔ وہ اس سے گھر کی ضرورت کا کوئی سامان لانے کو کہتی تو وہ گالم گلوچ پر اتر آتا۔ ''تمہارے باپ نے کھاتا نہیں کھلوا رکھا ہے تمہارے نام کا میرے بینک میں۔''

''وہ بے چارے تو کبھی اپنے نام کا کھاتا بھی نہیں کھلوا سکے کسی بینک میں۔'' ماہ نور حسرت سے کہتی۔

تڑاخ! اس کے منہ پر طمانچہ رسید کرنے کے لیے عاقب کو بس کوئی بہانہ چاہیے ہوتا۔

رات کو وہ اس پر بدترین جسمانی تشدد کرتا جسے سہنے میں ماہ نور ضبط کرتی۔

''میں تمہیں کسی اور کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ وحشی پن سے کہتا۔

''میں صرف آپ کی ہوں...... آپ ہی کی رہنا چاہتی ہوں ساری زندگی۔'' وہ روہانسی ہوجاتی۔

''اور مجھ سے پہلے کتنوں کی رہ چکی ہو۔'' وہ اس کے بازو اتنی شدت اور دیوانگی سے دبوچتا کہ اس کی سسکیاں نکل جاتیں۔

وہ منہ لال کر قہقہہ لگاتا۔ اس کے بازو چھوڑ کر جابجا چٹکیاں بھرنے لگتا۔ وہ تکلیف سے بلبلاتی تو حظ اٹھاتا۔

ماہ نور یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ عاقب اسے جسمانی تشدد اور ذہنی اذیت سے کیوں دوچار رکھتا تھا۔ اپنی کسی جائز ضرورت سے اسے آگاہ کرتی تو وہ نہایت حقارت سے کہتا۔ ''شکل دیکھی ہے تم نے اپنی...... ہو تم اس لائق کہ میں تمہیں کچھ لا کر دوں۔''

وہ بے چارگی سے اس کا منہ دیکھنے لگتی۔

''آپ کے بھائی اپنی بیویوں کی ضرورتیں پوری نہیں کرتے ہیں کیا۔'' ایک بار اس نے کہہ دیا تو وہ بھڑک پڑا۔

''ان کی بیویاں اپنے گھروں سے بھاگ کر نہیں آئی تھیں۔''

وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

اسے گھر سے بھاگنے کا طعنہ وہ دے رہا تھا جس کی خاطر وہ گھر سے بھاگی تھی۔ اس نے خود ہی تو بلایا تھا اسے اپنے گھر۔ ماہ نور کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔

''تم جیسی لڑکیاں پتا نہیں کتنوں سے یاریاں لگاتی ہیں۔'' عاقب نہایت بے ہودگی سے کہتا۔

ماہ نور کو دکھ ہوتا کہ وہ اس سے اتنی بدگمانی رکھتا تھا۔

اس کی خاطر تو اس نے اپنے سارے خاندان سے دشمنی مول لی تھی۔ ماں کا سا پیار دینے والی خالہ کو دھتکار دیا تھا۔ تھانہ اور عدالت میں وہ کس بے بسی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اس کی منت سماجت کرتی رہی تھیں کہ وہ گھر واپس آجائے مگر اس نے کسی کی نہیں سنی تھی۔ اپنے پیروں میں پڑی خاندان کے مردوں کی ٹوپیوں کی پروا نہیں کی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ عاقب کی بن کر رہنا چاہتی تھی اور اب وہی اسے کچوکتا تھا...... بات بات پر...... بہانے بہانے۔

کبھی کبھی ماہ نور کو یوں لگتا جیسے عاقب ایک نارمل

آدمی نہیں تھا بلکہ نفسیاتی مریض تھا جو اسے اذیت دینے میں تسکین پاتا تھا یا شاید اسے اذیت دے کر وہ خاندان میں اپنی کھوئی عزت کا رنج نکالتا تھا۔ بے عزتی تو اس کی بھی ہوئی تھی۔ بہرحال وجہ جو بھی تھی۔ اس کا رویہ ماہ نور کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆

ماہ نور امید سے ہوگئی۔ اسے امید بندھی کہ اب عاقب کا رویہ اس کے ساتھ بہتر ہوجائے گا۔ وہ یہ سوچ کر کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اس کے ساتھ اپنا غیر انسانی رویہ ترک کردے گا۔ اس پر مہربان ہوجائے گا۔ اس کا خیال رکھے گا۔ اسے قابل اعتبار جانے گا مگر اس کی یہ امید خوش فہمی ثابت ہوئی۔ دونوں بھائیوں نے ماہ نور کے امید سے ہونے کی خبر سن کر عاقب کو خوب لتاڑا۔

”بہت جلدی تھی تمہیں۔“ ثاقب نے ڈانٹا۔

”فیملی بڑھانے کی منصوبہ بندی دیکھ بھال کر کی جاتی ہے یار...... تمہارے پاس ابھی ہے کیا...... ابھی اتنا تو پتا نہیں ہے تمہیں کہ یہ عورت کب تک تمہارے پاس ٹکتی ہے۔“ عاطف نے اپنی فراست بگھاری۔

”یہ جو چالاک عورتیں ہوتی ہیں یہ مرد کے پیروں میں اولاد کی بیڑی ڈال کر اسے نچاتی ہیں...... ابھی اس چکر میں مت پڑو...... جس لڑکی نے اپنے خاندان کی عزت کی پروا نہیں کی۔ وہ تم سے کب وفا کرے گی۔“ ثاقب نے تڑکا لگایا۔

دونوں بھائیوں نے اسے ماہ نور سے بدظن کرنے اور بچہ پیدا کرنے کے خلاف کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

”اس جھنجٹ سے فوراً چھٹکارا حاصل کرو۔“ ثاقب نے صلاح دی۔

”ابارشن کرادو یار۔“ عاطف نے مشورہ دیا۔

”ابارشن؟“

”ہاں یار...... لیکن احتیاط سے...... کسی ڈاکٹر کا پتا کرو جو یہ کام کرتی ہو، شہر میں بہت سی ایسی کلینکس اور اسپتال ہیں جہاں یہ کام ہوتا ہے...... اسے لے جاؤ وہاں...... تھوڑا خرچہ ضرور ہوگا مگر تمہاری جان چھوٹ جائے گی اور آئندہ ذرا احتیاط کرنا۔“ عاطف نے صلاح دی۔

عاقب نے ماہ نور سے کہا۔ ”مجھے ابھی بچہ نہیں چاہیے۔“

وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

”اسے ضائع کرادیتے ہیں۔“

وہ دم بخود اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اختلاف کی جرأت ہی نہ دی تھی شوہر کے سخت رویے نے اسے۔ وہ تو قفس میں گرفتار ایک پرندے کی طرح بے بس اور لاچار تھی۔

ثاقب نے کہا۔ ”اس کام کے لیے تمہیں کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس جانے کی بھی ضرورت نہیں...... نیٹ پر دنیا کے ہر مسئلے کا حل موجود ہے...... سرچ کرو۔“

عاقب نے نیٹ پر سرچ کیا تو کسی ڈاکٹر یا حکیم کی مدد کے بغیر گھر میں ہی حمل ضائع کرنے کے ایک دو نہیں بیسیوں طریقے اس کے علم میں آگئے اور اس نے ماہ نور کو تختہ مشق بنا ڈالا۔ وٹامن سی کے حامل رس دار پھلوں کی کثرت سے پنسار کی جڑی بوٹیوں، ڈاکٹری ادویات اور سخت جسمانی مشقت تک اس نے حمل ضائع کرنے کا ہر طریقہ ہی تو دھان پان سی ماہ نور پر آزما ڈالا۔ وہ گڑگڑاتی، منت سماجت کرتی کہ وہ اسے اس خوشی سے محروم کرنے کے لیے اسے یوں تختہ مشق نہ بنائے مگر وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی دھر کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کرتا اور آنکھیں دکھاتا۔ دفتر جاتا تو باہر گیٹ پر تالا ڈال جاتا۔

حمل تو ضائع ہوگیا مگر ماہ نور موت کے دہانے پر جا پہنچی۔ اسے ایک نجی اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ وہ مرتے مرتے بچی اور جب اس نے اپنی معالج کے استفسار پر اسے وہ سب کچھ بتایا جو عاقب نے اسے حمل ضائع کرانے کے لیے استعمال کرایا تھا تو ڈاکٹر نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”تمہارا ہسبینڈ پاگل تو نہیں ہے۔ اس نے تو تمہاری موت کی تیاری کر رکھی تھی۔“ ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بچ گئی ہو...... مگر نقصان بہت ہوا ہے۔“

عاقب نے اسپتال ہی میں اس پر اپنا غصہ نکالا۔

”ڈاکٹر سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میرے شوہر کو ابھی بچہ نہیں چاہیے...... یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ میں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی ہے ابھی بچہ نہیں پیدا کرنا چاہتی۔ ہوسکتا ہے اس سے بھی اچھا دوسرا کوئی مل جائے۔“

ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

”پھر وہی مگرمچھ کے آنسو...... نفرت ہے مجھے ان آنسوؤں سے۔“ عاقب نے یہ سوچ کر بھی اس پر رحم نہ کھایا کہ وہ موت کی وادی میں جا کر پلٹی تھی۔ خدا جانے کس جنم کی دشمنی نکال رہا تھا وہ اس سے۔

تین دن اسپتال میں رہ کر وہ گھر واپس آئی تو عاقب کا منہ پھولا ہوا تھا اور اس کے منہ میں دونوں بھائیوں کی

زبانیں دھری تھیں۔ "اگر تمہیں شوہر کی عزت کا خیال ہوتا تو ڈاکٹر کے سامنے اسے ننگا کرنے کے بجائے کہتیں میں خود پریگنینسی ضائع کرنا چاہتی تھی...... اب میں تمہارا کیسے اعتبار کرسکتا ہوں کسی معاملے میں۔"

وہ چپ رہی...... کہتی تو کیا کہتی...... اس سے غلطی ہوئی تھی اور اسے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا واجب تھا۔

☆☆☆

"خوش قسمت تھے تم جو تمہاری جان چھوٹ گئی۔" ثاقب نے کہا۔

"مر کے بچی ہے وہ۔" عاقب نے بتایا۔

"مرجاتی تو اچھا تھا...... خس کم جہاں پاک۔" عاطف نہایت بے رحمی سے بولا۔

"چھٹی کرو اس کی اور اپنی جان چھڑاؤ۔" دونوں بھائیوں کی طرف سے اسے مشورہ دیا گیا۔ مگر اس کے گلے میں تو دولاکھ روپے مہر کی چھچھوندر اٹکی ہوئی تھی۔

"یار! دولاکھ کی خاطر ساری زندگی گند کو تو اپنے سر پر نہیں رکھا جاسکتا...... لاکھ تم دینا پچاس پچاس ہزار ہم دونوں دے دیں گے۔"

اس نے سوچنے میں دیر نہ لگائی۔ البتہ یہ کہہ کر اپنی اوقات ضرور دکھا دی کہ دو لاکھ مہر فرقان کی ماہ نور سے خوامخواہ کی ہمدردی کا شاخسانہ تھا۔

بھائیوں کی طرف سے رقم وصول ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے کچہری جاکر طلاق نامہ تیار کروایا اور نہایت سفاکی سے اس بے آسرا لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیا جس کے قدموں کی ایک لغزش نے اس کے قدموں تلے سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔

"میرا تو کوئی ٹھکانا بھی نہیں میں کہاں جاؤں گی؟" اس نے زاروقطار روتے ہوئے بے بسی سے کہا اور اس کے قدموں میں لوٹ گئی۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں۔" اس کی آنکھوں سے بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ محبت تو خیر اس نے اس سے شاید کبھی بھی نہیں کی تھی۔ بس اپنے نفس کی تسکین کا آلہ کار بنائے رکھا تھا مگر ماہ نور کو اس سے اتنی سفاکی اور غیر انسانی رویے کی توقع نہ تھی۔ وہ شدید رنج اور صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اجنبیت کا پرتو اپنے چہرے پر لیے یہ وہ شخص تھا جسے اس نے سوچ سمجھے بنا رات کی تاریکی میں اپنی سب سے قیمتی متاع سونپ دی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ اس کے سامنے کھڑا وہ شخص بے حس تھا یا بے رحم...... نفسیاتی مریض تھا یا بھائیوں کے اشاروں پر ناچنے والا ایک بودا اور کمزور انسان۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ اس کی خانماں بربادی میں وہ اکیلا نہیں اس کے دونوں بھائی بھی شریک رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا وہ اس گھر سے نکل کر کہاں جائے۔ بدن کے تین کپڑوں میں وہ اپنی خالہ کے گھر سے اس گھر آئی تھی۔ اس گھر سے بھی اسے تین کپڑوں میں ہی نکلنا پڑا۔ نیچے زمین تھی اوپر آسمان اور ان دونوں کے بیچ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرتی بے آسرا، بے ٹھکانا ماہ نور!

☆☆☆

دونوں بھائی بہت خوش ہوئے۔

"فرقان کو ضرور بتا دینا تاکہ کوئی اونچ نیچ ہو تو وہ سنبھال سکے۔" ثاقب نے عاقب کو ہدایت کی۔

فرقان نے سنا تو اس نے عاقب کو بے نقط سنائیں۔

"بے شرم آدمی تو نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ بے چاری جائے گی کہاں۔"

"یہ تو اسے اپنی خالہ کے گھر سے نکلتے ہوئے خود سوچنا چاہیے تھا فرقان بھائی۔" عاقب کو اپنے کیے پر ذرا ملال نہ تھا۔

"اب تو وہ تمہاری عزت تھی۔" فرقان بھپک کر بولا۔

"رہنے دیں فرقان بھائی ایسی عورتیں نہ آج آپ کی ہوتی ہیں نہ کل۔" عاقب کے منہ میں بھائیوں کی زبان بول رہی تھی۔

"کیا نہیں کیا اس نے تمہارے لیے...... خاندان کی عورتوں نے اپنے دوپٹے اور مردوں نے اپنی ٹوپیاں ڈال دی تھیں اس کے قدموں میں...... وہ اگر اس وقت تمہارے خلاف بیان دے دیتی تو تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔"

"وہ خود آئی تھی...... کیسے دے سکتی تھی میرے خلاف بیان۔" عاقب نے خود کو بے قصور ثابت کرنا چاہا۔

"تمہارے بلانے پر آئی تھی۔" فرقان جو ہم راز تھا غصے سے عاقب کو گھورتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے کہہ سکتے ہو تم کہ یہ جھوٹ ہے۔"

وہ شرمندہ ہوکر بغلیں جھانکنے لگا۔

"کیا قصور تھا اس کا جو تم نے اسے طلاق دی۔" فرقان نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"اس نے گزارہ نہیں کرنا تھا فرقان بھائی وہ آوارہ تھی۔"

"بکواس مت کرو۔" فرقان گرجا۔

"ثاقب بھائی اور عاطف بھائی کی مرضی بھی یہی

تھی۔" اس نے دبی زبان سے کہا۔

"اس لیے کہ ان کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی...... بھگتو گے تم سب بھگتو گے...... اور جلدی بھگتو گے...... آسمان والا اوپر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے...... وہ گئی کہاں؟"

"پتا نہیں۔"

فرقان نے جبڑے بھینچ لیے۔ کچھ دیر ناقابل بیان ذہنی بھونچال سے دوچار کھڑا رہا پھر اس نے عاقب کے سینے پر ہلکے سے گھونسا رسید کرتے ہوئے نہایت تحقیر سے کہا۔ "تم سے اور تمہارے بھائیوں سے اچھی تو میری ماں رہی جس نے عورت ہونے کے باوجود اس لڑکی کو اس وقت اپنے گھر میں پناہ دی جب شاید کوئی بھی اس کے سر پر ہاتھ دھرنا مناسب نہ سمجھتا...... جانتے ہو کیوں...... کیونکہ اس کے اپنے گھر میں بیٹیاں تھیں اور دل میں خداترسی...... تم بدقسمت ہو کہ نہ تمہارے گھر میں بہنیں تھیں اور نہ دل میں خداترسی۔"

"مائنڈ نہ کیجیے گا فرقان بھائی...... اس راستے پر مجھے لگایا تو آپ ہی نے تھا۔" عاقب نے اوچھا وار کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے معلوم تھا ایک دن یہی کہو گے...... مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ اس غلطی کی کچھ سزا تو میں بھگت چکا ہوں...... میری تم سے کیا رشتہ داری تھی جو ثاقب کے ساتھ پولیس مجھے بھی کھینچ لے گئی...... حساب کتاب کیا تو سمجھ میں آ گیا کہ میرا حوالات جانا میری اسی غلطی کی سزا تھی...... مجھے اب بھی جب اپنی غلطی کا خیال آتا ہے تو توبہ کرتا ہوں اپنے اللہ کے حضور اور آگے کے لیے معافی مانگتا رہتا ہوں خدا سے...... یار تمہاری غلطی تو میری غلطی سے کہیں بڑی تھی...... اس لڑکی کو طلاق دے کر بے گھر اور بے آسرا کرتے ہوئے تمہیں اللہ سے ذرا خوف نہیں آیا۔"

وہ چپ رہا پھر کچھ دیر بعد دھیمی آواز میں بولا۔ "میرا خیال تھا وہ آپ کے گھر ہی جائے گی۔"

فرقان نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا پھر کہا۔ "نہیں...... وہ میری طرف نہیں آئی...... اور ہاں ذرا یہ سوچ لینا کہ اگر وہ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں بھی نہیں گئی ہے تو...... آج تو وہ اس سے ناراض ہیں کل کلاں کو اگر انہوں نے پلٹ کر اس کی خیر خبر لینے کی کوشش کی تو تم انہیں کیا جواب دو گے۔"

عاقب نے سٹپٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بتاؤ گے انہیں؟ کہاں گئی وہ؟" فرقان نے مزید کہا۔

"یار فرقان بھائی......" جز بز دکھائی دیتے ہوئے وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

"بیٹا! بھگتو گے ضرور...... تم سب بھگتو گے۔" فرقان کے لہجے میں تیقن تھا مگر یہ اس کے اپنے گمان میں بھی نہیں تھا اس کے کہے پر مشیت ایزدی کی مہر اتنی جلد ثبت ہو جائے گی۔

☆☆☆

عارف صاحب کی طرف سے ان کے تینوں بیٹوں کو مکان کے ساتھ مرض دل بھی وراثت میں ملا تھا۔ اس مرض کے باعث عارف صاحب خود بھی محض چھیالیس سال کی عمر میں جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ ثاقب کو ان سے بھی کم عمر میں ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ راحمہ اور اکلوتے بیٹے عاشر کے ساتھ سعودی عرب ہی میں تھا۔ وہیں میڈیکل ٹیسٹ ہوئے۔ رپورٹ آئی کہ دل کی تین شریانیں بند تھیں اور بائی پاس سرجری لازم۔ راحمہ کے میکے والوں کی رائے ٹھہری کہ سرجری پاکستان میں کروائی جائے تاکہ مشکل وقت میں وہ بھی بیٹی داماد کے ساتھ کھڑے ہوں۔

سرجری کامیاب رہی مگر ثاقب کو سعودی عرب میں اپنی ملازمت کو خیرباد کہنا پڑا۔ ماہ نور کو اس گھر سے گئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہی راحمہ جو کبھی عاقب کی شادی اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے کروانے کی خاطر عاقب کی پھوپی زاد منگیتر نسرین کی جڑیں کاٹنے کے درپے رہا کرتی تھی ماہ نور کے ساتھ عاقب کے بہیمانہ سلوک کے بعد اب اپنے خاندان کی کسی لڑکی کا تو کجا باہر کی کسی غیر لڑکی کا خیال بھی عاقب کے لیے اپنے دل میں لانے کو تیار نہ تھی۔ سعودی عرب جانے کے بعد بھی ثاقب اور عاقب سے چوری چھپے اس کی اور ماہ نور کی فون پر بات چیت رہا کرتی تھی۔ ماہ نور پر کیے جانے والے عاقب کے ہر ظلم و ستم بلکہ بربریت سے آگاہ تھی وہ! بالخصوص ماہ نور کی پریگننسی ضائع کرانا اور اس بہیمانہ اقدام کے لیے اسے جسمانی اور نفسیاتی ہر دو قسم کے تشدد سے دوچار کرنا، عاقب کا ایسا غیر انسانی سلوک تھا جس نے راحمہ کو عاقب سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انسان کو درندہ بننے کے لیے برسوں کا سفر طے کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض لوگ عاقب کی طرح نوجوانی میں بھی درندے بن جاتے ہیں۔

اپنے اور اپنی فیملی کے محفوظ مستقبل اور پرسکون زندگی گزارنے کی خاطر ثاقب نے برطانیہ میں جا بسنے کی منصوبہ بندی کی اور برطانیہ چلا گیا۔ زیادہ نہیں چند ہی ماہ گزرے ہوں گے کہ ایک رات ایسا سویا دوبارہ زندگی سے

نظریں نہیں ملا سکا۔

عاطف جو دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ بڑے بھائی کی موت کے بعد اس کا غم اپنے چچا اور ان کی فیملی کے ساتھ مل بیٹھ کر بٹانے کو رخشندہ اور بچوں کے ساتھ پاکستان آیا اور اسے بھی دل کی تکلیف ہوئی۔ فوری سرجری لازم ٹھہری۔ آپریشن کامیاب رہا لیکن بعد میں کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوئیں کہ کوما میں چلا گیا۔ تقریباً دو ماہ زندگی سے بے نیاز بستر پر پڑے رہنے کے بعد چل بسا۔

شوہر کے انتقال کے بعد رخشندہ نے اپنے سسرالی گھر میں رہنے کے بجائے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں رہنے کو ترجیح دی۔ اتنا سب کچھ ہوجانے کے بعد سسرالی گھر میں رہ کروہ اپنے اور بچوں کے لیے کوئی خطرہ مول نہ لینا چاہتی تھی۔ عاطف نے جو اپارٹمنٹ خرید رکھا تھا۔ وہاں وہ دو چھوٹے بچوں کے ساتھ رہ نہ سکتی تھی۔ میکے والوں نے چاہا کہ اس کے بچوں کا دادا کے گھر میں حصہ مل جائے تو وہ اپارٹمنٹ کو بھی فروخت کر کے اپنے میکے کے نزدیک کوئی گھر خرید لے مگر عاقب ان کا حصہ دینے پر تیار نہ ہوا۔ بلکہ جب اس پر مکان میں بھائیوں کے یتیم بچوں کو ان کا جائز حق دینے کے لیے دباؤ بڑھا تو وہ حق داروں کا حق ہڑپ کرنے کے لیے سینہ ٹھونک کر کھڑا ہوگیا۔ ''کسی میں ہمت ہے تو مکان بیچ کر دکھائے۔'' خود غرضی اور حرص و ہوس نے اسے باؤلا کر دیا تھا۔

شوہر کی زندگی میں پرآسائش زندگی گزارنے والی رخشندہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ والدین کے آسرے پر پڑی رہنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کا ناز و تکبر خاک میں مل گیا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا اس نے کہ آناً فاناً زندگی اتنی بدل جائے گی سوچا تو اس کے شوہر نے بھی نہیں ہوگا اپنی زندگی میں کہ ماہ نور کو طلاق دلوا کر اور گھر سے بے گھر کرا کے وہ اپنے بال بچوں کے لیے کیسی تکلیف دہ زندگی کا بیج بو جائے گا۔

راحمہ کے مسائل دوسری نوعیت کے تھے۔ غریب الوطنی، اپنوں سے دوری، اکیلاپن اور اکلوتے بیٹے کو مغربی معاشرے کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھنے کی فکر۔ سات سمندر پار وہ بھی اور اس کا بیٹا عاشر۔ ان کے دکھ سکھ میں کوئی تیسرا ان کا ساجھی نہ تھا۔

باپ کے نہایت چاہ سے تعمیر کردہ مکان میں فقط عاقب رہ گیا۔ اپنے گھر کے سناٹے سے اس کا دل گھبراتا مگر اس سے زیادہ خوف اسے اپنے گھر کی عقبی طرف واقع ماہ نور کی خالہ اور خالو کے گھر پر چھائی خاموشی سے محسوس ہوتا۔ وضع دار اور انا پسند لوگ تھے۔ انہوں نے کبھی یہ دیکھنے یا جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ماہ نور کس حال میں تھی...... اور تھی بھی کہ نہیں۔ معاشرے کے بدلے اطوار نے ہمسایوں کو عاقب کے گھر میں خاتون خانہ کی خیر خبر لینے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہونے دی۔ ویسے بھی جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد محلے دار اس گھرانے سے دور دور ہی رہتے تھے۔

☆☆☆

گھر کے سناٹے اور اپنی تنہائی سے تنگ آکر عاقب نے اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیا اور نہایت سادگی اور خاموشی سے دوسری شادی کر کے آفریدہ کو گھر لے آیا۔ آس پاس آباد گھرانے اس کے ساتھ ایک نئی عورت کو گھر سے باہر آتے جاتے دیکھ کر چونکے ضرور مگر کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ بہرحال چھپنے والی بات تھی نہیں سو بالآخر لوگوں کو پتا چل ہی گیا کہ عاقب نے دوسری شادی کر لی تھی۔ پہلی چلی گئی تھی...... کہاں؟ کیوں؟ کسی نے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی حتیٰ کہ ماہ نور کی خالہ اور خالو نے بھی نہیں...... آخر لوگ اپنے بہت پیارے لوگوں کو دفنا کر، رو دھو کر بھی تو صبر کر ہی لیتے ہیں۔ ان عزت دار لوگوں نے بھی عدالت سے آخری فیصلہ سننے کے بعد ماہ نور سے کہا تھا۔ ''آج کے بعد تو ہمارے لیے مرگئی۔''

عاقب کا لوگوں سے میل جول بہت محدود ہو چکا تھا۔ فرقان سے بھی بس اس وقت تک تعلق رہا جب تک دونوں ایک برانچ میں تھے۔ ماہ نور کو طلاق دینے کے بعد فرقان نے عاقب سے بات چیت بہت کم کردی تھی۔ پیشہ ورانہ تعلقات کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید فرقان اس سے بول چال بالکل ہی ختم کر دیتا۔ فرقان کی عاقب سے ناراضگی بے جا نہ تھی۔ اس نے ایک کمزور اور بے آسرا لڑکی کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ عاقب اب بینک کی اس برانچ میں نہیں تھا البتہ فرقان وہیں تھا اور ترقی پا کر برانچ منیجر بن چکا تھا۔

آفریدہ سے شادی سے قبل جب عاقب سے اس کے گھر والوں کی بات چیت چل رہی تھی۔ آفریدہ سمیت تمام اہل خانہ عاقب کے سامنے بڑی تہذیب اور نہایت شرافت کے ساتھ پیش ہوتے رہے۔ شادی کے بعد ان کا اصل روپ کھلا۔ آفریدہ سمیت اس کے گھر کے تمام افراد اسی سیاسی جماعت سے وابستہ تھے جس سے فرقان علی کی بھی وابستگی تھی۔ آفریدہ کا ایک بھائی اس پارٹی کا نامی گرامی کارکن تھا اور اس کی پارٹی راہنما تک براہِ راست رسائی

تھی۔ شادی کے بعد عقدہ کھلا کہ آفریدہ کی بھی یہ پہلی نہیں دوسری شادی تھی حالانکہ شادی سے قبل اس کے گھر والوں نے عاقب پر یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ غیر شادی شدہ تھی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ آفریدہ کے پہلے شوہر نے اسے دو وجوہ کی بنا پر طلاق دی تھی۔ اولاً وہ نہیں چاہتا تھا کہ آفریدہ کسی بھی سیاسی جماعت کے لیے کام کرے۔ دوم اس کا بانجھ ہونا۔

آفریدہ سے شادی کے بعد اس کی اور اس کے گھر والوں کی اصل حقیقت کھلنا عاقب کے لیے صیاد کے اپنے ہی دام میں آجانے کے مترادف تھی۔

ماہ نور کے برعکس آفریدہ معمولی شکل وصورت کی حامل تھی۔ نہ اسے بات کرنے کا سلیقہ تھا نہ گھر سنبھالنے کا قرینہ۔ دن بھر فون پر سیاست کرتی رہتی۔ ابھی ایک سے بات تو ابھی دوسرے سے راز و نیاز۔ عاقب کے بارے میں اسے چند ہی دنوں میں اندازہ ہوگیا تھا کہ بڑبولا آدمی ہے۔ پہلے اس نے اپنی زبان درازی سے اس کے بڑبولے پن کی منڈیا مروڑی پھر اپنے اور اپنے گھر والوں بالخصوص بھائی کے سیاسی اثر ورسوخ کا ہوا دکھا کر اسے اپنے تلووں تلے لگایا۔ عاقب بیوقوف اور عاقبت نااندیش ایسا کہ اس نے شادی کے ابتدائی دنوں ہی میں آفریدہ کو ماہ نور سے اپنے تعلق کی داستان اول تا آخر سنا دی تھی۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے اس سے کہتی۔ ”مجھے ماہ نور مت سمجھنا۔ میں تو تمہاری ہڈیوں کا شوربا بنا کر پی جاؤں گی مگر اس گھر سے نہیں جاؤں گی۔“

عارف صاحب مرحوم نے یہ گھر بڑے ارمانوں سے اپنے تینوں بیٹوں کے لیے بنوایا تھا۔

آفریدہ کے گھر والوں کی رال تو اس گھر پر اسی دن ٹپک پڑی تھی جب وہ شادی سے قبل عاقب کی دعوت پر اس گھر میں آئے تھے۔

”اتنا بڑا لان ہے آفریدہ کہ تو پورے خاندان کو بھی دعوت پر بلائے گی تو کافی ہوگا۔“ آفریدہ کی ماں نے اس سے کہا تھا۔

”اور خالی گھر...... نہ ساس نندوں کا جھنجٹ نہ کسی دیورانی جیٹھانی کا دم چھلا۔“ آفریدہ کی بھابی بولی۔

”دو منزلیں ہیں گھر کی جیسا نیچے ویسا ہی اوپر...... بھئی آفریدہ میں تو جب آؤں گا اوپر ہی بیٹھا کروں گا...... پہاڑ دکھائی دیتے ہیں اوپر سے۔“ آفریدہ کے باپ کی ندیدگی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

”اللہ پھوپھو کچن، باتھ رومز، بیڈ رومز سب ہی بہت اچھا ہے۔“ آفریدہ کی بھتیجی نے جو اپنے ماں باپ، چھ بہن بھائیوں اور بوڑھے دادا کے ساتھ دو کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ کی رہائشی تھی عاقب کے گھر سے ہو کر آنے کے بعد نہایت رشک سے اپنی پھوپی آفریدہ کو اس گھر کا احوال دیتے ہوئے کہا۔

”اور پھپو گھر میں کوئی بھی نہیں سوائے انکل کے...... آپ اکیلی کیسے رہیں گی اتنے بڑے گھر میں...... آپ کے ساتھ میں رہوں گا۔“ بھتیجے نے اپنی خدمات پیش کیں۔

شادی کے بعد آفریدہ نے عاقب سے پہلی فرمائش تو یہ کی کہ اسے گھر کے کام کرنے کے لیے ایک فل ٹائم ملازمہ کی سہولت فراہم کی جائے پھر اس نے کھانے پینے کے لیے نت نئی چیزوں کی فرمائش شروع کی، آئے دن نئے کپڑوں،

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ تم کسی کو دھوکا دے کر یہ مت سمجھو کہ وہ کتنا بے وقوف تھا بلکہ یہ سوچو کہ اسے تم پر اعتبار کتنا تھا۔

☆ لوگوں کو اتنی ہی اہمیت دو جتنی وہ تمہیں دیتے ہیں۔ اگر کم دو گے تو مغرور کہلاؤ گے اور زیادہ دو گے تو گر جاؤ گے۔

☆ اپنی زبان کو کسی کے عیوب بیان کر کے آلودہ نہ کرو۔ اس لیے کہ عیب تو تم بھی رکھتے ہو اور زبان دوسروں کے پاس بھی ہے۔

☆ جو لوگ صرف اپنے کام کے وقت آپ کو یاد کرتے ہیں ان کے کام ضرور آیا کرو کیونکہ وہ اندھیروں میں روشنی ڈھونڈتے ہیں اور ان کے لیے وہ روشنی آپ ہو۔

☆ اگر تم اپنے سر کو ٹھنڈا اور اپنے پاؤں کو گرم رکھو گے تو تمہیں پوری زندگی کسی طبیب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆ انسان کی اصل موت اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کے دل اور دعاؤں سے نکل جاتا ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

جوتوں اور کاسمیٹکس کی خریداری معمول بن گیا۔ ناپسند اور پرانی چیزیں جو نئی جیسی ہی ہوتیں وہ تھیلے بھر بھر کر اپنی بہنوں اور بھانجیوں بھتیجیوں کے لیے میکے پہنچادیتی۔ عاقب اعتراض کرتا تو وہ منہ پھلالیتی۔ کبھی لڑنے بھی لگتی اور اس کی تان بالآخر اس بات پر ٹوٹتی۔ ”مجھے ماہ نور سمجھنے کی ضرورت نہیں...... اس کے تو آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مجھے بہت ہیں پوچھنے والے۔ مجھے کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو اللہ رکھے میرا بھائی حمید ہی کافی ہے نمٹنے کے لیے۔“ عاقب کو تو اس کی شکل ہی سے خوف آتا تھا۔ شادی کی بات چیت کے زمانے میں وہ اپنی کسی ایکٹویٹی کے بعد روپوش نہ ہوتا اور عاقب کو اپنی رونمائی کرادیتا تو شاید عاقب اس کی صورت سے ڈر کر ہی اس کی بہن سے شادی کا خیال ترک کر دیتا۔ بہرحال ماہ نور کے بعد اس کا دوسرا جوڑ وہیں لکھا تھا، کون ٹال سکتا تھا۔

شادی کے بعد حمید منظر عام پر آیا تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر آفریدہ سے کہا۔ ”واہ باجی! تمہاری تو قسمت کھل گئی...... مقدر کی سکندر بن گئیں تم تو...... ایسا گھر تو اپن نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا...... بس اب تم فوراً اسے اپنے نام کروانے کی کرو۔“

آفریدہ اور اس کے گھر والوں نے عاقب سے یہ فرمائش بڑے پیار سے کی۔ وہ پہلے تو چونکا پھر اس نے انہیں ٹرخانے کو کہا۔ ”گھر آفریدہ ہی کا ہے جب وقت آئے گا نام بھی ہوجائے گا۔“

”گھر نام کرنے کے لیے وقت کیا دیکھنا۔ کچہری جاؤ لکھت پڑھت کراؤ...... اللہ اللہ خیر سلا۔“ آفریدہ کی ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے امی...... کرلیں گے۔“ عاقب نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

گھر آفریدہ کے نام کرنے کے لیے عاقب پر آفریدہ اور اس کے گھر والوں کا دباؤ روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ ناچار عاقب کو اس حقیقت سے انہیں آگاہ کرنا پڑا جس سے وہ اب تک خود نظریں چراتا رہا تھا۔ ”یہ گھر صرف میرا نہیں اس میں میرے دونوں بھائیوں کے بچوں کا حصہ بھی ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”مرنے والے مرگئے اب کسی کا کوئی حصہ وصہ نہیں۔“ آفریدہ کا بھائی آفریدہ کی حمایت میں ہاتھ نچاتا عاقب کے سامنے آیا۔

”یہ میں نہیں کہہ رہا...... شریعت کہہ رہی ہے قانون کہہ رہا ہے۔“ عاقب نے ترپ کا پتا پھینکا۔

”ارے چلو چلو...... اور کتنی شریعت کی پابندی کر رہے ہو تم...... قانون کو بھی دیکھ لیں گے...... لوگوں کے زندہ ہوتے ان کی جائدادیں دوسروں کے نام ہوجاتی ہیں تم گڑے مردوں کو رو رہے ہو۔“ حمید استہزائیہ انداز میں بولا۔

”حمید بھائی! کورٹ جائیں گے تو وہ وراثت نامہ اور نہ جانے کیا کچھ مانگیں گے۔ تمام ورثا کو بلائیں گے...... قانون بہرحال قانون ہوتا ہے۔“

حمید نے عاقب کو دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ”عاقب بھائی قانون کی آنکھوں میں مرچیں جھونک کر اسے اندھا کرنا آتا ہے ہمیں...... تم بس نوٹ ڈھیلے کرو گھر باجی کے نام کروانا میری ذمے داری۔“

”یار! بھابیاں اور ان کے بچے آکر میرا گریبان پکڑلیں گے۔“

”اپن کے ہوتے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا تمہیں۔“

”نہیں حمید میں یتیموں کے حق پر ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔“

سیدھی انگلیوں سے گھی نکلتے نہ دیکھ کر حمید نے تیور بدل لیے۔ ”عاقب بھائی تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ بندے کو فی الفور پار کردیتا ہوں میں۔“ اس نے عاقب کو آنکھیں دکھائیں۔

عاقب فطرتاً بزدل آدمی تھا۔ گو وقت اور تجربے نے اسے گرگ دیدہ بنادیا تھا مگر اندر سے وہ بزدل ہی تھا۔ حمید نے تیور بدلے تو اس کا پتا پانی ہونے لگا۔ وراثت کی قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا مکان آفریدہ کے نام ہونا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔

مگر حمید نے کہا۔ ”یہاں سب کچھ ہوجاتا ہے۔“

قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ عاقب نے اس خیال سے اسے فری ہینڈ دے دیا کہ وہ منہ کی کھائے گا مگر حمید نے سچ کہا تھا۔ کچہری میں بیٹھے گرگوں سے ساز باز کر کے اس نے بالآخر مکان آفریدہ کے نام کروالیا۔ عاقب دیکھتا رہ گیا۔ یہی نہیں اپنی اس غیر معمولی خدمت کے صلے میں حمید مکان کی بالائی منزل پر بھی قابض ہوگیا اور اسے اپنا سیاسی گڑھ بنالیا۔ طرح طرح کے لوگ دندناتے ہوئے گھر میں آتے اور اوپر چڑھ جاتے۔ عاقب اعتراض کرتا تو آفریدہ کہتی۔ ”گھر میرا ہے آپ کو کیا تکلیف۔“

عاقب کے اعتراضات حمید تک پہنچے تو وہ سینہ پھلائے عاقب کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”دیکھو عاقب

بھائی! اپن سے پنگا لینے کی ضرورت نہیں۔ بھائی بن کر رہو گے تو سر آنکھوں پر رکھوں گا...... نظر بگاڑی تو ٹائیں ٹائیں فش! کیا سمجھے۔''

''شرم نہیں آتی بہنوئی کو دھمکی دے رہے ہو۔''

عاقب نے اخلاقی حربہ آزمایا۔

''بہنوئی بھی تو بہنوئی بن کر رہے بھائی میاں۔'' حمید استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''کیوں! میں نے کیا کیا ہے؟''

''پورے مکان کی مالک بنا دیا آپ کی بیگم کو اور آپ احسان ماننے کے بجائے آنکھیں دکھا رہے ہو۔''

''کوئی احسان نہیں کیا...... میری بیگم تمہاری بہن بھی ہے۔''

''ہاں تو جب میری بہن کو اس گھر میں میرے آنے جانے پر اعتراض نہیں تو آپ کو اعتراض کیوں بھائی میاں!''

''میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے میرے گھر میں تمہاری پارٹی کے لوگ آئیں جائیں۔''

''وہ تو آئیں گے...... جہاں ہم ہوں گے وہاں پارٹی کے لوگ بھی ضرور آئیں گے۔''

''دیکھو مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں۔''

''آپ کی پسند ناپسند سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا...... گھر باجی کا ہے اگر وہ منع کریں تو میں......'' حمید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

عاقب جانتا تھا آفریدہ اسے منع نہیں کرے گی۔ سات بہن بھائیوں میں حمید تو اس کی جان تھا۔

حمید اپنے ہاتھ پاؤں دن بہ دن پھیلاتا ہی چلا گیا۔ بالائی منزل پر ایک حصے میں اس نے اپنی ''گرل فرینڈ'' کے ساتھ رہائش اختیار کر لی اور ایک حصے کو سیاسی بیٹھک بنا لیا۔

اپنے گھر میں قماش قماش کے لوگوں کی آمد و رفت روکنے کے لیے عاقب نے نہ چاہتے ہوئے بھی فرقان علی کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پارٹی کے بااثر لوگوں میں سے تھا۔ نیچے سے اوپر تک اس کی بات سنی جاتی تھی۔ حمید کے خلاف وہی اس کی مدد کر سکتا تھا۔

☆☆☆

عاقب طویل عرصے بعد فرقان سے ملا تھا۔ اس نے اپنے مسائل کی روداد فرقان کو سنا دی تھی اور اب اس کی مدد کا طالب تھا۔

''کبھی سوچا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا تمہارے ساتھ؟'' فرقان نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے چونک کر فرقان کو دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ ''آپ بھی کہیں گے ماہ نور کی وجہ سے۔''

''تو کیا غلط کہوں گا؟'' فرقان نے کہا۔

''فرقان بھائی اس کی وجہ سے ہم سارے خاندان سے کٹ گئے تھے۔'' عاقب بولا۔

''تو کیا اب جڑ گئے۔''

عاقب نے سر جھکا لیا۔

''اس بے چاری کے لیے تو تم نے دنیا ہی تنگ کر دی یار...... بے عزتی، گالم گلوچ، مار پیٹ، تنگی، تشدد، کون سا ظلم تھا جو تم نے اس پر نہیں کیا...... یار! اپنے ہی بچے کو تم نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔''

عاقب نے بے ساختہ چونک کر فرقان کی طرف دیکھا کہ یہ بات اسے کیونکر معلوم ہوئی۔ وہ اس جرم سے انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔

''ثاقب بھائی اور عاطف بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ماہ نور کو آزمائے بغیر میں اتنی جلدی بچوں کے چکر میں پڑ جاؤں۔''

''اپنی بیویوں کے ساتھ انہوں نے ایسا کیا؟'' فرقان کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''معاف کرنا کہ میں مرحومین کے بارے میں ایسا کہنے پر مجبور ہوں...... سفاک وہ بھی تھے اور بے رحم تم بھی۔'' وہ ایک لمحے کو رکا۔ ''انجام؟'' اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے اپنی اولاد گنوائی تو ان کی اپنی اولاد بن باپ کے رہ گئی...... یار! رب سوہنا بندوں کی خطاؤں پر لٹھ لے کر مارنے نہیں آتا، ایسے ہی ہماری پکڑ کرتا ہے...... بات سمجھنے کی ہوتی ہے بس...... انسان کو کبھی کبھی اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے...... افضل تو یہ ہے کہ ہر رات بستر پر لیٹنے سے قبل...... کیا سمجھے؟''

''جی فرقان بھائی۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''مہر کے دو لاکھ روپے اس کے ہاتھ میں تھما کر اور اسے اپنے گھر سے نکال کر تم نے تو شاید یہ سمجھا ہو کہ اس بے بس لڑکی کا کوئی حق تم نے اپنے ذمہ نہیں رکھا...... مگر جانتے ہو تمہاری بے رحمی نے جو تم نے اس پر پریگنینسی ضائع کرانے کے لیے آزمائی اسے کیسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا؟''

عاقب اسے الجھی الجھی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''وہ دوبارہ ماں بننے کے لائق نہیں رہی۔''

عاقب چونکا۔

جوتوں اور کاسمیٹکس کی خریداری معمول بن گیا۔ ناپسند اور پرانی چیزیں جو نئی جیسی ہی ہوتیں وہ تھیلے بھر بھر کر اپنی بہنوں اور بھانجیوں بھتیجیوں کے لیے میکے پہنچا دیتی۔ عاقب اعتراض کرتا تو وہ منہ پھلا لیتی۔ کبھی لڑنے بھی لگتی اور اس کی تان بالآخر اس بات پر ٹوٹتی۔ ''مجھے ماہ نور سمجھنے کی ضرورت نہیں...... اس کے تو آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مجھے بہت ہیں پوچھنے والے۔ مجھے کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو اللہ رکھے میرا بھائی حمید ہی کافی ہے نمٹنے کے لیے۔'' عاقب کو تو اس کی شکل ہی سے خوف آتا تھا۔ شادی کی بات چیت کے زمانے میں وہ اپنی کسی ایکٹویٹی کے بعد روپوش نہ ہوتا اور عاقب کو اپنی رونمائی کرا دیتا تو شاید عاقب اس کی صورت سے ڈر کر ہی اس کی بہن سے شادی کا خیال ترک کر دیتا۔ بہرحال ماہ نور کے بعد اس کا دوسرا جوڑ وہیں لکھا تھا، کون ٹال سکتا تھا۔

شادی کے بعد حمید منظر عام پر آیا تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر آفریدہ سے کہا۔ ''واہ باجی! تمہاری تو قسمت کھل گئی...... مقدر کی سکندر بن گئیں تم تو...... ایسا گھر تو اپن نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا...... بس اب تم فوراً اسے اپنے نام کروانے کی کرو۔''

آفریدہ اور اس کے گھر والوں نے عاقب سے یہ فرمائش بڑے پیار سے کی۔ وہ پہلے تو چونکا پھر اس نے انہیں ٹرخانے کو کہا۔ ''گھر آفریدہ ہی کا ہے جب وقت آئے گا نام بھی ہو جائے گا۔''

''گھر نام کرنے کے لیے وقت کیا دیکھنا۔ کچہری جاؤ لکھت پڑھت کراؤ...... اللہ اللہ خیر سلا۔'' آفریدہ کی ماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے امی...... کرلیں گے۔'' عاقب نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

گھر آفریدہ کے نام کرنے کے لیے عاقب پر آفریدہ اور اس کے گھر والوں کا دباؤ روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ ناچار عاقب کو اس حقیقت سے انہیں آگاہ کرنا پڑا جس سے وہ اب تک خود نظریں چراتا رہا تھا۔ ''یہ گھر صرف میرا نہیں اس میں میرے دونوں بھائیوں کے بچوں کا حصہ بھی ہے۔'' اس نے انہیں بتایا۔

''مرنے والے مر گئے اب کسی کا کوئی حصہ وصہ نہیں۔'' آفریدہ کا بھائی آفریدہ کی حمایت میں ہاتھ نچاتا عاقب کے سامنے آیا۔

''یہ میں نہیں کہہ رہا...... شریعت کہہ رہی ہے قانون کہہ رہا ہے۔'' عاقب نے ترپ کا پتا پھینکا۔

''ارے چلو چلو...... اور کتنی شریعت کی پابندی کر رہے ہو تم...... قانون کو بھی دیکھ لیں گے...... لوگوں کے زندہ ہوتے ان کی جائدادیں دوسروں کے نام ہو جاتی ہیں تم گڑے مردوں کو رو رہے ہو۔'' حمید استہزائیہ انداز میں بولا۔

''حمید بھائی! کورٹ جائیں گے تو وہ وراثت نامہ اور نہ جانے کیا کچھ مانگیں گے۔ تمام ورثا کو بلائیں گے...... قانون بہرحال قانون ہوتا ہے۔''

حمید نے عاقب کو دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ''عاقب بھائی قانون کی آنکھوں میں مرچیں جھونک کر اسے اندھا کرنا آتا ہے ہمیں...... تم بس نوٹ ڈھیلے کرو گھر باجی کے نام کروانا میری ذمے داری۔''

''یار! بھابیاں اور ان کے بچے آ کر میرا گریبان پکڑ لیں گے۔''

''اپن کے ہوتے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا تمہیں۔''

''نہیں حمید میں یتیموں کے حق پر ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔''

سیدھی انگلیوں سے گھی نکلتے نہ دیکھ کر حمید نے تیور بدل لیے۔ ''عاقب بھائی تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ بندے کو فی الفور پار کر دیتا ہوں میں۔'' اس نے عاقب کو آنکھیں دکھائیں۔

عاقب فطرتاً بزدل آدمی تھا۔ گو وقت اور تجربے نے اسے گرگ دیدہ بنا دیا تھا مگر اندر سے وہ بزدل ہی تھا۔ حمید نے تیور بدلے تو اس کا پتا پانی ہونے لگا۔ وراثت کی قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا مکان آفریدہ کے نام ہونا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔

مگر حمید نے کہا۔ ''یہاں سب کچھ ہو جاتا ہے۔''

قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ عاقب نے اس خیال سے اسے فری ہینڈ دے دیا کہ وہ منہ کی کھائے گا مگر حمید نے سچ کہا تھا۔ کچہری میں بیٹھے گرگوں سے ساز باز کر کے اس نے بالآخر مکان آفریدہ کے نام کروا لیا۔ عاقب دیکھتا رہ گیا۔ یہی نہیں اپنی اس غیر معمولی خدمت کے صلے میں حمید مکان کی بالائی منزل پر بھی قابض ہو گیا اور اسے اپنا سیاسی گڑھ بنا لیا۔ طرح طرح کے لوگ دندناتے ہوئے گھر میں آتے اور اوپر چڑھ جاتے۔ عاقب اعتراض کرتا تو آفریدہ کہتی۔ ''گھر میرا ہے آپ کو کیا تکلیف۔''

عاقب کے اعتراضات حمید تک پہنچے تو وہ سینہ پھلائے عاقب کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ''دیکھو عاقب

بھائی! اپن سے پنگا لینے کی ضرورت نہیں۔ بھائی بن کر رہو گے تو سر آنکھوں پر رکھوں گا...... نظر بگاڑی تو ٹائیں ٹائیں فش! کیا سمجھے۔"

"شرم نہیں آتی بہنوئی کو دھمکی دے رہے ہو۔"

عاقب نے اخلاقی حربہ آزمایا۔

"بہنوئی بھی تو بہنوئی بن کر رہے بھائی میاں۔" حمید استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"کیوں! میں نے کیا کیا ہے؟"

"پورے مکان کی مالک بنا دیا آپ کی بیگم کو اور آپ احسان ماننے کے بجائے آنکھیں دکھا رہے ہو۔"

"کوئی احسان نہیں کیا...... میری بیگم تمہاری بہن بھی ہے۔"

"ہاں تو جب میری بہن کو اس گھر میں میرے آنے جانے پر اعتراض نہیں تو آپ کو اعتراض کیوں بھائی میاں!"

"میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے میرے گھر میں تمہاری پارٹی کے لوگ آئیں جائیں۔"

"وہ تو آئیں گے...... جہاں ہم ہوں گے وہاں پارٹی کے لوگ بھی ضرور آئیں گے۔"

"دیکھو مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں۔"

"آپ کی پسند ناپسند سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا...... گھر باجی کا ہے اگر وہ منع کریں تو میں......" حمید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

عاقب جانتا تھا آفریدہ اسے منع نہیں کرے گی۔

سات بہن بھائیوں میں حمید تو اس کی جان تھا۔

حمید اپنے ہاتھ پاؤں دن بہ دن پھیلاتا ہی چلا گیا۔ بالائی منزل پر ایک حصے میں اس نے اپنی "گرل فرینڈ" کے ساتھ رہائش اختیار کرلی اور ایک حصے کو سیاسی بیٹھک بنالیا۔

اپنے گھر میں قماش قماش کے لوگوں کی آمدورفت روکنے کے لیے عاقب نے نہ چاہتے ہوئے بھی فرقان علی کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پارٹی کے بااثر لوگوں میں سے تھا۔ نیچے سے اوپر تک اس کی بات سنی جاتی تھی۔ حمید کے خلاف وہی اس کی مدد کرسکتا تھا۔

☆☆☆

عاقب طویل عرصے بعد فرقان سے ملا تھا۔ اس نے اپنے مسائل کی روداد فرقان کو سنادی تھی اور اب اس کی مدد کا طالب تھا۔

"کبھی سوچا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا تمہارے ساتھ؟" فرقان نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے چونک کر فرقان کو دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ "آپ یہی کہیں گے نا ماہ نور کی وجہ سے۔"

"تو کیا غلط کہوں گا؟" فرقان نے کہا۔

"فرقان بھائی اس کی وجہ سے ہم سارے خاندان سے کٹ گئے تھے۔" عاقب بولا۔

"تو کیا اب جڑ گئے۔"

عاقب نے سر جھکا لیا۔

"اس بے چاری کے لیے تو تم نے دنیا ہی تنگ کردی یار...... بے عزتی، گالم گلوچ، مار پیٹ، تنگی، تشدد، کون سا ظلم تھا جو تم نے اس پر نہیں کیا...... یار! اپنے ہی بچے کو تم نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔"

عاقب نے بے ساختہ چونک کر فرقان کی طرف دیکھا کہ یہ بات اسے کیونکر معلوم ہوئی۔ وہ اس جرم سے انکار تو نہیں کرسکتا تھا۔

"ثاقب بھائی اور عاطف بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ماہ نور کو آزمائے بغیر میں اتنی جلدی بچوں کے چکر میں پڑ جاؤں۔"

"اپنی بیویوں کے ساتھ انہوں نے ایسا کیا؟" فرقان کے لہجے میں تلخی تھی۔ "معاف کرنا کہ میں مرحومین کے بارے میں ایسا کہنے پر مجبور ہوں...... سفاک وہ بھی تھے اور بے رحم تم بھی۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔ "انجام؟" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ "تم نے اپنی اولاد گنوائی تو ان کی اپنی اولاد بن باپ کے رہ گئی...... یار! رب سوہنا بندوں کی خطاؤں پر لٹھ لے کر مارنے نہیں آتا، ایسے ہی ہماری پکڑ کرتا ہے...... بات سمجھنے کی ہوتی ہے بس...... انسان کو بھی اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے...... افضل تو یہ ہے کہ ہر رات بستر پر لیٹنے سے قبل...... کیا سمجھے؟"

"جی فرقان بھائی۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"مہر کے دو لاکھ روپے اس کے ہاتھ میں تھما کر اور اسے اپنے گھر سے نکال کر تم نے تو شاید یہ سمجھا ہو کہ اس بے بس لڑکی کا کوئی حق تم نے اپنے ذمہ نہیں رکھا...... مگر جانتے ہو تمہاری بے رحمی نے جو تم نے اس پر پریگننسی ضائع کرانے کے لیے آزمائی اسے کیسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا؟"

عاقب اسے الجھی الجھی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"وہ دوبارہ ماں بننے کے لائق نہیں رہی۔"

عاقب چونکا۔

''اور یہ شاید اس کی اس غلطی کی سزا ہے جو اس بے وقوف لڑکی نے اس رات اپنی خالہ کے گھر سے تمہارے گھر آکر اور اپنے خاندان کی ناموس کو داؤ پر لگا کر کی تھی۔''

عاقب گومگو کیفیت سے دوچار دکھائی دینے لگا۔ کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی حائل رہی اور فرقان اسے کنکھیوں سے کچھ اس طرح دیکھتا رہا جیسے اس کے بولنے کا منتظر ہو پھر اس نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ''تم نے یہ نہیں پوچھا مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔''

عاقب نے پہلو بدلا اور اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ ''جی...... میں یہی پوچھنا چاہتا تھا مگر......''

''مگر؟''

''ہمت نہیں ہوئی۔'' وہ مردہ سی آواز میں بولا۔

''مرد ہو تو فردِ جرم کا سامنا کرنے کی ہمت رکھنی چاہیے۔'' فرقان کی بات عاقب کو گالی کی طرح لگی۔

''تمہارے گھر سے نکالے جانے کے بعد اس کا اپنے گھر والوں کے پاس جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ وہ کئی دن ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی رہی...... کبھی کسی مسجد کے خواتین کی نماز کے لیے وقف حصے میں دن گزارا تو کبھی کسی اسپتال کی راہداری میں پڑ کر رات بسر کی۔ کبھی رفاہی اداروں کا رخ کیا اور اندر جائے بغیر ہی گھبرا کر پلٹ آئی۔ ایک روز دن کے وقت مسجد میں تھی کہ کئی دن سے تعاقب کرتا شیطان اس پر حملہ آور ہوا۔ ہراساں ہو کر بھاگی اور اس نے میری والدہ کے پاس آکر دم لیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے ایک ماں کے سائے میں پناہ لی ورنہ فرشتہ ہونے کا دعویٰ تو میں بھی نہیں رکھتا۔''

عاقب نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں یار...... شیطان تو ہر آدمی کے اندر بستا ہے۔'' فرقان نے بے لاگ کہا۔

''پھر؟'' عاقب اتنا ہی کہہ سکا۔

''پھر اس نے والدہ کو وہ سب کچھ بتایا جو اس کے ساتھ تمہارے گھر میں ہوتا رہا...... کچھ عرصہ وہ ہمارے گھر رہی پھر والدہ نے کوشش کر کے اس کا نکاح اپنے دور پار کے ایک رشتہ دار سے کرا دیا جس کی بیوی مر چکی تھی اور اسے اپنے تین بچوں کے لیے ماں کی ضرورت تھی۔''

عاقب کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''خوش ہے؟''

''تم خوش ہو؟'' فرقان نے الٹا سوال داغا۔

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا...... شکست خوردگی سے۔ فرقان نے ایک گہری اور لمبی سانس کھینچی پھر بوجھل آواز میں بولا۔ ''ہم سب اپنے اپنے بوئے کی فصل کاٹتے ہیں عاقب...... گو میں پارٹی معاملات سے آج کل لاتعلق ہو چکا ہوں لیکن پھر بھی تمہارے سالے کو لگام ڈلوانے کی کوشش کروں گا...... کوشش کروں گا، اسے وعدہ مت سمجھنا...... اور کوشش بھی اس لیے کہ تمہارا بھائی ثاقب میرا بہت اچھا دوست رہا۔''

''تھینک یو ویری مچ فرقان بھائی۔''

عاقب جانے کو اور فرقان اسے رخصت کرنے کو اٹھا۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر عاقب ٹھٹک گیا اور ہچکچاتے ہوئے نہایت دل گرفتگی سے بولا۔ ''بہت بے سکون ہوں فرقان بھائی...... آپ کی کبھی اس سے ملاقات ہو تو کہیے گا مجھے معاف کر دے...... بلکہ انہیں بھی جو اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''او کے...... موقع ملا تو کہہ دوں گا۔'' فرقان نے کہا۔

''میں نے اس کے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی۔'' عاقب سر جھکا کر ندامت سے بولا۔ ''بہت پچھتاتا ہوں اب۔''

فرقان نے ایک لمبی اور گہری سانس کھینچی۔ ''یہ تمہارا نہیں ہم انسانوں کا مشترکہ المیہ ہے...... جب چیزیں ہماری دسترس میں اور لوگ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو ہم اکثر ان کی قدر نہیں کرتے...... انہیں کھو کر پچھتاتے ہیں۔''

''پتا نہیں خدا مجھے معاف کرے گا یا نہیں۔'' عاقب کی آواز بھرا رہی تھی۔

''یار! یہ تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ خدا اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا...... فقط امید ہے اس کی رحمت کی جو ہمارے دل کو اس وقت بھی سہارا دیے رکھتی ہے جب تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔'' فرقان نے ایک پل کو توقف کیا پھر کہا۔ ''مگر توبہ اور معافی سچے دل کے ساتھ مشروط ہے۔''

عاقب نے ایک نظر فرقان کو دیکھا۔ فرقان کو اس کی نگاہوں میں پچھتاوا، دکھ اور شرمندگی کے ساتھ کشمکش کی وہ کیفیت نظر آئی جو نتیجے کا انتظار کرتے اس طالب علم کی نگاہوں میں دکھائی دیتی ہے جس کے پرچے اچھے نہ ہوئے ہوں فقط ممتحن کی مہربانی کی آس ہو۔

''چلتا ہوں فرقان بھائی۔'' اس نے بوجھل آواز میں کہا لیکن جانے سے پہلے اس کا سر جھک گیا۔ اتنا کہ عرقِ ندامت کے قطرے اس کے گریبان پر ٹپکنے لگے۔



اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا مکمل حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری ناجی ہاشمی گذشتہ 25 برسوں سے اسماء الحسنی کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں آپ کے پروگرام اسماء الحسنی کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ہیں

اولادِ نرینہ کی طلب

○ میرے دونوں بیٹے پیدائش کے بعد تین ماہ زندہ رہے اور فوت ہو گئے۔ اللہ کی رحمت تین بیٹیاں ہیں وہ ماشاءاللہ صحیح سلامت ہیں اللہ ان کی حیاتی رکھے لیکن اولادِ نرینہ کی بڑی خواہش ہے۔ آپ کے روحانی علاج کی بہت شہرت ہے آپ پر سرکار داتا حضور اور سیدنا غوث الاعظم کی بڑی عنایت ہے آپ اسماء الحسنیٰ بھی تلقین کیجئے اور روحانی علاج بھی تجویز کر دیجئے مجھے آپ سے ملنے کا بھی بے حد اشتیاق ہے۔ فیس بک پر آپ کی زیارت ہوتی رہتی ہے۔ آپ کا تابعدار۔ غائبانہ مرید۔ نسیم اختر شیخوپورہ

☆ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے لیکن ناممکن کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر دعا کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ جب وہ ابراہیم علیہ السلام کو ننانوے برس میں اولاد عطا کر سکتا ہے تو آپ کو عطا کرنا اس کے لئے کیا ناممکن ہے۔ اپنا ایمان قائم رکھئے ہر نماز کے بعد 101 مرتبہ درود شریف ابراہیمی پڑھ کر دعا کیجئے۔ آپ کی فرمائش پر علاج در عقیم اولادِ نرینہ کے لئے ارسال کیا جا رہا ہے۔ آپ بروز اتوار محفلِ درود شریف میں آیئے دعا کے بعد ملاقات ہو جائے گی۔ انشاءاللہ

ڈپریشن ۔ والدہ کی بے بسی

○ رات رات بھر جاگتی ہوں لیکن نیند نہیں آتی ہے۔ بظاہر کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن سکونِ قلب میسر نہیں ہے۔ مال و اولاد سب حاصل ہے لیکن دل بالکل مردہ ہے۔ ڈپریشن، غصہ، ناکامی، اداسی جیسی کیفیات طاری رہتی ہیں۔ کئی حکیموں، ماہر نفسیات کو دکھا چکی ہوں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ دوائیں کھا کھا کر السر کی مریض ہو چکی ہوں کیا میری اس بے کسی کا علاج ہے؟ نصرت آرا۔ کراچی

☆ بہن! آپ کی بیماری جسمانی نہیں روحانی ہے آپ کے حوالے سے جو چیز استخارے کے ذریعے سامنے آئی اس نے میرا دل دہلا دیا اور آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔ آپ نے اپنی والدہ کا دل بہت دکھایا ہے، وہ آپ کو آخری لمحوں تک یاد کرتے کرتے، آپ کا انتظار کرتے کرتے اس جہاں سے گزر گئی تھیں لیکن آپ نے ان کی کوئی خبر نہیں لی۔ آپ کی والدہ نے، مجھے سو فیصد یقین ہے کوئی بد دعا نہیں دی ہوگی، لیکن ان کے صبر اور بے بسی نے آپ کو جکڑ لیا ہے۔ آپ ان کے لئے ایصال ثواب کریں، ممکن ہو تو ان کی قبر پر جا کر باقاعدہ معافی مانگیں۔ "سورۃ الملک" پڑھ کر ان کو ہدیہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی اطاعت اور ان کی دعائیں سمیٹنے والا بنائے۔ (آمین)

بربادی ۔ مزید قرضدار

○ گزشتہ کئی برسوں سے جو کاروبار بھی کرتا ہوں وہ شروع میں تو اچھا چلتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے نقصان میں آ کر ختم ہو جاتا ہے اور میں مزید قرضدار ہو جاتا ہوں، پہلے بیگم کا زیور، پھر پلاٹ، آخر میں گھر اور گاڑی بھی بک گئی اور ہم ڈھائی سو گز سے 64 گز کے معمولی سے کرائے کے گھر میں آ گئے ہیں، ہزار ہا کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوتا، بہت محدود پانچ ہوتا ہے جو دوسروں کو بتاتا ہوں وہ ہٹ ہو جاتا ہے جو خود کرتا ہوں پٹ جاتا ہے، کوئی کہتا ہے جادو ہے تعویذ ہے، کیا کروں۔ آپ کے متعلق بہت سنا ہے، اللہ کے واسطے میرا مسئلہ حل کر دیجئے۔ دعا گو رہوں گا۔ نصیر احمد۔ کراچی

☆ بھیا! دو باتیں ہیں آپ بہت اچھے منتظم اور اچھے پلانر ہیں لیکن آپ کا جو اسکل ہے وہ بڑے پیمانے پر کام کرنے کا ہے۔ آپ اپنے کاروبار کی بجائے کسی بڑے ادارے میں جاب کے لئے اپلائی کیجئے، دوسرے آپ کی ناکامی کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ 7 برس پہلے بیمار ہوئے تھے۔ اس کا جسمانی علاج نہیں ہوا تھا بلکہ آپ کا روحانی علاج ہوا تھا لیکن اس کے بعد آپ جسمانی طور پر تو صحت مند ہو گئے لیکن بداثرات کے دائرے سے نہیں نکل پائے۔ آپ "سورۃ یٰسین" سات مبین والی بعد نماز عشاء پڑھنی شروع کر دیں معاملات اچھے ہو جائیں گے۔ آپ کی خصوصی فرمائش پر لوحِ مشتری برائے کامیابی

اور روپے پیسے میں برکت کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔

حالات اچھے تھے۔تو بھول گیا

O میں آپ کا ایک مرید ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں کہ جب حالات اچھے تھے تو بھول گیا اب برے ہوئے ہیں تو پھر آپ کے پاس حاضر ہوں، میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ کاروبار شروع کیا۔اس نے سارا لین دین عملاً اپنے ہاتھ میں رکھا مگر ساری بینک ٹرانزیکشن میں کرتا تھا۔چار سال کاروبار بہت اچھا چلا ہم لوگوں نے خوب پیسے کمائے ۔ہمارے کاروبار کی بہتری کو دیکھ کر میرے پارٹنر نے مجھے کچھ لوگوں سے ملوایا کہ یہ ہمارے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ہمیں اپنے ایک کام کے لئے چودہ لاکھ کی ضرورت تھی۔انہوں نے ہم سے معاہدہ کر کے ہمیں 20 لاکھ ادا کر دیئے جو میں نے بینک میں جمع کروا دیئے، چند دنوں میں کام کی پے منٹس کے سلسلے میں پارٹنر نے تمام رقم نکال لی اور مجھے معلوم ہی نہ ہوا اس میں 6-6 ماہ کے 8 لاکھ کے بارہ تیرہ چیک بھی تھے۔پھر اچانک تھوڑے ہی عرصے میں جن لوگوں نے رقم دی تھی انہوں نے تقاضا شروع کر دیا اور جنہوں نے مال ہمیں بھیجا تھا ان کے چیکس واپس ہونا شروع ہو گئے، گھر بار ہر چیز بک گئی مگر میرے اوپر قرض کا پہاڑ کھڑا ہے۔کبھی ایک چیک کی ضمانت کرواتا ہوں، کبھی حوالات کی سیر کرتا ہوں۔عزیز رشتے دار منہ موڑ چکے ہیں بیوی ساتھ دیتی ہے۔بچے بری طرح سہم گئے ہیں کیا کروں سمجھ نہیں آتا۔وہ پارٹنر ایسا غائب ہوا ہے کہ جیسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔کیا کروں کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے خودکشی کر لوں۔کیا ایک بار پھر نظر کرم نہیں کریں گے۔دعا کا طالب۔محمد طالب حسین۔حیدرآباد

☆اچھے میاں! ہمارا ناراضگی یا غصے سے کیا علاقہ، محبت اور مروت ہمارا مشرب ہے۔اللہ تعالیٰ تمام معاملات کو بہتر کرنے والا ہے۔میرے رب کی رحمت سے پہاڑ جیسا قرض بھی ہو تو ادا ہو جائے گا۔"سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم" کثرت سے پڑھا کرو۔بروز جمعرات ایک روٹی کا صدقہ کیا کرو اور اتوار کے دن ٹھیک 2 بجے تا 4 بجے گھر والوں کے ساتھ درود شریف پڑھا کرو اور پیر خانے کی دعا جو پونے چار بجے شروع ہوتی ہے اس وقت دعا شروع کرو پیر خانے میں بھی دعا ہوگی۔تمام بہن بھائی جو کسی وجہ نہ آسکیں یا بیرونِ ملک اشہر ہوں ان کو بھی تاکید ہے کہ 2 بجے تا 4 بجے محفل درود شریف منعقد کیا کریں۔تمہارے کاروباری مسائل کو دیکھتے ہوئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

معاملہ ختم۔صحت بحال

O میری بیٹی ماشاء اللہ خوبصورت قد بت کی ہے، ماسٹرز کیا ہے۔مگر جب بھی اس کے رشتے کی بات فائنل ہونے لگتی ہے وہ بیمار پڑ جاتی ہے چہرے کی رنگت نچڑ جاتی ہے سانس پھولنے لگتا ہے، ہاتھ پیروں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔چہرے پر پانی والے دانے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔اسکن اسپیشلسٹ، ماہر نفسیات سب کو دکھایا، لیکن افاقہ نہیں ہوتا۔مگر جونہی شادی کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے صحت بحال ہونا شروع ہو جاتی ہے، لوگ کہتے ہیں جادو تعویذ کا اثر ہے۔اگر ایسا ہے تو علاج عنایت کیجئے تاکہ شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔آپ کی بہن دعا گو

☆اچھی بہن! معاملہ تو واقعی تشویشناک ہے۔آپ کی صاحبزادی آسیبی کیفیت کا شکار ہیں۔شریعت قطعی برہنہ ہو کر نہانے سے منع کرتی ہے۔اسی لئے شریعت نے قضائے حاجات کے لئے مسنون دعائیں تلقین کی ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم احتیاط نہیں کرتے، جس کا نتیجہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔آپ کو نظر بد، جن اور آسیبی معاملات کے لئے ایک ورد، پینے کے غسل کے جلانے کے تعویذ بذریعہ ڈاک بھیجے جارہے ہیں۔اس پر پابندی سے عمل کیجئے۔انشاء اللہ بچی کے معاملات 90 روز میں بہتر ہو جائیں گے۔

مطلبی مرید۔نہ میاں نہ

O بیرونِ ملک جانے کی بڑی خواہش ہے مگر کئی برسوں کی کوشش کے باوجود بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ہزاروں روپے ایجنٹوں کے چکر میں برباد کر چکا ہوں، ایک بار بڑی مشکل سے یونان پہنچا مگر ڈی پورٹ کر دیا گیا۔والد صاحب کا کہنا ہے کہ یہیں کوئی کام کر لو مگر میری بھی ضد ہے کہ کام باہر ہی کروں گا۔اس وجہ سے ابا بھی ناراض رہتے ہیں۔کیا اس کا کوئی حل ہے آپ کے روحانی اور قرآنی اعمال کا بہت سنا ہے آپ میرا کام کر دیں تو میں آپ کا مرید ہو جاؤں گا۔رضوان محمود۔نواب شاہ

☆نہ میاں نہ! ہمیں مطلبی مریدوں کی ضرورت نہیں۔اللہ پاک آپ کے معاملات حل فرمائے۔ترکیب ہم بتا دیتے ہیں۔ایجنٹوں کا چکر چھوڑیں جو ابا کہتے ہیں مان لیں اور کاروبار شروع کر دیں جب ابا خوش ہو جائیں تو ان کی مرضی سے بیرونِ ملک کے لئے اپلائی کر دیں، کامیاب ہو جائیں گے، یاد رکھیں والد کا غضب اللہ کا غضب اور والد کی اطاعت اللہ کی خوشنودی ہے آپ کی بے حد فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

شادی۔ورنہ خودکشی

O کئی دنوں سے ایک ایسی پریشانی میں پھنس گئی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میرا بیٹا میری بہو کی بہن کو پسند کرتا ہے مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے آپس میں رشتے داری کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے مطلب یہ کہ شادی طے ہے۔مگر میرے بیٹے کی ضد یہی ہے کہ وہ روزینہ ہی سے شادی کرے گا۔دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کی مگر اللہ کے فضل نے اسے بچا لیا۔میرے دو بیٹے اور ایک ہی بیٹی ہے۔بہو اور بیٹے کا رویہ بدل گیا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ میں علیحدہ

ہوجاؤں، دوسری طرف وہ لوگ بھی ہم سے ناراض ہورہے ہیں کہ ہم اپنے بیٹے کو سمجھاتے نہیں ہیں مگر ہم کیا کریں، سچی بات تو یہ ہے بھائی صاحب کہ اگر میرے بیٹے کو محبت کا حق حاصل ہے تو ان دونوں کو بھی یہی حق حاصل ہے پھر یکطرفہ محبت سے فائدہ کیا؟ اذیت کے علاوہ کیا ملتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس کے لئے کوئی ایسا روحانی حل تجویز کریں کہ یہ سب خوش رہیں۔ سلمٰی پروین۔ راولپنڈی

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ تمام والدین کو اولاد کے دکھ سے محفوظ و مامون رکھے۔ آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا کریم یا سلام یا ھادی یا نافع" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ بیٹے کی اصلاح کے لئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ بیٹی کے امتحانات میں کامیابی کے لئے لوح عطارد ارسال ہے۔

آیا امتحان۔ ہوگئی چڑچڑاہٹ

○ میری بیٹی اور بیٹا نویں، دسویں کے طالب علم ہیں ٹیسٹ میں ان کے نمبر بہت اچھے آتے ہیں مگر امتحان کے دنوں میں طبیعت سست، بے چین ہوجاتی ہے چڑچڑے ہوجاتے ہیں نیند بہت آنے لگتی ہے جو یاد کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں پتا نہیں کہ بچوں کو نظر لگ گئی ہے یا کوئی جادو ہے۔ آپ کوئی روحانی علاج تجویز کردیجئے۔ عذرا آفتاب۔ فیصل آباد

☆ بہن! ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ "سورۂ الم نشرح" پانی پر دم کرکے پلائیں، بے وجہ نصیحتوں اور دباؤ سے گریز کریں۔ دونوں کو 7 باداموں پر "یا علیم یا قوی" 100 مرتبہ دم کرکے دے دیا کریں آپ کی فرمائش پر لوح عطارد ارسال کی جارہی ہے۔ گیارہویں شریف کے لئے آپ کے ہدیے کا شکریہ

میاں۔ اڑیل مزاج

○ میری شادی کو 9 برس ہوگئے ہیں مگر کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ میاں عجیب سے اڑیل مزاج ہیں جو بات منہ سے نکل جائے بس وہی ہونا ہے۔ چاہے غلط ہو یا سہی ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں پہلے رشتے دار ناراض تھے اب سگے بہن بھائی بھی ملنا چھوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کی بیویوں کو ٹوکنا لازمی سمجھتے ہیں سب میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنے میاں کو، مگر میری کوئی اوقات ہو تو میں سمجھاؤں، بس ایک نوکرانی ہی ہوں، ضرورت کے تحت میرے پاس آتے ہیں اور اس میں بھی رویہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہن اور بدن احساسِ ذلت سے سلگ جاتا ہے، نہ نماز نہ روزہ اوپر سے دین کی من مانی تشریح جو صرف اپنے مفاد کے مطابق ہو۔ جاہل نہیں ہیں اپنے مضمون کے پی ایچ ڈی ہیں دنیا ان کے علم و فضل کی دیوانی اور گھریلو معاملات میں صفر، کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں مگر پھر سوچتی ہوں میرے بچوں کا کیا قصور اگر باپ کی شفقت نہیں ملتی تو ماں کی ممتا سے کیوں محروم کروں۔ کیا اس کا علاج ہے آپ کے پاس میں تو دعائیں کر کر کے تھک گئی ہوں ایک بزرگ کی طرح میری مدد فرمائیں۔ شاہین اسلم۔ کراچی

☆ بیٹی جیتی رہو! تم جیسی بچیوں سے معاشرہ سلامت ہے تمہارے میاں اصل میں احساسِ کمتری کے مریض ہیں، اوپر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ تعلیم اور نوکری سے نواز دیا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ہر شخص خصوصاً خاندان والے چونکہ ان کی خامیاں کمزوریاں ان کے علم میں ہیں لہٰذا ان کا فائدہ اٹھا کر تضحیک کرنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ ہرگز خودکشی کا نہ سوچنا اللہ میاں بہت غفور الرحیم ہے۔ ہر نماز کے بعد صرف 14 مرتبہ "درود شریف تاج" پڑھ کر ان کا تصور کرکے دم کردیا کرو خصوصاً جب "دافع البلاء والوباء والقحط والمرض والالم" تک پہنچو تو تین بار تکرار کرو اصلاح کے لئے لوح تسخیر خاص اور نقوشِ زعفران ارسال کئے جارہے ہیں۔ یقین رکھو اللہ پاک اچھا اجر دیں گے۔

اسکول کی لڑکی۔ خواب میں آئے

○ میرے ساتھ کچھ عرصے سے عجیب سا واقعہ ہونا شروع ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے میرا سکھ چین غارت ہوگیا ہے، میں اپنے گھر، بیوی، بچوں سے بے حد خوش ہوں، مگر گزشتہ ڈیڑھ سالوں سے میرا ہر پل عذاب ہوگیا ہے، ہم میرپور خاص میں رہتے تھے، پھر والد صاحب کے تبادلے کے ساتھ یہاں آگئے، تعلیم وغیرہ سب یہیں حاصل کی، شادی ہوگئی۔ ایک دن اچانک بازار میں پرانے شہر کے ایک واقف مل گئے بچپن میں ہم سب ایک ہی گلی میں رہتے تھے، وہ میرے گھر آئے میں ان کے گھر گیا تو معلوم ہوا ان کی شادی ہماری ہی ایک اسکول فیلو سے ہو گئی تھی، سچی بات تو یہ کہ مجھے اس کی شکل تک یاد نہیں تھی، مگر جب انہوں نے ملوایا تو ایک عجیب سا احساس ہوا، مجھے یاد آیا کہ وہ کالی سی سوکھی سی مریل سی لڑکی ہوا کرتی تھی مگر اب وہ ایک بھرپور خاتون تھی، ملاقات چائے، کھانے کے بعد ہم گھر واپس آگئے مگر وہ میرے ذہن سے چپک

ضروری نوٹ

اپنا مختصر مسئلہ اپنے مکمل نام معہ والدین اور تاریخ پیدائش کے ساتھ ارسال کریں۔ اس کالم میں جواب باری آنے پر دیا جاتا ہے۔ براہ راست جواب کے لئے اپنا پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ بھیجئے۔ فون پر مسئلہ نہیں سنا جاتا ہے، خط لکھیں یا ملاقات کریں۔ بیرون شہر سے آنے والے وقت لے کر تشریف لائیں۔ بیرون ملک مقیم خواتین و حضرات اپنا مکمل پتا ارسال کریں۔

پیر شاہ محمد قادری 382-A/2، جوہر ٹاؤن،
نزد محمد علی چوک، کالج روڈ۔ لاہور۔ تعطیل بروز جمعۃ المبارک
0302-5555967

گئی، اب ہر رات خوابوں میں آتی ہے، میں اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہوں وہ میرے دوست کی بیوی ہے، پھر میرا اس کا تعلق ہی کیا مگر جس قدر بھی نظر انداز کردوں اس کے خیال کو کچلوں وہ میرے اعصاب پر سوار ہے، خدا کے لئے میرا گھر تباہ ہونے سے بچا لیجئے۔ محمد جنید۔ کراچی

☆ عزیزم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ ایک ذہنی صدمے کا ردعمل ہے بقول آپ کے وہ کالی سوکھی مریل سی لڑکی کو آپ اس روپ میں دیکھنے کو تیار ہی نہیں تھے مگر جب آپ نے اس کو اچانک دیکھا اس کی جاذبیت نے آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا یہ تو ہے آپ کے مسئلے کی توجیح روحانی حل یہ ہے آپ رات سونے سے قبل بکثرت "ایاک نعبد وایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم" پڑھا کریں۔ آپ کے لئے لوح زہرہ ارسال ہے۔

ٹیچر کی محبت۔ گرفتار

بات اچھی تو نہیں ہے مگر جب مشورہ لیا جائے تو سچ کہے بغیر چارہ نہیں اور آپ سے تو ویسے بھی میں جھوٹ بولنا گناہ سمجھتی ہوں، آپ کی فیس بک اور ویب سائٹ بہت پسند ہے میں غائبانہ آپ کی مرید ہوں میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ٹیچر سے محبت ہوگئی ہے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں حالانکہ وہ شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ ہیں ہمارے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ ہے، وہ پانچ مرلے کے کرائے کے پورشن میں رہتے ہیں اور ہمارا گھر دو کنال پر ہے، اس سے آپ اندازہ لگالیں، مگر دل کا کیا کروں کہ وہ میرے قابو میں نہیں ہے، ان کی نرمی، محبت اور توجہ نے مجھے ان کی محبت میں گرفتار کرلیا ہے۔ مگر وہ میری طرف توجہ ہی نہیں دیتے، ایک بار میں نے ان سے کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ جو چیز میں افورڈ نہیں کرسکتا اس پر نہ توجہ دیتا ہوں اور نہ ہی اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ان کی اس بے نیازی نے مجھے اور بھی ان پر مائل کردیا ہے، میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ دن رات ان کے فراق میں تڑپتی رہتی ہوں، آپ مدد کردیں۔ نوشابہ۔ شہر نامعلوم

☆ کریم آقا حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے، آدمی کے تین باپ ہیں، ایک وہ جس کے صلب سے وہ پیدا ہوتا ہے ایک وہ جو اسے تعلیم دیتا ہے اور ایک وہ جو اس کو بیٹی دیتا ہے، آپ کی محبت درست ہے مگر زاویہ درست نہیں، اپنا نقطہ نظر بدل لیجئے، زندگی آسان ہوجائے گی، آپ کے لئے لوح زحل ارسال کی جارہی ہے، آپ ہماری بیٹی ہیں اور بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے، مرید ہونے کے لئے اپنے والدین کے ہمراہ آئیں۔